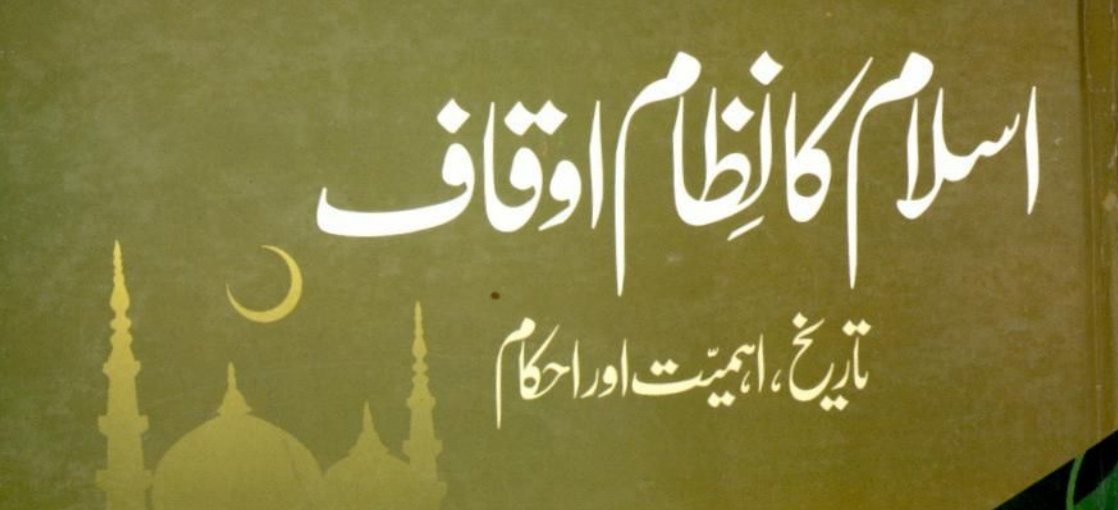


اسلام کا نظامِ اوقاف

تاریخ، اہمیت اور احکام

مؤلف

مولانا ڈاکٹر خلیل احمد اعظمی

استاذ جامعہ دار العلوم کراچی

ادارہ اسلامیات

کراچی — لاہور

اسلام کا نظامِ اَوقاف

تاریخ، اہمیت اور احکام

مؤلف

مولانا ڈاکٹر خلیل احمد اعظمی

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

ناشر

اِدارۂ اسلامیات

کراچی۔ لاہور

پہلی بار : ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ ۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء
باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمٰن
کمپوزنگ : سمیع اللہ ۔ لانڈھی، کراچی ۔ ۶
ناشر : ادارۃ اسلامیات کراچی ۔ لاہور

طلب فرمایئے:

۱۔ ادارۃ اسلامیات موہن روڈ، چوک اردو بازار کراچی، فون: ۰۲۱۔۳۲۷۲۲۴۰۱
۲۔ ادارۃ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی، لاہور۔ پاکستان فون: ۰۴۲۔۳۷۵۳۲۵۵/ ۰۴۲۔۳۷۲۴۳۹۹۱
۳۔ ادارۃ اسلامیات دینا ناتھ منشن مال روڈ، لاہور فون: ۰۴۲۔۳۷۳۲۴۴۱۲/ ۰۴۲۔۳۷۳۲۴۷۸۵

ملنے کے پتے:

بیت العلوم : ۲۶ نابھہ روڈ لاہور
ادارۃ المعارف : ڈاک خانہ دارالعلوم کراچی ۱۴
مکتبہ معارف القرآن : ڈاک خانہ دارالعلوم کراچی ۱۴
مکتبہ دارالعلوم : جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴
دارالاشاعت : ایم اے جناح روڈ کراچی نمبر ۱
بیت القرآن : اردو بازار کراچی نمبر ۱
بیت الکتب : نزد اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک نمبر ۲ کراچی
ادارہ تالیفات اشرفیہ : بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر
ادارہ تالیفات اشرفیہ : جامع مسجد تھانیوالی ہارون آباد بہاولنگر

انتساب

عظیم والدین کے نام جنہوں نے حالات کی بے رحم موجوں، گرم و تیز ہواؤں کے تھپیڑوں کا خود سامنا کر کے مجھے تحصیلِ علم کے لئے وقف کر دیا، جو کچھ حرف شناسی کی دولت حاصل ہے یہ انہی کی توجہات اور دعاؤں کا ثمرہ ہے۔
اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور مجھے مزید ایسے علمی کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو میرے لئے اور ان کے لئے صدقہ جاریہ بن سکیں۔ آمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

استاذ محترم مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دام اقبالہم (رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی) کی ترغیب وتشویق سے ۲۰۰۰ء میں بندہ نے جامعہ کراچی کے کلیہ معارفِ اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کے داخلے کے لئے کوشش شروع کی تو میرے مشفق استاذ حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب زید مجدہم نے ''وقف'' کا موضوع تجویز فرمایا۔ اللہ رب العزت کے بے پایاں فضل سے یہ مقالہ مکمل ہوا اور جامعہ کراچی نے اس کی بنیاد پر پی ایچ ڈی کی سند جاری کی، اس مقالہ کی طباعت اور اہل علم کی خدمت میں اسے پیش کرنے کی ہمت نہیں تھی، لیکن استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب زید مجدہم نے ہی اس کی اشاعت کی ہمت دلائی اور مزید احسان یہ فرمایا کہ بندہ کی درخواست پر اس مقالہ کے تقریباً نوے فیصد سے زائد حصہ کا بالاستیعاب مطالعہ فرمایا اور جہاں ضرورت سمجھی اصلاح فرمائی اور مفید مشورے عنایت فرمائے اور بقیہ حصہ کا اجمالی مطالعہ فرمایا، الحمد للہ استاذِ محترم کی اصلاح اور مفید مشورے میرے لئے کسی بھی عظیم خزانہ سے کم نہیں تھے، میں نے اس کے مطابق اس میں تبدیلیاں کیں اور اب یہ کتاب طباعت کے لئے تیار ہے۔ اللہ تعالیٰ استاذِ محترم کو اپنی شان کے مطابق اجرِ عظیم عطا فرمائے، انہیں صحتِ کاملہ، عافیتِ دائمہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے فیوضات سے مزید مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

میں جامعہ کراچی کی پروفیسر ڈاکٹر مسرت جہاں صاحبہ کا بھی شکر گذار ہوں جن کے اشراف کے تحت یہ مقالہ لکھا گیا اور ان کا تعاون ہمہ وقت شامل رہا، اللہ تعالیٰ انہیں عافیتِ دارین عطا فرمائے۔

آخر میں حضراتِ اہلِ علم سے درخواست ہے کہ اگر اس کتاب میں کوئی قابلِ اصلاح بات پائیں تو بندہ کو اس سے ضرور آگاہ کریں، بندہ ان کا احسانمند ہوگا اور انشاء اللہ ان کی رائے پر مکمل انبساط اور توجہ سے غور کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر میرے لئے اور میرے والدین واساتذہ کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے اور مزید خدماتِ دینیہ مقبولہ کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین، آمین، آمین۔ یارب العالمین۔

بندہ خلیل احمد اعظمی

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی

۲۰ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب زید مجدہم

استاذِ حدیث و مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی

بعد الحمد والصلاۃ

عزیز گرامی قدر جناب مولانا خلیل احمد اعظمی صاحب زید مجدہم جامعہ دارالعلوم کراچی کے ہونہار طلبہ میں شامل تھے، دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد تخصص فی الافتاء کے تین سال مکمل کئے تو تیسرے سال انہوں نے الاشباہ والنظائر کی ''کتاب الوقف'' کی شرح کے طور پر عربی زبان میں مقالہ لکھا، مقالہ نویسی کے دوران وہ احقر سے مشورہ کرتے رہے، اس دوران ان کی استعداد اور صلاحیت، کام سے ان کی لگن، مسائل میں غور و فکر کی عادت اور حق قبول کرنے کی صلاحیت نے ہمیشہ ایک خوشگوار تاثر چھوڑا۔ جامعہ دارالعلوم کراچی سے فراغت کے بعد جامعہ ہی میں بحیثیت استاذ ان کا تقرر ہوا نیز اسلامی بنکاری میں بھی انہوں نے وقت لگانا شروع کیا اور دونوں جگہ ان کی اچھی صلاحیت کا ظہور ہوا، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے داخلہ لیا تو احقر کے مشورہ سے انہوں نے پھر اسی موضوع کا انتخاب کیا اور ماشاء اللہ نئے انداز سے انہوں نے اردو زبان میں ایک قابلِ قدر مقالہ تیار کیا۔ جس کی بنیاد پر بحمد اللہ کراچی یونیورسٹی سے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری جاری کی گئی۔

اب یہ مقالہ انہوں نے قسطوں کی شکل میں احقر کو دیا احقر نے تقریباً پورے مقالہ سے استفادہ کیا۔ کچھ حصہ سرسری انداز سے لیکن اکثر حصہ بالاستیعاب۔ عزیز مکرم سلمہم اللہ تعالیٰ کی خواہش اور ان کی ہدایت کے پیش نظر دورانِ مطالعہ کسی جگہ مزید تحقیق، کسی جگہ تعبیر کی تبدیلی، کسی جگہ شروط و قیود کا اضافہ جیسے مشورے دیتا رہا جسے عزیز مکرم حسبِ سابق خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے اور کتاب کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

عزیز القدر سلمہ کے اس کام سے احقر کی اپنی دلچسپی کی وجہ بنیادی طور یہ تھی کہ ملک میں اوقاف کی کثرت اور ان کے پیش آنے والے نت نئے مسائل کے باوجود کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس میں دورِ حاضر کے عرف وقوانین کو سامنے رکھتے ہوئے اوقاف کے مسائل کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہو۔

احقر کے عظیم المرتبت دادا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو اس کی ضرورت کا احساس بہت زیادہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس موضوع پر جامع کتاب فقہی انداز سے مرتب کریں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کتبِ فقہ سے اہم حوالے بھی جمع کر لئے تھے جن کی روشنی میں وہ ''الکشاف فی احکام الاؤقاف '' کے نام سے کتاب مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن کاموں کے ہجوم اور مشاغل کی کثرت کی وجہ سے اپنی زندگی میں وہ یہ کام مکمل نہ کر سکے اور وہ حوالے ''الکشاف فی احکام الاوقاف '' کے نام سے جامعہ دارالعلوم کراچی کے کتب خانہ میں باقی رہ گئے۔ عزیز سلمہ نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ عزیز سلمہ کے اس کام سے احقر کو اپنے عظیم المرتبت دادا کی خواہش کی تکمیل بھی نظر آئی اس لئے ان کے کام کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔

اب بحمد اللہ ان کی یہ کتاب طباعت کے لئے تیار ہوئی تو ان کی خواہش ہوئی کہ احقر اس پر چند کلمات لکھ دے، ان کی خواہش کے پیش نظر احقر یہ سطور تحریر کر رہا ہے۔ بلاشبہ عزیز سلمہ کی کتاب قابلِ قدر ہے جس پر یہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بارک اللہ تعالیٰ فی علمه و عمله، ووفقه للمزید بالاخلاص والصدق والتوفیق لما یحبه ویرضاه۔ آمین

البتہ اس کتاب کے قابل قدر اور قابل مبارکباد ہونے کے باوجود یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ اوقاف کے مسائل پیچیدہ ہیں اور ہمارے دور میں ان پر کام بھی کم ہوا ہے اس لئے بعض مسائل میں ایک سے زائد رائے کا احتمال موجود ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ان پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور اس بارے میں غور وفکر کرنے اور حق کی تلاش کے لئے راہنما ثابت ہوگی اور حق جوئی کے راستے کھولے گی۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو مؤلف سلمہ کے حق میں قبول فرما کر انہیں دارین میں اجر عظیم سے اور اپنی رضا وقبولیت سے نوازیں اور مزید خدماتِ دینیہ مقبولہ کی توفیق عطا کریں۔ آمین

خادم احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ

دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۹/شوال ۱۴۳۱ھ۔ ۲۹/ستمبر ۲۰۱۰ء



مقدمہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد خاتم النبیین و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین و علی من تبعھم باحسان الی یوم الدین.

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس نے انسانوں کے سامنے دونوں جہاں کی کامیابی وکامرانی کا نظریہ بھر پور اور جامع طریقہ سے پیش کیا ہے، اور ایک اسلامی فلاحی معاشرہ تشکیل دینے کے متعلق ایسی واضح ہدایات، جامع تعلیمات اور آفاقی اصول ہمیں عطا کئے ہیں جنہیں بروئے کار لاکر صحیح معنوں میں ایسا اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے جہاں قرآن وسنت کی بالادستی کے ساتھ انسانیت کی فلاح و بہبود کے اداروں کو بھی اولویت حاصل ہو اور جہاں حقوق اللہ کی مکمل پاسداری کے ساتھ ساتھ حقوق العباد سے وابستہ اداروں کی بھی منظّم شکل موجود ہو۔

ان اصولوں میں سے ایک اصول وقف ہے، جو اسلامی فلاحی معاشرہ کے بنیادی ستونوں میں سے ایک اہم ستون ہے، اور اپنی اس منظّم شکل کے اعتبار سے اسلام ہی کا خاصہ ہے، اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان اور مذاہب میں ہمیں اس قدر منظّم شکل میں وقف کا نظام نظر نہیں آتا۔

نظام وقف کے ذریعہ اسلام کے اعلیٰ اخلاق واقدار کی حقیقت نمایاں ہوتی ہے اور یہی نظام اسلام کی ترقیاتی اقدار اور عبادت وعقیدہ کی اقدار کے درمیان ہم آہنگی کو ظاہر کرنے کی اصل اور حقیقی شکل ہے، اس کے ذریعہ مسلم معاشرہ کو اپنے مختلف طبقات اور گروہوں سے مربوط رہنے کا حقیقی موقع ملتا ہے، وقف کے ذریعہ مسجدیں آباد ہوتی ہیں، مدارس اور تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں، بیماروں کے علاج ومعالجہ کے لئے ہسپتال وشفاخانے کھولے جاتے ہیں، معذوروں اور قوم کے کمزور افراد کے لئے تعلیم وتربیت کے ادارے

کام کرتے ہیں۔

نظامِ وقف کے ذریعہ انفاقِ عام کی صحیح رخ ملتا ہے، حکومت کے عام بجٹ کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے، نہ صرف رفاہی امور میں انفاق کو مناسب جہت ملتی ہے بلکہ معاشرتی امور کے انتظام میں بھی انفاق کو صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

اسلامی اوقاف کا سلسلہ جناب نبی کریم ﷺ کے دور سے چل رہا ہے آپ ﷺ نے خود بھی اپنی بعض زمینیں وقف کیں اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اس کی ترغیب دی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ میں سے جو بھی صاحبِ استطاعت تھے انہوں نے بقدرِ استطاعت اپنی جائیدادیں راہِ خدا میں ضرور وقف کیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تقریباً اسی صحابہ کرامؓ نے اپنی جائیدادیں وقف کیں (ان تمام روایات وآثار کا تفصیلی باحوالہ ذکر وقف کی تاریخ کے ذیل میں آرہا ہے) بعد میں خلافت بنوامیہ اور خلافتِ عباسیہ کے زمانہ میں پورے عالم اسلام میں اتنی جائیدادیں وقف کی گئیں کہ وقف کا ایک وسیع نظام وجود میں آگیا، ایک دور تو وہ آیا کہ جب انسان تو انسان جانوروں کے لئے بھی مسلمانوں کے یہاں متعدد اوقاف موجود تھے، ایک زمانہ تھا کہ ہر مسجد و مدرسہ کے ساتھ وسیع وعریض اوقاف موجود ہوتے اور ہر آنے والا حکمران ان میں اضافہ ہی کرتا تھا، وقف کا یہ سلسلہ الحمدللہ آج تک چلا آرہا ہے لیکن اس میں روز بروز کمی آتی جارہی ہے جس کے بہت سے اسباب ہیں، مثلاً:

۱۔ اوقاف کی طرف حکومتی سطح پر عدمِ ترغیب۔

۲۔ جو اوقاف موجود ہیں ان کی طرف عدمِ توجہی اور اوقاف کے شرعی اصولوں کی عدمِ تنفیذ

۳۔ اوقاف کے امور میں بے جا حکومتی مداخلت۔

۴۔ اوقاف کے متولیین کی خیانت اور واقف کی شرائط کا لحاظ نہ رکھنا۔

۵۔ اوقاف کو چند مخصوص احوال اور صورتوں میں منحصر سمجھنا۔

۶۔ آمدنی کے لئے جدید تمویلی صورتوں کو اختیار نہ کرنے کی وجہ سے ان کی آمدنی کا نہایت قلیل ہونا۔

ان امور کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ جس وسیع پیمانہ پر خلافت بنوامیہ، خلافتِ عباسیہ اور خلافتِ عثمانیہ کے زمانہ میں اس کا نظام قائم تھا آج اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں رہا، جبکہ آج اس کی ضرورت پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی ہے، آج مسلم معاشرہ میں بیشتر لوگوں کو علاج ومعالجہ کی سہولتیں حاصل نہیں، تعلیمی وتربیتی اداروں کا فقدان ہی نہیں بلکہ قحط ہے معذوروں اور یتیم بچوں کے لئے تربیتی اور دیکھ بھال کے ادارے عنقا ہیں۔ اور جو پرانے اوقاف موجود ہیں وہ بھی ایک ایک کر کے ختم ہوجاتے جارہے ہیں اور عوام میں انہیں محض متروکہ جائیداد

کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس اہم نظام پر توجہ دی جائے۔ اور اس کے لئے علمی و عملی دونوں طرح کی کوششیں بروئے کار لائی جائیں، زیرِ نظر مقالہ اس موضوع پر علمی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔

اس سے قبل اردو زبان میں اس موضوع پر چند مضامین اور رسائل کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہیں، البتہ عربی زبان میں اس موضوع پر معلومات کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، یہ ذخیرہ معلومات ان تمام کتب میں ملتا ہے جو کتبِ فقہ و فتاویٰ کہلاتی ہیں، مثال کے طور پر علامہ مرغینانیؒ کی ہدایہ ابن عابدینؒ کی ردالمحتار، ابن نجیمؒ کی البحر الرائق، ابن الہمامؒ کی فتح القدیر، علامہ قاضی خانؒ کی فتاویٰ خانیہ اور فتاویٰ ہندیہ و مہدویہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ اس موضوع پر اربابِ علم کی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں، ہلال بن یحییٰ مسلم الرأی متوفی ۲۴۵ھ کی کتاب ''کتاب احکام الوقف'' اور امام ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف المتوفی ۲۶۱ھ کی کتاب ''احکام الاوقاف'' اس موضوع پر سب سے قدیم ماخذ ہیں، ان میں اگرچہ وقف سے متعلق سارے اصولوں اور مسائل کا استقصاء تو نہیں کیا گیا لیکن جن مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ کی گئی ہے، برہان الدین الطرابلسی کی الاسعاف بھی اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن چونکہ یہ قدیم انداز میں لکھی گئی ہے اس لئے اس سے استفادہ زیادہ آسان نہیں۔ موجودہ دور میں شیخ ابوزہرہ کی ''محاضرات فی الوقف''، شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء کی ''احکام الاوقاف'' شیخ محمد شفیق المعانی کی ''احکام الاوقاف'' بھی اس موضوع پر اہم اور قابلِ قدر کتابیں ہیں۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وقف پر مستقل تصنیف کے لئے قدیم ماخذ سے مختلف مسائل ایک رسالہ کی صورت میں ''الکشاف عن بعض مسائل الاوقاف'' کے نام سے جمع فرمائے تھے، لیکن اسے با قاعدہ تصنیف کی صورت دینے کا حضرت کو موقعہ نہیں مل سکا۔ (یہ مخطوطہ جامعہ دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں موجود ہے)

یہ تمام کتب اور رسائل وقف کے موضوع پر بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا دائرہ چند مخصوص مسائل تک محدود ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان قدیم ماخذ کو بنیاد بنا کر اِن میں موجود اصولوں اور مسائل کو مرتب انداز میں پیش کیا جائے، اور ان اصولوں کا تحقیقی مطالعہ کر کے اِن کی روشنی میں وقف سے متعلق نئے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حل تلاش کیا جائے۔ زیرِ نظر مقالہ میں اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ مقالہ ایک مقدمہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے، مقدمہ میں موضوع کا تعارف کرایا گیا ہے۔
پہلا باب وقف کی مبادیات سے متعلق ہے، اس میں وقف کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اس کے مقاصد، وقف کی تاریخ اور اس کی فقہی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب وقف کی بنیادی شرائط پر مشتمل ہے، اس باب کو میں نے تین فصلوں پر تقسیم کیا ہے، پہلی فصل میں واقف کی شرائط سے بحث کرتے ہوئے نابالغ، مجنون، مجور اور غیر مسلم و مرتد کے وقف پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے دوسری فصل میں وقف کردہ چیز کی شرائط بیان کی گئی ہیں اس میں کرنسی کے وقف، سرکاری زمینوں کے وقف اور حقوق و منافع کے وقف پر خاص طور پر کلام کیا گیا ہے۔ تیسری فصل جہتِ موقوفہ کی شرائط کے بارے میں ہے۔

تیسرا باب وقف کے رکن سے متعلق ہے، اس میں الفاظِ وقف، تحریری وقف، وقف کی دستاویز اوراس کی شرعی وقانونی اہمیت وحیثیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھا باب وقف کی آمدنی کے بارے میں ہے جس میں وقف کی آمدنی کے ذرائع اور خاص کر جدید ذرائع آمدنی پر گفتگو کی گئی ہے، اس باب میں وقف کی آمدنی سے تجارت، قرض دینے اوراس آمدنی پر زکوٰۃ وعشر اور سرکاری ٹیکس کی شرعی حیثیت بھی بیان کی گئی ہے۔

پانچواں باب وقف کے مصارف کے بارے میں ہے، اس میں مصارف کے لحاظ سے وقف کی مختلف صورتوں، وقف علی الاولاد، وقف علی النفس پر خصوصاً بحث کی گئی ہے، نیز اس باب میں وقف کے ناقابل انتفاع ہوجانے کی صورت میں اس کے مصرف پر بھی مدلل کلام کیا گیا ہے۔

چھٹا باب وقف کی نگرانی اور تولیت کے حوالہ سے ہے، اس باب میں متولی کی شرائط، اس کی ذمہ داریاں، اس کے اختیارات اوراس کے عزل ونصب کے اختیارات پر گفتگو کے ساتھ وقف میں قاضی اور محکمہ اوقاف کے کردار اوران کے اختیارات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ساتواں باب اور آخری باب واقف کی عائد کردہ شرائط کے بیان میں ہے، اس میں واقف کی عائد کردہ شرائط کی اہمیت، ان کی مختلف اقسام اوران کے احکام پر گفتگو کی گئی ہے، نیز ان شرائط میں حکومت کی طرف سے تغییر وتبدیلی کے امکان وعدم امکان پر بھی بحث کی گئی ہے۔

امید ہے کہ یہ مقالہ اسلام کے نظام وقف پر ایک اہم دستاویز ثابت ہوگا اور اسلامی قانون سازی میں بھی معاون ثابت ہوگا، اوراس موضوع پر مزید کام کرنے والوں کے لئے انشاءاللہ ماخذ کا کام دے گا۔

اللہ رب العزت کے حضور دعا ہے کہ اس حقیری کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرما کر میرے لئے اور میرے والدین واساتذہ کے لئے صدقہ جاریہ اور ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

خلیل احمد اعظمی

بابِ اول

مبادیاتِ وقف

پہلا باب

مبادیاتِ وقف

وقف کی لغوی تعریف:

وقف عربی زبان کا لفظ ہے لغت میں وقف کے معنی آتے ہیں روکنا، اسی لئے میدان حشر کو موقف کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں لوگ حساب کتاب کے لئے روکے جائیں گے۔

علامہ زبیدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وقف الدار على المساكين كما في العباب وفي الصحاح للمساكين اذا حبسه. (۱)

وقف الدار علی المساکین اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ گھر کو (دیگر تصرفات سے) روک دیا ہو۔

فیروز آبادیؒ تحریر کرتے ہیں:

وقف الدار حبسه كاوقفه وهذه ردية. (۲)

وقف الدار کے معنی ہیں اسے (دیگر تصرفات سے) روک دیا، ''اَوقف'' کا لفظ بھی اس مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ لغت ردیئہ ہے۔

علامہ وہبہ الزحیلی تحریر فرماتے ہیں:

الوقف التحبيس و التسبيل بمعنى واحد، وهو لغة: الحبس عن التصرف، يقال وقفت كذا أى حبسه ...... ومنه الموقف لحبس الناس

---

(۱) ابن منظور، محمد ابن مکرم ابن منظور ۶۳۰ھ - ۷۱۱ھ. لسان العرب، بيروت، داراحياء التراث العربي، الطبعة الاولىٰ، ۱۹۸۸ء (۱۵/۳۷۴)

(۲) فيروز آبادى، مهر ابن يعقوب فيروز ابادى، القاموس المحيط، بيروت، داراحياء التراث العربي، الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۱ء (۳/۲۹۶)

فيـه للحساب، ثم اشتهر اطلاق كلمة الوقف على اسم المفعول وهو الموقوف و يعبر عن الوقف بالحبس، و يقال في المغرب: وزير الاحباس. [۱]

وقف، تحبیس، اور تسبیل ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لغت میں ان کے معنی ہیں کسی کو تصرف سے روکنا، کہا جاتا ہے وقفت کذا یعنی میں نے اس کو روک دیا، پھر کلمہ وقف کا اطلاق شئ موقوف پر عام طور پر کیا جاتا ہے کیونکہ مصدر اسم مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، وقف کو حبس سے تعبیر کیا جاتا ہے، مراکش میں وقف کے وزیر کو وزیرِ احباس کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وقف کے معنی ہیں روکنا، اور معروف وقف کو وقف اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی شئ موقوف کو مالکانہ تصرفات یعنی بیع وشراء، ہبہ وغیرہ سے روک دیا جاتا ہے۔

وقف کی اصطلاحی تعریف:

فقہاء کرامؒ سے وقف کی مختلف تعریفیں منقول ہیں، اور ان میں اختلاف کی وجہ درحقیقت ان کا وقف کی حقیقت میں اصولی اختلاف ہے کہ وقف لازم ہوتا ہے یا نہیں اسی طرح وقف کرنے کے بعد شئ موقوف پر ملکیت کس کی ہوتی ہے اسی طرح وقف تملیک کی قبیل سے ہے یا اسقاط کی قبیل سے ہے۔

ان اصولی اختلافات کی وجہ سے جن پر ہم ان شاء اللہ آگے جا کر تفصیلی گفتگو کریں گے فقہاء کرامؒ کے یہاں وقف کی مختلف تعریفیں منقول ہیں جن میں سے چند ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کی تعریف:

امام ابوحنیفہؒ نے وقف کی تعریف ان الفاظ میں کی:

حبس العين على ملك الواقف والتصدق بالمنفعة. [۲]

کسی چیز کی ذات کو واقف اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے اس کے منافع صدقہ کردے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہ تعریف اس اصول پر مبنی ہے کہ وقف کرنے سے شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نہیں نکلی، البتہ اس کی منفعت کا صدقہ ضروری ہے۔

---

(۱) الزحيلي، الدكتور وهبة الزحيلي. الفقه الاسلامي وادلته، بيروت، دار الفكر، الطبعة الاولىٰ، ۱۹۸۴م (۱۵۳/۸)

(۲) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۱۸/۵) نیز دیکھئے: نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادى عشر. الفتاوىٰ الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۳۵۰/۲)

حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک وقف کی تعریف:

حضرت امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف نام ہے:

حبس العين على حكم ملك الله تعالىٰ على وجه تعود منفعته الى العباد. (۱)

کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں اس طرح روکنا کہ اس چیز کا فائدہ بندوں کو پہنچے۔

یہ تعریف اس اصول پر مبنی ہے کہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک وقف واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں حکماً چلا جاتا ہے۔

حضراتِ شوافع رحمہم اللہ کے نزدیک وقف کی تعریف:

علامہ مناوی رحمہ اللہ محرر مذہب شافعی علامہ نووی رحمہ اللہ کے حوالہ سے وقف کی تعریف کرتے ہیں:

حبس مال يمكن الانتفاع به مع بقاء عينه بقطع التصرف فى رقبته و تصرف منافعه الى البر تقرباً الى الله تعالىٰ. (۲)

ایسا مال جس کے عین کو باقی رکھتے ہوئے اس سے انتفاع کیا جا سکے اسے اللہ رب العزت کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اس طرح روک دینا کہ اس کے عین اور اس کی ذات میں تصرف نہ کیا جا سکے لیکن اس کے منافع وجوہِ خیر میں صرف کئے جائیں۔

شوافع کی بیان کردہ تعریف بھی اسی تصور پر مبنی ہے جس پر حضرات صاحبین رحمہما اللہ کی تعریف مبنی ہے۔

مالکیہ کے نزدیک وقف کی تعریف:

علامہ دردیر رحمہ اللہ تعریف کرتے ہیں:

وهو (الوقف) جعل منفعة مملوك ولو بأجرة أو غلته لمستحق بصيغة مدة مايراه المحبس. (۳)

وقف یہ ہے کہ کسی مملوک چیز کی منفعت یا اس کی آمدنی کسی مستحق کے لئے ایک مدت تک مخصوص کر دی جائے، مدت کی تعیین کا اختیار واقف کو ہے۔

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۱۸/۵) نیز دیکھئے: نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرآن الحادى عشر. الفتاوىٰ الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۳۵۰/۲)

(۲) المناوى، عبد الرؤف بن تاج العارفين المناوى الشافعى. تيسير الوقوف، مكه مكرمه، مكتبه نزار المصطفى الباز الطبعة الاولىٰ، ۱۹۹۸م (۱۷/۱)

(۳) الدردير، ابو البركات احمد بن محمد الدردير. الشرح الصغير، مصر، دارالمعارف، طبع فى سنة ۱۳۹۲ھ (۹۷/۴)

مالکیہ کی یہ تعریف اس تصور پر مبنی ہے کہ وقف میں تابید شرط نہیں یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کوئی چیز وقف کی جائے بلکہ مخصوص مدت کے لئے بھی کوئی چیز وقف کی جاسکتی ہے اسی طرح وقف واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتا۔

حنابلہ کے نزدیک وقف کی تعریف:

علامہ ابن قدامہ تعریف کرتے ہیں:

تحبيس الأصل و تسبيل الثمرة. [۱]

وقف یہ ہے کہ کسی چیز کی اصل اور عین کو وقف کر کے ہمیشہ باقی رکھا جائے اور اس کے منافع فقراء پر خرچ کئے جائیں۔

یہ تعریف درحقیقت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے ماخوذ ہے جو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمائے تھے: **حبس الأصل و سبل الثمرة۔** [۲]

راجح تعریف:

ان تمام تعریفات میں راجح تعریف حضراتِ حنابلہ کی معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ:

۱۔ یہ حدیث کے الفاظ سے ماخوذ ہے۔

۲۔ اس میں وقف کی حقیقت بتلائی گئی ہے احکام سے بحث نہیں کی گئی اور تعریف سے مقصود بھی کسی چیز کی حقیقت و ماہیت بتلانا ہوتا ہے نہ کہ شرعی احکام۔

راجح تعریف کا حاصل:

راجح تعریف کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی مملوکہ چیز کی ذات میں مالکانہ تصرفات نہ کرے اور اس کو وقف کر کے باحفاظت باقی رکھے البتہ اس کے منافع اور اس چیز کی آمدنی کسی خاص جہتِ خیر میں خرچ کرے، جیسے گھر وقف کیا تو اس گھر کو باحفاظت رکھا جائے گا البتہ اس کی سکونت کی سہولت یا اسے کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی مثلاً فقراء پر خرچ کی جائے۔

---

(۱) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۵۴۱. ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۴/۸)

(۲) ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۲۵۹/۵) نیز دیکھئے: الشوکانی، محمد بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۵ھ. نیل الاوطار، مصر، مصطفی البابی الحلبی طبع فی سنة ۱۳۴۷ھ (۱۹/۶)

وقف کے فضائل اور اس کے مقاصد

وقف کے فضائل کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ جناب نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی وقف فرمایا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اس کا مشورہ اور ترغیب دی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب اپنے باغ ثمغ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ نے انہیں وقف ہی کا مشورہ دیا اسی طرح آپ نے بیئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دینے کی ترغیب دی، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسے خرید کر وقف فرما دیا، اسی طرح حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو بیئر حاء نامی باغ وقف کرنے کی ترغیب دی، یہ تمام روایات ہم انشاء اللہ وقف کی تاریخ اور وقف کی مشروعیت کے ذیل میں ذکر کریں گے، نیز وقف صدقہ جاریہ کی ایک صورت ہے کہ انسان کے انتقال ہونے کے بعد بھی اس کے وقف کا ثواب اسے ہمیشہ ملتا رہتا ہے، علامہ طرابلسیؒ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

لم نر خيراً للميت ولا للحي من هذه الحبس الموقوفة أما الميت فيجرى أجرها عليه و أما الحى فتجس عليه ولا توهب ولا تورث ولا يقدر على استهلاكها.[1]

ہم زندہ اور مرجانے والوں کے حق میں اس وقف سے بہتر کسی چیز کو نہیں سمجھتے، میت کو تو اس کا ثواب ہمیشہ ملتا رہتا ہے اور زندہ لوگوں کے حق میں یہ اس لحاظ سے بہتر ہے کہ وقف کے منافع ان کے لئے مخصوص رہتے ہیں اسے نہ بیچا جا سکتا ہے، نہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس کے مکمل ختم کر دینے پر قادر ہیں۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۹)

وقف کی مشروعیت کے مقاصد بڑے دوررس اور حیرت انگریز ہیں، ذیل میں ہم ان کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

ا۔ اللہ رب العزت نے معاشی لحاظ سے تمام انسانوں کو برابر نہیں رکھا ہے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اللہ رب العزت خود ارشاد فرماتے ہیں:

و الله فضل بعضكم على بعض في الرزق. (۱)

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے۔

کسی کے پاس مال و دولت زیادہ ہے اور کسی کے پاس کم، اس تقسیم کے بعد اللہ رب العزت نے مالداروں کی دولت کو غریبوں تک پہنچانے کے مختلف انتظامات فرمائے ہیں، ایک انتظام تو یہ فرمایا کہ غریب آدمی مالدار کے یہاں ملازمت کر کے اجرت اور تنخواہ کی شکل میں اس کی دولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، دوسرا انتظام صدقاتِ واجبہ کی شکل میں فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال کے اعتبار سے فضیلت عطا کی ہے اس پر اس کی زکوٰۃ واجب کی ہے اور پیدوار پر عشر واجب کیا ہے، یہ زکوٰۃ اور عشر غریب لوگوں ہی کو ملتے ہیں، تیسرا انتظام اس کی دولت کی تقسیم کا میراث کی شکل میں فرمایا کہ یہ مال جتنا بھی جمع کر لیا جائے انتقال کے بعد یہ کئی ہاتھوں میں تقسیم ہو جائے گا، چوتھا انتظام اللہ تعالیٰ نے صدقاتِ نافلہ کی ترغیب دے کر فرمایا کہ صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اپنے مال سے غرباء اور دیگر مستحقین پر خرچ کرتے رہا کرو اور اس میں یہ یہ فضیلتیں ہیں، وقف بھی صدقاتِ نافلہ ہی کی ایک شکل ہے، گویا اس کے ذریعہ مالداروں کی دولت کا رخ کم حیثیت اور کم مال والے لوگوں کی طرف کرنے کا کام لیا جا رہا ہے اور اسلام کے نظامِ تقسیمِ دولت کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

۲۔ بہت سارے امور جو بنیادی طور پر حکومت کی ذمہ داری ہیں کہ وہ اپنے عوام کے لئے ان کا انتظام کریں وقف کے ذریعہ حکومت کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں تعاون ہوتا ہے، مثال کے طور پر عوام کی بنیادی ضروریات جیسے تعلیم، علاج کا انتظام، پانی کی فراہمی، شاہراہوں کا قیام، مساجد کی تعمیر، معذوروں کی کفالت، یتیموں اور بیواؤں کے اخراجات کا انتظام، ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لئے چھاؤنیوں کا قیام وغیرہ جو کہ کسی بھی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہیں اسے متمول لوگوں کے اوقاف کے ذریعہ کافی حد تک پورا کیا جا سکتا ہے، بنوامیہ اور بنوعباس کے دور میں مسلم حکمرانوں نے ان تمام مقاصد

---

(۱) القرآن (۱۶ / ۷۱)

کے لئے وقف کو ترویج دی اور اوقاف کی حفاظت کے لئے مستقل محکمے قائم کئے اور لوگوں میں یہ اعتماد کی فضا پیدا کی کہ ان کے اوقاف صحیح مصارف ہی میں استعمال ہوں گے، ان میں بدعنوانی سے کام نہیں لیا جائے گا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے اپنی اپنی بڑی بڑی جائیدادیں مذکورہ بالا مقاصد کے لئے وقف کیں، ہارون الرشید کی اہلیہ زبیدہ کی جانب سے بنائی گئی نہر زبیدہ اس کی واضح مثال ہے، انہوں نے مکہ مکرمہ کے عوام اور حجاج کرام کو پانی کی فراہمی کے لئے یہ نہر بنا کر وقف کی، ۶۸۲ھ میں قاہرہ میں ''بیمارستان منصوری'' کے نام سے عظیم الشان ہسپتال اور میڈیکل یونیورسٹی بنا کر وقف کی گئی ڈاکٹر علی جمعہ محمد نے اپنے ایک مقالہ میں ابن بطوطہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ''بأنہ یعجز الواصف عن محاسنہ'' اس کے اوصاف بیان کرنے سے لوگ عاجز ہیں، اس میں مختلف امراض کے الگ الگ وارڈ تھے اس کا متولی مریضوں کے لئے تمام تر سہولتوں کا انتظام رکھتا تھا ان کے لئے چارپائیاں، لحاف، کھانے پینے کے سامان، اطباء کی تنخواہیں اور میڈیکل یونیورسٹی کے تمام تر اخراجات یہ وقف خود برداشت کیا کرتا تھا، مریضوں اور طلبہ سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ (۱)

اسی طرح کا ہسپتال سلطان سلیمان القانونی کی اہلیہ نے ۹۶۳ھ میں دمشق میں قائم کیا اس کے ساتھ بھی میڈیکل یونیورسٹی تھی۔ (۲)

اسی طرح تعلیم کے میدان میں لوگوں نے اپنی جائیدادیں اعلیٰ دینی اور دنیوی تعلیم کو عام کرنے کے لئے وقف کیں، ۶۴۱ھ میں ملک نجم الدین ایوب نے مستنصریہ بغداد میں ''مدرسہ صالحیہ'' کے نام سے تعلیمی ادارہ وقف کیا۔ منصور بن قلادون نے ۶۸۳ھ میں مدرسہ منصوریہ یعنی منصوریہ یونیورسٹی کے نام سے میڈیکل کی تعلیم کے لئے بہت بڑی یونیورسٹی بنائی، اسی طرح ایک رصدگاہ تعمیر کی ان دونوں اداروں کے لئے بڑی بڑی جائیدادیں وقف کیں، ان اوقاف کا سلسلہ محض عام لوگوں کی تعلیم کی حد تک ہی نہیں تھا بلکہ جیل کے قیدیوں کی تعلیم کیلئے بھی اوقاف قائم کئے گئے۔ (۳)

---

(۱) علی جمعہ محمد. الوقف واثرہ التنموی، مقالہ طبعت فی ابحاث ندوۃ نحو دور التنموی للوقف، کویت، وزارۃ اوقاف و شئون وقف، ۱۹۹۳م

(۲) علی جمعہ محمد. الوقف واثرہ التنموی، مقالہ طبعت فی ابحاث ندوۃ نحو دور التنموی للوقف، کویت، وزارۃ اوقاف و شئون وقف، ۱۹۹۳م

(۳) علی جمعہ محمد. الوقف واثرہ التنموی، مقالہ طبعت فی ابحاث ندوۃ نحو دور التنموی للوقف، کویت، وزارۃ اوقاف و شئون وقف، ۱۹۹۳م

ان تمام اوقاف نے ان ادوار میں تعلیم کے عام ہونے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا، یہی وجہ ہے کہ جس وقت یورپ میں جہالت اور تاریکی کا دور تھا مسلمانوں کے زیرنگین ممالک میں علم وفضل کا چرچا تھا اور یہی ہمارے آباء واجداد کا علم تھا جو بعد میں یورپ منتقل ہوگیا۔

ان ادوار میں اقتصادی ترقی کے لئے بھی اوقاف سے بہت کام لیا گیا، متمول لوگوں نے نہریں بنوائیں، سڑکیں تعمیر کیں، بے آب وگیاہ علاقوں میں پانی کے حوض تعمیر کرا کر پانی جمع کرنے کے مواقع پیدا کئے، مسافر خانے تعمیر کئے گئے۔

مسلمان خلفاء نے اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بھی اوقاف کی ترغیب دی، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو ہر علاقہ میں اپنے ذرائع آمدنی سے چھاؤنیاں قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، ڈاکٹر علی جمعہ، محمد ابن حوقل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ عالم اسلام کے جتنے بڑے بڑے شہر تھے بجستان، کرمان، جزیرہ، آذربائیجان، عراق، حجاز، یمن، شام، مصر، مراکش وغیرہ ان تمام جگہوں پر اہل شہر نے مسلمان مجاہدین کے لئے بڑے بڑے گھر وقف کر رکھے تھے وہ جب بھی ان علاقوں سے گذرتے انہی گھروں میں قیام کرتے۔ (۱)

یہ چند مثالیں احقر نے پیش کی ہیں ورنہ ہماری تاریخ ان مثالوں سے بھری پڑی ہے، دیکھئے اگر یہ تمام امور اوقاف کے ذریعہ انجام نہ دیئے جاتے تو حکومتی سطح پر انجام دینے کے لئے کتنا بڑا سرمایہ درکار ہوتا، اوقاف درحقیقت حکومتی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور لوگوں میں حکومت کے ساتھ تعاون کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرا مقصد وقف، سے صدقہ جاریہ کا حاصل ہوتا ہے، انسان اگر ایسے ہی صدقہ کردے تو فقیر وقتی طور پر اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، کچھ عرصہ بعد جب وہ صدقہ ختم ہوجاتا ہے تو واقف کی نسبت سے بھی صدقہ کا ثواب ختم ہوجاتا ہے اور فقیر کی ضرورت بھی باقی رہتی ہے، وقف چونکہ ہمیشہ باقی رکھا جاتا ہے اس کے منافع سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اس لئے اس کا ثواب بھی ہمیشہ ملتا رہتا ہے اور فقیر کی ضرورت بھی ہمیشہ پوری ہوتی رہتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

ومن التبرعات الوقف و كان أهل الجاهلية لا يعرفونها فاستنبطه النبی صلی اللہ علیه وسلم لمصالح لاتوجد فی سائر الصدقات فان الانسان

---

(۱) علی جمعہ محمد. الوقف واثره التنموی، مقاله طبعت فی ابحاث ندوة نحو دور التنموی للوقف، كويت، وزارة اوقاف و شئون وقف، ۱۹۹۳ م

ربما يصرف في سبيل الله مالا كثيراً ثم يفنى فيحتاج اولئک الفقراء تارة اخرى و يجئى اقوام اخرون من الفقراء فيبقون محرومين فلا أحسن ولا أنفع للعامة من أن يكون شيء حبسا للفقراء وأبناء السبيل تصرف عليهم منافعه و يبقى أصله على ملک الواقف. (۱)

تبرعات میں سے وقف بھی ہے، اہل جاہلیت اسے جانتے ہی نہیں تھے، وقف کا حکم جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے ان مصالح کی وجہ سے مستنبط کیا ہے جو عام طور پر بقیہ صدقات میں نہیں پائے جاتے، انسان بسا اوقات بہت سا مال اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے لیکن وہ ختم ہو جاتا ہے وہ فقراء جنہیں مال دیا تھا دوبارہ محتاج ہو جاتے ہیں اور دوسرے فقراء محروم رہ جاتے ہیں اس لئے لوگوں کے لئے سب سے بہتر اور مفید صورت یہی ہے کہ کوئی چیز فقراء، مسافرین وغیرہ کے لئے وقف کر دی جائے اور ان پر اس کے منافع خرچ کئے جائیں اور اس چیز کو محفوظ رکھا جائے۔

۴۔ اپنے قریبی رشتہ داروں اور اولاد کی دائمی طور پر کفالت کا بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے، ایک شخص کے رشتہ دار ضرورتمند ہیں انہیں اگر صدقہ یا ہدیہ کے طور پر کچھ دیا جائے تو وہ تو ختم ہو جائے گا انہیں وقتی فائدہ ہوگا، اگر ان کے لئے کچھ وقف کر دیا جائے تو وہ اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھا سکیں گے، اسی طرح ایک شخص کی اولاد ناسمجھ ہے اور اس کے انتقال کے بعد جو لوگ ان کے ولی بنیں گے وہ بھی قابل اعتماد نہیں ہیں یہ اندیشہ ہے کہ اس کے انتقال کے بعد اس کی میراث جو اس کی اولاد کو ملے گی اگر انہی کے پاس رہنے دی جائے تو سارا مال ضائع کر دیں گے اور اگر ان کے اولیاء کے قبضہ میں رہے تو وہ با اعتماد نہیں ہیں ان خطرات کے تدارک کے لئے وہ اپنی اولاد کے لئے وقف کر سکتا ہے کہ جب تک اس کی اولاد موجود ہے انہیں اس وقف کی آمدنی دی جائے اور اگر وہ نہ رہیں تو فقراء میں تقسیم کی جائے، یہ وقف متولی کے پاس رہے گا اور اس کے منافع سے اس کی اولاد ہمیشہ فائدہ اٹھاتی رہے گی اور ان خطرات و اندیشوں کا تدارک بھی ہو جائے گا جو اسے درپیش تھے۔

ان مقاصد کے علاوہ اور بھی بہت سے مقاصد ہیں جو وقف سے حاصل ہو سکتے ہیں، طوالت کے اندیشہ کے پیش نظر ہم انہی چند مقاصد پر اکتفا کرتے ہیں جن سے وقف کی اہمیت خوب واضح ہے۔

---

(۱) الشاه ولى الله، الشيخ احمد المعروف بشاه ولى الله. حجة الله البالغة، كراچى، قديمى كتب خانه (۳۱۰/۲)

ارصاد

وقف سے ملتی جلتی صورت ارصاد کی بھی ہے، عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ارصاد کو بھی وقف کی ایک خاص شکل سمجھا تا ہے، اس لئے ارصاد کی تعریف، اس میں اور وقف میں بنیادی فرق کی وضاحت ضروری ہے۔

ارصاد کی تعریف:

الموسوعۃ الفقہیۃ میں ارصاد کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

تخصیص الامام غلة بعض أراضی بیت المال لبعض مصارفه. (۱)

امام کا بیت المال کی اراضی کی آمدنی بیت المال کے بعض مصارف کے لئے خاص کرنا۔

بیت المال کے بہت سے مصارف ہیں اگر حاکمِ مسلمین بیت المال کی اراضی میں سے بعض زمینوں کو ان مصارف میں سے کسی خاص مصرف مثلاً یتامیٰ کے لئے خاص کر دے کہ ان مخصوص زمینوں کی آمدنی انہیں ہی ملے گی تو اس عمل کو ارصاد کہا جاتا ہے۔

علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے ارصاد کا سلسلہ سلطان نور الدین شہید رحمہ اللہ نے شروع کیا تھا، انہوں نے بیت المال کی کچھ زمینیں مدارس ومساجد کے لئے خاص کر دی تھیں اور اس زمانہ کے عظیم عالم ابن عصرون سے اس عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے اس کی تائید کی۔ (۲)

ارصاد وقف نہیں:

ان کے علاوہ اور حکام نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں بیت المال کے بعض مصارف کے لئے اس

---

(۱) الموسوعة الفقهية، وزارة الاوقاف والشئون الاسلاميه، کویت الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۰ (ماده ارصاد)

(۲) الطحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی. حاشية الطحطاوی علی الدر المختار، کوئٹه، المکتبة العربية (۴۶۸/۲)

کی بعض زمینیں مخصوص کیں، اس تخصیص کو عام طور پر وقف ہی سمجھا جاتا ہے، یہ درست نہیں کیونکہ وقف کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ جو چیز وقف کی جارہی ہے وہ واقف کی ملکیت ہو، ارصاد میں تو بیت المال کی اراضی صرف مختص کی جاتی ہیں جو حاکم کی ملکیت نہیں اس لئے اسے وقف نہیں کہا جاسکتا۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

لأنها بعد ما علم أنها من بيت المال فالأصل بقاء ها على ماكانت فيكون وقفها ارصادا وهو مايحرزها الامام من بيت المال لمستحقه من العلماء و نحوهم عونا لهم على وصولهم الى بعض حقهم من بيت المال.[1]

جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ زمین بیت المال کی ہے تو اصل کے مطابق اسے اپنی سابقہ حالت پر برقرار رکھا جائے گا اور اس کا وقف ارصاد ہوگا، ارصاد کا مطلب یہ ہے کہ امام بیت المال میں سے کچھ اس کے مخصوص مستحقین جیسے علماء وغیرہ کے لئے خاص کردے کہ انہیں اپنا حق لینے میں آسانی ہو۔

ارصاد کا حکم:

ارصاد کا حکم یہ ہے کہ بیت المال کے جن مستحقین یا مصارف کے لئے وہ زمینیں مخصوص کی گئی ہیں انہیں ہمیشہ انہی مصارف پر خرچ کیا جائے گا، ان کے علاوہ کسی اور پر خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا، مثلاً اگر حاکمِ مسلمین نے بیت المال کی کچھ زمینیں مریضوں کے علاج کے لئے یا علماء پر خرچ کرنے کے لئے مخصوص کردی تھی تو بعد میں آنے والے حکام اسے کسی اور مصرف پر خرچ نہیں کرسکتے۔

علامہ طحطاویؒ تحریر فرماتے ہیں:

لايجوز نقضه وابطاله بغير مسوغ شرعي حيث كان المرصد عليهم من مصارف بيت المال من العلماء والقراء والأيتام والنساء والأرامل وبناء المساجد...... لأن بيت المال أعد لمصالح المسلمين و ظاهر أنه لامصلحة فى قطع أرزاق المستحقين من بيت المال.[2]

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۷۴)

(۲) الطحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعيل الطحطاوی. حاشية الطحطاوی على الدر المختار، كوئٹه، المكتبة العربية (۲/۴۶۸)

ارصاد کو بغیر وجہ شرعی کے باطل کرنا جائز نہیں بشرطیکہ جن لوگوں کے لئے یہ زمینیں مخصوص کی گئی ہوں وہ بیت المال کے مصارف میں سے ہوں، جیسے علماء، فقراء، یتامیٰ، بیوائیں اور مساجد کی تعمیر وغیرہ، کیونکہ بیت المال تو مسلمانوں کے مصالح کے لئے قائم کیا گیا ہے اور بیت المال کے مستحقین کے ذرائع آمدنی ختم کرنے میں بظاہر کوئی مصلحت نہیں ہوسکتی۔

۷۷۰ھ میں مصر کے حاکم برقوق نے چاہا تھا کہ اس سے پہلے حکمرانوں نے جو زمینیں بیت المال کے کسی خاص مصرف کے لئے مخصوص کردی ہیں انہیں واپس لے لے تو اس وقت کے علماء شیخ سراج الدین بلقینی، برہان ابن جماعہ اور شارح ہدایہ اکمل الدین بابرتی رحمہم اللہ نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ بیت المال کے مستحقین کے لئے اگر پہلے حکمرانوں نے کچھ زمینیں مخصوص کردی ہیں تو آپ ان سے یہ زمینیں واپس نہیں لے سکتے، ہاں انفرادی طور پر اگر انہوں نے اقرباء پروری میں کسی خاص فرد کو یہ زمین دیدی ہیں تو اس سے واپس لے جاسکتی ہیں۔[1]

وقف اور ارصاد میں فرق:

وقف اور ارصاد اس قدر تو مشترک ہیں کہ دونوں میں جہتِ معینہ کی پابندی ضروری ہے اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی، لیکن درج ذیل وجوہ سے ان میں فرق بھی ہے:

۱۔ وقف میں وقف کردہ چیز پر واقف کی ملکیت ضروری ہے، جبکہ ارصاد میں ارض مرصدہ پر مرصد کی ملکیت نہیں ہوتی۔

۲۔ وقف اگر کسی متعینہ جہت پر کردیا جائے اور واقف نے اپنے لئے تبدیل وتغییر کا اختیار نہ رکھا ہو تو کوئی بھی اس مصرف کو تبدیل نہیں کرسکتا حتی کہ واقف کے لئے بھی ایسی صورت میں مصرف میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔

جبکہ ارصاد میں جہت تو تبدیل نہیں کی جاسکتی لیکن اس مصرف کے تحت داخل افراد میں ارض مرصدہ کی آمدنی تقسیم کرنے میں کمی وبیشی کی جاسکتی ہے، ضروری نہیں کہ سب کو برابر آمدنی دی جائے۔[2]

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۱۸۴/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۳۷/۴)

۳۔ اسی طرح اگر حاکم نے بیت المال کی اراضی میں سے کوئی زمین کسی خاص جہت کے لئے مخصوص کی اور اس سے استفادہ کے لئے کچھ خاص شرطیں عائد کردیں کہ مثلاً اس زمین سے وہ عالم فائدہ اٹھا سکتا ہے جو فقہِ حنفی کا ماننے والا ہو تو اس شرط کی پابندی ضروری نہیں ہوگی بلکہ جو بھی اس جہت سے تعلق رکھتا ہوگا وہ اس زمین سے فائدہ اٹھا سکے گا، کیونکہ علماء کے لئے اس زمین کو مخصوص کرنا ان کے حنفی یا شافعی ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بیت المال کے مستحقین میں داخل ہونے کی وجہ سے اس کی اجازت دی گئی ہے، حنفی عالم جس طرح مستحقین بیت المال میں شامل ہے اسی طرح غیر حنفی عالم بھی مستحقین میں داخل ہے لہٰذا حاکم کی شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے بھی اس زمین سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہوگا۔

الاشباہ والنظائر میں علامہ سیوطیؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

أوقاف الأمراء والسلاطين كلها ان كان لها أصل من بيت المال أو ترجع اليه فيجوز لمن كان بصفة الاستحقاق من عالم للعلوم الشرعية أو طالب العلم كذلك وصوفي على طريقة الصوفية من أهل السنة أن ياكل مما وقفوه غير متقيد بما شرطوه. (۱)

اُمراء وسلاطین کا وقف اگر بیت المال سے ہو تو جو بھی بیت المال سے فائدہ حاصل کرنے کا استحقاق رکھتا ہے اس کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے جیسے علومِ شرعیہ کا عالم یا طالب علم یا صوفی وغیرہ، اور جو شرائط انہوں نے لگائی ہیں یہ زمینیں اس کے ساتھ مقید نہیں ہوں گی۔

جبکہ وقف میں واقف کی عائد کردہ شرائط کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، اگر وہ حنفی عالم کے لئے وقف کرے تو غیر حنفی عالم اس سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، کیونکہ وقف میں استحقاق اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ کسی کو واقف کے مال سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے بلکہ واقف کے از خود دینے سے اسے یہ حق ملتا ہے، لہٰذا واقف کو اختیار ہے کہ جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے، اس کی شرائط کی پابندی بہرصورت ضروری ہے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم، الاشباه والنظائر، كراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۱۱۶/۲)

وقف کی مشروعیت

جمہور علماء کے نزدیک وقف مشروع ہے اور فقہاء کرام میں سے بھی تقریباً تمام فقہاء وقف کی مشروعیت پر متفق ہیں۔[1] البتہ اس کی ذیلی جزئیات میں وجہتِ نظر کا اختلاف ضرور موجود ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لانعلم بین المتقدمین منهم فی ذلک اختلافاً فی اجازة وقف الأرضین.[2]

ہمارے علم میں نہیں ہے کہ حضرات صحابہ کرام اور متقدمینِ اہلِ علم کا اراضی کے وقف کے جواز میں کوئی اختلاف ہو۔

قاضی شریح اور امام شعبیؒ وقف کی مشروعیت کے قائل نہیں تھے۔ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سئل الشعبی عن الحبس فقال جاء محمد علیه الصلوٰة والسلام ببیع الحبس.[3]

امام شعبیؒ سے حبس (وقف) کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو حبس (وقف) کو بیچنے کے لئے تشریف لائے تھے۔

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وجاء عن شریح أنه انکر الحبس.[4]

امام شریح کے بارے میں آیا ہے کہ وہ حبس یعنی وقف کا انکار کرتے تھے۔

---

(۱) دیکھئے فقہ حنفی کی المبسوط للسرخسی (۱۲/۲۷) الاسعاف (۳) فقہ شافعی کی کتاب الأم (۱۳۸/۸) فقہ مالکی کی الخرشی علی خلیل (۷۸/۷) منح الجلیل لعلیش (۳۴/۳) فقہ حنبلی کی المغنی لابن قدامه (۱۸۵/۸)

(۲) الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سوره الترمذی. سنن الترمذی مع تحقیق احمد شاکر، بیروت، دار احیاء التراث العربی (رقم الحدیث: ۱۳۷۵ باب فی الوقف)

(۳) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۲۹/۱۲)

(۴) الشوکانی، محمد بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۵ه. نیل الاوطار، مصر، مصطفی البابی الحلبی طبع فی سنة ۱۳۴۷ه (۲۰/۶)

بعض حضرات نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ نسبت کی ہے کہ وہ بھی وقف کی مشروعیت کے قائل نہیں تھے۔[1]

لیکن بیشتر فقہاء حنفیہ نے اس کی سختی سے تردید کی ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا وقف کے سلسلہ میں موقف کیا تھا اس پر ہم اس بحث کے آخر میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ سردست ہم اصول شرعیہ کی روشنی میں وقف کی مشروعیت کا جائزہ لیتے ہیں اس کے بعد انشاء اللہ مانعینِ وقف کے دلائل کا جائزہ بھی لیں گے۔

وقف کا ثبوت قرآن کریم سے:

قرآن کریم کی مختلف آیات میں صدقات کی فضیلت آئی ہے، وقف بھی صدقہ ہی کی ایک صورت ہے، لہٰذا یہ بھی ان آیات کے عموم میں داخل ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون. [2]

تم خیرِ کامل حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔

اس آیت میں راہِ خدا میں خرچ کرنے کی فضیلت آئی ہے اور وقف میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے۔
سنن نسائی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے:

قال لما نزلت هذه الآية لم تنالوا البر حتى تنفقوا مماتحبون، قال أبوطلحة: ان ربنا ليسألنا عن أموالنا، فأشهدک يا رسول الله انی قد جعلت أرضى لله، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اجعلها فی قرابتک فی حسان و أبی بن كعب. [3]

فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت "لن تنالوا البر حتى تنفقوا مماتحبون" نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ہمارا رب ہم سے ہمارے مالوں کا مطالبہ کررہا ہے، یا رسول اللہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنی زمین اللہ کے لئے مخصوص

---

(۱) الشوكانی، محمد بن محمد الشوكانی المتوفی ۱۲۵۵ھ. نيل الاوطار، مصر، مصطفى البابی الحلبی طبع فی سنة ۱۳۴۷ھ (۲۰/۶)، نیز ملاحظہ فرمائیے: المبسوط للسرخسی (۲۹/۱۲)

(۲) القرآن (۹۲/۲)

(۳) النسائی، احمد بن شعيب بن علی النسائی. سنن النسائی مع تعليق عبد الفتاح ابوغده، بيروت، دار البشائر الاسلاميه ۱۹۸۶م (رقم الحديث: ۳۳۶۸ قبيل باب حبس المشاع) نیز دیکھئے: القرطبی، ابو عبد الله محمد بن احمد الانصاری القرطبی. الجامع لاحكام القرآن، القاهرة، مطبعة دار الكتب العربيه، الطبعة الاولىٰ ۱۳۰۱ھ (۱۳۲/۴)

(وقف) کردی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے اپنے قریبی رشتہ دار ابی بن کعبؓ اور حسان بن ثابتؓ کے لئے کردو۔

تفصیلی طور پر تو یہ روایت تاریخ اوقاف کے ذیل میں آئے گی یہاں اس کا مختصر طریق ذکر کیا گیا ہے جس سے اتنی بات واضح ہے کہ حضرات صحابہ کرام نے جہاں اس آیت سے صدقات کی مختلف صورتیں سمجھی تھیں اور ان پر عمل کیا تھا وہاں اس سے وقف کی فضیلت بھی سمجھی تھی چنانچہ اس پر بھی فوراً عمل کیا۔

وقف کا ثبوت حدیث سے:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعوا له. (۱)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بنی آدم کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے سوائے تین چیزوں کے، ایک صدقہ جاریہ دوسرے ایسا علم جس سے فائدہ حاصل کیا جاتا رہے، تیسرے نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے۔ (ان تین چیزوں سے مرنے کے بعد بھی انسان کو فائدہ پہنچتا رہتا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین چیزوں میں ایک صدقہ جاریہ کو بھی شمار فرمایا ہے اور ظاہر ہے صدقہ جاریہ کی صورت وقف ہی ہے کہ اصل شئی کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کے منافع سے لوگ ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور وقف کرنے والے کو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی جب تک اس کی وقف کردہ چیز باقی ہے ثواب ملتا رہتا ہے۔

شارح صحیح مسلم علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

وكذلك الصدقة الجارية وهى الوقف ...... وفيه دليل لصحة أصل الوقف و عظيم ثوابه. (۲)

صدقہ جاریہ سے مراد وقف ہے اور یہ نفسِ وقف کی مشروعیت اور اس کے عظیم الشان اجر و ثواب کی دلیل ہے۔

---

(۱) القشيرى، مسلم بن الحجاج القشيرى. صحيح لمسلم مع شرح النووى، كراچى، ادارة القرآن (۲/۸۵)
(۲) النووى، يحيىٰ بن شرف النووى. شرح النووى لصحيح مسلم، كراچى، ادارة القرآن (۲/۸۵)

(۲) جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زمینیں راہِ خدا میں وقف کیں، حضرت عمرو بن حارث بن المصطلق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ماترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موته درهماً ولا ديناراً ولا عبداً ولا أمة ولا شيئاً الا بغلته البيضاء وسلاحه و أرضاً جعلها صدقة. (۱)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت دراہم ودنانیر، غلام، باندیاں کچھ نہیں چھوڑا سوائے اپنے سفید خچر، ہتھیار اور ایک موقوفہ زمین کے۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم جعل سبع حيطان له بالمدينة صدقة على بني المطلب و بني هاشم. (۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے اپنے سات باغ بنی عبد المطلب اور بنی ہاشم پر صدقہ (وقف) کر دیئے تھے۔

(جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقاف کا تفصیلی ذکر ''وقف کی تاریخ'' کے ذیل میں آئے گا)

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی بے شمار زمینیں اور باغات اللہ کے راستے میں وقف کئے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لقد بلغني أن أكثر من ثمانين رجلا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم من الأنصار تصدقوا صدقات محرمات موقوفات. (۳)

مجھے معلوم ہوا کہ تقریباً اسی انصاری صحابہ کرام نے اپنی جائیدادیں وقف کیں۔

حضرات صحابہ کرام کے اوقاف اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے اوقاف بھی وقف کی مشروعیت کا بین ثبوت ہیں۔ (ان کا تفصیلی ذکر ''وقف کی تاریخ'' کے ذیل میں ان شاء اللہ آئے گا۔)

---

(۱) البخاری، الامام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاری. صحيح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۵/۳۵۶ رقم الحديث: ۲۷۳۹) وكذا فی سنن النسائی (رقم الحديث: ۳۳۶۱)

(۲) البيهقی، احمد بن حسين بن علی البيهقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۶/۱۶۰)

(۳) البيهقی، احمد بن حسين بن علی البيهقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. معرفة السنن والآثار، قاهرة، دار الوفاء (۹/۱۴)

(۵) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے جب عرض کیا گیا کہ قاضی شریح حبس (وقف) کو مشروع نہیں سمجھتے تو آپ نے فرمایا کہ شریح نے اپنے شہر کے لحاظ سے بات کی ہوگی، وہ مدینہ نہیں آئے ورنہ وہ یہاں حضرات ازواجِ مطہرات، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور حضرات تابعینؒ وغیرہ اکابرین امت کے اوقاف کے آثار دیکھ لیتے، ان حضرات نے اپنے اموال وقف کئے اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا، اور یہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موقوفہ سات باغ موجود ہیں۔

علامہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فالأ حباس سنة قائمة عمل بها النبی علیه السلام والمسلمون من بعده و قد قیل لمالک: ان شریحاً کان لایری الحبس و یقول لاحبس عن فرائض الله، فقال مالک: تکلم شریح ببلاده ولم یرد المدینة فیری اثار الاکابر من أزواج النبی علیه السلام وأصحابه والتابعین بعدهم، هلم جراً الی الیوم، وماحبسوا من اموالهم لایطعن فیه طاعن. وهذه صدقات النبی علیه السلام سبعة حوائط، و ینبغی للمرء أن لایتکلم الا فیما أحاط به خبرا، وبهذا احتج ایضاً مالکؒ لما ناظر ابایوسف بحضرة الرشید فقال هذه أحباس رسول الله صلی الله علیه وسلم و صدقاته ینقلها الخلف عن السلف قرناً بعد قرن، فقال حینئذ ابویوسف: کان ابوحنیفة یقول انها غیر جائزة، وأنا اقول انها جائزة فرجع فی الحال عن قول أبی حنیفة الی الجواز.[1]

اوقاف سنت جاریہ ہیں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد مسلمانوں نے اس پر عمل کیا، امام مالک رحمۃ اللہ سے کہا گیا کہ شریحؒ وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصوں سے روکنا جائز نہیں ہے، امام مالکؒ نے فرمایا کہ شریح نے اپنے شہر کے لحاظ سے یہ بات کہی ہوگی وہ مدینہ نہیں آئے، اگر مدینہ منورہ آتے تو یہاں ازواج مطہرات اور دیگر اکابر صحابہ کرام وتابعین کے آثار دیکھ لیتے جو آج تک چلے آرہے

---

(۱) ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد ابن رشد القرطبی المتوفی ۵۲۰ھ. المقدمات الممهدات، بیروت، دار الغرب الاسلامی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۸ھ (۲/۴۱۷)

ہیں، انہوں نے اپنے اموال وقف کئے کسی نے ان پر تنقید نہیں کی اور یہ دیکھو حضور کے وقف کردہ سات باغ موجود ہیں، انسان کو چاہئے کہ اپنی معلومات کے مطابق ہی بات کیا کرے۔ یہی استدلال امام مالکؒ نے ہارون رشید کے دربار میں امام ابو یوسفؒ سے مناظرہ کرتے ہوئے کیا تھا، فرمایا تھا کہ یہ حضور کے اوقاف وصدقات ہیں جو سلف سے خلف کی طرف اب تک منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں، امام ابو یوسفؒ نے عرض کیا کہ امام ابوحنیفہؒ تو اسے ناجائز کہتے تھے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جائز ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مقابلہ میں وقف کے جواز کے قول کی طرف رجوع کرلیا۔

وقف کا ثبوت اجماع سے:

علامہ نوویؒ نے وقف کی صحت پر اجماع نقل فرمایا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

هذا الحديث دليل على صحة اصل الوقف وأنه مخالف لشوائب الجاهلية وهذا مذهبنا و مذهب الجماهير و يدل عليه ايضاً اجماع المسلمين على صحة وقف المساجد و السقايات. (۱)

یہ حدیث وقفِ عمرؓ اصل وقف کی صحت پر اور اس بات پر دلیل ہے کہ وقف زمانہ جاہلیت میں پائی جانے والی صورتوں سے مختلف ہے، یہ ہمارا اور جمہور کا مذہب ہے، مسلمانوں کا مساجد اور سقایات (پانی پلانے کی جگہیں) کے وقف کی صحت پر اجماع بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ نے وقف کی صحت پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع نقل فرمایا ہے:

وقال جابر: لم يكن أحد من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ذو مقدرة الاوقف، وهذا اجماع منهم فان الذى قدر منهم على الوقف وقف واشتهر ذلک فلم ينكر أحد فكان اجماعاً. (۲)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں "حضرات صحابہ کرام میں سے کوئی بھی صاحب استطاعت ایسا نہیں تھا جس نے وقف نہ کیا ہو۔" یہ صحابہ کرام کا اجماع ہو گیا کیونکہ جو وقف پر قادر تھا اس

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. شرح النووی لصحیح مسلم، کراچی، ادارة القرآن (۸۶/۱۱)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی، ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۶/۸)

نے وقف کیا اور یہ بات مشہور بھی ہوگئی کسی اور نے اس پر نکیر بھی نہیں کی تو یہ صحابہ کرام کا وقف کی صحت پر اجماع ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ وقف کے جواز کے قائل نہیں تھے، یہ درست نہیں ہم آگے اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے وقف کی صحت اور لزوم پر صحابہ کرام کا اجماعِ عملی نقل فرمایا ہے۔(۱)

وقف کا ثبوت قیاس سے:

مسجد کا وقف بالاتفاق سب کے نزدیک درست ہے اور اس میں بھی زمین واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دیگر اوقاف بھی درست ہوں، اسی طرح وقف کو اعتاق پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اعتاق میں بھی معتَق سے معتِق کی ملکیت زائل ہوتی ہے اور معتَق کسی اور کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتا، یہی صورتحال وقف میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، لیکن کسی اور انسان کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولأن الوقف ليس الا ازالة الملک عن الموقوف وجعله لله تعالیٰ خالصاً فاشبه الاعتاق وجعل الأرض أو الدار مسجداً. (۲)

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندری المتوفی ۸٦۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۲۲)

(۲) الكاسانی، علاء الدين ابوبكر بن مسعود الكاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بيروت، دار احياء التراث العربی (۵/۳۲٦)

مانعین مشروعیت وقف کے دلائل

جو حضرات وقف کی مشروعیت کے قائل نہیں ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

پہلا استدلال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

انـه قال: لما نزلت سورة النسآء و فرضت فيها الفرائض. المواريث.
قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاحبس عن فرائض الله. (۱)

انہوں نے فرمایا کہ جب سورۃ نساء نازل ہوئی اور اس میں میراث کے حصے متعین کردئے گئے تو جناب کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ حصوں سے روکنا جائز نہیں۔

یعنی میراث میں جس جس کا جتنا حصہ ہے اسے وہ دینا ضروری ہے، اس کے حصہ کو روک کر وہ مال کہیں اور خرچ کرنا جائز نہیں جبکہ وقف میں یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنا مال کسی کارِ خیر میں لگا دیتا ہے اور اس کے ورثاء محروم رہ جاتے ہیں اس لئے اس حدیث کی رو سے وقف کی ممانعت ہونی چاہئے۔

دوسرا استدلال:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے:

قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد ماأنزلت سورة النساء
وانزل فيها الفرائض نهى عن الحبس. (۲)

---

(۱) البيهقى، احمد بن حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۲/۶)

(۲) الطحاوى، ابو جعفر احمد بن محمد المصرى الطحاوى ۲۳۹ھ۔ ۳۲۱ھ. شرح معانى الآثار، ملتان، المكتبة الامدادية (۲۲۹/۲)

جب سورہ نساء نازل ہوگئی اور اس میں میراث کے حصے متعین کر دیئے گئے تو میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے حبس (وقف) کی ممانعت فرمادی۔

تیسرا استدلال:

اُبوعون، شریح سے روایت کرتے ہیں:

عن أبی عون عن شریح قال جاء محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم بمنع الحبس. (۱)

انہوں نے فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر حبس (وقف) کی ممانعت فرمادی۔

چوتھا استدلال:

واقدی فرماتے ہیں:

قال مامن أحد من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم الا وقد أوقف وحبس أرضاً الا عبد الرحمن بن عوف فانه یکره الحبس. (۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جس نے زمین وقف نہ کی ہو سوائے عبدالرحمٰن بن عوف کے کہ وہ وقف کو ناپسند کیا کرتے تھے۔

یہ چند مشہور دلائل ہیں جو مانعینِ مشروعیت وقف اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں، لیکن مانعینِ مشروعیتِ وقف نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اس پایہ کے نہیں ہیں کہ ان کی بنیاد پر امت کے متوارث طریقہ کو چھوڑ کر ان کا موقف اختیار کیا جائے، جمہور فقہاء کی طرف سے ان دلائل کے جواب دیئے گئے ہیں، ذیل میں ترتیب وار ان دلائل پر گفتگو کی جاتی ہے۔

---

(۱) البیهقی، احمد بن حسین بن علی البیهقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۳/۶)

(۲) ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم المتوفی ۴۰۶ھ. المحلیٰ، بیروت، دار الکتب العلمیه (۱۵۰/۸)

مانعینِ وقف کے دلائل پر بحث

پہلی دلیل کا جواب:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ کی پہلی روایت جس میں ذکر ہے کہ سورہ نساء کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لاحبس عن فرائض اللہ'' اول تو یہ روایت ابن لہیعہ کی وجہ سے متکلم فیہ ہے، اور اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے وقف کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ وقف اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ میراث کے حصوں کی تقسیم میں رکاوٹ نہیں ہے، یہ تو ایک انسان کا اپنی زندگی میں اپنے مملوکہ مال میں تصرف ہے، جس طرح آدمی کو اپنی زندگی میں یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے مملوکہ مال میں جس طرح چاہے جائز تصرف کرے، کسی کو بطور عطیہ دینا چاہے تو دیدے، کسی کو ہدیہ میں پیش کرنا چاہے تو کردے، اسی طرح اسے یہ اختیار بھی حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اپنا مملوکہ مال اللہ تعالیٰ کے راستہ میں وقف کرنا چاہے تو کردے، اور جس طرح زندگی میں عطیہ کرنا، ہدیہ دینا حصہ میراث کی تقسیم میں رکاوٹ نہیں سمجھا جاتا اسی طرح وقف کو بھی میراث کی تقسیم میں رکاوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا۔[1]

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ شرح ہدایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وفی مبسوط شيخ الاسلام: الاستدلال بهذا الحديث غير مستقيم لأنه انما يستقيم هذا اذا تعلق به حق الوارث، فاما اذا كان الوقف قبل التعلق فليس حبس عن فرائض الله كالتصدق بالمنقولات.[2]

شیخ الاسلام کی مبسوط میں ہے کہ اس حدیث سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس سے استدلال تب درست ہوتا جب واقف کے مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو چکا ہوتا،

---

(۱) الكبيسی، محمد عبيد الكبيسی. احكام الوقف فی الشريعة الاسلامية. بغداد (۱/۱۵۸)

(۲) العينی، بدر الدين ابو محمد محمود بن احمد العينی ۷۶۲ھ۔ ۸۵۵ھ. البناية شرح الهدايه، فيصل آباد، ملک سنز (۲/۹۸۷) نیز دیکھئے: الشافعی، محمد بن ادريس الشافعی. كتاب الام، بيروت، دار قتيبه ۱۹۹۶م (۸/۱۵۸)

ورثاء کے حق متعلق ہونے سے پہلے یہ میراث سے روکنا نہیں ہے، جیسے منقولی اشیاء صدقہ کی جائیں تو اس کی اجازت ہے اسی طرح وقف کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مقصد تو درحقیقت زمانہ جاہلیت کے اس غلط تصور کی تردید کرنا تھا جس میں عورتوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا اور انہیں میراث سے محروم رکھا جاتا تھا اور آدمی کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ کو اپنی مرضی سے غلط جگہوں پر صرف کردیا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ اس کی تردید فرمادی کہ جب اللہ تعالیٰ نے میراث میں ہرایک کے حصے متعین فرمادئے ہیں تو ہرایک وارث کو اس کا حصہ ملنا چاہئے چاہے وہ عورت کیوں نہ ہو، کوئی چیز اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

علامہ طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

أما الجواب عن قوله صلی الله علیه وسلم لاحبس عن فرائض الله فنقول انه محمول علی انه لایمنع اصحاب الفرائض عن فروضهم التی قدرها الله لهم فی سورة النساء بعد الموت بدلیل نسخها لما کانوا علیه من حرمانهم الاناث قبل نزولها و توریثهم بالمؤاخات والموالاة مع وجودهن.[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "لاحبس عن فرائض الله" کو ہم اس پر محمول کرتے ہیں کہ سورہ نساء میں مورث کے مرنے کے بعد ورثاء کے جو حصے متعین کردئے گئے ہیں اب انہیں ان حصوں سے محروم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ سورہ نساء نے آکر ان کے اس طرزِ عمل کو منسوخ کردیا کہ وہ عورتوں کو میراث نہیں دیا کرتے تھے اور مؤاخاۃ وموالاۃ کی بنیاد پر میراث تقسیم کیا کرتے تھے۔

دوسرے اور تیسرے استدلال کا جواب:

اور جہاں تک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت "نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الحبس" اور قاضی شریح کی مرسل روایت جاء محمد بمنع الحبس کا تعلق ہے تو

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه، ۱۳۲۰ھ (۱۰) نیز دیکھئے: الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء. احکام الاوقاف، دمشق (۱/۱۸)

ان میں ''حبس'' سے مراد وقف نہیں ہے بلکہ اس سے زمانہ جاہلیت کی وہ رسم مراد ہے جس میں لوگ اپنے جانور کا دودھ بتوں کے نام وقف کردیتے تھے یا خود جانور کو بتوں کے نام وقف کرکے چھوڑ دیتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حبس کی ممانعت فرمادی، اور خود قرآن کریم میں بھی اس کی ممانعت آئی ہے، ارشاد باری ہے:

ما جعل الله من بحيرة ولا سائبة ولا وصيلة ولا حام. (1)

اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد سے پہلے لوگوں میں حبس رائج تھا، حضور نے ان ارشادات کی ذریعہ اس کی ممانعت فرمادی حالانکہ یہ بات طے ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اور ابتداء اسلام تک وقف کا نظام اس طرح رائج نہیں ہوا تھا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک فرمایا کہ ''میرے علم کے مطابق اہل جاہلیت نے ثواب کے لئے کوئی گھر اور زمین وقف نہیں کی، وقف تو اہل اسلام نے کئے''(2) لہٰذا جب وقف کا رواج ہی نہیں تھا تو اس کی ممانعت کا کیا مطلب؟ اس لئے ان ارشادات کا مقصد وقف کی ممانعت نہیں ہوسکتا بلکہ ان سے زمانہ جاہلیت کی مذکورہ بالا رسم پر پابندی لگانا مقصود ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کتاب الأم میں فرماتے ہیں:

وقال شريح جاء محمد باطلاق الحبس ...... قال الشافعي: والحبس التي جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم باطلاقها والله أعلم. ماوصفنا من البحيرة والوصيلة والحام والسائبة ان كانت من البهائم فان قال قائل: مادل على ماوصفت؟

قيل: ما علمنا جاهلياً حبس داراً على ولدٍ ولا في سبيل الله ولا على مساكين وحبسهم كانت ماوصفنا من البحيرة والسائبة والوصيلة والحام فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم باطلاقها. والله أعلم. و كان بينا في كتاب الله عزوجل اطلاقها. (3)

---

(1) القرآن (۶/۱۰۳)

(2) الشافعي، محمد بن ادريس الشافعي. كتاب الام، بيروت، دار قتيبه ۱۹۹۶م (۸/۱۳۸) "ولم يحبس اهل الجاهلية علمته دار اولا أرضاً تبرراً بحبسها، وانما حبس اهل الاسلام.

(3) حوالہ بالا (۸/۱۵۷) مزید ملاحظہ فرمائے: المبسوط للسرخسی (۱۲/۲۹) الاسعاف (۱۰)

شریح کہتے ہیں جاء محمد باطلاق الحبس کہ حضور ''حبس'' کو چھڑانے کے لئے تشریف لائے...... حالانکہ وہ ''حبس'' جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھڑانے کے لئے تشریف لائے وہ بحیرہ، وصیلہ، حام اور سائبہ تھے، ہم زمانہ جاہلیت کے کسی ایک آدمی کو نہیں جانتے جس نے اپنا گھر اپنی اولاد یا اللہ کے راستہ میں یا مسکین پر وقف کیا ہو، ان کا وقف تو وہی تھا جو ہم نے بیان کیا بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں آزاد کرانے اور ختم کرنے کے لئے آئے، اور اس کا ختم کرنا اور اس کی ممانعت تو خود قرآن کریم میں بھی منقول ہے۔

چوتھے استدلال کا جواب:

واقدی کی روایت جو محلی لابن حزم میں منقول ہے وہ اولاً تو واقدی کی وجہ سے ضعیف ہے۔[1] اور دوسرے اس سے تو جمہور فقہاء کی تائید ہوتی ہے کہ حضراتِ صحابہ کرام میں کس قدر وقف کا اہتمام تھا، زیادہ سے زیادہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف وقف کو ناپسند کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے جمہور صحابہ کے تعامل سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف ان کی ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے اصل وقف کی مشروعیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ سیدنا عبد الرحمٰن بن عوف بالفعل صدقہ کو وقف پر راجح سمجھتے ہوں، اور مختلف حالات کے لحاظ سے ایسا ممکن ہے۔

قول راجح:

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل اور اہتمام کو دیکھتے ہوئے جمہور فقہاء کرام کا قول ہی راجح ہے کہ وقف اسلام میں مشروع ہے اور بہت ہی فضیلت اور اجر و ثواب کا کام ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک امت میں اس کا توارث چلا آرہا ہے کسی نے اس پر نکیر نہیں کی بعض حضرات نے اس پر امت کا اجماع بھی نقل کیا ہے جیسا کہ ماقبل میں گذر چکا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ پوری امت ایک غلط کام پر متفق ہوگئی ہو اور وہ غلطی چودہ سو سال سے مسلسل چلی آرہی ہو، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمادیا ''لن تجمع امتی علی الضلالة '' کہ میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی، اس لئے امت کے اجماع اور جمہور فقہاء کے متفقہ قول کو چھوڑ کر وقف کی مشروعیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

---

(۱) واقدی کے بارے میں دیکھئے: عثمانی، محمد تقی عثمانی۔ درس ترمذی، کراچی، مکتبہ دار العلوم (۱/۲۷۰)

مشروعیتِ وقف کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف

وقف کی مشروعیت کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا موقف کیا ہے؟

اس سلسلہ میں بسیار تلاش کے باوجود براہ راست امام ابوحنیفہ رحمہ علیہ سے منقول کوئی بات ہمیں نہیں مل سکی، اور فقہاء کرام کی عبارات بھی امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے سلسلہ میں متضاد ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کی طرف جن آراء کی نسبت کی گئی ہے انہیں یہاں ذکر کیا جائے اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے کر امام صاحب کے اصل موقف تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

مسجد کا وقف بلا اختلاف مشروع ہے:

اس بات پر تو تمام فقہاء متفق ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسجد کا وقف بلاشبہ مشروع ہے اور وقف کرنے سے مسجد واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں ''باب وقف الأرض للمسجد'' کے تحت فرماتے ہیں:

لم یختلف العلماء فی مشروعیة ذلک لامن أنکر الوقف ولا من نفاه.[1]

مسجد کے لئے زمین وقف کرنے کی مشروعیت میں علماء کا اختلاف نہیں حتی کہ جو لوگ وقف کا انکار اور اس کی نفی کرتے ہیں ان کا بھی اس میں اختلاف نہیں۔

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اعلاء السنن میں فرماتے ہیں:

لانزاع فی الوقوف الذی یکون صدقةً جاریةً اللہ تعالیٰ خالصاً کبناء المساجد، فان الناس جمیعاً أجمعوا علیه، وھو الأصل فی وقف الأرض.[2]

---

(۱) ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاھور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۵/۴۰۴)

(۲) عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۱۳/۹۸)

جو وقف بطور صدقہ جاریہ کیا جائے جیسے مسجد وغیرہ کی تعمیر، اس میں تو کسی کا نزاع ہے ہی نہیں، سب کا اس کی مشروعیت پر اجماع ہے، اور زمین کے وقف میں یہی اصل ہے۔

البتہ مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب دوطرح کی روایات ملتی ہیں۔

مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف میں امام ابوحنیفہؒ سے منسوب پہلی روایت:

پہلی روایت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف کی مشروعیت کے قائل نہیں تھے، اسے فقہاء احناف میں سے امام ہلال الرائیؒ اور امام ابوبکر خصافؒ نے نقل کیا ہے، چنانچہ ھلال الرأی رحمۃ اللہ علیہ ''کتاب اَحکام الوقف'' میں فرماتے ہیں:

أبـو حـنيفة رحمه الله تعالىٰ فان كان لايجوز شيئا من ذلک ولا يجوز شيئاً من الوقف. [۱]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے کسی صورت کو جائز نہیں کہتے اور وقف کی کسی صورت کو بھی جائز قرار نہیں دیتے تھے۔

امام ابوبکر خصافؒ فرماتے ہیں:

عـن الحسن بن زياد قال: قال ابو حنيفة: لا يجوز الوقف الا ماكان منه عـلـى طـريـق الـوصايا واعتل فى ابطالها بما روى عن شريح قال جاء مـحـمـد الـنبـى صـلـى الله عليه وسلم ببيع الحبس والحديث الآخر. (لاحبس عن فرائض الله) [۲]

مجھے حسن بن زیاد نے بتلایا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقف کو جائز قرار نہیں دیتے، الا یہ کہ وہ وصیت کے طریقہ پر ہو، اور اس کے بطلان پر شریح کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ جاء محمد صلى الله عليه وسلم ببيع الحبس۔ اسی طرح ایک دوسری روایت لاحبس عن فرائض الله سے استدلال کرتے ہیں۔

---

(۱) الـرای، هـلال بـن يـحـيـىٰ بـن مسـلـم الـرای. كتاب احكام الوقف، حيدر آباد دكن، دائرة المعارف العثمانية ۱۳۵۵ھ (۱۲)

(۲) الـخـصـاف، ابـوبـكـر احـمـد بـن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۹۳)

شرح السیر الکبیر کی عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقف کے قائل نہیں تھے، چنانچہ اس میں مذکور ہے:

و أما عند أبی حنیفة رضی الله عنه، الحبس لیس بشئی فان فعل ذلک فان ملکه لایزول بالحبس، حتی أن له أن یبیعه ان شاء. (۱)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کی کوئی حیثیت نہیں، اگر کوئی وقف کرے تو وقف کرنے سے اس کی ملکیت زائل نہیں ہوگی، حتی کہ اس کے لئے جائز ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسے بیچ دے۔

دوسری روایت:

دوسری روایت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقف کی مشروعیت اور جواز کے قائل تھے البتہ بعض صورتوں میں وقف کو لازم قرار دیتے تھے اور بعض صورتوں میں اسے لازم قرار نہیں دیتے تھے جمہور فقہاء احنافؒ نے اسی کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف قرار دیا ہے۔

علامہ برہان الدین الطرابلسی فرماتے ہیں:

وهو جائز عند علمائنا أبی حنیفة وأصحابه رحمهم الله وذکر فی الاصل کان أبوحنیفة رحمة الله لایجیز الوقف ...... والصحیح أنه جائز عند الکل وانما الخلاف بینهم فی اللزوم وعدمه فعند أبی حنیفة رحمة الله یجوز جواز الاعارة فتصرف منفعته الی جهة الوقف مع بقاء العین علی حکم ملک الواقف. (۲)

وقف ہمارے تمام علماء کے نزدیک جائز ہے، کتاب الاصل میں مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وقف کو جائز قرار نہیں دیتے تھے، بعض لوگوں نے اس عبارت کے ظاہر کو لے لیا اور کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف جائز نہیں ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ تمام

---

(۱) السرخسی، محمد بن احمد السرخسی. شرح کتاب السیر الکبیر، افغانستان، حرکة انقلاب اسلامی ۱۴۰۵ھ (۲۰۸۴/۵)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه، ۱۳۲۰ھ (۳)

علماء کے نزدیک جائز ہے ان میں وقف کے لازم ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف عاریت کی طرح جائز ہے شیء موقوف کی منفعت جہتِ موقوفہ پر خرچ کی جائے گی اور اس کی ذات واقف کی ملکیت ہی میں رہے گی۔

شمس الائمہ السرخی رحمۃ اللہ علیہ مبسوط میں فرماتے ہیں:

وظن بعض أصحابنا رحمهم الله انه غير جائز على قول أبي حنيفة واليه يشير في ظاهر الرواية فنقول أما أبوحنيفةؒ فكان لايجيز ذلك مراده أن لايجعله لازما فأما أصل الجواز ثابت عنده. (۱)

ہمارے بعض اصحاب نے یہ سمجھا کہ وقف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں اور ظاہر الروایۃ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، ہم کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے وقف کو جائز قرار نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے لازم قرار نہیں دیتے، جہاں تک نفسِ جواز کا تعلق ہے تو وہ ان کے نزدیک ثابت ہے۔

یہی رائے بقیہ تمام فقہاء احناف کی ہے۔ (۲)

اور کتاب الأصل کی وہ عبارت جس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ ''**أنه لايجيز الوقف**'' اور جس کی بنیاد پر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف پہلی روایت کی نسبت کی جاتی ہے، جمہور فقہاء احناف نے اسے مختلف محامل پر محمول کیا ہے۔

روایتِ اولیٰ کا پہلا محمل:

اکثر حضرات نے تو یہ فرمایا کہ کتاب الأصل کی عبارت میں ''لایجیز'' سے مراد ''لایجعله لازماً'' ہے یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقف کو لازم قرار نہیں دیتے تھے، ہاں جواز کے قائل تھے، علامہ اوزجندیؒ فتاویٰ قاضیخان میں فرماتے ہیں:

---

(۱) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دار المعرفة ۱۹۹۳م (۲۷/۱۲)

(۲) دیکھئے: رد المحتار (۳۳۸/۴) الفتاوی التتارخانیه (۲۹۳/۵) البحر الرائق (۱۹۴/۵) الدر المنتقیٰ بهامش مجمع الانهر (۵۱۹/۲) انفع الوسائل للطرسوسی (۷۲)

وذكر في الأصل كان أبوحنيفة رحمه الله تعالىٰ لايجيز الوقف و بظاهر هذا اللفظ أخذ بعض الناس فقال عند أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ لايجوز الوقف وليس كما ظن بل هو جائز عند الكل الا أن عند أبي يوسف و محمد رحمهما الله تعالىٰ اذا صح الوقف يزول عن ملك الواقف لا الى مالك ...... وعند أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ يجوز الوقف جواز الاعارة تصرف المنفعة الى جهة الوقف ويبقى العين على ملك الواقف له أن يرجع عنه ويجوز بيعه وان مات يورث عنه.[1]

کتاب الاصل میں مذکور ہے کہ ''کان ابوحنیفۃ رحمہ اللہ لایجیز الوقف''، بعض لوگوں نے ان الفاظ کے ظاہر کو لے کر کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف جائز نہیں، لیکن ایسا نہیں ہے جیسا کہ انہوں نے سمجھا بلکہ وقف سب کے نزدیک جائز ہے، البتہ اتنا فرق ہے کہ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک وقف جب صحیح ہو جاتا ہے تو واقف کی ملکیت سے نکل جاتا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک وقف عاریت کی طرح جائز ہے، موقوفہ شیء کی منفعت توجہتِ موقوفہ پر صرف کی جائے گی اور اس کا عین واقف ہی کی ملکیت میں رہے گا۔

دوسرا محمل:

شمس الائمہ السرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السیر الکبیر میں کتاب الاصل کی عبارت کو ایک مخصوص صورت پر محمول کیا ہے، ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ وقف کی دو صورتیں ہو سکتی ہے، ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی مکان یا زمین کو وقف کیا جائے اور یہ صراحت کر دی جائے کہ اس مکان اور زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی فقراء پر صدقہ کر دی جائے، یہ صورت جائز ہے اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف درست ہو جائے گا، اور اس وقف سے حاصل ہونے والی آمدنی فقراء پر صدقہ کر دی جائے گی۔

---

(۱) الاوز جندی، فخر الدين حسن بن منصور الاوز جندی المتوفی ۵۹۵ھ. الفتاوی الخانية بهامش الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۴۰۲ھ (۲۸۵/۳)

دوسری صورت وقف کی یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی مکان وقف کیا جائے اور یہ صراحت کر دی جائے کہ اس کی رہائش کا حق فقراء کو ہے یا کوئی گھوڑا وقف کر دیا جائے اور یہ صراحت کر دی جائے کہ اس پر سواری کا حق فقراء کو ہے تو ایسی صورت میں یہ وقف درست نہیں ہوگا۔

دونوں صورتوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں زمین اور مکان کی آمدنی ایسی چیز ہے جو قابلِ تملیک ہے اور فقراء پر اسے صدقہ کیا جا سکتا ہے۔

جبکہ دوسری صورت میں مکان میں رہائش کا حق اور گھوڑے پر سواری کا حق قابلِ تملیک نہیں ہے صرف عین سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے اسے صدقہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے پہلی صورت میں وقف جائز ہے اور دوسری صورت میں وقف جائز نہیں۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ کتاب الاصل میں امام ابوحنیفہؒ کا جو موقف ذکر کیا گیا ہے کہ وہ وقف کو جائز قرار نہیں دیتے تھے اس کا تعلق وقف کی ایک مخصوص صورت سے ہے جس میں ایسی چیز کو وقف کیا جاتا ہے جو قابل تملیک نہیں، وقف کی بقیہ صورتوں میں امام ابوحنیفہؒ بھی جواز کے قائل ہیں۔

تیسرا محمل:

شیخ علاء الدین السمرقندی کی عبارت سے کتاب الأصل (مبسوط) کی عبارت کا ایک تیسرا محمل سمجھ میں آتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

واما اذا جعل أرضه أو داره وقفا على الفقراء، أو على وجوه الخير. فعند أبى حنيفة: أن جعله وقفا فى حال حياته، ولم يقل وصية بعد

---

(۱) السرخسی، محمد بن احمد السرخسی، شرح کتاب السیر الکبیر، افغانستان، حرکة انقلاب اسلامی ۱۴۰۵ھ (۲۱۰۴/۵) "فاما ابو حنيفة رضى الله تعالىٰ فانه كان لايجيز الوقف والحبس فى حالة الحياة، فلا يجوز عنده اذا أوصى بعد موته الا ماكان له اصل فى الشريعة، والوصية بالغلة لها أصل فى الشريعة، فانه لو أوصى بأن يصرف غلة بستانه على الفقير فذلك جائز، لما يقع فيه من التمليك، فكذلك حبس الأراضى والعبد والدار لتكون غلتها فى سبيل الله يجوز لأن فيه معنى التمليك، لأن الغلة يتصدق بها على أهل الحاجة ممن يغزو، فتصير ملكا لمن يأخذها، يصنع بها ماشاء، فأما ماليس فيه معنى تمليك الشئ ولكن فيه انتفاع بالعين، نحو سكنى الدار وركوب الفرس و قراءة المصحف ولبس السلاح و خدمة العبيد، لا اصل فى جوازه فى الشرع اذا وقع لاقوام مجهولين، فانه لو اوصى بخدمة عبيده لقوم بغير أعيانهم لايجوز ذلك، واذا كانوا معلومين جاز، وهاهنا وقع الحبس لأقوام مجهولين فلا يجوز والمعنى فى ذلك أنه اذا لم يكن فيه تمليك العين لم يكن صدقة."

وفاته، فانه يكون هذا الوقف صحيحا فی حق التصدق بالغلة والسكنی فی الدار الی وقت وفاته، ويكون نذرا بالتصدق بذلک، وتكون رقبة الأرض علی ملكه. يجوز له بيعه والتصرفات فيه، واذا مات يصير ميراثا للورثة، وهذا معنی قول بعض المشايخ: ان الوقف لايجوز عند أبی حيفة: أن الوقف لاحكم له عنده، بل يكون نذرا بالتصدق بغلته ومنافعه. (۱)

جب اپنی زمین فقراء پر یا دیگر وجوہ خیر پر وقف کردی تو اگر اسے اپنی زندگی ہی میں وقف کردیا مرنے کے بعد اس کی وصیت نہیں کی تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ وقف صحیح ہے، اس معنی میں کہ اس زمین کے منافع یا اس مکان کا حق رہائش اس شخص کی وفات تک فقراء پر صدقہ کیا جائے گا، اور یہ درحقیقت اس صدقہ کی نذر ہوگی، اور زمین بدستور واقف ہی کی ملکیت میں رہے گی اس کے لئے اسے بیچنا اور اس میں دیگر تصرفات کرنا جائز ہوگا، اور جب اس کا انتقال ہوجائے گا تو یہ زمین اس کے ورثاء کی میراث ہوجائے گی۔
اور یہی مطلب ہے بعض مشائخ کے اس قول کا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف جائز نہیں، یعنی وقف کا ان کے نزدیک مستقل حکم نہیں، بلکہ یہ شئی موقوفہ کے منافع اور آمدنی کے صدقہ کرنے کی نذر ہے۔

علامہ سمرقندیؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ وقف کو جائز قرار دیتے ہیں البتہ وقف کے جو احکام بیان کرتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ گویا ان کے نزدیک وقف کا کوئی مستقل حکم نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے شئی موقوفہ کے منافع اور آمدنی کے صدقہ کرنے کی نذر کا نام وقف ہے۔
جن عبارات میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ''لا یجیز الوقف'' کی نسبت ہے ان سے یہی مراد ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک وقف کوئی مستقل حکم نہیں ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ وقف کی مشروعیت کے قائل نہیں ہیں۔

---

(۱) سمرقندی، علاء الدین سمرقندی. تحفة الفقهاء، دمشق، مطبع جامعة دمشق، الطبعة الاولیٰ ۱۹۵۸م (۲۶۸/۳)

قولِ راجح مع وجہِ ترجیح:

مشروعیتِ وقف سے متعلق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے بارے میں راجح بات وہی معلوم ہوتی ہے جسے جمہور فقہاءِ احنافؒ نے اختیار کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقف کی مشروعیت کے قائل تھے، البتہ بعض صورتوں میں اسے لازم قرار دیتے تھے اور بعض صورتوں میں لازم قرار نہیں دیتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کے قول کا پس منظر:

امام محمد رحمہ اللہ نے ''**كتاب الحجة على اهل المدينه**'' میں ''**كتاب الحبس**'' کے نام سے مستقل باب قائم کیا ہے، اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مطلق وقف کی مشروعیت کا انکار نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اصل صورتحال یہ تھی کہ امام صاحبؒ کے زمانہ میں ''**وقف على الاولاد**'' کا بہت رواج ہو گیا تھا، لوگ اپنی جائیدادیں اپنی اولاد میں سے کسی کو نوازنے کے لئے اس کے نام وقف کر دیا کرتے تھے اور یہ بھی صراحت نہیں کرتے تھے کہ بعد میں ان جائیداد کے منافع فقراء کو ملیں، اس طرح وقف کا سلسلہ اور اس کے فوائد فقراء تک نہیں پہنچ پاتے اور ظاہر ہے یہ صورت شرعاً درست نہیں تھی، اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی سختی سے تردید کی، کیونکہ وقف علی الاولاد تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اس کی صراحت کرے کہ میری اولاد کے بعد اس شئی کے منافع اور فوائد فقراء کے لئے ہیں اور بسا اوقات موقع محل کی مناسبت سے امام ابوحنیفہؒ نے مطلق وقف کی بھی ممانعت فرمادی اگرچہ مراد اس سے یہی مخصوص صورت تھی، بعض حضرات نے اسی کو لے کر امام ابوحنیفہؒ کی طرف مطلق وقف کی ممانعت کی نسبت کردی۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ''ہدی'' کے جانور کے ''اشعار'' کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ منسوب ہے کہ انہوں نے ''اشعار'' کو مکروہ کہا ہے اور اسی بناء پر اس مسئلہ میں امام صاحب پر بہت طعن و تشنیع کی گئی، حالانکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں لوگ اشعار کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ کرنے لگے تھے اور اشعار میں کھال کے ساتھ ساتھ گوشت بھی کاٹ ڈالتے تھے اور گہرے زخم لگا لیتے تھے جس سے جانوروں کو ناقابلِ برداشت تکلیف ہوتی تھی اور جانور کے مرنے کا خطرہ ہوتا تھا، اس لئے انہوں نے سد اللباب اشعار سے روکا، ورنہ ان کا مقصود نفس اشعار سے روکنا نہ تھا بلکہ مبالغہ فی

الاشعار سے روکنا تھا۔[1]

اسی طرح وقف کے باب میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بسا اوقات سد اللباب مطلق وقف کو ممنوع قرار دیا، ورنہ ان کا مقصود نفسِ وقف کو ممنوع قرار دینا نہیں تھا بلکہ وقف کی ایک صورت ''وقف علی الاولاد'' کی خاص شکل کو ممنوع قرار دینا تھا جو ان کے زمانہ میں شائع ہوگیا تھا اور اس میں وقف کی انتہاء فقراء پر نہیں ہوتی تھی۔ واللہ اعلم۔

امام محمد رحمہ اللہ علیہ کتاب الحجہ میں فرماتے ہیں:

وقد جاء ت فی الحبس اثار کثیرة علی ما قال ابوحنیفة رضی الله عنه، ولا نعلم ان لکم فی الحبس أثرا واحدا، قالوا: قد جاء ت الأثار عن علی و عمر وابن عمر وزید بن ثابت رضی الله عنهم أنهم حبسوا أراضیهم، قیل لهم: انما کان حبس القوم صدقات لهم علی الفقراء والمساکین یتصدقون بغلتها فی حیاتهم وبعد موتهم، وهذا عندنا ایضا جائز، من جعل غلة أرضه صدقة فی حیاته و بعد موته (فی الفقراء والمساکین) أجزنا له ذلک بعد موته کما یجیزه غیرنا، فأما الحبس علی الولد وولد الولد ومن لایجوز له الوصیة فها توافی ذلک حدیثا واحدا أن أحدا من اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم جعل أرضاله أو دار اله أو عبد اله حبسا علی ولده و أولاد ولده ...... وقال محمد رحمه الله انما یجوز الحبس عندنا مایکون یرجع آخره الی الفقراء والمساکین وابن السبیل ولا یرجع آخره الی المیراث ابدا، فهذا یجوز لأنه صدقة کصدقات عمر و علی و زید بن ثابت

---

(١) العینی، محمود بن احمد المعروف ببدر العینی. عمدة القاری، بیروت، دار الفکر (٣/٤٣٥) "لأن الطحاوی الذی هو أعلم الناس بمذاهب الفقهاء ولا سیما بمذهب أبی حنیفة ذکر ان اباحنیفة لم یکره اصل الاشعار ولا کونه سنة وانما کره مایفعل علی وجه یخاف منه هلاکها لسرایة الجرح لاسیما فی حر الحجاز مع الطعن بالسنان او الشفرة فاراد سد الباب علی العامة لانهم لایراعون الحد فی ذلک واما من وقف علی الحد فقطع الجلد دون اللحم فلایکرهه."

رضی اللہ عنهم، وأما ما كان حبيسا على الولد أو ولد الولد لايرجع الى أن يكون صدقة فى الفقراء فهو باطل. (۱)

وقف کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے مطابق تو بہت سے آثار آئے ہیں لیکن ہمارے علم میں نہیں ہے کہ آپ حضرات کے موقف کے مطابق ایک اثر بھی ہو اہل مدینہ نے جواب دیا کہ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عمرؓ، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے آثار ہیں کہ انہوں نے اپنی زمینیں وقف کیں۔

امام محمدؒ نے ان سے فرمایا کہ ان حضرات نے تو اپنی جائیدادیں فقراء اور مساکین پر وقف کی تھیں، ان کی جائیدادوں کا غلہ ان کی زندگی اور ان کے مرنے کے بعد انہی پر خرچ کیا جاتا تھا اور یہ تو ہمارے نزدیک بھی جائز ہے، جو شخص اپنی زمین کے منافع اپنی زندگی اور اپنی موت کے بعد فقراء اور مساکین پر وقف کردے تو ہم بھی اسے جائز قرار دیتے ہیں جیسے کہ ہمارے علاوہ دوسرے حضرات اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

لیکن اولاد اور اولاد کی اولاد جن کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ان پر وقف کرنا اس سلسلہ میں آپ حضرات ہمیں کوئی حدیث پیش کردیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی نے بھی اپنی زمین یا اپنا گھر یا اپنا غلام اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد پر وقف کیا ہو، امام نے مزید فرمایا کہ ہمارے نزدیک وہ وقف جائز ہے جس کی انتہاء فقراء، مساکین اور مسافروں پر ہو، اس کی انتہاء اس پر نہ ہو کہ وہ ہمیشہ کے لئے کسی کی میراث بن جائے، یہ والا وقف جائز ہے اور یہ حضرت عمرؓ، علیؓ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے اوقاف کی طرح ہے اور جو وقف صرف اولاد پر ہو اور اس کی انتہاء فقراء پر صدقہ کی شکل میں نہ ہو وہ باطل ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ امام ابوحنیفہؒ وقف کی مشروعیت کے قائل تھے البتہ وقف کی ایک مخصوص صورت کی ممانعت فرماتے تھے، علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ امام محمدؒ کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

---

(۱) الشيبانى، محمد بن الحسن الشيبانى. كتاب الحجة على اهل المدينة، لاهور، دار المعارف النعمانية الطبعة الاولىٰ ۱۹۸۱م (۳/۶۵-۵۸)

وهـذا صـريـح فـى ان أبـاحنيفة انما كان يذهب فى الوقف الى ماكان عـليـه فقهاء بلاده وينكر ماأنكروه، فكان يجيز ماكان منه صدقة على الـفـقـراء ابتداء وانتهاء، وينكر ماكان وقفا على الولد وولد الولد ولا يـرجـع آخـره صـدقة عـلـى الـفـقـراء فافهم، والظاهر أن الوقف على الأولاد كـان قـد شاع فى زمانه فأطلق القول بعدم جواز الوقف وأراد الـنوع الذى كان شائعاً ففهم الناس من اطلاقه أنه لايجيز الوقف أصلا كـما فهم بعضهم من قوله فى الهدى: "اشعاره مكروه" انه كره مطلق الاشـعـار وانما كره مااعتاده أهل زمانه من المبالغة فيه، وهكذا الفقيه اذا راى الـنـاس قـد تـعـدوا عـن الحدود فى أمر يطلق القول بكراهته بالمنع منه ويريد النوع الشائع بخصوصه.(۱)

یہ عبارت صریح ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا وقف کے سلسلہ میں وہی موقف تھا جو ان کے زمانہ اور شہر کے دیگر فقہاء کا تھا اور وقف کی انہی صورتوں کا انکار کرتے تھے جن کا وہ لوگ انکار کرتے تھے، امام ابوحنیفہؒ اس وقف کو جائز قرار دیتے تھے جو ابتداًء وانتہاءً فقراء پر صدقہ ہو، اور اس وقت کی ممانعت فرماتے تھے جو اولاد، اولاد کی اولاد پر ہو اور بالآخر اس کی انتہاء فقراء پر صدقہ کی صورت میں نہ ہو اور ظاہر یہی ہے کہ وقف علی الاولاد ان کے زمانہ میں بہت رائج ہوگیا تھا اس لئے انہوں نے وقف کو مطلقاً عدم مشروع قرار دیا اور مراد وقف کی وہ صورت لی جو ان کے زمانہ میں شائع تھی، لوگ ان کے اطلاق سے یہ سمجھے کہ وہ وقف کو بالکل جائز قرار نہیں دیتے جیسا کہ بعض حضرات نے ہدی کے سلسلہ میں ان کے قول "اشعارہ مکروہ" سے یہ سمجھا کہ وہ مطلق اشعار کو مکروہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ انہوں نے تو اشعار کی اس صورت کو مکروہ قرار دیا تھا جسے ان کے زمانہ کے لوگوں نے اختیار کرلیا تھا یعنی اشعار میں حد سے زیادہ مبالغہ، اور درحقیقت فقیہ ایسا ہی کرتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگ کسی چیز میں حد سے تجاوز کرنے لگے ہیں تو وہ اسے علی الاطلاق مکروہ اور ممنوع قرار دے دیتا ہے اور مراد وہی مخصوص صورت لیتا ہے۔ واللہ اعلم

---

(۱) عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی ادارۃ القرآن و العلوم الاسلامیہ، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۱۳/۱۰۰)

خلاصہ:

خلاصہ یہ کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وقف کی مشروعیت کے قائل تھے البتہ بعض صورتوں میں وقف کو لازم قرار دیتے تھے اور بعض میں لازم قرار نہیں دیتے تھے یہی بات امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ سے معلوم ہوتی ہے اور مبسوط وغیرہ میں جہاں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف مطلق وقف کی مشروعیت کے انکار کی نسبت کی گئی ہے اس سے مراد وقف کی بعض مخصوص صورتیں ہیں نہ کہ مطلقِ وقف۔

روایتِ ثانیہ کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی تفصیل:

اب صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اگر مشروعیتِ وقف کے قائل ہیں تو کن صورتوں میں وہ وقف کو لازم قرار دیتے ہیں اور کن صورتوں میں لازم قرار نہیں دیتے؟ اس سلسلہ میں معروف تو یہی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر وقف کو لازم قرار نہیں دیتے اور اس کی خرید و فروخت کو جائز کہتے ہیں لیکن یہ بات اس عموم کے ساتھ درست نہیں فقہاء کرام کی عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس میں تفصیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وقف کی دو قسمیں ہیں:

نمبر۱: کسی چیز کے عین اور اس کی ذات کو وقف کیا جائے مثلاً زمین وقف کر کے اس پر مسجد بنا دی یا قبرستان کے لئے زمین وقف کی یا مسافر خانہ، مجاہدین کے لئے چھاؤنی یا حاجیوں کی رہائش گاہ بنا دی، اس صورت کا حکم یہ ہے کہ یہ وقف بالاتفاق لازم ہے، واقف کے لئے اس سے رجوع کرنا جائز نہیں اور نہ ہی وہ اسے بیچ سکتا ہے اور ہبہ کر سکتا ہے، اس صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک وہی ہے جو جمہور علماء کا ہے۔

نمبر۲: دوسری قسم یہ ہے کہ کسی چیز کے صرف منافع کو وقف کیا جائے اس کی ذات کو وقف نہ کیا جائے مثلاً کوئی شخص اپنے مکان کی آمدنی مسجد یا فقراء وغیرہ پر وقف کر دے، اس کی پھر تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ زمین وغیرہ کے صرف منافع وقف کئے جائیں اور اس وقف کو موت کے بعد کی طرف منسوب کیا جائے، مثلاً کسی شخص نے یوں کہا کہ ”جب میں مر جاؤں تو میری زمین کے منافع فقراء پر وقف ہیں“ اس صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واقف کے مرنے کے بعد یہ اس کی میراث میں تقسیم نہیں ہوگا، اور نہ ہی اس کے انتقال کے بعد اسے بیچا اور

ہبہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زمین وغیرہ کے صرف منافع وقف کئے جائیں اور اس وقف کو موت کے بعد کی طرف منسوب بھی نہ کیا جائے لیکن کوئی حاکم یا قاضی اس کے لازم ہونے کا فیصلہ کردے، مثلاً کسی شخص نے کہا کہ "میں اپنی زمین کے منافع فقراء پر وقف کرتا ہوں" پھر کسی حاکم یا قاضی نے یہ فیصلہ کردیا کہ یہ وقف لازم ہے اور اس زمین کے منافع ہمیشہ فقراء کو ملیں گے، اس صورت میں بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف لازم ہوجاتا ہے واقف کو رجوع کا حق نہیں رہتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زمین کے صرف منافع وقف کئے جائیں اور اس وقف کو موت پر معلق بھی نہ رکھا جائے اور کوئی حاکم یا قاضی اس وقف کے لزوم کا فیصلہ بھی نہ کرے مثلاً کوئی شخص یوں کہے کہ "میں نے اپنی زمین کے منافع فقراء پر وقف کئے" صرف اس صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جمہور فقہاء سے اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں وقف لازم نہیں ہوگا، واقف کا انتقال ہوجائے تو یہ زمین اس کی میراث میں شامل ہوکر اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم ہوجائے گی۔(۱)

البتہ اس صورت میں بھی واقف پر واجب ہے کہ وہ زمین وغیرہ کے منافع اپنے بیان کردہ مصرف پر خرچ کرتا رہے کیونکہ یہ ایک طرح سے مذکورہ زمین کے منافع صدقہ کرنے کی نذر ہے اور اگر وہ اس وقف

---

(۱) دیکھئے: محمد تقی عثمانی. تکملہ فتح الملہم، کراچی، مکتبہ دارالعلوم ۱۴۱۵ھ (۱۲۲/۲) نیز دیکھئے: اعلاء السنن (۹۹/۱۳) "یقول العلامة ظفر احمد العثمانی: والحق أن الوقف ینقسم قسمین: أحدهما ماتصدق الواقف بأصله کأرض جعلها مسجدا أو مقبرة أو خانا للمارة أو منزلا للغزاة أو مسکنا للحاج، والثانی ماتصدق الواقف بمنفعته دون أصله، فالأول لانزاع فی صحته ولزومه، وقول أبی حنیفة فیه کقول الجمهور، والثانی لانزاع فی جوازه فی حق وجوب التصدق بالفرع مادام الواقف حیا، حتی أن من وقف غلة داره أو أرضه علی مسجد أو علی الفقراء یلزمه التصدق بغلة الدار والأرض، ویکون ذلک بمنزلة النذر بالتصدق بالغلة ولاخلاف ایضاً فی جوازه فی حق زوال ملک الرقبة اذا اتصل به حکم الحاکم أو أضافه مابعد الموت بأن قال: اذا مت فقد جعلت داری أو أرضی وقفا علی کذالک أو قال: هو وقف فی حیاتی صدقة بعد وفاتی کما فی البدائع، والنزاع انما هو فی وقف لم یتصدق الواقف بأصله بل حبس أصله وتصدق بثمرته و منفعته علی نفسه أو ولده و ولد ولده و علی الفقهاء بعدهم أو تصدق بها علی الفقهاء ابتداء ولم یضفه الی مابعد الموت ولم یصرح بکونه وقفا مؤبدا ولا حکم حاکم بصحته، فهذا لایکون لازما عند أبی حنیفة حتی کان للواقف بیعه وهبته واذا مات یصیر میراثا وقال أبویوسف و محمد و عامة العلماء بجواز ذلک ولزومه أیضاً حتی لایباع ولایوهب ولایورث، هذا هو تنقیح قول أبی حنیفة علی ظاهر الروایة."

سے رجوع کرتا ہے اور اسے بیچتا یا ہبہ کرتا ہے تو یہ مکروہ ہے تاہم چونکہ یہ وقف لازم نہیں ہے اس لئے یہ رجوع اور ہبہ وغیرہ فی نفسہ درست ہو جائے گا۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:

لاخلاف بين العلماء في جواز الوقف في حق وجوب التصدق بالفرع مادام الواقف حيا حتى أن من وقف داره أو أرضه يلزمه التصدق بغلة الدار والارض ويكون ذلک بمنزلة النذر بالتصدق بالغلة. [1]

علماء کے درمیان وقف کے جواز میں اس حیثیت سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب تک واقف زندہ ہے اس پر وقف کی آمدنی کا صدقہ کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نے اپنی زمین یا اپنا مکان وقف کیا تو اس پر زمین اور مکان کے منافع اور ان کی آمدنی صدقہ کرنا واجب ہے اور یہ وقف، منافع کے صدقہ کرنے کی نذر ماننے کے درجہ میں ہوگا۔

علامہ طرابلسی الاسعاف میں فرماتے ہیں:

فعند أبي حنيفةؒ يجواز جواز الاعارة فتصرف منفعته الى جهة الوقف مع بقاء العين على حكم ملک الواقف، ولو رجع منه حال حياته جاز مع الكراهة. [2]

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف عاریت کی طرح جائز ہے اس کے منافع جہتِ موقوفہ پر خرچ کئے جائیں گے اور شئی موقوفہ کی ذات واقف کی ملکیت میں رہے گی، اور اگر وہ اس سے رجوع کر لیتا ہے اپنی زندگی میں تو یہ کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علی الاطلاق وقف کے عدمِ لزوم کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ایک صورت میں وقف کو لازم قرار نہیں دیتے، اور اس میں بھی وقف کے منافع کے تصدق کو واجب اور اس سے رجوع کو مکروہ کہتے ہیں، بقیہ صورتوں میں وہ بھی جمہور علماء کی طرح وقف کے لزوم کے قائل ہیں۔

---

(۱) الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود الكاساني المتوفى ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بيروت، دار احياء التراث العربي (۳۲۶/۵)

(۲) الطرابلسي، ابراهيم بن موسىٰ بن ابي بكر الطرابلسي. الاسعاف في احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه، ۱۳۲۰ھ (۳)

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم تکملۃ فتح الملہم میں اس موضوع پر بحث کرنے کے بعد نتیجہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ویتبین لک من تعمق النظر فیما ذکرنا أن الامام أباحنیفةؒ لایخالف الجمهور فی لزوم الوقف و تابیده، وانما یخالفهم فی طریق انعقاد هذا الوقف الموبد فیقول: انه لا ینعقد وقفا مؤبدا الا بأحد من الطرق الثلاثة: امایجعل رقبة الأرض وقفا أو صدقة واما باضافتها الی مابعد موته واما بحکم الحاکم، فأما اذا لم یتحقق شئی من ذلک و تصدق الرجل بمنافع ملکه دون أن یضیفه الی مابعد موته فانه لاینعقد وقفا موبداً. [1]

ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے اس میں غور کرنے سے واضح ہوگا کہ امام ابوحنیفہؒ وقف کے لازم ہونے اور اس کے ہمیشہ باقی رہنے میں جمہور سے اختلاف نہیں رکھتے، البتہ یہ وقف کس طریقہ سے لازم اور مؤبد بنے گا اس میں ان کا جمہور علماء سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ وقف تین ہی طریقوں سے لازم ہوسکتا ہے یا تو زمین وغیرہ کا عین اور اس کی ذات وقف کی جائے یا اس کی اضافت مرنے کے بعد کی طرف کی جائے، یا کوئی حاکم اس کے لزوم کا فیصلہ کردے، اگر ان میں سے کوئی صورت نہ پائی جائے اور ایک شخص اپنی مملوکہ چیز کے منافع وقف کردے اور اسے موت پر معلق نہ کرے تو ایسی صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف لازم نہیں ہوگا۔

البتہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ اس صورت میں بھی ان منافع کا صدقہ کرنا واجب ہوگا اور اس وقف سے رجوع کرنا مکروہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ أعلم۔

---

(۱) عثمانی، محمد تقی عثمانی. تکمله فتح الملهم، کراچی، مکتبه دارالعلوم ۱۴۱۵ھ (۱۲۴/۲)

وقف کی تاریخ اور اس کا ارتقاء

وقف کا بنیادی تصور ہمیں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب ونظریات میں بھی ملتا ہے کہ کسی چیز سے اپنے ملکیتی تصرفات ختم کر کے اس کے منافع جہتِ متعینہ کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔ لیکن اسلام میں وقف کے لئے جو اصول اور شرائط طے کئے گئے ہیں، اس کے مقاصد ومناہج کی جو تعیین کی گئی ہے اور وقف کو جس قدر منظّم ومرتب کیا گیا ہے اس لحاظ سے یہ نظامِ وقف درحقیقت اسلام ہی کی خصوصیت ہے، یہ امتیازات اور خصائص ہمیں دیگر مذاہب ونظریات میں پائے جانے والے تصورِ وقف میں دور دور تک نظر نہیں آتے، یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کتابِ الأم میں فرماتے ہیں:

ولم يحبس أهل الجاهلية علمته دارا ولا أرضا تبررا بحبسها، انما حبس أهل الاسلام.[1]

میرے علم کے مطابق اہل جاہلیت نے نیکی کے ارادے سے کوئی گھر اور زمین وقف نہیں کی، وقف تو اہل اسلام نے کئے۔

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لأن العرب لم تعرف فی جاهليتها الحبس الذی اختلفنا فيه انما هو اسم شريعی و شرع اسلامی جاء به محمد صلی الله عليه وسلم كما جاء بالصلاة والزكاة والصيام، ولو لاه عليه الصلاة والسلام ماعرفنا شيئا من هذه الشرائع ولا غيرها.[2]

عرب زمانہ جاہلیت میں اس وقف کو جانتے ہی نہیں تھے جس میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، یہ شریعتِ محمدی کی ایک اصطلاح ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ وقف کا حکم بھی اسی طرح لے کر

---

(۱) الشافعی، محمد بن ادريس الشافعی. كتاب الام، بيروت، دار قتيبه ۱۹۹۶ م (۱۳۸/۸)

(۲) ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد بن سعيد بن حزم المتوفی ۴۰۶ھ. المحلیٰ، بيروت، دار الكتب العلمية (۱۵۲/۸)

آئے جیسے نماز، روزے وغیرہ کے احکام، اگر آپ ﷺ تشریف نہ لاتے تو ہمیں دیگر احکام کی طرح وقف کا علم ہی نہیں ہوتا۔

شیخ خطیب، علامہ صاوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

لأن بناء الكعبة و حفر بئر زمزم انما كان على وجه التفاخر، لا لأجل البر و التقوى. (۱)

نیز زمزم اور بناء کعبہ وغیرہ جو زمانہ جاہلیت کے اوقاف نظر آتے ہیں، یہ سب علی سبیل التفاخر تھے، نیکی کے پیش نظر نہیں تھے۔

لیکن چونکہ فی الجملہ وقف کا تصور اسلام سے پہلے بھی تھا اس لئے پہلے اس پر گفتگو کرنا ضروری ہے۔

قبل از اسلام وقف کا تصور

جس طرح بیع، اجارہ اور دیگر عقود اسلام سے پہلے بھی تھے، اسی طرح وقف کا تصور بھی مختلف شکلوں میں اسلام سے پہلے نظر آتا ہے، ذیل میں ہم اس کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوقاف:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوقاف جیسے کعبہ مشرفہ وغیرہ اسلام سے پہلے اوقاف کے ثبوت کی واضح مثال ہیں۔

علامہ طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وابراهيم الخليل عليه السلام وقف أوقافا، وهي باقية الى يومنا هذا. (۲)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کئی وقف کئے اور وہ آج تک باقی ہیں۔

علامہ قاضی خانؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) الخطيب، احمد على الخطيب. الوقف والوصايا، بغداد (۱۴)

(۲) الطرابلسى، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى الاحكام الاوقاف، مصر مكتبه هنديه، ۱۳۲۰ھ (۴)

والناس لم يأخذوا بقول أبي حنيفة رحمة الله عليه للآثار المشهورة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم والصحابة رضوان الله عليه أجمعين و تعامل الناس باتخاذ الرباطات والخانات، أولها وقف الخليل صلوات الله عليه. (۱)

لوگوں نے وقف کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو اختیار نہیں کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مشہورہ اور لوگوں کے رباطات اور سرائے خانے وقف کرنے کے تعامل کی وجہ سے، جن میں سب سے پہلا وقف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کیا ہے۔

اہل عرب کے نزدیک کعبہ مشرفہ کی عظمت اور اس کا احترام مخفی نہیں، تمام قبائل عرب کے لئے یہ یکساں اہمیت رکھتا تھا، لوگ اس کا طواف کیا کرتے تھے اور ہر سال حج کی ادائیگی کے لئے یہاں جمع ہوتے تھے اور اپنے اپنے طریقوں کے مطابق عبادت کیا کرتے تھے۔

اسلام نے بھی اس کی عظمت واحترام کو باقی رکھا اور اسے مسلمانوں کا قبلہ قرار دے کر اس کی مذہبی حیثیت کو اور زیادہ اجاگر کیا، البتہ یہاں جو شرکیہ اعمال انجام دئے جاتے تھے فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب پر پابندی لگادی اور اپنے ہاتھ سے ان بتوں کو توڑا جو یہاں عبادت کے لئے رکھے گئے تھے، اسی طرح ننگے ہوکر طواف کرنے سے ممانعت فرمائی جیسا کہ مشرکین کیا کرتے تھے۔ گویا کہ آپ نے اس کی سابقہ حیثیت کو باقی رکھا اور جو شوائبِ شرک ومنکرات اس سے متعلق پیدا ہوگئے تھے انہیں ختم فرمایا۔

(۲) مسجد اقصیٰ کا وقف:

مسجد اقصیٰ کا وجود حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے تھا، اور ظاہر ہے وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ اس کی حیثیت بھی وقف کی سی تھی۔

(۳) بئر زمزم:

بئر زمزم اور دیگر کنویں جو قبل از اسلام کھودے گئے، ان میں سے بیشتر عام لوگوں کے استعمال کے لئے تھے، اور آج تک ان سے لوگ فائدہ اٹھاتے آرہے ہیں۔

---

(۱) الاوز جندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوز جندی المتوفی ۵۲۹۵. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیة، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲۸۶/۳) نیز دیکھئے: الطرسوسی، ابراهیم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۲۸)

(۴) مختلف مذاہب کے عبادت خانے:

ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک تمام اقوام کسی نہ کسی شکل میں مختلف خداؤں کی عبادت کرتی آرہی ہیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے عبادت خانے بھی قائم کئے اور ہر زمانہ میں ان عبادت خانوں کے لئے جاگیریں بھی مختص کی گئیں، جن کی آمدنی سے ان کے جملہ اخراجات پورے کئے جاتے تھے، یہ تمام عبادت خانے اور ان کے لئے مختص جاگیریں کسی کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں بلکہ وقف ہی کی ایک صورت تھیں۔ شیخ ابوزہرہ تحریر فرماتے ہیں:

و معنى الوقف كان ثابتا عند الأقدمين قبل الاسلام، و ان لم يسم بهذا الاسم، و ذلک لأن المعابد كانت قائمة ثابتة، وما رصد عليها من عقار ينفق من غلاته على القائمين على هذه المعابد كان قائما ثابتا، ولا يمكن تصور هذا الا على أنه في معنى الوقف أو هو على التحقيق وقف، ولذلک لما أنكر أبوحنيفة الحقيقة الشرعية للوقف لم يستطع أن ينفي وقف المسجد ولزومه، لأنه المساجد كانت قائمة قبل الاسلام، فالبيت الحرام والمسجد الأقصى كانا قائمين، وكذلک كانت المعابد من كنائس و بيع وأديرة كانت قائمة، ولايتصور أن تكون مملوكة لأحد من العباد، ومنا فعها لجميع الذين يتعبدون فيها. [1]

وقف کا مفہوم اسلام سے پہلے قدیم زمانہ میں بھی ثابت تھا اگرچہ اسے یہ نام نہیں دیا گیا تھا، کیونکہ اسلام سے پہلے عبادت خانے بھی موجود تھے اور ان کے لئے مخصوص جائیدادیں بھی موجود تھیں جن کی آمدنی عبادت خانوں کے منتظمین پر خرچ کی جاتی تھیں، اور اس کا تصور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ یہ سب وقف تھے یا وقف کے معنی میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب وقف کی حقیقتِ شرعیہ کا انکار کیا تو وہ مسجد کے وقف اور اس کے لزوم کا انکار نہیں کر سکے (یہ نسبت درست نہیں جیسا کہ ہم ابھی اس کا تفصیلی جائزہ لے چکے ہیں) کیونکہ مساجد اسلام سے پہلے بھی موجود تھیں، مسجدِ حرام اور مسجد اقصیٰ پہلے

---

۱) ابوزهرة، محاضرات في الوقف، جامعة الدول العربية (۷)

سے موجود تھیں، اسی طرح کنیسہ، یہودیوں کی عبادت گاہیں وغیرہ یہ بھی پہلے موجود تھیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ سب کسی کی ذاتی ملکیت ہوں، ان کے منافع ان میں عبادت کرنے والوں پر خرچ کئے جاتے تھے۔

(۵) زمانہ جاہلیت میں وقف سے ملتی جلتی شکل:

زمانہ جاہلیت میں عربوں کے یہاں بحیرہ، سائبہ، وصیلۃ اور حام کی صورت میں اپنے بتوں کے لئے جانور مخصوص کرنے کا رواج تھا، ان جانوروں کا نہ تو کوئی دودھ استعمال کرسکتا تھا اور نہ ہی ان پر سواری کرسکتا تھا، انہیں بڑی احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، لوگ انہیں بتوں کے نام پر چھوڑ کر حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ یہ وقف ہی کے مشابہ صورت تھی، لیکن چونکہ مشرکانہ رسوم پر مبنی تھی اس لئے اسلام میں اس کی ممانعت کردی گئی اور اللہ رب العزت نے اس کی ممانعت کے لئے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

ماجعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام ولکن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب. (۱)

اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حامی کو، لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ معارف القرآن میں حضرت سعید بن المسیبؒ کے حوالہ سے اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

بحیرہ: جس جانور کا دودھ بتوں کے نام پر وقف کردیتے تھے، کوئی اپنے کام نہ لاتا تھا۔
سائبہ: جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانہ کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔
حامی: نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کرچکا ہو، اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔
وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچے جنے، درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو، اسے بھی بتوں کے نام چھوڑ دیتے تھے۔ (۲)

---

(۱) القرآن (۵/۱۰۳)
(۲) شفیع، مفتی محمد شفیع. معارف القرآن، کراچی، ادارۃ المعارف ۱۹۸۸ (۳/۲۴۶) نیز دیکھئے: ابن کثیر، اسماعیل بن کثیر. تفسیر ابن کثیر، لاھور، سھیل اکیڈمی ۱۹۷۲م (۲/۱۰۰) القرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی. الجامع لاحکام القرآن، القاھرۃ، مطبعۃ دار الکتب العربیہ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۰۱ھ (۶/۳۳۵)

(۶) قدیم مصری تاریخ میں وقف کا تصور:

قدیم مصری تاریخ میں بھی وقف کا تصور ملتا ہے، لوگ الٰہہ، معابد، مقابر کے لئے زمینیں مختص کر دیا کرتے تھے تاکہ ان زمینوں کی آمدنی ان کی تعمیر و مرمت میں خرچ ہو اور ان سے خدام وغیرہ کو تنخواہ وغیرہ دی جاسکے، اور لوگ اسے باعثِ قربت سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد عبید الکبیسی نے تحریر کیا ہے:

ویوجد فی المتحف المصری الیوم بعض اللوحات التی تشیر الی ذلک، ومن أقدمها اللوحة رقم ۷۶ دلیل ما سبیرو، و علیها بعض النقوش المتضمنة وقف عقار علی بعض الکهنة فی الأسرة الرابعة.[۱]

اس وقت بھی مصری عجائب خانہ میں بعض ایسی تختیاں ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسرہ رابعہ میں کوئی زمین کاہنوں پر وقف کی گئی تھی۔

شیخ کبیسی، ڈاکٹر شفیق کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ان رمسیس الثانی قد منح معبد أبیدوس أملاکا واسعة وأجریت الطقوس لنقل ملکیة هذه الأعیان الی المعبد أمام جمع کبیر من الرعایا.[۲]

رمسیس ثانی نے ''ابیدوس'' کے عبادت خانہ کو بہت سی املاک دی تھیں، اور ان املاک کی ملکیت عبادت خانہ کی طرف منتقل کرنے کے لئے ایک بہت بڑی تقریب منعقد کی گئی تھی۔

اسی طرح قدیم مصری تاریخ میں اہل خاندان اور اولاد پر وقف کا ثبوت بھی ملتا ہے، اس طرح جو زمینیں وقف کی جاتیں ان میں تملیک و تملک کا اختیار کسی کو نہیں رہتا اور ان کے منافع اہل خاندان اور اولاد کو ملتے اور ان کی تولیت کا حق اولاد میں سے بڑے بیٹے کو ملتا۔[۳]

---

(۱) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱/۲۴)
(۲) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱/۲۴)
(۳) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱/۲۴)

(۷) رومیوں کے یہاں وقف کا تصور:

رومیوں کے یہاں بھی کنیساؤں اور رفاہی اداروں کا نظام پایا جاتا ہے اور رومی یہ سمجھتے تھے کہ اشیاء مقدسہ یعنی جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے قائم کی گئی ہیں، جیسے عبادت خانے، چڑھاوے وغیرہ انہیں بیچنا جائز نہیں، اور کسی کے لئے ان کا مالک بننا جائز نہیں، کیونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ہیں۔

علامہ کبیسی مدونہ جستینان کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

جاء فی مدونة جستینان: الأشیاء المقدسة والأشیاء الدینیة والأشیاء الحرام لایملکها أحد، اذ ماکان لله فلایملکه انسان. [۱]

مدونہ جستینان میں ہے کہ اشیاء مقدسہ اور اشیائے دینیہ کا کوئی مالک نہیں بن سکتا، کیونکہ جو چیز اللہ کے لئے ہو اس کا انسان مالک نہیں بن سکتا۔

رومی حکیم بابنیان کی رائے تھی کہ اگر کوئی مقدس مکان منہدم ہو جائے تو اس کی زمین مقدس باقی رہتی ہے۔[۲] یہ تصور ہماری مسجد سے ملتا جلتا ہے۔

(۸) جرمن قانون میں وقف کا تصور:

موجودہ زمانے میں جرمن قانون میں بھی ایسی صورت ملتی ہے جو وقف کے مشابہ ہے، مثلاً جرمن قانون کی رو سے کوئی شخص اپنا مال کسی خاص خاندان کے لئے ایک متعینہ مدت تک مخصوص کرسکتا ہے، اس میں خاندان کے تمام افراد کا استحقاق ہوگا اور اس مال کو نہ بیچا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں میراث جاری ہوسکتی ہے، مستحق کو اس سے صرف انتفاع کا حق حاصل ہے۔[۳]

مذکورہ بالا مثالیں اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ وقف کا تصور فی نفسہ اسلام سے پہلے بھی ملتا ہے اور ابھی بھی دیگر ادیان و مذاہب میں اس طرح کی چیزوں کا وجود ہے، البتہ اسلام نے آکر اس کے مقاصد و مناہج کی تعیین کی اور اس میں اصلاحات نافذ کیں اور اسے ایک منظّم ادارہ کی شکل دی۔

---

(۱) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱/۲۴)
(۲) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱/۲۴)
(۳) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱/۲۴)

تاریخِ اسلامی اوقاف

(عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کے اوقاف)

اسلامی اوقاف کا سلسلہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ ہجرت کے دوران مسجدِ قباء کی تعمیر سے شروع ہوتا ہے۔

مسجدِ قباء:

یہ پہلی با قاعدہ مسجد ہے جو عامۃ المسلمین کے لئے باجماعت نماز پڑھنے کی غرض سے تعمیر کی گئی، اس سے پہلے اگر چہ مختلف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے انفرادی طور پر نمازوں کی ادائیگی کے لئے جگہیں متعین کر رکھی تھیں لیکن یہ با قاعدہ مسجد نہیں تھیں بلکہ انہیں "مسجد البیت" کہنا زیادہ مناسب ہے، انہی کو بعض محدثین نے مسجد سے تعبیر کیا ہے۔[1]

علامہ قسطلانیؒ المواہب اللدنیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وأسس مسجد قباء الذی أسس علی التقوی، علی الصحیح، وهو أول مسجد بنی فی الاسلام و أول مسجد صلی فیه ﷺ بأصحابه جماعة ظاهرة، وأول مسجد بنی لجماعة المسلمین عامة، وان کان تقدم بناء غیره من المساجد لکن لخصوص الذی بناه.[2]

جناب نبی کریم ﷺ نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ یہ پہلی مسجد ہے جو اسلام آنے کے بعد تعمیر کی گئی، اور یہ پہلی مسجد ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ کھلم کھلا باجماعت نماز پڑھی، اور یہ پہلی مسجد ہے جو عامۃ المسلمین کے لئے

---

(۱) ظفیر، مولانا محمد ظفیر الدین. اسلام کا نظام مساجد کراچی، دارالاشاعت (۲۰)

(۲) القسطلانی، احمد بن محمد القسطلانی ۹۳۲ھ. المواهب اللدنیة بالمنح المحمدیة، بیروت، المکتب الاسلامی ۱۴۱۲ھ (۳۰۸/۱)

تعمیر کی گئی، اگر چہ اس سے پہلے اور بھی مساجد بنائی گئی تھیں لیکن وہ سب بنانے والوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔

مسجد قبا جس جگہ تعمیر کی گئی یہ جگہ کلثوم بن الہدم کی تھی، وہ یہاں کھجور سکھایا کرتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ جگہ لے کر یہاں مسجد کی بنیاد رکھی(۱) اور خود اپنے ہاتھ سے یہ مسجد تعمیر کی۔

علامہ سمہودیؒ نے وفاء الوفاء میں طبرانی کے حوالہ سے حضرت شموس بنت نعمان رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے:

قالت: نظرت الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین قدم و نزل و أسس هذا المسجد قباء، فرأيته يأخذ الحجر أو الصخرة حتى يهصره الحجر، وأنظر الى بياض التراب على بطنه أو سرته فيأتي الرجل من أصحابه و يقول: بأبى يارسول الله! أعطنى أكفك، فيقول: لا، خذ مثله، حتى أسسه. (۲)

فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اترے اور اس مسجد کی بنیاد رکھی تو میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ پتھر یا چٹان اٹھاتے اور اسے دوسرے پتھر سے جوڑتے، اور میں اس وقت بھی گویا آپ کے پیٹ یا ناف پر مٹی کی سفیدی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کے صحابہ میں سے کوئی آتا اور کہتا کہ یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ یہ مجھے دیدیں میں کافی ہوں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے، نہیں، تم دوسرا پتھر لے لو، یہاں تک کہ آپ نے اس کی تعمیر مکمل فرمالی۔

اور یہی وہ مسجد ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں یہ شہادت دی گئی ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لمسجد اسس على التقوى من اول يوم احق ان تقوم فيه. (۳)

البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔

---

(۱) الصالحی، محمد بن يوسف الصالحي الشامي ۹۴۲. سبل الهدىٰ والرشاد، القاهرة، لجنة احياء التراث الاسلامي ۱۴۰۲ھ (۲۶۷/۳) "كان لكلثوم بن الهدم مربد، والمربد الموضع الذى يبسط فيه التمر ليجف، فأخذه منه رسول الله صلى الله عليه وسلم فأسسه وبناه مسجدا."

(۲) السمهودی، نور الدين على بن احمد ۹۱۱ھ. وفاء الوفاء، مدينه منوره، الشيخ محمد النمكانى ۱۳۷۴ھ (۲۵۲/۱)

(۳) القرآن (۱۰۸/۹)

مسجدِ قبا کی فضیلت:

احادیثِ مبارکہ میں اس مسجد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت سہل بن حنیفؓ کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من تطهر في بيته ثم أتى مسجد قباء فصلى فيه صلاة كان له كأجر عمرة. (۱)

جو شخص اپنے گھر میں وضو کر کے مسجد قبا آئے اور اس میں نماز پڑھے تو اسے عمرہ جیسا ثواب ملتا ہے۔

امام عز الدین الکنانی نے ہدایۃ السالک میں حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس مسجد کی فضیلت وعظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

وعن عمر أنه كان يأتي قباء يوم الاثنين و يوم الخميس، فجاء يوما فلم يجد فيه أحدا من أهله فقال: والذي نفسي بيده لقد رأيت رسول الله عليه وسلم وأبابكر في أصحابه ينقلون حجارته على بطونهم ويؤسسه رسول الله صلى الله عليه وسلم وجبريل يؤم به البيت، و محلوف عمر بالله لو كان مسجدنا هذا بطرف من الأطراف لضربنا اليه أكباد الابل. (۲)

حضرت عمرؓ ہر پیر اور جمعرات کے دن مسجدِ قباء تشریف لایا کرتے تھے، ایک دن آپ تشریف لائے، آپ نے مسجد میں اپنے اہل خانہ میں سے کسی کو نہیں پایا تو آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں نے خود حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ کے اصحاب سمیت دیکھا کہ آپ لوگ اس مسجد کی تعمیر کے لئے پیٹ کے بل پتھر منتقل کر رہے تھے، جناب نبی کریم ﷺ خود اس کی تعمیر فرما رہے تھے اور

---

(۱) القزويني، ابوعبد الله محمد بن يزيد القزويني المتوفى ۲۷۳ھ. سنن ابن ماجه، رياض، شركة الطباعة العربية، الطبعة الثانية ۱۹۸۴م (باب اقامة الصلاة)

(۲) محمد بن ابراهيم ۷۶۷ھ. هداية السالك الى المذاهب الاربعة فى المناسك، بيروت، دارالبشائر الاسلامية ۱۴۱۴ھ (۱/۱۲۰)

جبریل امین علیہ السلام بیت اللہ کی طرف رخ کرکے امامت کرا رہے تھے، اور مجھے اپنی یہ قسم بھی یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ اگر ہماری یہ مسجد مدینہ کے گرد و نواح میں سے کسی دور جگہ ہوتی تو ہم اونٹوں پر سفر کرکے وہاں جاتے۔

مسجد نبوی:

اس مسجد کی تعمیر کے فوراً بعد جب جناب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ پہنچے تو آپ نے وہاں مسجد نبوی کی بنیاد رکھی، جس جگہ مسجد نبوی کی بنیاد رکھی گئی یہ وہ جگہ ہے جہاں حضور اکرم ﷺ کی اونٹنی بیٹھی تھی۔ یہ جگہ بنو نجار کے دو یتیم لڑکوں کو سہل اور سہیل کی ملکیت تھی اور اسے کھجور سکھانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ (۱)

جناب نبی کریم ﷺ نے جب یہاں مسجد بنانے کا ارادہ فرمایا تو بنونجار کو بلوایا اور بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے مروی روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا:

یابنی النجار ثامنونی بحائطکم هذا. (۲)

اے بنونجار! تم اپنا یہ باغ ہمیں بیچ دو اور اس کی قیمت طے کرلو۔

اس کے جواب میں انہوں نے عرض کیا کہ:

لا واللہ! لانطلب ثمنه الا الی اللہ. (۳)

نہیں خدا کی قسم! ہم اس کی قیمت کسی سے طلب نہیں کرتے سوائے اللہ عز وجل کے۔

بخاری شریف کی اس روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنونجار نے یہ زمین حضور ﷺ کو بیچی نہیں بلکہ اسے خود مسجد کے لئے وقف کر دیا تھا امام بخاریؒ کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ بخاری شریف میں کتاب الوصایا کے تحت امام بخاریؒ نے اس حدیث پر دو باب قائم فرمائے ہیں۔ ایک ''**باب اذا وقف جماعة أرضا مشاعا فهو جائز**'' دوسرا ''**باب وقف الأرض للمسجد**'' یہ دونوں باب اسی تقدیر پر ہیں کہ بنونجار نے یہ باغ خود وقف کر دیا تھا۔

---

(۱) دیکھئے: سبل الهدیٰ والرشاد (۳/۳۳۵)

(۲) البخاری، الامام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۵/۳۹۸ رقم الحدیث: ۲۷۷۱)

(۳) حواله بالا

لیکن علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں تحریر فرمایا ہے کہ طبقات ابن سعد میں واقدی سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے یہ باغ ان سے دس دینار میں خریدا اور ثمن کی ادائیگی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کی۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

و ذكر محمد بن سعد في الطبقات عن الواقدي أن النبي ﷺ اشتراه منهم بعشرة دنانير دفعها أبوبكر الصديق، وقال: كان ذلك مربد اليتيمين، فدعاهما النبي ﷺ فساومهما ليتخذه مسجدا، فقالا: بل نهبه لك يارسول الله، فأبى رسول الله ﷺ حتى ابتاعه منهما بعشرة دنانير وأمر أبا بكر أن يعطيهما ذلك. [1]

محمد بن سعد نے طبقات میں واقدی کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے یہ جگہ ان سے دس دینار میں خریدی تھی جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ادا کئے تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ جگہ دو یتیموں کا ''مربد'' تھی جہاں کھجور سکھائی جاتی تھی۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کو بلایا اور قیمت کے سلسلہ میں ان سے بات چیت کی تا کہ اس جگہ کو مسجد بنایا جا سکے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم یہ جگہ آپ کو ہبہ کرتے ہیں، حضور ﷺ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ آپ نے یہ جگہ ان دونوں سے دس دینار میں خرید لی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ادائیگی کا حکم دیا۔

اسی طرح علامہ سمہودیؒ نے زہری کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے:

وفي كتاب يحيى عن الزهري أيضا أن المربد كان لسهل و سهيل، وأنهما كانا في حجر أبي أمامة أسعد بن زرارة، وأن النبي ﷺ قال حين بركت به راحلته: هذا المنزل ان شاء الله، ثم دعا الغلامين فساومهما بالمربد ليتخذه مسجدا، فقالا: بل نهبه لك يارسول الله، فأبى أن يقبله هبة حتى ابتاعه منهما ثم بناه مسجدا. [2]

---

(۱) العيني، محمود بن احمد المعروف ببدر العيني. عمدة القارى، بيروت، دارالفكر (۱۷۷/۴)
(۲) السمهودى، نور الدين على بن احمد ۹۱۱ھ. وفاء الوفاء، مدينه منوره، الشيخ محمد النمكانى ۱۳۷۴ھ (۳۲۲/۱) مزید دیکھئے: المواهب اللدنية بالمنح المحمدية (۳۲۶/۱)

یحییٰ کی کتاب میں زہری سے روایت ہے کہ یہ ''مربد'' سہل اور سہیل کا تھا جو حضرت اسعد بن زرارہؓ کی پرورش میں تھے۔ جب حضور ﷺ کی اونٹنی یہاں بیٹھ گئی تو آپ نے فرمایا: بس یہی ہماری منزل ہوگی انشاء اللہ، پھر حضور اکرم ﷺ نے ان دونوں لڑکوں کو بلایا اور ان سے ''مربد'' کے سلسلہ میں مول بھاؤ کیا تاکہ اسے مسجد بنایا جائے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم اسے ہبہ کرتے ہیں لیکن جناب نبی کریم ﷺ نے اسے بطور ہبہ قبول کرنے سے انکار فرمایا اور اسے ان دونوں سے خریدا اور پھر یہاں مسجد بنائی۔

اس طرح کی اور روایتیں بھی سیرت اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے یہ باغ خریدا تھا اور پھر اسے مسجد کے لئے وقف فرما کر اس پر مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی تھی۔ علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں اسی احتمال کو ترجیح دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

والصحيح أن بنی النجار لم يوقفوا شيئا بل باعوه ووقفه النبی ﷺ. (۱)

صحیح یہ ہے کہ بنونجار نے کچھ بھی وقف نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے تو اسے بیچ دیا تھا اور پھر جناب نبی کریم ﷺ نے اسے وقف کیا۔

اور علامہ سمہودیؒ ان دونوں روایتوں میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

طريق الجمع بين ذلک کما أشار الحافظ ابن حجر أنهم لماقالوا: لانطلب ثمنه الا الى الله، سأل عن من يختص بملكه منهم فعينوا له الغلامين فابتاعه منهما أو من وليهما ان كانا غير البالغين. (۲)

ان میں جمع کی صورت یہ ہے کہ (جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے) جب بنونجار نے عرض کیا کہ ''ہم اس کی قیمت طلب نہیں کرتے مگر اللہ تعالیٰ سے'' تو حضور ﷺ نے اس کے مالک کے بارے میں پوچھا، انہوں نے ان دونوں لڑکوں کو متعین کر دیا، چنانچہ حضور ﷺ نے ان دونوں سے خرید لیا اگر وہ نابالغ تھے تو ان کے اولیاء سے یہ باغ خرید لیا۔

---

(۱) العینی، محمود بن احمد المعروف، ببدر العینی. عمدة القاری، بیروت، دارالفکر (۱۷۷/۴)

(۲) السمهودی، نور الدین علی بن احمد ۹۱۱ھ. وفاء الوفاء، مدینه منوره، الشیخ محمد النمکانی ۱۳۷۴ھ (۳۲۴/۱)

خلاصہ یہ کہ مسجدِ نبوی جس جگہ تعمیر کی گئی یہ جگہ حضورﷺ نے اس کے مالک دو بچوں سے خرید کر مسجد کے لئے وقف فرمادی تھی اور پھر اس پر مسجد نبوی کی تعمیر کی گئی۔ یہ دوسری مسجد تھی جو باقاعدہ عامۃ المسلمین کے لئے باجماعت نماز پڑھنے کی غرض سے تعمیر کی گئی، اس کے بعد مساجد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو حضورﷺ کے زمانہ میں تعمیر کی گئیں۔

بیر رومہ:

جناب نبی کریمﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہاں میٹھے پانی کی قلت تھی، صرف ایک کنواں تھا جس کا نام بیر رومہ تھا[۱] اس کا پانی نہایت شریں اور لذیذ تھا، یہ انتہائی قدیم کنواں تھا۔ علامہ سمہودیؒ نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے:

لما رواه ابن زبالة عن غير واحد من أهل العلم أن تبعا اليمانى لما قدم المدينة كان منزله بقناة، واحتفر البئر التى يقال لها: بئر الملك، وبه سميت. [۲]

ابن زبالہ نے مختلف اہل علم سے روایت کیا ہے کہ یمن کا بادشاہ ''تبع'' جب مدینہ آیا تو اس نے یہ کنواں کھدوایا تھا اسے بیر الملک کہا جاتا تھا۔

ہجرت کے وقت ابن عبد البرؒ کی روایت کے مطابق یہ ایک یہودی کی ملکیت تھا، مسلمان اس سے خرید خرید کر پانی استعمال کرتے تھے، جناب نبی کریمﷺ نے جب یہ دیکھا تو آپ نے فرمایا: کون ہے جو بیر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کردے اور اس کے بدلہ اسے جنت میں مشرب ملے گا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے جب یہ سنا تو فوراً اس یہودی کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے یہ کنواں خریدنے کی بات چیت کی، اس نے پورا کنواں بیچنے سے انکار کردیا، چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے آدھا کنواں بارہ ہزار دینار دے کر خرید لیا اور اسے مسلمانوں کے لئے وقف کردیا، حضرت عثمان غنیؓ نے یہودی کو یہ تجویز پیش کی کہ

---

(۱) دیکھئے: الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ الترمذی. سنن الترمذی مع تحقیق احمد شاکر، بیروت، دار احیاء التراث العربی (رقم الحدیث: ۳۷۰۳) "عن أبى مسعود الجويرى عن ثمامة بن مزن القشيرى قال: شهدت الدار حين أشرف عليهم عثمان فقال ......: "أنشدكم بالله والاسلام هل تعلمون أن رسول اللهﷺ قدم المدينة وليس بها ماء يستعذب غير بئر رومة."

(۲) السمهودى، نور الدين على بن احمد ۹۱۱ھ. وفاء الوفاء، مدينه منوره، الشيخ محمد النمكانى ۱۳۷۴ھ (۹۷۰/۲)

ایک دن تم اس کنویں سے فائدہ اٹھانا اور ایک دن میں اس کنویں سے فائدہ اٹھاؤں گا، یہودی اس پر راضی ہوگیا۔ جس دن حضرت عثمان غنیؓ کی باری ہوتی مسلمان اس دن کنویں سے اتنا پانی نکال لیتے جو دو دن کے لئے کافی ہوتا اور جب یہودی کی باری آتی اس سے کوئی خریدنے نہیں آتا، یہودی نے جب یہ دیکھا تو حضرت عثمان غنیؓ سے کہا کہ تم نے میرا کنواں خراب کردیا ہے بس یہ دوسرا حصہ بھی تم خریدلو، چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ نے اس کا دوسرا حصہ بھی آٹھ ہزار درہم میں خرید کر پورا کنواں مسلمانوں کے لئے وقف کردیا۔(۱)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بغویؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے:

لما قدم المهاجرون المدينة استنكروا الماء و كانت لرجل من بنى غفار عين يقال لها: رومة و كان يبيع منها القربة بمد فقال له النبى صلى الله عليه وسلم: تبيعنيها بعين فى الجنة؟ فقال: يارسول الله ليس لى ولا لعيالى غيرها، فبلغ ذلك عثمانؓ فاشراها بخمسة و ثلاثين الف درهم، ثم أتى النبى صلى الله عليه وسلم فقال: أتجعل لى فيها ما جعلت له؟ قال: نعم، قال: جعلتها للمسلمين.(۲)

جب حضراتِ صحابہ ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے تو انہیں وہاں کا پانی موافق نہیں آیا، بنوغفار کے ایک آدمی کا کنواں تھا جسے رومہ کہا جاتا تھا اور وہ اس کا پانی ایک مشکیزہ ایک مدغلہ کے بدلہ بیچا کرتا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ یہ مجھے جنت کے ایک چشمے کے عوض بیچ دو، اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اس کے علاوہ میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے، اس لئے میں اسے بیچ نہیں سکتا۔ حضرت عثمان غنیؓ کو اس کی اطلاع ہوگئی انہوں نے یہ کنواں ۳۵ ہزار درہم میں خرید لیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر میں اسے خریدلوں تو کیا آپ مجھ سے بھی وہی وعدہ

---

(۱) ابن عبد البر، يوسف بن عبد الله بن عبد البر ۴۶۳ھ. الاستيعاب بيروت دارالجبل (۱۰۳۹/۳) "اشترى عثمان بئر رومة، وكانت ركية ليهودى يبيع المسلمين ماء ها. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من يشترى رومة فيجعلها للمسلمين، يضرب بدلوه فى دلائهم، له بها مشرب فى الجنة؟ فأتى عثمان اليهودى فساومه بها، فأبى أن يبيعها كلها، فاشترى نصفها باثنى عشر ألف درهم فجعله للمسلمين، فقال له عثمانؓ: ان شئت جعلت على نصيبى قرنين، وان شئت فلى يوم ولك يوم، قال: بل لك يوم ولى يوم، فكان اذا كان يوم عثمان استقى المسلمون مايكفيهم يومين، فلما رأى اليهودى قال: أفسدت على ركيتى، فاشتر النصف الآخر، فاشتراه بثمانية آلاف درهم."

(۲) ابن حجر، احمد بن على بن حجر العسقلانى. فتح البارى، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۴۰۷/۵)

کرتے ہیں جو آپ نے اس سے کیا تھا کہ جنت میں ایک چشمہ دیا جائے گا؟ حضورﷺ نے فرمایا: ہاں، حضرت عثمان غنیؓ نے عرض کیا کہ میں اسے خرید چکا ہوں اور اسے میں نے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کنواں ایک غفاری کا تھا۔ ہم فی الوقت اس تحقیق میں نہیں پڑتے کہ وہ یہودی کا تھا یا غفاری کا، بہر حال ان دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے بیر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔ احقر کو باوجود تلاشِ بسیار کے اس کے وقف کی تاریخ کہیں نہیں مل سکی لیکن ابھی ذکر کردہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتداءِ ہجرت کا زمانہ تھا[1] اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ بیر رومہ تاریخ اسلام میں اپنی نوعیت کا پہلا وقف تھا، اگر چہ اس سے پہلے مسجد کی صورت میں مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی کا وقف وجود میں آچکا تھا۔ چونکہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا وقف تھا اسی لئے غالباً علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اسے تاریخ اسلام کا سب سے پہلے وقف قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

قلت: بل صدقة عثمان فانه اشترى بئر رومة مقدم النبیﷺ المدينة و جعلها للمسلمين. [2]

میں کہتا ہوں کہ حضرت عثمان غنیؓ کا وقف پہلا وقف تھا، کیونکہ انہوں نے حضور اکرمﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے موقعہ پر بیر رومہ خریدا تھا اور اسے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔

اس کی تحقیق آگے آرہی ہے کہ اسلام کا سب سے پہلا وقف کونسا ہے؟

جناب نبی کریمﷺ کے اوقاف:

خود جناب نبی کریمﷺ نے وہ سات باغ اللہ کے راستے میں وقف فرمادئے تھے جن کی وصیت ''مُخیرِیق'' نامی ایک یہودی نے آپ کے لئے کی تھی، آپﷺ ان باغات کی آمدنی فقراء، مساکین، ابن سبیل اور اپنے رشتہ داروں پر خرچ فرمایا کرتے تھے۔

---

(۱) دیکھئے: الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ الترمذی. سنن الترمذی مع تحقیق احمد شاکر، بیروت، دار احیاء التراث العربی (رقم الحدیث: ۳۷۰۳) "عن ثمامة بن حزن القشیری قال: شهدت الدار حین أشرف علیهم عثمان ...... فقال: أنشدكم بالله والاسلام هل تعلمون أن رسول اللهﷺ قدم المدینة ولیس بها ماء یستعذب غیر بئر رومة."

(۲) عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۱۲۰/۱۳)

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مُخیرِیق ایک یہودی عالم تھا اور وہ بہت مالدار تھا، بہت سے باغات کا مالک تھا، وہ جناب نبی کریم ﷺ کو آپ کی صفات اور اپنی معلومات کے ذریعہ خوب پہچانتا تھا اور دین اسلام سے کافی مانوس تھا۔ جب غزوہ احد کا دن آیا جو کہ ہفتہ کا دن تھا اس نے یہودیوں سے کہا کہ خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد کی مدد کرنا تم پر ضروری ہے، انہوں نے جواب دیا کہ آج ہفتہ کا دن ہے جس میں ہمارے مذہب میں لڑنا منع ہے۔ مُخیرِیق نے کہا کہ خدا کرے کہ تمہارا کوئی ہفتہ کا دن نہ ہو۔ اس نے اپنے ہتھیار لئے اور جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں احد کے میدان میں پہنچا اور اس نے پہلے اپنی قوم سے یہ عہد لے لیا تھا کہ اگر آج میں قتل کر دیا جاؤں تو میرا سارا مال محمد (ﷺ) کا ہوگا، وہ اس میں جیسا چاہے تصرف کریں۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو وہ بھی خوب لڑا یہاں تک کہ قتل کر دیا گیا۔

جناب نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ مُخیرِیق یہودیوں میں سب سے بہتر تھا، اور جناب نبی کریم ﷺ نے اس کے اموال حسبِ وصیت لے لئے، آنحضرت ﷺ کے مدینہ میں عام اوقاف انہی میں سے تھے۔(۱)

حافظ ابن حجرؒ نے مغازی واقدی کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ:

ان أول صدقة موقوفة كانت فى الاسلام أراضى مخيريق التى أوصى بها الى النبى ﷺ فوقفها النبى ﷺ. (۲)

اسلام میں سب سے پہلا وقف مُخیرِیق کی زمینیں تھیں جن کی اس نے آنحضرت ﷺ کے لئے وصیت کی تھی، پھر حضور ﷺ نے وہ اراضی وقف فرما دی تھیں۔

---

(۱) ابن هشام، عبد الملک بن هشام الحميرى. السيرة النبوية، مصر، مصطفى البابى ۱۹۵۵م (۱/۱۸) "قال ابن اسحاق: وكان من حديث مخيريق وكان حبر اعالما وكان رجلا غنيا كثير الأموال من النخل، وكان يعرف رسول الله ﷺ بصفته وما يجد فى علمه، وغلب عليه الف دينه، فلم يزل على ذلک حتى اذا كان يوم أحد، وكان يوم أحد يوم السبت، قال: يامعشر يهود! والله انكم لتعلمون أن نصر محمد عليكم لحق، قالوا: ان اليوم يوم السبت، قال: لاسبت لكم، ثم أخذ سلاحه فخرج حتى أتى رسول الله ﷺ بأحد، وعهد الى من وراءه من قومه: ان قتلت هذا اليوم فأموالى لمحمد ﷺ، يصنع فيها ماأراه الله، فلما اقتتل الناس قاتل حتى قتل. فكان رسول الله ﷺ...... فيما بلغنى ...... يقول: مخيريق خير يهود، وقبض رسول الله ﷺ أمواله، فعامة صدقات رسول الله ﷺ بالمدينة منها."

(۲) ابن حجر، احمد بن على بن حجر العسقلانى. فتح البارى، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۵/۴۰۲)

اس پر تو ہم آگے جا کر گفتگو کریں گے کہ اسلامی تاریخ کا سب سے پہلا وقف کونسا تھا، بہرحال ۳ھ میں مخیریق غزوہ احد میں قتل ہوا اور اس کا مال اس کی وصیت کے مطابق جناب نبی کریم ﷺ کو ملا اور آپ نے اسے وقف فرمادیا۔

یہ تو وہ وقف تھا جو آپ ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں فرمادیا تھا ورنہ آپ کے تمام اموال آپ کی وفات کے بعد وقف ہو گئے تھے، کیونکہ جناب نبی کریم ﷺ کی ہدایت تھی:

"لانورث ماتركنا صدقة."(۱)

ہماری میراث جاری نہیں ہوتی، ہم نے جو کچھ چھوڑا وہ صدقہ ہے۔

علامہ عینیؒ لفظ "صدقۃ" کے ذیل میں فرماتے ہیں:

ومما يستفاد من الحديث جواز الوقف وأن يجرى بعد الوفاة كالحياة فلا يباع ولا يملك.(۲)

اس حدیث سے وقف کا جواز معلوم ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وفات کے بعد بھی اس کے وہی احکام ہیں جو حیات میں تھے کہ اسے نہ بیچا جاسکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا مالک بنایا جاسکتا ہے۔

آپ ﷺ کے انتقال کے بعد آپ کی جو جائیداد و زمینیں صدقات قرار دی گئیں ان کی تفصیل استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم نے علامہ نوویؒ کے حوالہ سے تکملہ فتح الملہم میں نقل فرمائی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ کے انتقال کے وقت آپ کی ملکیت میں درج ذیل زمینیں تھیں:

(۱) بنونضیر میں مخیریق کے وصیت کردہ سات باغ۔

(۲) بنونضیر کی زمینیں جو ان کی جلاوطنی کے بعد آنحضرت ﷺ کو بطور فئی دی گئی تھیں۔

(۳) فدک کی نصف زمین جس پر آپ نے فتح خیبر کے بعد اہل فدک سے صلح کی تھی۔

(۴) وادی القری کی ثلث زمین جو بطور صلح آپ کو دی گئی تھی۔

(۵) خیبر کے دو قلعے وطیح اور سلالم بھی آپ کو صلحاً ملے تھے اور آپ کی ملکیت تھے۔

---

(۱) البخاری، الامام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاری. صحيح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (رقم الحديث: ٦٧٢٦)

(۲) العينی، محمود بن احمد المعروف ببدر العينی. عمدة القاری، بيروت، دارالفكر (۲۳/۲۳۵)

(٦) فتح خیبر کے بعد خیبر کے خمس میں سے آپ کو حصہ ملا تھا۔(۱)

یہ ساری زمینیں اور باغات جناب نبی کریم ﷺ کی ملکیت تھے، مخیریق کے باغات تو آپ نے پہلے ہی وقف فرمادئے تھے، بقیہ زمینیں جناب نبی کریم ﷺ کے تصرف میں رہتی تھیں، آپ ان سے اپنے گھر والوں پر خرچ فرمایا کرتے تھے اور بقیہ تمام آمدنی مسلمانوں پر اور مصالح عامہ میں صرف کیا کرتے تھے، آپ کے انتقال کے بعد یہ ساری زمینیں آپ کی ہدایت کے مطابق صدقات (وقف) قرار دی گئیں اور انہیں حضراتِ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین انہی مصارف میں خرچ فرماتے رہے جن میں جناب نبی کریم ﷺ اپنی حیات مبارکہ میں خرچ فرمایا کرتے تھے۔(۲)

---

(۱) دیکھئے: عثمانی، محمد تقی عثمانی. تکملہ فتح الملھم، کراچی، مکتبہ دارالعلوم ۱۴۱۵ھ (۸۴/۲)
"والخلاصة ما ذكره النوويؒ فى آخر شرح الباب الآتى عن القاضى عياضؒ: قال فى تفسير صدقات النبی ﷺ:
"صارت اليه بثلاثة حقوق: أهدها ماوهب له ﷺ، وذلک وصية مخيريق اليهودى له عند اسلامه يوم أحد، وكانت سبع حوائط فى بنى النضير. الثانى: حقه من الفئى من أرض بنى النضير حين أجلاهم، كانت له خاصة، لأنها لم يوجف عليها المسلمون خيل ولاركاب.

وأما منقولات بنى النضير فحملوا منها ما حملته الابل غير السلاح كما صالحهم، ثم قسم ﷺ الباقى بين المسلمين، وكانت الأرض لنفسه، ويخرجها فى نوائب المسلمين وكذلک نصف أرض فدک، صالح أهلها بعد فتح خيبر على نصف أرضها وكان خالصاله، وكذلک ثلث أرض وادى القرى أخذه فى الصلح حين صالح أهلها اليهود، وكذلک حصنان من حصون خيبر وهما الوطيح والسلالم، أخذها صلحا.

والثالث: سهمه من خمس خيبر وما افتتح فيها عنوة، فكانت هذه كلها ملكا لرسول الله ﷺ خاصة، لاحق فيها لأحد غيره، لكنه ﷺ كان لايستأثر بها، بل ينفقها على أهله والمسلمين وللمصالح العامة، وكل هذه صدقات محرمات التملک بعده." والله أعلم.

(۲) صدقات نبوی کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائے: السمھودی، نور الدين على بن احمد ۹۱۱ھ. وفاء الوفاء، مدينه منوره، الشيخ محمد النمكانى ۱۳۷۴ھ (۹۸۸/۳)

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوقاف

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وقف:

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے زمین کی صورت میں وقف کیا۔ ان سے پہلے اگرچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ''بیر رومہ'' وقف فرما چکے تھے لیکن اس کی نوعیت دوسری تھی، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وقف کا پس منظر یہ تھا کہ آپ کی خیبر میں ایک زمین تھی جس کا نام ''ثمغ'' تھا، یہاں کچھ باغات بھی تھے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے ایک ایسی زمین حاصل کی ہے کہ اس سے قیمتی زمین مجھے اب تک نہیں ملی، آپ اس کے بارے میں مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تصدق بأصله لایباع ولا یوهب ولا یورث ولکن ینفق ثمره. (۱)

اس کی اصل کو وقف کردو کہ اسے نہ بیچا جاسکے، نہ ہبہ کیا جاسکے اور نہ ہی اس میں میراث جاری ہوسکے، البتہ اس کے پھل (منافع) خرچ کئے جاتے رہیں۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے وقف کردیا اور اس کے مصارف کا تعین بھی کردیا کہ اس سے حاصل ہونے والے منافع مہمانوں، رشتہ داروں اور اقارب میں خرچ کئے جائیں، اور جو شخص اس کا متولی بنے اسے اجازت ہے کہ وہ مناسب طریقہ سے اس میں سے کھائے اور اپنے دوست کو کھلائے، بشرطیکہ وہ اسے مال جمع کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ (۲)

---

(۱) البخاری، الامام ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور دار نشر للکتب الاسلامیة (رقم الحدیث: ۲۷۶۴)

(۲) حوالہ بالا: ''عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن عمر تصدق بمال له علی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، وکان یقال له ثمغ وکان نخلا، فقال عمر: یارسول الله! انی استفدت مالا وهو عندی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ان تفصیلات کے ساتھ وقف تو حضرت عمرؓ نے حضورﷺ کی موجودگی ہی میں کر دیا تھا، البتہ اس کی دستاویز اپنے دورِ خلافت میں لکھوائی، اور اس موقعہ پر حضرات انصار ومہاجرین کو جمع کیا اور انہیں اس دستاویز پر گواہ بنایا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے:

لما كتب عمر بن الخطاب صدقته فى خلافته دعا نفرا من المهاجرين والأنصار فأحضرهم ذلك وأشهدهم عليه. (۱)

جب حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے وقف کی دستاویز لکھی تو حضراتِ انصار ومہاجرین کی ایک جماعت کو اس موقعہ پر بلوایا اور انہیں اس پر گواہ بنایا۔

یہ دستاویز کتب حدیث میں منقول ہے۔ سنن دار قطنی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت مروی ہے جس میں شروع میں حضرت عمرؓ کے وقف کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد یہ دستاویز نقل کی گئی ہے:

عن نافع عن ابن عمر ...... فكتب عمر هذا الخطاب: من عمر بن الخطاب فى ثمغ والمائة الوسق التى أطعمنيها رسول اللهﷺ من أرض خيبر، انى حبست أصلها وجعلت ثمرتها صدقة لذى القربى واليتامى.والمساكين وابن السبيل، والمقيم عليها أن يأكل أو يوكل صديقا لاجناح، ولا يباع ولايوهب ولا يورث ماقامت السموات والأرض، جعل ذلك الى ابنته حفصة، فاذا ماتت فالى ذى الرأى من أهلها. (۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

نفيس فأردت أن أتصدق به، فقال النبىﷺ: تصدق بأصله لايباع ولا يوهب ولا يورث ولكن ينفق ثمره، فتصدق به عمر، فصدقته تلك فى سبيل الله وفى الرقاب والمساكين والضيف وابن السبيل ولذى القربى، ولا جناح على من وليه أن يأكل منه بالمعروف أو يؤكل صديقه غير متمول به.''

(حاشیہ صفحہ ہذا)

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۸)

(۲) الدار قطنى، على بن عمر الدار قطنى المتوفى ۳۸۵ھ بيروت، دار المعرفة، الطبعة الاولىٰ ۱۴۲۲ھ (۳/۴۲۹)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے یہ دستاویز لکھی: ''یہ دستاویز عمر بن خطاب کی ہے ثمغ اور خیبر کے ان سو وسق کے بارے میں جو حضور نے مجھے عطا کئے تھے۔ میں نے اس کی اصل کو وقف کر دیا اور اس کے ثمرات و منافع رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے وقف ہیں، اور جو ان کا متولی ہوگا وہ خود بھی ان میں سے کھا سکتا ہے اور اپنے دوستوں کو بھی کھلا سکتا ہے، اسے نہ بیچا جائے گا، نہ ہبہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس میں میراث جاری ہوگی جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اس کا انتظام وانصرام حفصہ بنت عمر کے سپرد ہے، اور جب اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی اولاد میں سے جو ذی رائے ہو وہ اس کی نگرانی کرے گا۔

اسی سے ملتے جلتے الفاظ میں یہ دستاویز ابوداؤد شریف میں بھی مروی ہے۔[1]

حضرت عمر فاروق ؓ کا یہ وقف اور اس کی دستاویز اسلامی اوقاف کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے وقف کے بہت سے احکام ثابت ہوتے ہیں جنہیں ہم انشاءاللہ متعلقہ ابواب میں ذکر کریں گے۔[2]

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا وقف:

مسجد نبوی کے سامنے حضرت ابوطلحہؓ کا بیرحاء نامی باغ تھا۔ یہ باغ بڑا قیمتی، زرخیز اور ان کو اپنی جائیداد میں سب سے زیادہ محبوب تھا، اس کا پانی نہایت شیریں تھا، جناب نبی کریم ﷺ ان کے باغ میں

---

(۱) السجستانی، ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ. سنن ابی داؤد بیروت، مؤسسة الریان ۱۹۹۸ (۳/۴۰۰ رقم الحدیث: ۲۸۷۱) "حدثنا سلیمان بن داود المهری قال: أخبرنا ابن وهب قال: أخبرنی اللیث عن یحیی بن سعید عن صدقة عمر بن الخطاب قال: نسخها لی عبد الحمید بن عبد الله بن عبد الله بن عمر بن الخطاب: بسم الله الرحمن الرحیم، هذا ماکتب عبد الله عمر فی ثمغ فقص من خبره نحو حدیث نافع قال: غیر متأثل مالا فما عفا عنه من ثمره فهو للسائل والمحروم. قال: وساق القصة قال: وان شاء ولی ثمغ اشتری من ثمره رقیقا لعمله، و کتب معیقیب و شهد عبد الله بن الأرقم بسم الله الرحمن الرحیم، هذا ماأوصی به عبد الله عمر أمیر المومنین ان حدث به حدث أن ثمغا وصرمة بن الأكوع و العبد الذی فیه والمائة سهم الذی بخیبر و رقیقه الذی فیه والمائة التی أطعمه محمد ﷺ بالوادی تلیه حفصة ماعاشت، ثم یلیه ذو الرأی من أهلها أن لایباع ولایشتری ینفقه حیث رأی من السائل والمحروم و ذوی القربی، ولا حرج علی من ولیه ان أكل أو آكل أو اشتری رقیقا منه."

(۲) فوائد کے لئے دیکھئے: ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۵/۴۰۳)

تشریف لے جاتے اور اس کا پانی نوش فرماتے۔ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون. [1]

تم ہرگز نیکی کامل حاصل نہیں کرسکو گے یہاں تک کہ تم اپنی محبوب چیزوں میں سے کچھ خرچ نہ کرو۔

تو حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی محبوب چیزوں پر نظر ڈالی اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کے سامنے درخواستیں پیش کی جانے لگیں۔ حضرت ابوطلحہؓ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں: ''لن تنالوا البر حتی تنفقوا مماتحبون'' میرے تمام اموال میں بیرحاء مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، آپ جس کام میں پسند فرمائیں اس کو صرف فرمادیں۔ آپ نے خوش ہوکر فرمایا: واہ واہ! وہ تو بڑے منافع والا باغ ہے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ اس کو اپنے اقرباء میں تقسیم فرمادیں۔ حضرت ابوطلحہؓ نے آنحضرت ﷺ کے اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے اقرباء اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کردیا۔ [2]

وقف کے اس واقعہ سے بھی بہت سے فوائد معلوم ہوئے ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں انہیں تفصیلاً ذکر کیا ہے، ہم بھی متعلقہ مقامات پر انہیں ذکر کریں گے۔ [3]

---

(۱) القرآن (۹۲/۳)

(۲) دیکھئے: البخاری، الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاھور دار نشر للکتب الاسلامیة (رقم الحدیث: ۲۷۶۹) ''عن اسحاق بن عبد اللہ بن أبی طلحة أنه سمع أنس بن مالکؓ یقول: کان أبو طلحة أکثر الأنصار بالمدینة مالا من نخل، وکان أحب ماله الیه بیر حاء مستقبلة المسجد، وکان النبی ﷺ یدخلها و یشرب من ماء فیها طیب. قال أنس: فلما نزلت ''لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون'' قام أبو طلحة فقال: یارسول اللہ ان اللہ یقول: ''لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون'' وان أحب أموالی الی بیر حاء، وانها صدقة للہ، أرجو برها و ذخرها عند اللہ، فضعها حیث أراک اللہ فقال: بخ، ذلک مال رابح، أو رایح ...... شک ابن مسلمة ...... وقد سمعت ماقلت: انی أری أن تجعلها فی الأقربین، قال أبو طلحة: أفعل ذلک یارسول اللہ، فقسمها أبو طلحة فی أقاربه وبنی عمه.''

(۳) دیکھئے: ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاھور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۳۹۸/۵)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا وقف:

بخاری شریف میں روایت ہے:

أن سعد بن عبادةؓ توفيت أمه وهو غائب عنها، فقال: يارسول الله ان أمي توفيت وأنا غائب عنها أينفعها شيء ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم، قال: فاني أشهدك أن حائطي المخراف صدقة عليها. (۱)

حضرت سعد بن عبادہؓ کی والدہ کا انتقال ہوگیا، وہ موجود نہیں تھے۔ جب تشریف لائے تو حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، میں موجود نہیں تھا کیا اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کردوں تو انہیں اس کا فائدہ پہنچے گا؟ حضورﷺ نے فرمایا: ہاں، حضرت سعدؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ جس کا نام ''مخراف'' ہے وہ ان کی طرف سے وقف ہے۔

یہ تو وہ اوقاف تھے جو جناب نبی کریمﷺ کی حیات میں حضراتِ صحابہ کرامؓ نے کئے۔ آپ کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ذیل میں ہم آپ کی وفات کے بعد کئے جانے والے اوقاف میں سے چند اوقاف کا تذکرہ کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وقف:

حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ایک زمین دی تھی جس کا نام ''ینبع'' تھا۔ پھر اس کے آس پاس کی کچھ اور زمین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خرید لی تھی اور اس میں ایک کنواں کھودا تھا۔ لوگ ابھی اس زمین کا کام کر رہے تھے کہ اچانک اس سے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ وافر مقدار میں پانی پھوٹا، لوگ حضرت علیؓ کے پاس گئے اور انہیں خوشخبری سنائی، آپ نے فرمایا: یہ خوشخبری تو وارث کو سناؤ۔ پھر آپ نے وہ زمین فقراء، مساکین، مجاہدین، مسافرین، قریب و بعید پر وقف کردی اور فرمایا کہ یہ وقف میں اس دن کے پیش نظر کر رہا ہوں جس دن بعض چہرے روشن ہوں گے اور بعض سیاہ، اور

---

(۱) البخاری، الامام ابوعبد الله محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (رقم الحديث: ۲۷۵۶)

آخر میں یہ بھی ذکر کیا کہ تا کہ اللہ تعالیٰ میرے چہرہ کو آگ سے پھیر دے اور آگ کو میرے چہرے سے پھیر دے۔[1]

امام خصافؒ نے بھی اسی طرح کی روایت ذکر کی ہے اور اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں اس موقوفہ زمین کی پیداوار ایک ہزار وسق تک پہنچ گئی تھی۔[2]

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا وقف:

امام خصافؒ نے خارجہ بن زید کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

عن زيد بن ثابت قال: لم نرخيرا للميت ولا للحی من هذه الحبس الموقوفة، أما الميت فيجری أجرها عليه وأما الحی فتحبس عليه لاتباع ولا توهب ولا تورث ولا يقدر علی استهلاکها، وان زيد بن ثابت جعل صدقته التی وقفها علی سنة صدقة عمر بن الخطاب وكتب كتابا علی كتابه.[3]

خارجہ بن زید حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ہم نے زندہ اور مردہ کے لئے وقف سے بہتر کوئی چیز نہیں دیکھی، میت کے لئے تو اس لئے کہ اسے اس کا ثواب ہمیشہ ملتا رہتا ہے اور زندہ کے لئے اس اعتبار سے بہتر ہے کہ اس پر چیزیں وقف کردی جاتی ہیں، نہ تو وقف کردہ چیزوں کو بیچا جاسکتا ہے، نہ انہیں ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان میں میراث جاری ہوتی ہے اور وہ اسے ختم بھی نہیں کرسکتا۔ اور زید بن ثابتؓ نے اپنا

---

(۱) البيهقی، احمد بن حسين بن علی البيهقی ۳۸۴ھ ـ ۴۵۸ھ. السنن الكبریٰ، ملتان، نشر السنة (۶/۱۶۰) "عن جعفر بن محمد عن أبيه أن علی بن أبی طالب قطع له عمر بن الخطابؓ ينبع ثم اشتری علی بن أبی طالب الی قطيعة عمرؓ أشياء فحفر فيها عينا، فبينما هم يعملون فيها اذ انفجر عليهم مثل عنق الجزور من الماء، فأتی علی وبشر بذلك. قال بشر الوارث: ثم تصدق بها علی الفقراء والمساكين وفی سبيل الله وابن السبيل القريب والبعيد وفی السلم وفی الحرب، ليوم تبيض وجوه وتسود وجوه، ليصرف الله تعالیٰ بها وجهی عن النار ويصرف النار عن وجهی."

(۲) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمر والشيبانی المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۶)

(۳) حوالہ بالا

وقف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے وقف کے طریقہ پر کیا تھا اور اس کی دستاویز بھی دستاویز فاروقی کی طرح لکھی تھی۔

بیہقی کی روایت میں ہے کہ آپ نے اپنے دو گھر وقف فرمائے تھے۔ ایک بقیع کے پاس تھا اور دوسرا مسجدِ نبوی کے قریب تھا، آپ اپنی وفات تک اس موقوفہ گھر میں قیام پذیر رہے جو مسجد نبوی کے قریب تھا۔[1]

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا وقف:

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اپنا گھر اپنی اولاد پر وقف فرما دیا تھا اس طرح سے کہ اسے نہ بیچا جا سکے اور نہ اس میں میراث جاری ہو، اور اس میں یہ بھی صراحت تھی:

أن للمردودة من بناته أن تسكن غير مضرة ولا مضار بها، فان استغنت بزوج فلاشيء لها. [2]

کہ میری بیٹیوں میں جو مطلقہ یا بیوہ ہو جائے وہ اس گھر میں رہے گی، نہ اسے تکلیف پہنچائی جائے گی اور نہ وہ کسی کو ضرر پہنچائے گی۔ اور اگر وہ دوسری شادی کر کے اس سے مستغنی ہو جائے تو پھر اسے اس میں رہنے کا حق نہیں۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وقف:

امام بیہقی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وقف کا تفصیلی قصہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جو اگرچہ کچھ مفصل ہے لیکن بہت سے نکات پر مشتمل ہے، اس لئے اسے یہاں نقل کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں توسیع کا ارادہ فرمایا تو اس توسیع میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کا گھر بھی آرہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اسے

---

(۱) دیکھئے: البیھقی، احمد بن حسین بن علی البیھقی ۳۸۴ھ - ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۱/۲) "حدثنی مالک أن زید بن ثابتؓ کان قد حبس دارہ التی فی البقیع و دارہ التی عند المسجد، و کتب فی کتاب حبسه علی ماحبس عمر بن الخطابؓ. قال مالک: وحبس زید بن ثابت عندی قال: وکان زید بن ثابتؓ یسکن منزلا فی دارہ التی حبس عند المسجد حتی مات فیه، وقد کان عبد الله بن عمرؓ فعل ذلک حبس دارہ و کان یسکن مسکنا فیها."

(۲) الدارمی، عبد الله بن عبد الرحمن الدارمی. سنن الدارمی، دمشق، دار القلم ۱۹۹۶م (۸۸۵/۲ رقم الحدیث: ۳۱۸۲) وکذا فی السنن الکبری للبیھقی (۱۶۱/۲)

بھی مسجدِ نبوی میں داخل کر دیں اور حضرت عباسؓ کو اس کا کچھ عوض دیدیں لیکن انہوں نے یہ گھر دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ تو مجھے جناب نبی کریم ﷺ نے دیا تھا۔ دونوں حضرات میں اختلاف ہوا، چنانچہ دونوں نے حضرت ابی بن کعبؓ کو فیصلہ کے لئے منتخب کیا اور ان کے گھر پر حاضر ہوئے، حضرت ابی بن کعبؓ کو ''سید المسلمین'' کہا جاتا تھا، حضرت ابی بن کعبؓ نے دونوں کے لئے تکیہ منگوائے اور دونوں تکیہ لگا کر آپ کے سامنے بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ جو چاہتے تھے وہ انہوں نے ذکر کیا، حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ یہ تو حضور ﷺ نے مجھے دیا تھا۔ (دونوں فریقوں کی بات سن کر حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا قصہ سنایا) اور فرمایا کہ اللہ عز وجل نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرا کوئی گھر بناؤ، داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ یارب کہاں بناؤں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جہاں فرشتہ کو تلوار سونتے ہوئے کھڑا دیکھو وہاں بناؤ، حضرت داؤد علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ فرشتہ ایک چٹان پر کھڑا ہے، وہ جگہ بنی اسرائیل کے ایک لڑکے کی تھی جہاں وہ غلہ وغیرہ رکھا کرتا تھا اور اسے گاہتا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس کے پاس گئے اور کہا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس جگہ میں اللہ کا گھر بناؤں، لڑکے نے عرض کیا کہ کیا اللہ جل شانہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ میری رضامندی کے بغیر یہ جگہ مجھ سے لے لیں؟ داؤد علیہ السلام نے فرمایا نہیں، اتنے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میں نے تمہیں زمین کے سارے خزانے دئے ہوئے ہیں، تم اس لڑکے کو کچھ دے کر راضی کرلو، حضرت داؤد علیہ السلام دوبارہ اس لڑکے کے پاس آئے اور فرمایا کہ مجھے تمہاری خوشی کی رعایت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تم اس زمین کے بدلہ سونے کی ایک ڈھیری لے لو، لڑکے نے کہا کہ میں نے قبول کیا لیکن یہ بتلائیں کہ یہ زمین زیادہ بہتر ہے یا ایک ڈھیری سونا؟ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ زمین زیادہ بہتر ہے، اس نے کہا کہ پھر تو آپ مجھے راضی کیجئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ چلو اس کے بدلہ تمہارے لئے تین ڈھیری سونا ہے، لیکن وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوا اور برابر حضرت داؤد علیہ السلام سے زیادہ کا مطالبہ کرتا رہا یہاں تک کہ اس زمین کے بدلہ نو ڈھیری سونے پر راضی ہوا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے جب یہ قصہ ختم کیا تو حضرت عباسؓ نے فرمایا: خدا کی قسم! میں اس مکان کے بدلہ کچھ نہیں لوں گا، میں نے اسے مسلمانوں کی جماعت پر وقف کیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے قبول

کیا اور مسجد میں داخل فرمادیا۔ (۱)

یہ تو حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے چند اوقاف کا ذکر تھا، ورنہ اگر ان کے تمام اوقاف کا احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حضرت جابرؓ تو فرماتے ہیں:

فما أعلم أحدا كان له مال من المهاجرين والأنصار الا حبس مالا من ماله صدقة موبدة لاتشترى أبدا ولا توهب ولا تورث. (۲)

میرے علم میں نہیں ہے کہ حضراتِ مہاجرین اور انصار میں سے کسی کے پاس مال ہو اور اس نے اپنا مال اس طرح وقف نہ کیا ہو کہ اسے نہ بیچا جا سکے، نہ ہبہ کیا جا سکے اور نہ اس میں میراث جاری ہو سکے۔

قدامہ ابن موسیٰ محمد بن عبدالرحمٰن بن سعد بن زرارہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

ما أعلم أحدا من أصحاب رسول الله ﷺ من أهل بدر من المهاجرين والأنصار الا وقد وقف من ماله حبسا لايشترى ولا يورث ولا يوهب حتى يرث الله الأرض ومن عليها. (۳)

---

(۱) دیکھئے: البیھقی، احمد بن حسین بن علی البیھقی ۳۸۴ھ - ۴۵۸ھ، السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۸/۶) "عن أبي هريرةؓ قال: لما أراد عمر بن الخطاب أن يزيد في مسجد رسول الله ﷺ وقعت زيادته على دار العباس بن عبد المطلب، فأراد عمر أن يدخلها في مسجد رسول الله و يعوضه منها، فأبى وقال: قطيعة رسول الله ﷺ، واختلفا فجعلا بينهما أبي بن كعب فأتياه في منزله وكان يسمى سيد المسلمين، فأمر لهما بوسادة فألقيت لهما فجلسا عليهما بين يديه، فذكر عمر ماأراد وذكر العباس قطيعة رسول الله ﷺ، فقال أبي: ان الله عزوجل أمر عبده ونبيه داؤد عليه السلام أن يبنى له بيتا، قال: أي رب! وأين هذا البيت؟ قال: حيث ترى الملك شاهراً سيفه، فرآه على الصخرة فاذا ماهناك يومئذ اندر لغلام من بني اسرائيل. فأتاه داؤد فقال: اني قد أمرت أن أبني هذا المكان بيتا لله عزوجل، فقال له الفتى: الله أمرك أن تأخذها مني بغير رضاي؟ قال: لا، فأوحى الله الى داؤد عليه السلام: اني جعلت في يدك خزائن الأرض فأرضه، فأتاه داؤد فقال: اني قد أمرت برضاك، فلك بها قنطار من ذهب، قال: قد قبلت ياداؤد، وهي خير أم القنطار؟ قال: بل هي خير، قال: فأرضني، قال: فلك بها ثلاث قناطير، قال: فلم يزل يشدد على داؤد حتى رضي منه بتسع قناطير. قال العباس: اللهم لا آخذ لها ثوابا وقد تصدقت بها على جماعة المسلمين، فقبلها عمر فأدخلها في مسجد رسول الله ﷺ."

(۲) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمر الشيباني المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بيروت، دار الکتب العلميه ۱۹۹۹م (۸)

(۳) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمر الشيباني المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بيروت، دار الکتب العلميه ۱۹۹۹م (۸)

میرے علم میں نہیں ہے کہ حضور ﷺ کے بدری مہاجرین اور انصاری صحابہ میں سے کوئی ایسا ہو جس نے اپنا مال اس طرح وقف نہ کیا ہو کہ اسے نہ بیچا جا سکے، نہ اس میں میراث جاری ہو اور نہ اسے ہبہ کیا جا سکے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

امام بیہقیؒ نے معرفۃ السنن الآثار میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضور ﷺ کے صرف انصاری صحابہ میں سے اسی حضرات نے اپنی جائیدادیں وقف کیں۔(۱)

علامہ رملیؒ نے حضرت جابرؓ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ حضراتِ صحابہ میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے ذراسی بھی استطاعت ہوا اور اس نے وقف نہ کیا ہو۔(۲)

امام خصافؒ نے حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابی اروی الدوسیؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے اوقاف کا اپنی کتاب میں سند کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن طوالت کے پیش نظر ہم انہیں یہاں ذکر نہیں کر رہے۔

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں بھی کچھ صحابہ کرام نے اپنی جائیدادیں وغیرہ وقف کیں اور آپ کی وفات کے بعد تو وقف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ خلافتِ راشدہ کے تیس سالہ دور میں جہاں انفرادی اوقاف کثرت سے وجود میں آئے وہاں حکومتی سطح پر بھی مذہبی اوقاف اور رفاہی اوقاف کا سلسلہ جاری رہا، صرف حضرت عمرؓ نے سرکاری سطح پر چار ہزار مساجد تعمیر کروائیں(۳) جن میں اضافہ کا سلسلہ دیگر خلفاء نے آپ کے بعد جاری رکھا۔ غرضیکہ جس نظام وقف کی بنیاد جناب نبی کریم ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں رکھی تھی، اسے وسعت اور عروج حضراتِ خلفائے راشدین کے دور میں ملا، اور ایک وسیع البنیاد نظامِ وقف وجود میں آگیا۔

---

(۱) دیکھئے: البیهقی، احمد بن حسین بن علی البیهقی ۳۸۴ھ - ۴۵۸ھ. معرفة السنن والآثار، قاهرة، دار الوفاء (۴۱/۹)

(۲) الرملی، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدین الرملی. نهایة المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی. (۳۵۶/۵)

(۳) عارف، ڈاکٹر محمود الحسن عارف۔ اسلام کا قانون وقف مع تاریخ مسلم اوقاف، لاہور، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (۲۲۳)

تاریخ اسلام کا سب سے پہلا وقف

اسلام میں سب سے پہلا وقف کس کا ہے؟ اس میں حضراتِ محدثین اور مورخین کا کافی اختلاف ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اسلام میں سب سے پہلے وقف کیا جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے سب سے پہلے مخیریق کے وصیت کردہ باغات وقف کئے۔

حافظ ابن حجرؒ فریقین کا اختلاف ذکر کرتے ہوئے فتح الباری میں فرماتے ہیں:

وحديث عمر هذا أصل فى مشروعية الوقف، قال أحمد حدثنا...... عن نافع عن ابن عمر قال: أول صدقة۔ أى موقوفة۔ كانت فى الاسلام صدقة عمر، وروى عمر بن شبة عن عمرو بن سعد بن معاذ قال: سألنا عن أول حبس فى الاسلام، فقال المهاجرون: صدقة عمر، وقال الأنصار: صدقة رسول الله ﷺ وفى اسناده الواقدى، وفى مغازى الواقدى أن أول صدقة موقوفة كانت فى الاسلام أراضى مخيريق بالمعجمة مصغر التى أوصى بها الى النبى ﷺ فوقفها النبى ﷺ. (۱)

حضرت عمرؓ کا یہ وقف کا واقعہ وقف کی مشروعیت میں اصل ہے۔ امام احمدؒ نے نافع کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا وقف حضرت عمرؓ کا ہے اور عمر بن شبہ نے عمر بن سعد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم نے اسلام کے سب سے پہلے وقف کے بارے میں دریافت کیا، حضرات مہاجرین نے فرمایا: حضرت عمرؓ کا وقف، اور حضراتِ انصار نے فرمایا: جناب نبی کریم ﷺ کا وقف، (اس کی سند میں واقدی ہے) مغازی واقدی میں ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا وقف مخیریق کی زمینیں

---

(۱) ابن حجر، احمد بن على بن حجر العسقلانى. فتح البارى، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۵/۴۰۲)

ہیں، جن کی اس نے جناب کریم ﷺ کے لئے وصیت کی تھی اور حضور ﷺ نے انہیں وقف فرمایا دیا تھا۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا لیکن علامہ خصافؒ نے مسور رفاعہ کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں صراحت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ثمغ ۷ھ میں حضور ﷺ کے خیبر سے واپس آنے کے بعد وقف فرمایا جبکہ حضور ﷺ کو مخیریق کی زمینیں غزوہ احد کے بعد مل گئی تھیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ حضور ﷺ نے جلد ہی وقف فرمادیا ہوگا، اس لئے راجح یہی ہے کہ حضور ﷺ کا وقف حضرت عمرؓ کے وقف سے مقدم ہے۔

مسور ابن رفاعہ ابن کعب سے روایت کرتے ہیں:

قال: أول صدقة كانت فى الاسلام وقف رسول الله ﷺ أمواله، فقلت لابن كعب: فان الناس يقولون: صدقة عمر بن الخطاب أول؟ فقال: قتل مخيريق بأحد على رأس اثنين وثلاثين شهرا من مهاجر رسول الله ﷺ وأوصى: ان أصبت فأموالى لرسول الله ﷺ فقبضها رسول الله ﷺ وتصدق بها، وهذا قبل ماتصدق به عمرو انما تصدق عمر بثمغ حين رجع رسول الله ﷺ من خيبر سنة سبع من الهجرة.(۱)

ابن کعب نے فرمایا کہ اسلام میں سب سے پہلا وقف حضور اکرم ﷺ کا ہے، مسور بن رفاعہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا کہ لوگ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کا وقف سب سے پہلا ہے، ابن کعب نے فرمایا: مخیریق احد میں ہجرت کے بتیسویں مہینے میں قتل ہوا اور اس نے یہ وصیت کی تھی کہ اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو میرا سارا مال محمد کا ہے، چنانچہ حضور ﷺ نے وہ سارا مال لے لیا اور اسے وقف فرمادیا اور یہ حضرت عمرؓ کے وقف سے پہلے تھا، حضرت عمرؓ نے تو "ثمغ"، حضور کی خیبر سے واپسی پر ۷ھ میں وقف کیا۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے ایک تیسری رائے اختیار فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کا سب سے پہلا وقف

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلمية ۱۹۹۹م (۷) نیز دیکھئے: وفاء الوفاء للسمهودى (۱۱۶۶/۴)

نہ تو حضور ﷺ کا ہے اور نہ ہی حضرت عمرؓ کا، بلکہ سب سے پہلا وقف حضرت عثمان غنیؓ کا وقف کردہ بیر رومہ ہے جسے آپ نے ابتدائے ہجرت میں خرید کر وقف فرمادیا تھا۔[1] اس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

راجح رائے:

احقر کے خیال میں اسلام کا سب سے پہلا وقف ''مسجد قبا'' ہے، کیونکہ حضور ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو ابتداء میں آپ نے کچھ ایام ''قباء'' میں قیام فرمایا اور وہیں ''مسجدِ قباء'' تعمیر فرمائی (اس کا تفصیلی ذکر پیچھے ہو چکا ہے) یہ اسلام کی سب سے پہلی باقاعدہ مسجد ہے اور سب سے پہلا وقف ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر ''مسجدِ نبوی'' ہے جس کی تعمیر آپ نے اس زمین پر کی جہاں آپ کی اونٹنی بیٹھی تھی یہ جگہ دو یتیم لڑکوں کی تھی، ان سے آپ نے یہ خرید کر اس پر مسجد تعمیر فرمائی۔ تیسرے نمبر پر کہا جا سکتا ہے کہ ''بیر رومہ'' ہے۔

فتح الباری اور خصاف کے حوالہ سے گذشتہ صفحات میں ہم نے جو بحث ذکر کی ہے وہ حضور ﷺ کے مخیریق کی وصیت کردہ زمینوں کے وقف اور حضرت عمرؓ کے وقف میں باہمی تقابل کے اعتبار سے تو ہوسکتی ہے کہ ان میں سے کونسا وقف مقدم تھا اور کونسا موخر، لیکن علی الاطلاق ان میں سے کسی کو تاریخ اسلام کا سب سے پہلا وقف قرار دینا مشکل ہے۔

ان مختلف اقوال میں تطبیق کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یوں کہا جائے کہ مساجد کی صورت میں تاریخ کا سب سے پہلا وقف ''مسجدِ قباء'' ہے، اور کنوؤں کی صورت میں سب سے پہلا وقف ''بیر رومہ'' ہے، اور اراضی و باغات کی صورت میں سب سے پہلا وقف راجح قول کے مطابق جناب نبی کریم ﷺ کا مخیریق کی وصیت کردہ زمینوں کا وقف کرنا ہے۔

اس طرح ان مختلف اقوال میں تطبیق ہوسکتی ہے، لیکن بہرحال ان نسبتوں سے قطع نظر تاریخ اسلام کا سب سے پہلا وقف ''مسجدِ قباء'' ہی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم

---

(۱) دیکھئے: عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۱۲۰/۱۳)

وقف کا حکم

وقف کے حکم میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کی آراء مختلف ہیں، ذیل میں ہم ان شاء اللہ وہ آراء اور ان کے ماخذ ذکر کر کے ان کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف کا حکم:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتی بلکہ اسی کی ملکیت میں رہتی ہے اور وقف لازم بھی نہیں ہوتا واقف چاہے تو اس چیز کو بیچ سکتا ہے، کسی کو بطور ہدیہ دے بھی سکتا ہے، اسی طرح وہ دیگر تصرفات بھی کر سکتا ہے اور واقف کے انتقال کے بعد موقوفہ چیز اس کے ورثاء میں دیگر ترکہ کے ساتھ تقسیم ہوگی، البتہ جب تک موقوفہ چیز موجود ہے اس کے منافع کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

هو فی الشرع عند أبی حنیفة: حبس العین علی ملک الواقف والتصدق بالمنفعة بمنزلة العاریة. (۱)

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شرعاً وقف کسی چیز کو واقف کی ملکیت میں رکھتے ہوئے اس کی منفعت صدقہ کرنے کا نام ہے، اس کی مثال رعایت کی ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

فعنده یجوز جواز الاعارة فتصرف منفعته الی جهة الوقف مع بقاء العین علی حکم ملک الواقف، ولو رجع عنه حال حیاته جاز مع الکراهة ویورث عنه. (۲)

---

(۱) المرغینانی، برهان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۴۱۹)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۳۸)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف عاریت کی طرح جائز ہے اس کے منافع جہت وقف میں خرچ کیے جائیں گے جبکہ وقف کی ذات واقف کی ملکیت ہی میں باقی رہے گی، اور اگر اپنی زندگی میں واقف اس سے رجوع کرنا چاہے تو یہ کراہت کے ساتھ جائز ہے اور اس میں واقف کی میراث بھی جاری ہوگی۔

الاسعاف میں ہے:

عند أبي حنيفة رحمة الله يكون نذراً بالصدقة بغلة الأرض ويبقى ملكه على حاله فاذا مات تورث عنه.[1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وقف درحقیقت موقوفہ زمین کی آمدنی صدقہ کرنے کی نذر ہے اور موقوفہ زمین حسب سابق واقف کی ملکیت ہی میں باقی رہتی ہے، اور جب واقف کا انتقال ہوجائے تو اس کی میراث بھی اس میں جاری ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے مطابق وقف سے پہلے اور وقف کے بعد موقوفہ چیز کے حکم میں فرق:

مذکورہ بالا تفصیل پر بظاہر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ وقف کرنے سے پہلے بھی موقوفہ چیز واقف کی ملکیت میں تھی اور وہ اس میں تمام تصرفات کرسکتا تھا، اگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف کے بعد بھی واقف کی ملکیت برقرار ہے اور وہ اس میں تمام تصرفات کرسکتا ہے تو وقف کا فائدہ کیا ہوا؟

اس کا جواب علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مذکورہ موقف کے مطابق بھی وقف کرنے سے بہت سے فوائد ہیں جو وقف سے پہلے حاصل نہیں ہوسکتے تھے مثلاً وقف کرنے کے بعد عدالت کے ذریعہ اس کے لزوم کا فیصلہ کروایا جاسکتا ہے کہ کسی شخص نے وقف کردیا اور اس کا متولی بھی مقرر کردیا اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثہ متولی سے مطالبہ کریں کہ اسے میراث میں تقسیم کیا جائے، جیسا کہ امام صاحب کا مسلک ہے تو متولی قاضی کی عدالت میں یہ مسئلہ لے جاسکتا ہے اور صاحبین کے مذہب کے مطابق وقف کے لزوم کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ اب اگر قاضی نے مفتی بہٖ قول یعنی صاحبین کے قول کے

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر مكتبه، هنديه، ۱۳۲۰ه (۱۱)

مطابق لزوم کا فیصلہ کردیا تو امام صاحبؒ کے مذہب کے مطابق بھی وقف لازم ہوجائے گا کیونکہ حکم قاضی مسائل مجتہد فیہا میں رافع خلاف ہوا کرتا ہے جیسا کہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: احکام الاوقاف لمصطفیٰ الزرقاء صفحہ ۸۹، کتاب الوقف للشیخ عبدالجلیل عبدالرحمٰن عشوب صفحہ ۳۷ مطبوعہ المکتبۃ المکیۃ) وقف کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کرانا ممکن نہیں تھا، اسی طرح وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز سے فقیر کے لئے استفادہ کرنا جائز ہے حالانکہ وقف سے پہلے جائز نہیں تھا، وقف کرنے سے واقف کو ثواب ملتا ہے، وقف سے پہلے ثواب نہیں ملتا تھا، اسی طرح وقف کرنے کے بعد متولی وغیرہ کو مقرر کرنا درست ہے جبکہ وقف سے پہلے اس کا تصور نہیں ہوسکتا تھا۔(۱)

اس سے بھی آگے بڑھ کر صاحبِ اسعاف علامہ برہان الدین طرابلسی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ فرمایا ہے کہ وقف کرنے کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جب تک وہ چیز موجود ہے واقف پر اس کے منافع صدقہ کرنا واجب ہے، حالانکہ وقف سے پہلے ان منافع کا صدقہ کرنا واجب نہیں تھا اور بلاکراہت ان سے انتفاع جائز تھا۔(۲)

ان فوائد کے ہوتے ہوئے یہ اعتراض بے معنی ہوجاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے ذکر کردہ موقف کے مطابق وقف کا کوئی فائدہ نہیں۔

حضرت امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک:

امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے، اور واقف کو اس میں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہیں رہتا، وہ نہ اس سے رجوع کرسکتا ہے اور نہ ہی اسے بیچ سکتا ہے۔

اسی طرح واقف کے انتقال کے بعد اس میں اس کی میراث بھی جاری نہیں ہوگی، علامہ بابرتی رحمۃ اللہ علیہ عنایہ شرح ہدایہ میں صاحبین رحمہما اللہ کا مسلک تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۱۹۴/۵) "وفیه نظر لأن قوله لم یفد الوقف شیئاً غیر صحیح، لأنه یصح الحکم به ولو لا صحة الوقف لم یصح الحکم به ویحل للفقیر أن یأکل منه ولولا صحته لم یحل و یثاب الواقف علیه ولو لا صحته ماأثیب فکیف یقال لم یفد شیئاً وفی البزازیة: معنی الجواز جواز صرف الغلة الی تلک الجهة ویتبع شرطه ویصح نصب المتولی علیه فاذا ثبت هذه الاحکام کیف یقال لم یفد شیئاً."

(۲) دیکھئے: الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه، ۱۳۲۰ھ (۱۲) نیز دیکھئے: رد المحتار (۳۳۸/۴)

وعندهما هو حبس العين على حكم ملك الله تعالىٰ فيزول ملك الواقف عنه الى الله تعالىٰ على وجهٍ تعود المنفعة الى العباد فيلزم ولا يباع ولا يورث. (۱)

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک وقف یہ ہے کہ موقوفہ چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں حکماً محبوس کردیا جائے اس طریقہ سے کہ واقف کی ملکیت اس سے زائل ہوجائے اور وہ موقوفہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوجائے، اس کے منافع بندوں کو ملتے رہیں، پس (واقف کی ملکیت زائل ہونے کی وجہ سے) وقف لازم ہوجاتا ہے اسے نہ بیچا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں میراث جاری ہوسکتی ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الطرف الثاني في الاحكام المعنوية، فمنها اللزوم في الحال سواء اضافه الى مابعد الموت أم لم يضفه و سواء سلمه أم لم يسلمه، قضى به قاض أم لا ...... واذا لزم امتنعت التصرفات القادحة في غرض الواقف وفي شرطه و سواء في امتناعها الواقف وغيره، وأما رقبة الوقف فالمذهب وهو نصه في المختصر هنا أن الملك فيها انتقل الى الله تعالىٰ. (۲)

وقف کے معنوی احکام میں سے ایک یہ ہے کہ وقف فی الحال لازم ہوجاتا ہے، چاہے اسے موت کے بعد کی طرف منسوب کیا جائے یا نہیں، متولی کے حوالہ کیا جائے یا نہیں اور کوئی قاضی اس کے لزوم کا فیصلہ کرے یا نہیں ......اور جب وقف لازم ہوگیا تو اس میں وہ تمام تصرفات ممنوع ہوں گے جو واقف کی اغراض اور شرائط کے منافی ہوں یہ تصرفات واقف کرے یا غیر واقف، اور جہاں تک رقبہ وقف کی ملکیت کا تعلق ہے تو اس میں اصل مذہب یہی ہے کہ ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔

علامہ مناوی ؒ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) البابرتي، محمد بن محمود البابرتي. العنايه بهامش فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۱۹/۵)

(۲) النووي، يحيىٰ بن شرف النووي. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۴۲/۵)

وقد سبق أن حكمه اللزوم حالاً هبة على معين أو جهة وان لم يحكم به قاض ...... ويمنع الواقف من تصرف يقدح في الوقف أو شرطه وينتقل ملك رقبة الموقوف على جهة أو معين الى الله تعالىٰ أى ينفك عن اختصاص الأدمى. (۱)

پہلے گذر چکا ہے کہ وقف کا حکم یہ ہے کہ وہ کسی معین شخصیت یا کسی جہت پر ہبہ ہونے کی حیثیت سے فوراً لازم ہوجاتا ہے، اگر چہ قاضی اس کے لزوم کا فیصلہ نہ کرے اور واقف کے لئے ایسا تصرف ممنوع ہوجاتا ہے جو وقف کے لئے نقصان دہ ہو یا واقف کی شرط کے خلاف ہو اور شئی موقوف کی ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے خواہ وہ کسی معین شخص پر وقف ہو یا کسی جہت پر وقف ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف ملکیت منتقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی مملوکہ چیز پر جو خاص حقوق حاصل ہیں وہ حقوق اب باقی نہیں رہتے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کا حکم یہ ہے کہ وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز واقف کی ملکیت ہی میں رہتی ہے البتہ اسے اس میں ملکیتی تصرفات کرنے کا اختیار نہیں رہتا وہ اسے بیچ سکتا ہے نہ ہبہ کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کے انتقال کے بعد اس میں اس کی میراث جاری ہوگی۔

علامہ صاوی رحمہ اللہ نے الشرح الصغیر کے حاشیہ میں مدونہ کے حوالہ سے امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ:

لايباع العقار المحبس ولو خرب، وبقاء أحباس السلف دائرة دليل على منع ذلك. (۲)

موقوفہ زمین بیچی نہیں جاسکتی اگر چہ وہ ویران کیوں نہ ہوگئی ہو، اسلاف کے اوقاف کا مسلسل باقی رہنا موقوفہ زمین کے بیچنے کی ممانعت پر دلیل ہے۔

علامہ دردیر رحمہ اللہ موقوفہ چیز کی ملکیت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

---

(۱) المناوی، عبد الرؤف بن تاج العارفين المناوی الشافعی. تيسير الوقوف، مكه مكرمه، مكتبه نزار المصطفى الباز الطبعة الاولىٰ. ۱۹۹۸م (۱۲۶/۱)

(۲) الصاوی، احمد بن محمد الصاوی المالكی. حاشية الصاوی على الشرح الصغير، مصر، دار المعارف (۱۲۶/۴)

وملک الذات أی ذات الوقف فقط للواقف. (۱)

موقوفہ چیز کی ذات واقف ہی کی ملکیت میں رہتی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر موقوف علیہ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے اور وقف کرتے ہی وقف لازم ہوجاتا ہے، واقف اس میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتا نہ اسے بیچ سکتا ہے اور نہ ہی واقف کے مرنے کے بعد اس میں اس کی میراث جاری ہوگی۔

ابن مفلح حنبلی رحمہ اللہ المبدع فی شرح المقنع میں فرماتے ہیں:

لأن الوقف يزول به ملك الواقف ويلزم بمجرد اللفظ لحديث عمر السابق ولأنه يمنع البيع والهبة ...... فصل: ويملك الموقوف عليه الوقف فی ظاهر المذهب لأنه سبب يزيل التصرف فی الرقبة. (۲)

وقف میں محض الفاظ وقف کہنے سے واقف کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے اور وقف لازم ہوجاتا ہے، حدیث عمرؓ کی وجہ سے، اور یہ ایسا تبرع ہے جو بیع اور ہبہ کو ممنوع قرار دیدیتا ہے...... موقوف علیہ موقوفہ چیز کا مالک بن جاتا ہے ظاہر مذہب میں، کیونکہ وقف ایسا سبب ہے جو رقبہ میں تصرف کو زائل کردیتا ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

ان الوقف اذا صح زال به ملك الواقف عنه فی الصحيح من المذهب. (۳)

وقف جب درست ہوجائے تو مذہب حنبلی میں صحیح بات یہ ہے کہ اس سے واقف کی ملکیت زائل ہوجاتی ہے۔

---

(۱) دیکھئے: الشرح الصغير (۱۳۲/۴) الخرشی علی مختصر سيدی خليل (۷۸/۷) شرح منح الجليل (۳۴/۴) فتح القدير (۴۱۹/۵) مواهب الجليل للحطاب (۱۸/۶ ـ ۴۵)

(۲) ابن مفلح، ابو اسحاق برهان الدين ابراهيم بن محمد بن عبد الله بن مفلح ۸۱۶ھ ـ ۸۸۴ھ. المبدع فی شرح المقنع، بيروت، المكتب الاسلامی (۳۲۸/۵)

(۳) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۰۷/۸)

آگے مزید تحریر فرماتے ہیں:

وينتقل الملك في الموقوف الى الموقوف عليهم في ظاهر المذهب قـال احمد: اذا وقف داره على ولد أخيه صارت لهم، وهذا يدل على انهم ملكوه. (۱)

شئ موقوف کی ملکیت موقوف علیہم کی طرف منتقل ہوجاتی ہے ظاہر مذہب میں، امام احمدؒ نے فرمایا کہ اگر کسی نے اپنا گھر اپنے بھائی کی اولاد کے لئے وقف کیا تو یہ گھر ان کا ہوجائے گا، امام کی یہ عبارت اس پر دلالت کررہی ہے کہ شئ موقوف کی ملکیت وقف کرنے کے بعد موقوف علیہم کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔

اور اگر موقوف علیہ غیر محصور ہوں جیسے فقراء کے لئے، مساکین کے لئے یا طلبہ علم دین کے لئے وقف کیا یا جس جہت پر وقف کیا اس میں مالک بننے کی صلاحیت نہ ہو جیسے مساجد، سقایات وغیرہ تو ایسی صورت میں فقہاء حنابلہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف کسی متعین شخص کی ملکیت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ اجتماعی طور پر فقراء، مساکین اور طلبہ علم دین کی ملکیت ہوگا، اسی طرح مساجد اور سقایات کی صورت میں چونکہ ان سے تمام مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے کا حق ہے اس لئے یہ اجتماعی طور پر تمام مسلمانوں کی ملکیت ہوں گے اور جیسے مسلمانوں کی اجتماعی املاک کا انتظام وانصرام حکومت کی ذمہ داری ہے اسی طرح ان کے انتظام کے لئے اگر واقف نے کسی کو متولی مقرر نہیں کیا تو ان کا انتظام بھی حکومت ہی کی ذمہ داری ہوگا۔

علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فـلايصح (الوقف) على من لايملك. فان قيل قد جوزتم الوقف على الـمسـاجد والسقايات وأشباهها وهي لاتملك، قلنا: الوقف هناك على المسلمين الا انه عين في نفع خاص لهم. (۲)

آگے مزید لکھتے ہیں:

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱. ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۸/۸)

(۲) حواله بالا (۱۸۸/۸)

فـان لم يجعله (النظر) لأحد أو جعله لانسان فمات نظر فيه الموقوف عـليـه لأنـه مـلـكـه و نفعه له فكان نظره اليه كملكه المطلق ...... و أما الـوقف عـلـى الـمسـاكـين والـمسـاجـد ونحوها أو علىٰ من لايمكن حصرهم واستيعابهم فالنظر فيه الى الحاكم لأنه ليس له مالك متعين ينظر فيه.(۱)

منشاءِ اختلاف:

وقف کے حکم سے متعلق فقہاء کرام کی ذکر کردہ آراء اور ان کے مسالک میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف کے حکم میں ان کا اختلاف درحقیقت دو اصولی باتوں پر مبنی ہے:

نمبر۱: وقف کرنے سے وقف لازم ہو جاتا ہے یا نہیں؟

نمبر۲: موقوفہ چیز پر ملکیت کس کی ہوتی ہے؟

وقف کے حکم کے بارے میں راجح قول تک پہنچنے کے لئے پہلے ان دونوں امور سے متعلق فقہاء کرام رحمہم اللہ کے اقوال اور ان کے دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

---

(۱) المغنی ج۸ صفحہ۲۳۶ وکذا فی کشاف القناع للبهوتی ج۴ صفحہ۲۹۷

لزومِ وقف

وقف کرنے سے وقف لازم ہوتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرام کی دو آراء ہیں:

لزومِ وقف کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف:

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عام حالات میں وقف لازم نہیں ہوتا واقف کو اس میں تصرف کا اختیار رہتا ہے، البتہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں وقف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی لازم ہو جاتا ہے۔(۱)

ان تین صورتوں کی تفصیل مشروعیتِ وقف کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے ذیل میں بڑی وضاحت سے گذر چکی ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لزومِ وقف کے بارے میں جمہور فقہاء کا موقف:

جمہور فقہاء امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک وقف کرنے سے وقف لازم ہو جاتا ہے، اور اس میں واقف کو ملکیتی تصرفات کرنے کا اختیار نہیں رہتا وہ نہ تو اس سے رجوع کرسکتا ہے اور نہ ہی اسے بیچ سکتا ہے، اس کے انتقال کے بعد اس میں اس کی میراث بھی جاری نہیں ہوگی۔ (ہر ایک کے مذہب سے متعلق فقہی عبارات گذشتہ صفحات میں نقل کردی گئی ہیں)

عدمِ لزوم پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل:

وقف کے لازم نہ ہونے پر بہت سے دلائل پیش کئے گئے ہیں، ذیل میں ان میں سے چیدہ چیدہ دلائل نقل کئے جاتے ہیں:

---

(۱) دیکھئے: السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دار المعرفة ۱۹۹۳م (۱۲/۲۷)

دلیل نمبر ۱:

سنن بیہقی میں بکر بن حازم کی مرسل روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

عن عبد الله بن زيد بن عبد ربه الذى أرى النداء انه أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يارسول الله حائطى هذا صدقة وهو الى الله و رسوله، فجاء أبواه فقال يارسول الله كان قوام عيشنا فرده رسول الله صلى الله عليه وسلم اليهما ثم ماتا فورثهما ابنهما بعد. (۱)

حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ (اذان کا خواب دیکھنے والے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میرا یہ باغ اللہ اور اس کے رسول کے لئے صدقہ (وقف) ہے، اس کے بعد ان کے والدین حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ اسی باغ پر ہمارا گذر بسر تھا، آپ نے یہ سن کر وہ باغ حضرت عبداللہ بن زید کے والدین کو لوٹا دیا اور جب ان دونوں کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے ان کے وارث بنے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید کے باغ وقف کرنے کے بعد ان کے والدین کی درخواست پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ واپس کر دیا، اگر وقف کرنے سے وقف لازم ہو جاتا تو حضور باغ واپس نہ فرماتے۔

دلیل نمبر ۲:

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ وقف کرنے کے قصہ میں مذکور ہے کہ جب انہوں نے اپنا باغ وقف کیا تو حضور نے ان سے فرمایا کہ اسے اپنے رشتہ داروں پر وقف کردو، چنانچہ انہوں نے اپنے بہت سے رشتہ داروں پر وہ باغ وقف کر دیا۔ آگے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قال: وكان منهم أبى وحسان، قال وباع حسان حصته منه من معاوية، فقيل له: تبيع صدقة أبى طلحه؟ قال: الا أبيع صاعاً من تمرٍ بصاعٍ من

---

(۱) البيهقى، احمد بن حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ. ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۳/۶) و كذا فى السنن لدار قطنى (۵۰۱/۲)

دراهم؟ قال: وكانت تلك الحديقة في موضع قصر بني حديلة الذي بناه معاوية. (۱)

ان رشتہ داروں میں ابی بن کعب اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما بھی تھے، حضرت حسانؓ نے اپنا حصہ حضرت معاویہؓ کو بیچ دیا، ان سے کہا گیا کہ کیا آپ حضرت ابوطلحہؓ کا وقف بیچ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیا میں ایک صاع کھجور ایک صاع درہم کے عوض نہ بیچوں (یعنی اتنا منافع بخش سودا چھوڑ دوں) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ یہ باغ قصر بنی حدیلہ کی جگہ واقع تھا جسے حضرت معاویہؓ نے تعمیر کیا تھا۔

اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے باغ کا وہ حصہ جو ان پر وقف کیا تھا اسے بیچ دیا، اگر وقف کرنے سے وقف لازم ہو جاتا اور اسے بیچنا جائز نہیں ہوتا تو حضرت حسان رضی اللہ عنہ وہ باغ نہیں بیچتے۔

دلیل نمبر۳:

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح معانی الاثار میں مالک عن ابن شہاب کے طریق سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لو لاأني ذكرت صدقتي لرسول الله صلى الله عليه وسلم لرددتها. (۲)

اگر میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے وقف کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں اسے واپس لے لیتا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وقف سے رجوع کرنے سے اس وجہ سے نہیں رکے کہ وقف کرنے سے وقف لازم ہو جاتا ہے بلکہ صرف اس وجہ سے انہوں نے رجوع نہیں فرمایا کہ اس وقف کا تذکرہ حضور اکرم ﷺ سے کر چکے تھے، اور حضور اس کے بارے میں انہیں ہدایت دے چکے تھے، اب حضور ﷺ کے انتقال کے بعد انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس سے رجوع کریں، ورنہ رجوع کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ وقف کرنے سے وقف لازم نہیں ہوتا۔

---

(۱) البخاري، الامام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاري. صحيح البخاري مع فتح الباري، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۵/۳۸۷ رقم الحديث: ۲۷۵۸)

(۲) الطحاوي، ابو جعفر احمد بن محمد المصري الطحاوي ۲۳۹ھ - ۳۲۱ھ. شرح معاني الآثار، ملتان، المكتبة الامدادية (۲/۲۲۹)

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

واستدل بہ الطحاوی لأبی حنیفة وزفر فی أن ایقاف الأرض أی التصدق بغلتها دون أصلها لایمنع من الرجوع فیها وأن الذی منع عمر من الرجوع کونہ ذکرہ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فکرہ أن یفارقه علی امر ثم یخالفه الی غیرہ. (۱)

امام طحاویؒ نے اس روایت سے امام ابوحنیفہؒ اور امام زفرؒ کے حق میں استدلال پیش کیا ہے کہ زمین کا وقف رجوع عن الوقف سے مانع نہیں، اور حضرت عمرؓ کو جس چیز نے رجوع سے روکا وہ یہ تھی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کر دیا تھا، لہٰذا انہوں نے اسے ناپسند کیا کہ حضور سے ایک مرتبہ موافقت کرنے کے بعد پھر اس کی مخالفت کریں۔

دلیل نمبر ۴:

حضرت مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

قال أتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یقرأ "الهٰکم التکاثر" قال: یقول ابن ادم: مالی مالی. قال وهل لک یاابن ادم من مالک الا ماا کلت فأفنیت أو لبست فأبلیت أو تصدقت فأمضیت. (۲)

فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ الہاکم التکاثر پڑھ رہے تھے، آپ نے فرمایا ابن آدم کہتا ہے میرا مال میرا مال، حالانکہ اے ابن آدم تیرے لئے تیرے مال میں سے وہی ہے جو تو نے کھالیا اور اسے فنا کر دیا، یا پہن لیا اور اسے پرانا کر دیا، یا صدقہ کر دیا اور اسے آگے بھیج دیا۔

شمس الأئمہ السرخسی رحمۃ اللہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے مسلک پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس روایت میں جناب نبی کریم ﷺ نے صدقہ کے ساتھ فأمضیت کا لفظ ارشاد فرمایا

---

(۱) عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی، ادارۃ القرآن و العلوم الاسلامیہ، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۱۰۳/۱۳)

(۲) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارۃ القرآن (۹۴/۱۸) کتاب الزهد)

ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صدقہ میں میراث جاری نہیں ہوگی جسے نافذ کر دیا گیا ہو، اگر صدقہ کو نافذ نہیں کیا گیا ہو تو اس میں میراث جاری ہوگی، اور صدقہ کا نفاذ یہ ہے کہ دوسرے کو اس کا مالک بنادیا جائے، وقف میں چونکہ شئی موقوفہ کا کسی کو مالک نہیں بنایا جاتا اس لئے اس میں نفاذِ صدقہ نہیں پایا گیا، اور جب صدقہ کو نافذ نہیں کیا گیا تو وہ لازم نہیں ہوا اس میں میراث جاری ہوسکتی ہے۔ (۱)

یہ چند دلائل ہیں جو وقف کے لازم نہ ہونے پر پیش کئے جاتے ہیں۔

لزومِ وقف پر جمہور کے دلائل

جمہور فقہاء جو لزومِ وقف کے قائل ہیں انہوں نے بھی اپنے موقف پر دلائل پیش کئے ہیں جن میں سے چند ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

دلیل نمبر ۱:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا باغ وقف کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آپ نے فرمایا:

تصدق بأصله لايباع ولا يوهب ولا يورث. (۲)

اس باغ کی ذات کو تو وقف کر دو کہ اسے نہ بیچا جا سکے نہ ہی ہبہ کیا جا سکے اور نہ اس میں میراث جاری ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ وقف کرنے سے وقف لازم ہو جاتا ہے اسے نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہبہ کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دار المعرفة ۱۹۹۳م (۲۹/۱۲) "وحجة أبی حنفية قول رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول ابن ادم مالی مالی...... فبين النبی عليه السلام أن الارث انما ينعدم فی الصدقة التی أمضاها وذلک لايكون الا بعد التمليک من غيره. وكذا فی اعلاء السنن: ۱۰۱/۱۳، يقول العثمانی: فبين النبی صلی الله عليه وسلم أن الارث انما ينعدم فی الصدقة التی أمضاها وذلک لايكون الا بعد التمليک من غيره أو بالاضافة الی مابعد الموت أو باتصال حكم الحاكم به، فمن تصدق، بغلة أرضه وحبس أصلها ولم يضف الی مابعد الموت ولم يحكم به حاكم فقد تصدق ولم يمضه فلا يتم الوقف ولا يلزم، ومن ادعی الامضاء بغير ذلک فعليه البيان."

(۲) البخاری، الامام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاری. صحيح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۳۹۲/۵ رقم الحديث: ۲۷۶۴)

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ الحاوی الکبیر میں یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

والتعلق الثانی بالخبر أن عمر جعلها صدقة ثم ذكر أحكامها فقال: لاتباع ولا توهب ولا تورث فدل ذلك على أن هذه الاحكام تتعلق بها اذا صارت صدقة وان لم يحكم بها الحاكم.[1]

اس حدیث سے دوسری یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسے وقف قرار دیدیا پھر اس کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے نہ بیچا جائے گا نہ ہبہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس میں میراث جاری ہوگی، یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ زمین کے وقف ہوتے ہی یہ احکام اس سے متعلق ہوجاتے ہیں اگرچہ حاکم اس کے لزوم کا فیصلہ نہ بھی کرے۔

بعض حضرات نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ جملہ حضور کا ارشاد نہیں ہے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔[2]

لیکن یہ اعتراض درست نہیں، اگرچہ بعض روایتوں میں اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے طور پر ذکر کیا گیا ہے لیکن بخاری شریف میں صخر بن جویریہ عن نافع عن ابن عمر کے طریق میں واضح طور پر موجود ہے کہ:

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: تصدق بأصله لایباع ولا یوهب ولا یورث ولكن ينفق ثمره.[3]

اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب المزارعۃ میں تعلیقاً نقل فرمایا ہے:

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعمر: تصدق بأصله لایباع ولكن ينفق ثمره فتصدق به.[4]

---

(۱) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی. الحاوی الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیه، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۴ھ (۵۱۳/۷)

(۲) عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی، ادارة القرآن و العلوم الاسلامیه، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۱۰۶/۱۳)

(۳) البخاری، الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۳۹۲/۵ رقم الحدیث: ۲۷۶۴)

(۴) البخاری، الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۱۷/۷، باب: ۱۴ کتاب الحرث والزراعة)

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ اس باغ کو اس طرح وقف کردو کہ اسے نہ بیچا جا سکے، نہ ہبہ کیا جا سکے اور نہ اس میں میراث جاری ہو، لہٰذا یہ حدیث لزوم وقف پر بین دلیل ہے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو اله. (۱)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بنی آدم کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے، ایک صدقہ جاریہ، دوسرا ایسا علم جس سے فائدہ حاصل کیا جاتا رہے، تیسرے نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہے۔

اس روایت میں صدقہ جاریہ سے مراد وقف ہے جیسا کہ اس کی تفصیل علامہ نوویؒ کے حوالہ سے ''مشروعیت وقف'' کے ذیل میں گذر چکی ہے، اور ظاہر ہے وقف اسی صورت میں صدقہ جاریہ کا مصداق بن سکتا ہے جبکہ اسے لازم قرار دیا جائے، ورنہ اگر وقف کرنے کے بعد اس سے رجوع کرنے کی اجازت دی جائے تو وہ صدقہ جاریہ نہیں رہ سکتا۔

دلیل نمبر ۳:

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوقاف بھی لزوم وقف پر دال ہیں کیونکہ ان حضرات کے اتنی کثیر تعداد میں اوقاف منقول ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں:

لم يكن أحد من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ذو مقدرة الا وقف. (۲)

---

(۱) القشيرى، مسلم بن الحجاج القشيرى، صحيح لمسلم مع شرح النووى، كراچى، ادارة القرآن (۸۵/۱۱)

(۲) جواهر الاخبار والاثار مع البحر الزخار (۱۴۸/۴)

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جو بھی صاحب استطاعت تھا اس نے وقف کیا۔

لیکن اس کے باوجود کہیں یہ منقول نہیں ہے کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اپنے وقف سے رجوع کیا ہو یا اسے بیچا یا ہبہ کیا ہو، اگر وقف لازم نہ ہوتا تو ذخیرہ احادیث میں کہیں ایک واقعہ تو وقف سے رجوع کا منقول ہوتا۔

علامہ ماوردیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ویدل علی ذلک اجماع الصحابة، لأن أبابکر و عمر و عثمان و علیاً و طلحة و الزبیر و أنسا و أبا الدرداء و عبد الرحمن بن عوف و فاطمة و غیرهم و قفوا دوراً و بساتین ولم ینقل عن أحد منهم أنه رجع فی وقفه فباع منه شیئاً ولا عن أحد من ورثتهم مع اختلاف هممهم فلو کان ذلک جائزاً لنقل عن أحدمنهم الرجوع. (۱)

اور اس پر حضرات صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی دلالت کرتا ہے کیونکہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، انس، ابودرداء، عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا وعنہم اجمعین نے گھر اور باغات وقف کئے لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں منقول نہیں ہے کہ اس نے اپنے وقف سے رجوع کیا ہو اور اسے بیچا ہو اور نہ ہی ان کے ورثاء کے بارے میں یہ منقول ہے، حالانکہ ہر ایک کے عزائم دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں، اگر رجوع عن الوقف جائز ہوتا تو ان میں سے کسی ایک سے بھی رجوع منقول ہوتا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر وقف لازم نہ ہوتا تو آج حضراتِ صحابہ کرام اور اسلاف کے اوقاف میں سے کسی کا وجود نہ ہوتا کیونکہ لازم نہ ہونے کی صورت میں ان میں واقف کے مرنے بعد میراث جاری ہوتی اور ان کا وجود اس طرح ختم ہو جاتا، حالانکہ صدیوں تک ان کے اوقاف موجود رہے اور آج بھی بعض اوقاف کی نسبت ان کی طرف کی جاتی ہے۔

صاحب اسعاف علامہ طرابلسیؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی. الحاوی الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیه، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۴ھ (۵۱۳/۷)

وعند أبي يوسفؒ و محمدؒ يلزم الوقف بدون هذين الشرطين وهو قول عامة العلماء وهو الصحيح لان النبي صلى الله عليه وسلم تصدق بسبع حوائط في المدينة وابراهيم الخليل عليه السلام وقف أوقافاً وهي باقية الى يومنا هذا ...... عن بشر مولى المازنيين قال: سمعت جابر بن عبد الله يقول لما كتب عمر بن الخطاب رضي الله عنه صدقته في خلافته دعا نفراً من المهاجرين والأنصار فأحضرهم ذلك وأشهدهم عليه فانتشر خبرها قال جابرؓ: فلم أعلم أحداً كان له مال من المهاجرين والأنصار الاحبس مالا من ماله صدقة مؤبدة لاتشترى ابدا ولا توهب ولا تورث. (۱)

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک وقف بغیر کسی شرط کے لازم ہوجاتا ہے یہی جمہور علماء کا قول ہے، اور یہی صحیح ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں سات باغ وقف کئے اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بھی بہت سے وقف کئے اور وہ آج تک باقی ہیں ...... حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنے وقف کو تحریری شکل دی تو حضرات مہاجرین وانصار کی ایک جماعت کو بلایا اور اسے اس پر گواہ بنایا، اس کی خبر پھیل گئی، میرے علم میں نہیں ہے کہ انصار ومہاجرین میں سے کوئی مال والا ہو اور اس نے اپنے مال میں سے کچھ مال اس طرح وقف نہ کیا ہو کہ اسے کبھی نہ بیچا جاسکے نہ ہبہ کیا جاسکے اور نہ ہی اس میں میراث جاری ہوسکے۔

قول راجح:

اس مسئلہ میں جمہور فقہاء کا قول راجح ہے کہ وقف کرنے سے وقف لازم ہوجاتا ہے، فقہاء احناف رحمہم اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه، ۱۳۲۰ھ (۴۔۷)

والحق ترجح قول عامة العلماء بلزومه لأن الاحاديث والأثار متظافرة علـى ذلك قـولاً كما صح من قوله عليه الصلاة والسلام لايباع ولا يـورث الـى آخـره و تكرر هذا فى احاديث كثيرة واستمر عمل الأمة مـن الصحابة والتابعين ومن بعدهم على ذلك أولها صدقه رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم صدقة أبى بكر و عمر و عثمان و على والزبير و معاذ بن جبل و زيد بن ثابت و عائشة و اسماء اختها وأم سلمة و أم حبيبـه و صـفية بـنـت حيـى و سعد بن أبى وقاص و خالد بن الوليد و جـابـر بـن عبـد الله و عـقبة بن عامر و أبى أروى الدوسى و عبدالله بن الـزبيـر، كـل هـؤلاء مـن الـصحابة ثم التابعين بعدهم كلها بروايات و توارث الناس أجمعون ذلك.[1]

اور حق یہ ہے کہ جمہور علماء کا وقف کے لزوم کا قول ہی راجح ہے کیونکہ احادیث اور آثار اس پر متفق ہیں جیسا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: لا یباع ولا یورث الخ اور یہ بہت سی احادیث میں بار بار آیا ہے اور اس پر حضرات صحابہ وحضرات تابعین اور ان کے بعد والوں کا تعامل چلا آ رہا ہے ان میں سب سے پہلے جناب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وقف، اس کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ، ان کی بہن حضرت اسماء، حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت صفیہ بنت حی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت خالد بن ولید، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عقبہ بن عامر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے اوقاف ہیں، یہ سب روایات سے ثابت ہیں اور اس پر تمام لوگوں کا توارث چلا آ رہا ہے۔

شمس الائمہ السرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ معنوی طور پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو راجح قرار دیا ہے، لیکن یہ بھی فرمایا ہے کہ لوگوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول آثار کی شہرت کی وجہ سے اختیار نہیں کیا۔[2]

---

(۱) ابـن الهام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸٦١ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۲/۵)

(۲) السـرخسـى، شـمـس الائـمـه مـحمد بن احمد بن ابى سهل السرخسى. المبسوط للسرخسى، بيروت، دار المعرفة ۱۹۹۳م (۳۰/۱۲)

عدمِ لزومِ وقف پر پیش کردہ دلائل کا جواب

اور جہاں تک ان نقلی دلائل کا تعلق ہے جو عدم لزوم وقف پر پیش کئے گئے ہیں ان میں سے بعض سے تو استدلال درست نہیں اور بعض اگر چہ اپنے مدلول پر صریح ہیں لیکن حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار اور امت کے تعامل وتوارث کے ہوتے ہوئے ان سے استدلال مشکل ہے۔

ذیل میں ان میں سے ہر ایک پر ترتیب وار کلام کیا جاتا ہے:

پہلے استدلال کا جواب:

پہلا استدلال حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ کے واقعہ سے تھا کہ انہوں نے اپنا باغ حضور کے سامنے وقف کر دیا لیکن پھر ان کے والدین کی درخواست پر حضور نے اس کی وقفیت منسوخ کر دی۔

اس روایت کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں لیکن ان سب سے قطع نظر اگر اس کے اصل الفاظ پر غور کریں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ باغ حضرت عبداللہ کا تھا ہی نہیں بلکہ ان کے والدین کا تھا، چنانچہ روایت کے الفاظ ہیں:

فرده رسول الله صلى الله عليه وسلم عليهما ثم ماتا فورثهما ابنهما بعدهما.

کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ ان کے والدین کو واپس کر دیا، پھر جب ان دونوں کا انتقال ہو گیا تو ان کے بیٹے اس کے وارث بنے۔

ظاہر ہے باغ والدین کو واپس کرنا اور والدین کے انتقال کے بعد بیٹوں کا اس کا وارث بننا اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ باغ والدین کا ہو، اس لئے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت حال سے آگاہ ہونے پر اس وقف کو ختم فرما دیا۔ اس لئے اس واقعہ سے استدلال درست نہیں۔

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں:

وأما الجواب عن حديث عبد الله بن زيد: فهو أن ذلك الحائط ما كان له، انما كان لأبويه بدليل انه روى عن الخبر "ماتا فورثهما". (۱)

---

(۱) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی. الحاوی الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۴ھ (۵۱۳/۷)

عبداللہ بن زیدؓ والی حدیث کا جواب یہ ہے کہ وہ باغ ان کا تھا ہی نہیں بلکہ ان کے والدین کا تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ ان کے والدین کے انتقال کے بعد یہ ان کی میراث میں تقسیم ہوا۔

علامہ ابن قدامہؒ نے بھی یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔[۱]

دوسرے استدلال کا جواب:

دوسرا استدلال حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے تھا کہ انہوں نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے وقف کردہ باغ کا وہ حصہ جو انہیں ملا تھا اسے فروخت کر دیا تھا۔

اس کا ایک جواب تو علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں یہ دیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ باغ وقف کرتے وقت یہ شرط لگائی ہو کہ ان میں سے جسے اپنا حصہ بیچنے کی ضرورت ہو اس کے لئے اسے بیچنے کی اجازت ہے جیسا کہ بعض حضرات مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ اس شرط کو جائز قرار دیتے ہیں۔[۲]

لیکن یہ صرف ایک احتمال ہے کسی روایت سے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا اس طرح شرط لگانا ثابت نہیں، اس لئے یہ جواب تو مشکل ہے لیکن بخاری شریف میں جہاں یہ روایت مفصلاً مذکور ہے وہاں اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

باع حسان حصته منه من معاوية، فقيل له: تبيع صدقة أبى طلحه؟ فقال ألا أبيع صاعاً من تمر بصاعٍ من دراهم؟[۳]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس باغ میں سے اپنا حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بیچ دیا، ان سے کہا گیا کہ آپ ابوطلحہ کے وقف کردہ باغ کو بیچ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک صاع کھجور ایک صاع درہم کے بدلہ نہ بیچوں؟

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۶/۸)

(۲) ابن حجر، احمد بن على بن حجر العسقلانى. فتح البارى، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۳۸۸/۵) "يقول ابن حجرؒ: ويحتمل أن يقال شرط أبو طلحه عليهم لما وقفها عليهم أن من احتاج الى بيع حصته منهم جاز له بيعها وقد قال بجواز هذا الشرط بعض العلماء كعلى وغيره، والله اعلم."

(۳) البخارى، الامام ابو عبد الله محمد بن اسماعيل البخارى. صحيح البخارى مع فتح البخارى، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (رقم الحديث: ۲۷۵۸)

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ حضرت حسانؓ موقوفہ زمین بیچنے کے قائل تھے، لیکن یہ صرف انہی کی ذاتی رائے تھی ورنہ دیگر حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے قائل نہیں تھے، ان کے اس عمل پر نکیر کی گئی اور حیرت کا اظہار کیا گیا۔

تیسرے استدلال کا جواب:

جہاں تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا تعلق ہے:

لو لا أني ذكرت صدقتي لرسول الله صلى الله عليه وسلم لرددتها.(۱)

اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں: لیکن سب سے راجح بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرسل روایت ہے جبکہ دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے جس میں وہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ حضور نے موقوفہ باغ کے بارے میں فرمایا ''**لا يباع ولا يوهب ولا يورث**'' ظاہر ہے اس مرفوع روایت کے ہوتے ہوئے مرسل روایت کو اختیار نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ اس میں دیگر احتمال بھی ہیں، اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل بھی اس کے خلاف ہے۔

چوتھے استدلال کا جواب:

چوتھا استدلال حضرت ابومطرف کی روایت **يقول ابن ادم مالي مالي** میں ''**تصدقت فأمضيت**'' کے الفاظ سے تھا کہ یہاں صدقہ کے لئے امضاء یعنی انفاذ شرط قرار دیا ہے اور انفاذ بغیر تملیک کے ہوتا نہیں جبکہ وقف میں تملیک پائی نہیں جاتی اس لئے وقف لازم نہیں ہوگا۔

اس روایت سے وقف کے عدم لزوم پر استدلال انتہائی بعید ہے اور بغیر تکلف کے استدلال ممکن نہیں، کیونکہ امضاء کے معنی اگر چہ انفاذ یعنی نافذ کرنے کے آتے ہیں لیکن اگر پوری حدیث کو سامنے رکھا جائے تو سیاق کے اعتبار سے یہ معنی یہاں مناسب معلوم نہیں ہوتے بلکہ اُمضیت کے معنی ہیں صدقہ کئے ہوئے مال کو فناء ہونے سے بچا کر آخرت کے لئے محفوظ کر لیا۔

---

(۱) دیکھئے: ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاھور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۴۰۲/۵)

شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ شریف کی شرح أشعة اللمعات میں اس جملہ کا ترجمہ فرماتے ہیں:

یا تصدق کردی برفقراء پس گذارینده وباقی گذاشتی برائے آخرت۔[1]

یعنی یا جوتو نے صدقہ کردیا فقراء پر، پس اسے آخرت کے لئے باقی چھوڑ دیا۔

اسی طرح ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقات میں اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أو تصدقت فأمضيت أى فأمضيته من الافناء والابلاء وأبقيته لنفسك يوم الجزاء.[2]

یعنی تم نے اس صدقہ کوفنا ہونے اور پرانا ہونے سے گذاردیا اور قیامت کے دن اپنے لئے باقی رکھالیا۔

لہٰذا جب سیاق حدیث کی روشنی میں امضاء کا ترجمہ انفاذ سے ممکن نہیں تو اس روایت سے عدم لزومِ نف پر استدلال کرنا بھی درست نہیں، اور اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ اس روایت میں امضاء کے معنی انفاذ کے ں اور اس میں صدقہ کے لئے انفاذ یعنی تملیک الغیر کو ضروری قرار دیا گیا ہے تب بھی اس سے وقف کے زم نہ ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جمہور کے نزدیک وقف میں موقوفہ چیز کی ملکیت واقف سے ند تعالیٰ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے جیسا کہ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے لہٰذا وقف میں تملیک ئی جاتی ہے جب تملیک پائی گئی تو انفاذ بھی پایا گیا، اور انفاذ پر صدقہ کا لزوم موقوف تھا۔

لاصہ بحث:

خلاصہ یہ کہ لزومِ وقف وعدم لزوم وقف کے مسئلہ میں جمہور ہی کا قول راجح ہے، حضرات انبیاء رام حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے اوقاف اور امت کا تعامل وتوارث اس پر شاہد ے، اگر وقف لازم نہیں ہوتا تو آج ہمیں ان حضرات کے اوقاف کا وجود نہیں ملتا اور وہ تمام اوقاف ورثاء ں تقسیم ہوکر ختم ہوچکے ہوتے؟ بعض حضرات نے حضرات صحابہ کرامؓ کے اوقاف میں یہ تاویل کرنے کی شش کی ہے کہ ان اوقاف کے بارے میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کردیا تھا یا وہ اوقاف

---

[1] محدث دهلوى، شاه عبد الحق محدث دهلوى. اشعة اللمعات، لكهنو، منشى نول كشور (۴/۲۰۷)

[2] ملا على قارى، على بن سلطان المعروف بملا على القارى. مرقاة المفاتيح، كوئٹه، المكتبة الحبيبية (۹/۲۳)

بطور وصیت تھے اور ان دونوں صورتوں میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی وقف لازم ہو جاتا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ صرف ایک احتمال ہے جس کی کوئی قوی بنیاد نہیں ہے۔

فقیہ النفس علامہ قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ فریقین کے اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

والناس لم يأخذوا بقول أبي حنيفةؒ في هذا للآثار المشهورة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم والصحابة رحمهم الله تعالىٰ و تعامل الناس باتخاذ الرباطات والخانات، اولها وقف الخليل صلوات الله عليه. (۱)

لوگوں نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو اختیار نہیں کیا جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشہور آثار اور لوگوں کے رباط و مسافر خانے وغیرہ بنانے کا تعامل کی وجہ سے، جن میں سے سب سے پہلا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا وقف ہے۔

والله سبحانه و تعالىٰ اعلم.

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۵ھ. الفتاوی الخانية بهامش الهندية كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۴۰۲ھ (۲۸۶/۳)

ملکیتِ وقف

دوسرا اصولی اختلاف ملکیت وقف کے بارے میں ہے کہ وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز کس کی ملکیت میں رہتی ہے؟ اس میں بنیادی طور پر فقہاء کرام رحمہم اللہ کی تین آراء ہیں:

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا موقف:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز واقف ہی کی ملکیت میں رہتی ہے، البتہ اتنا فرق ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واقف کو اس میں ملکیتی تصرفات کرنے کا اختیار بھی رہتا ہے، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگرچہ واقف کی ملکیت برقرار رہتی ہے لیکن اسے اس میں ملکیتی تصرفات یعنی بیع وشراء اور ہبہ وغیرہ کا اختیار نہیں رہتا۔

البتہ جن صورتوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف لازم ہوجاتا ہے ان میں ملکیت وقف کے سلسلہ میں امام صاحب کا وہی مسلک ہے جو جمہور یعنی صاحبین اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

امام احمدؒ کا موقف:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر موقوف علیہ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے۔

امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کا موقف:

امام ابویوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے تو نکل جاتی ہے لیکن موقوف علیہ کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی بلکہ حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں منتقل ہوجاتی ہے۔

ہر مسلک سے متعلق فقہی عبارات ''وقف کے حکم'' کے ذیل میں گذر چکی ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل:

ان حضرات کے نزدیک وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز واقف ہی کی ملکیت میں رہتی ہے، اس پر نقلی دلیل بھی پیش کی جاتی ہے اور دلائل عقلیہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے ذیل میں ان میں سے چیدہ چیدہ دلائل مختصراً ذکر کئے جاتے ہیں۔

پہلا استدلال:

حدیثِ وقفِ عمر رضی اللہ عنہ کے بعض طریق میں یہ الفاظ آئے ہیں:

فاحبس اصلها و سبل الثمرة.(۱)

اس باغ کی اصل کو روکے رکھو اور اس کے منافع وقف کر دو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موقوفہ باغ کی اصل کو واقف ہی کی ملکیت میں باقی رکھا صرف اس کے منافع کو وقف کرنے کا حکم دیا۔(۲)

دوسرا استدلال:

صاحبِ ہدایہ نے اس مسلک کی عقلی دلیل یہ بیان فرمائی ہے کہ وقف کرنے کے بعد بھی واقف موقوفہ چیز سے فی الجملہ فائدہ اٹھا سکتا ہے، جیسے زراعت، رہائش وغیرہ، اسی طرح اسے متولی وغیرہ کے نصب وعزل کا اختیار بھی رہتا ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ وقف کرنے سے واقف کی ملکیت ختم نہیں ہوئی۔(۳)

---

(۱) النسائی، احمد بن شعیب بن علی النسائی. سنن النسائی مع تعلیق عبد الفتاح ابو غده، بیروت، دار البشائر الاسلامیه ۱۹۸۶م (رقم الحدیث: ۳۳۷۰)

(۲) دیکھئے: ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۵۸۶۱. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/ ۴۲۰)

(۳) المرغینانی، برهان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/ ۴۲۰) "لأن الملک باق فیه بدلیل انه یجوز الانتفاع به زارعة وسکنی وغیر ذلک والملک فیه للواقف، ألاتری أن له ولایة التصرف فیه بصرف غلاته الی مصارفها ونصب القوام فیها الا أنه یتصدق بمنافعه فصار شبیه العاریة، ولأنه یحتاج الی التصدق بالغلة دائما ولا تصدق عنه الا بالبقاء علی ملکه."

تیسرا استدلال:

تیسری دلیل یہ بیان کی جاتی ہے کہ وقف کی ملکیت کے سلسلہ میں تین صورتیں ممکن ہیں یا تو اسے واقف کی ملکیت سے نکال دیں اور کسی کو اس کا مالک نہ بنائیں یہ صورت تو ممکن نہیں کیونکہ اس میں ''خروج شئی لا الی مالک'' لازم آتا ہے کہ موقوفہ چیز کا کوئی مالک نہ ہو اور یہ محال ہے اس لئے ضروری ہے کہ موقوفہ چیز کو کسی کی ملکیت میں رکھا جائے، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو موقوف علیہ کو اس کا مالک بنا دیا جائے، یا اسے واقف ہی کی ملکیت میں رکھا جائے، ''ابقاء ما کان علی ما کان'' کے اصول پر دوسری صورت ہی متعین ہے کہ اسے واقف ہی کی ملکیت میں رکھا جائے، کیونکہ وقف کرنے سے پہلے یہ واقف ہی کی ملکیت تھی، الا یہ کہ کوئی ایسی دلیل سامنے آجائے جس سے واقف کی ملکیت کا زائل ہونا ثابت ہو جائے۔ (۱)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر موقوف علیہ کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی ہے یہی ان کا راجح قول ہے۔

ابن قدامہ رحمہ اللہ نے المغنی میں امام کے اس مسلک پر دو دلیلیں بیان فرمائی ہیں جن کا حاصل یہ ہے:

پہلا استدلال:

وقف بیع اور ہبہ کی طرح ہے، جس طرح بیع اور ہبہ سے مبیع اور شئی موہوب بائع اور واہب کی ملکیت سے نکل کر مشتری اور موہوب لہ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہیں، اسی طرح وقف بھی ایک ایسا سبب ہے جو واقف کی ملکیت کو زائل کر دیتا ہے اور موقوف چیز کو ایسے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے جسے اس چیز کا

---

(۱) دیکھئے: ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/ ۴۲۰) ''يقول ابن الهمام: وعند مالك هو حبس العين على ملك الواقف فلا يزول عنه ملكه لكن لايباع ولا يورث ولا يوهب وذكر بعض الشافعية ان هذا قول آخر للشافعي وأحمد لأنه صلى الله عليه وسلم قال: حبس الأصل و سبل الثمرة اه وهذا أحسن الاقوال فان خلاف الأصل والقياس ثابت فى كل من القولين وهو خروجه لا الى مالك وثبوت ملكه أو ملك غيره فيه مع منعه من بيعه وهبته، وكل منهما له نظير فى الشرع فمن الأول المسجد وغيره ومن الثانى أم الولد يكون الملك فيها باقيا ولاتباع ولا توهب ولا تورث وكذا المدبر المطلق عندنا فكل منهما يمكن ان يقع بالدليل ولا شك ان ملك الواقف كان متيقن الثبوت والمعلوم بالوقف من شرطه عدم البيع ونحوه فليثبت ذلك القدر فقط ويبقى الباقى على ما كان حتى يتحقق المزيل ولم يتحقق.''

مالک بنانا فی نفسہ صحیح ہے، لہٰذا اس میں بھی موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر موقوف علیہ کی ملکیت میں داخل ہو جائے گی۔

دوسرا استدلال:

اگر وقف موقوف علیہ کو صرف منفعت کا مالک بنانے کا نام ہے اور اس کی طرف موقوفہ چیز کی ملکیت منتقل نہیں ہوتی تو اس صورت میں وقف لازم نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ تو عاریۃ کی طرح ہو گیا اس میں بھی دوسرے کو صرف منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے حالانکہ وقف کو لازم کیا جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں موقوفہ چیز کی ملکیت بھی موقوف علیہ کی طرح منتقل کی جائے۔

علامہ تحریر فرماتے ہیں:

ولنا أنه سبب يزيل ملك الواقف، وجد الى من يصح تمليكه على وجهٍ لم يخرج المال عن ماليته فوجب أن ينقل الملك اليه كالهبة والبيع ولأنه لو كان تمليك المنفعة المجردة لم يلزم كالعارية والسكنى ولم يزل ملك الواقف عنه كالعارية. (۱)

ہماری دلیل یہ ہے کہ وقف ایک ایسا سبب ہے جو واقف کی ملکیت کو زائل کر دیتا ہے اور یہ وقف ایسے شخص کے لئے کیا گیا ہے جسے نفس الأمر میں اس چیز کا مالک بنانا صحیح ہے اور وقف کی وجہ سے مالِ موقوف کی مالیت بھی ختم نہیں ہوتی لہٰذا وقف میں موقوف علیہ کی طرف ملکیت منتقل ہونا ضروری ہے جیسے ہبہ اور بیع میں ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وقف محض منفعت کے مالک بنانے کا نام ہے تو یہ عاریت اور سکنی کی طرح لازم نہیں ہونا چاہئے اور واقف کے مالکانہ تصرفات زائل نہیں ہونے چاہئیں۔

امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کے دلائل:

ان حضرات کے نزدیک وقف کرنے کے بعد موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

---

(۱) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۴۱ - ۶۲۰. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۱۸۹/۸)

پہلا استدلال:

حدیثِ عمر رضی اللہ عنہ کے بعض طرق میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

تصدق بأصله لايباع ولايوهب ولايورث ولكن ينفق ثمره. (۱)

اس باغ کی اصل کو صدقہ کردو کہ اسے نہ بیچا جاسکے، نہ ہبہ کیا جاسکے اور نہ اس میں میراث جاری ہوسکے، لیکن اس کے منافع کو خرچ کیا جاتا رہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے اس باغ کی ذات کو صدقہ کرنے کا حکم دیا اور ظاہر ہے کسی چیز کو صدقہ کرنا اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ متصدق کی ملکیت سے نکل کر اس ذات کی ملکیت میں داخل ہوجائے جس کے لئے صدقہ کیا جارہا ہے، لہٰذا وقف میں بھی تصدق کا مفہوم اسی وقت پایا جائے گا جبکہ موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی طرف منتقل ہوجائے جن کی خوشنودی کے لئے وقف کیا جارہا ہے اور اس کے منافع موقوف علیہم کو ملتے رہیں۔

دوسرا استدلال:

مسجد کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ اس میں واقف کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے اور وہ حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے لہٰذا بقیہ اوقاف میں بھی یہی صورت ہونی چاہئے۔

تیسرا استدلال:

اگر موقوفہ چیز واقف کی ملکیت ہی قرار دی جائے تو واقف کو اس کے منافع بھی حاصل ہونے چاہئیں اور اگر اسے منافع حاصل نہیں ہوں اور اس کا تصرف کا اختیار باقی نہیں تو اس کی ملکیت بھی باقی نہیں رہنی چاہئے۔ (۲)

---

(۱) البخاری، الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحيح البخاری مع فتح البخاری، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (رقم الحديث: ۲۷۶۴)

(۲) النووی، يحيىٰ بن شرف النووی. المجموع شرح المهذب، بيروت، دار الفكر (۱۵/۳۲۴) "وأجيب على القول ببقاء الملک بأن الوقف سبب يزيل التصرف فی الرقبة والمنفعة فأزال الملک كالعتق، ولأنه لو كان ملكه لرجعت اليه قيمته كالملک المطلق."

قولِ راجح:

ملکیت وقف کے سلسلہ میں ان تینوں اقوال میں سے آخری قول راجح معلوم ہوتا ہے کہ وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، وجوہِ ترجیح تو ہم آگے جا کر بیان کریں گے اس سے پہلے ان دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے جو پہلے دو مؤقف اختیار کرنے والے حضرات کی طرف سے بیان کئے گئے ہیں۔

پہلے مؤقف پر پیش کردہ دلائل کا جائزہ

پہلے استدلال کا جواب:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے تھا جس میں حضور نے ارشاد فرمایا تھا ''فاحبس اصلها وسبل الثمرة'' لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح المہذب میں اور ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے المغنی میں فرمایا ہے کہ اس روایت میں حبسِ اصل سے یہ مراد نہیں ہے کہ اسے اپنی ملکیت میں رکھو، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے آگے بیچنے، ہبہ کرنے اور میراث جاری ہونے سے روکے رکھو۔ جیسا کہ بعض روایت میں اس کے بعد ارشاد ہے ''بأن لایباع ولا یوهب ولا یورث۔''

علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

وأما الخبر فالمراد به أن یکون محبوساً لایباع ولا یوهب ولا یورث.[1]

حدیث سے مراد یہ ہے کہ موقوفہ چیز کو بیچنے، ہبہ کرنے اور میراث میں تقسیم ہونے سے روکے رکھو۔

اور علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے الحاوی الکبیر میں اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں حبس سے مراد تحبیس ہے یعنی اس باغ کی ذات کو تو وقف کردو اور اس کے منافع اللہ کے راستہ میں خرچ کردو۔[2] چنانچہ

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت، دار الفکر (۳۲۴/۱۵)

(۲) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی. الحاوی الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیه، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۴ھ (۵۱۵/۷)

علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ النہایۃ فی غریب الحدیث میں حبس الأصل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أی اجعله وقفاً حبیساً. (۱)

اور اس سے بھی واضح انداز میں علامہ جار اللہ زمخشری الفائق فی غریب الحدیث میں یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد اس کے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أی اجعله حبیسا وقفا مؤبداً الا یباع ولا یوهب ولا یورث و اجعل ثمرته فی سبل الخیر. (۲)

اس باغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وقف کردو کہ اسے نہ بیچا جا سکے، نہ ہبہ کیا جا سکے اور نہ اس میں میراث جاری ہو سکے اور اس سے حاصل ہونے والے منافع کو خیر کے راستہ میں خرچ کردو۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث میں حبس سے مراد ملکیت میں روکے رکھنا نہیں بلکہ اصل کو وقف کرنا ہے لہٰذا اس سے اس بات پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ موقوفہ چیز واقف ہی کی ملکیت میں رہے گی۔

دوسرے استدلال کا جواب:

دوسرا استدلال یہ تھا کہ واقف فی الجملہ اپنے وقف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی ملکیت باقی ہے، یہ استدلال بھی اتنا قوی نہیں ہے، کیونکہ کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی ملکیت ختم نہیں ہوئی، یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز کسی شخص کی ملکیت سے نکل گئی ہو لیکن اسے پھر بھی اس سے انتفاع کی اجازت ہو جیسے قربانی کا جانور، قربانی کرنے والا جب جانور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ذبح کر دیتا ہے تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں منتقل ہو جاتا ہے تبھی اس کے گوشت کو بیچنا یا قصائی کو اجرت میں دینا جائز نہیں، لیکن اس کے باوجود اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے گوشت وغیرہ کھانے اور کھلانے کی اجازت اور اختیار حاصل رہتا ہے، یہی معاملہ واقف کا ہے کہ موقوفہ چیز اگر چہ اس کی ملکیت سے نکل کر اللہ رب العزت کی ملکیت میں حکماً منتقل ہو جاتی

---

(۱) ابن اثیر، مبارک بن محمد الجزری ابن الاثیر ۵۵۴ - ۶۰۶ھ. النهایة فی غریب الحدیث، ایران، مؤسسة اسماعیلیان (۳۲۹/۱)

(۲) زمخشری، جار الله محمود بن عمر الزمخشری. الفائق فی غریب الحدیث، بیروت، دار الفکر ۱۹۹۳م (۲۵۴/۱)

ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اس میں فی الجملہ مخصوص تصرفات کی اجازت عطا فرمائی ہے، اس سے یہ استدلال درست نہیں کہ جب اسے انتفاع کی اجازت ہے تو اس کی ملکیت بھی باقی ہوگی۔

صاحب عنایہ لکھتے ہیں:

بأن خروج الملک الی اللہ تعالیٰ قربة لایمنع التصرف فیه ممن خرج عنه، الاترى أن القربان تصیر بالاراقة الى اللہ عزوجل ثم ان صاحبه یتصرف فیه بالأکل والاطعام والتصدق به بتولیة الشرع لکونه المتقرب به فجاز أن یکون أمر الوقف کذالک. (۱)

بطور قربت اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کی ملکیت کا منتقل ہو جانا، جس شخص کی ملکیت سے یہ چیز نکلی ہے اس کے تصرف کے لئے مانع نہیں ہے، قربانی کا جانور خون بہاتے ہی اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہو جاتا ہے لیکن صاحب قربانی اس میں تصرف کرسکتا ہے کہ اسے خود کھائے یا کسی کو کھلائے یا صدقہ کردے، شریعت نے اسے اختیار دیا ہے، وقف کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اور جہاں تک تیسرے استدلال کا تعلق ہے تو ہم اس میں پہلی شق کو اختیار کرتے ہیں، رہا یہ سوال کہ اس صورت میں ''**خروج شئی لا الی مالک**'' لازم آئے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس بحث کے آخر میں انشاء اللہ تفصیل سے اس پر گفتگو کریں گے کہ وقف کے اندر خود مالک بننے کی صلاحیت ہے اور اس کی حیثیت شخصِ قانونی کی ہے، لہٰذا اب یہ اعتراض نہیں رہتا۔

دوسرے موقف پر پیش کردہ دلائل کا جائزہ

پہلے استدلال کا جواب:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وقف کو بیع اور ہبہ پر قیاس کیا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ وقف کو بیع اور ہبہ پر قیاس کرنا درست نہیں، کیونکہ اگر وقف بیع اور ہبہ کی طرح ہوتا اور موقوف علیہ اس کا مالک ہو جاتا تو موقوف علیہ کے لئے موقوفہ چیز کو اپنی ملکیت سے نکالنا اور دوسرے کی طرف منتقل کرنا جائز ہوتا جیسے کہ مشتری

---

(۱) البابرتی، محمد بن محمود البابرتی. العنایه بهامش فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۲۵/۵)

اور موہوب لہ کو اس کی اجازت ہے حالانکہ آپ بھی موقوف علیہ کو اس کی اجازت نہیں دیتے[1] اسی طرح اگر وقف نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگائی کہ جب تک موقوف علیہ زندہ ہے وہ اس وقف کے منافع حاصل کرتا رہے اور اس کے بعد فلاں شخص اس کے منافع کا مستحق ہوگا، تو بیع اور ہبہ پر قیاس کر کے موقوف علیہ کو مالک بنانے کا تقاضہ یہ ہے کہ واقف کی اس شرط پر عمل نہ کیا جائے کیونکہ مملوکہ چیز مالک کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، حالانکہ آپ بھی اس شرط پر عمل کرنا لازم قرار دیتے ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ وقف کو بیع اور ہبہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔[2]

دوسرے استدلال کا جواب:

دوسرے استدلال کا جواب یہ ہے کہ وقف موقوف علیہ کو صرف منفعت کا مالک بنانے کا نام ہے، وقف کرنے کے بعد موقوف علیہ کو اس سے صرف انتفاع کا حق حاصل ہو جاتا ہے رہی یہ بات کہ پھر تو اسے عاریۃ کی طرح ہونا چاہئے اور لازم نہیں ہونا چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وقف اس معنی میں تو عاریۃ کی طرح ہے کہ اس میں بھی موقوف علیہ صرف منفعت کا مالک ہوتا ہے لیکن اس حیثیت سے عاریۃ سے مختلف ہے کہ عاریۃ میں شئ مستعار معیر کی ملکیت سے نکلتی نہیں، جبکہ وقف کے سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ وقف اگر صرف منفعت کے مالک بنانے کا نام ہے تو اسے عاریۃ کی طرح لازم قرار نہیں دینا چاہئے، یہ بات تو اس وقت کہی جاسکتی تھی جب وقف من کل الوجوہ عاریۃ کے مشابہ ہوتا، اور یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ وقف کے لازم ہونے کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ موقوف علیہ کو اس کا مالک بھی بنایا جائے بلکہ اسے واقف کی ملکیت ہی میں رکھا جائے تب بھی اس کے لزوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور اس کی نظیر شریعت میں موجود ہے جیسے مدبر اور ام ولد وغیرہ کہ اس میں مالک کی ملکیت تو برقرار رہتی ہے لیکن بیع ہبہ وغیرہ کی اجازت نہیں ہوتی۔

---

(۱) المغنی: ج۸ صفحہ ۱۹۸: وامتناع التصرف فی الرقبة لا یمنع الملک. وفیه: ۳۲۷/۸ لیس للموقوف علیه وطئی الأمة الموقوفة لان ملکه ناقص.

(۲) کذا فهمت من عبارة العنایة (۴۲۴/۵) "یقول البابرتیؒ: لأنه لو دخل فی ملکه جاز له اخراجه من ملکه کسائر أملاکه ولما انتقل الی من بعده ممن شرطه الواقف لکن لیس کذالک بالاتفاق."

تیسرے مؤقف کی وجوہِ ترجیح

امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کا موقف کئی اعتبار سے راجح معلوم ہوتا ہے۔

پہلی وجہ ترجیح:

مسجد کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ وہ واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے لہٰذا بقیہ عام اوقاف میں بھی یہی ہونا چاہئے۔

بعض حضرات نے مسجد اور دیگر اوقاف میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ مسجد تو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اس میں عبادت کے علاوہ اور کوئی ملکیتی تصرفات واقف یا کوئی اور نہیں کرسکتا، جبکہ دیگر اوقاف میں ملکیتی تصرفات فی الجملہ ہوتے ہیں اس لئے دیگر اوقاف کو مسجد پر قیاس کرنا درست نہیں۔

علامہ ابن الہمام تحریر فرماتے ہیں:

حاصله أن المسجد جعل لله تعالىٰ على الخلوص محرراً عن أن يملك العباد فيه شيئاً غير العبادة فيه و ما كان كذلك خرج عن ملك الخلق أجمعين اصله الكعبة و الوقف غير المسجد ليس كذلك بل ينتفع العباد بعينه زراعة وسكنى وغيرهما كما ينتفع بالمملوكات. (۱)

فرق کا حاصل یہ ہے کہ مسجد خالص اللہ تعالیٰ کے لئے بنائی جاتی ہے اس میں انسان عبادت کے علاوہ کسی اور چیز کا مالک نہیں ہوتا اور جو چیز ایسی ہو وہ مخلوق کی ملکیت سے نکل جاتی ہے جیسے خانہ کعبہ، اور مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف ایسے نہیں ہوتے، انسان اس سے دیگر فوائد بھی اٹھا سکتا ہے جیسے زراعت، رہائش وغیرہ جیسے وہ اپنی دیگر مملوکات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

لیکن اگر مسجد کے احکام میں غور کیا جائے تو اس میں بھی مصالحِ مسجد کا لحاظ رکھتے ہوئے فقہاء کرام نے بعض ایسی چیزوں کی اجازت دی ہے جو ایک طرح سے ملکیتی تصرفات کے ذیل میں آتی ہے مثلاً مسجد

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۲/۵)

بناتے وقت واقف نے یہ نیت کی کہ اس کے اوپر امام کا گھر ہوگا تو اس کی اجازت ہے اور امام مسجد کے اوپر بنائے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کرسکتا ہے۔[1] حالانکہ مسجد تو تحت الثری سے عنان السماء تک مسجد ہی ہوتی ہے اس میں یہ ملکیتی تصرف مسجد کی مصالح کے پیش نظر اختیار کرلیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد اور دیگر اوقاف میں صرف تصرفات کی نوعیت کا فرق ہے ورنہ دونوں طرح کے اوقاف میں عبادت کے علاوہ دیگر تصرفات کسی حد تک جائز ہیں، اس لئے مسجد اور دیگر اوقاف کے احکام میں ملکیت کے اعتبار سے فرق نہیں ہونا چاہئے۔

دوسری وجہِ ترجیح:

اگر شئِ موقوف وقف کرنے کے بعد بھی واقف کی ملکیت میں رہے، یا موقوف علیہم کی ملکیت میں منتقل ہوجائے تو انہیں اس میں تصرف کا اختیار بھی ہونا چاہئے حالانکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ واقف کو اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ موقوف علیہم کو اس میں تصرف کا اختیار نہیں دیتے۔

تیسری وجہِ ترجیح:

اگر شیئِ موقوف کو واقف ہی کی ملکیت میں رکھا جائے یا موقوف علیہم کی ملکیت قرار دیا جائے تو ممکن ہے واقف کی زندگی تک تو اس کے منافع متعینہ جہت پر خرچ کئے جاتے رہیں، لیکن واقف کے انتقال کے بعد اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس کے ساتھ عام ذاتی املاک کا سا برتاؤ کیا جائے اور مقصدِ وقف حاصل نہ ہوسکے، اس لئے احتیاط کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اسے حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیدیا جائے تاکہ ان تمام خدشات سے حفاظت ہوسکے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی وجہ سے جمہور کا قول ہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور موقوف علیہ کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی بلکہ حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں منتقل ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں منتقل ہونے کا مطلب:

اب تنی بات رہ جاتی ہے کہ جمہور کے موقف کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں منتقل ہونے کا کیا

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/ ۲۵۱)

مطلب ہے؟ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے، وقف کرنے کے بعد اللہ رب العزت کی ملکیت میں چلے جانے کے کیا معنی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں وقف کرنے سے پہلے بھی موقوفہ چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوتی ہے اور وقف کرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں رہتی ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ وقف کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ملکیت کے تمام احکام، تصرفات اور اختیارات انسان کو مالکِ مجازی کی حیثیت سے دیئے ہوئے تھے، لیکن وقف کرنے کے بعد یہ سارے ملکیتی تصرفات واختیارات مالک مجازی سے خالصۃً اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوگئے، گویا کہ ملکیت حقیقی تو اللہ رب العزت کی تھی ہی اب ملکیتِ حکمی ومجازی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہوگئی، کسی اور کے اس میں ملکیتی تصرفات جائز نہیں رہے، ہاں وقف کے مقاصد کے حصول و تکمیل کے لئے جن تصرفات واختیارات کی ضرورت ہے اس کا اختیار متولی وناظر کو نیابۃً دیدیا گیا۔[1]

خلاصہ بحث:

خلاصہ یہ ہے کہ وقف کے حکم میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے اختلاف کا منشاء دو باتیں تھیں ایک مسئلہ لزومِ وقف اور دوسرا مسئلہ ملکیتِ وقف۔

ہم دونوں مسئلوں پر تفصیلی کلام کر چکے ہیں اور یہ ثابت کر چکے ہیں کہ لزومِ وقف اور ملکیت وقف میں جمہور ہی کا قول راجح ہے کہ وقف کرنے سے وقف لازم ہوجاتا ہے اور موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے اس لئے اب راجح قول کے مطابق وقف کا حکم یہ ہوا:

قول راجح کے مطابق وقف کا حکم:

وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر حکماً اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے اور واقف کو اس میں مالکانہ تصرف کا اختیار نہیں رہتا، وہ نہ اس سے رجوع کرسکتا ہے اور نہ ہی اسے بیچ سکتا ہے اور نہ ہی ہبہ کرسکتا ہے، واقف کے انتقال کے بعد اس میں اس کی میراث بھی جاری نہیں ہوگی۔

---

(۱) الرافعی، عبد القادر الرافعی، تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۴/۷۴)
"انها محبوسة على حكمه تعالىٰ و تصرفه بحيث يكون له لالغيره من الواقف وغيره الا مايثبته الشارع لغيره و حينئذ فالمناسب ان يقال زاد لفظ "حكم" اشارة الى أن الأشياء قبل الايقاف محبوسة على ملكه تعالىٰ و كذا بعده وبه صار أثر الملک يعنى أحكامه انما هى له تعالىٰ لالغيره بخلاف ما قبله فانه تعالىٰ فوض أحكام الملک من بيع وغيره لغيره تعالىٰ مع كونه هو المالک الحقيقى. و كذا فى نهاية المحتاج، :۵. ۳۸۵."

وقف کی فقہی حیثیت

وقف شخص قانونی ہے:

وقف کے احکام کا اگر جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقف خود اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے، شخصِ حقیقی میں جو اوصاف پائے جاتے ہیں تقریباً وہ تمام اوصاف وقف میں پائے جاتے ہیں اسی وجہ سے بعض معاصر علماء نے وقف کو شخصِ حکمی یا شخصِ قانونی (Juristic Person) قرار دیا ہے، شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء المدخل الفقہی العام میں فرماتے ہیں:

و کذلک نظام الوقف فی الاسلام، فان نظامه منذ اول نشأته فی عهد الرسول صلی الله علیه وسلم یقوم علی أساس اعتبار شخصیة حکمیة للوقف. (۱)

اسی طرح اسلام میں وقف کا نظام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اپنے ابتدائی آغاز ہی سے ''شخص حکمی'' کی بنیاد پر قائم ہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز عزت الخیاط اپنی کتاب ''الشرکات'' میں تحریر فرماتے ہیں:

فتثبت بهذه الاحکام وغیرها أن للوقف والمسجد و بیت المال ذمة، والذمة مناط أهلیة الوجوب فکان لها اذن شخصیة معنویة بالتعبیر الحدیث. (۲)

ان احکامات سے ثابت ہوتا ہے کہ وقف مسجد اور بیت المال کا ایک ''ذمہ'' ہے اور ''ذمہ'' ہونا ہی اہلیتِ وجوب کا مدار ہے لہٰذا ایسی صورت میں جدید تعبیر کے مطابق ان کے لئے شخصیہ معنویہ ثابت ہوگئی۔

---

(۱) الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء، المدخل الفقهی العام، دمشق، ادیب، الطبعة التاسعة ۱۹۶۷م (۲۵۹/۳)

(۲) الخیاط، الدکتور عبد العزیز عزت الخیاط. الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی، بیروت، مؤسسة الرسالة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۲۱۹/۱)

استاذ محترم حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں:

وقف اس کے لئے اگر چہ شخصِ قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخصِ قانونی ہے ...... مالک ہونا، دائن ہونا، مدیون ہونا، مدعی یا مدعیٰ علیہ ہونا شخص کے اوصاف میں سے ہے، معلوم ہوا کہ وقف میں شخصِ قانونی کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں، گو فقہاء نے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی۔ (۱)

مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ وقف شخصِ حکمی یا شخصِ قانونی ہے، بعض حضرات نے اسی نظریہ کو دوسرے الفاظ میں تعبیر کیا ہے کہ وقف کے لئے ضروری ہے کہ وہ ابتداہی سے یا انتہاءاً ایسی جہت پر وقف ہو جو ہمیشہ باقی رہنی والی ہو، جیسے فقراء، مسجد و مدرسہ وغیرہ، یہ جہت دائمہ درحقیقت شخص حکمی ہے اور شئی موقوفہ اسی شخصِ حکمی کی ملکیت ہے۔ شیخ زرقاء تحریر فرماتے ہیں:

وسيأتي أن كل وقف لابد لصحته من أن يكون فيه جهة خيرية دائمة يوقف عليها كالفقراء والمسجد والمدرسة ونحوها، فهذه الجهة تعتبر شخصياً حكمياً مالكاً للموقوف الذى يعتبر بذلك من الأموال العامة. (۲)

عنقریب یہ بات آئے گی کہ وقف کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کسی ایسی جہت خیر کا ذکر ہو جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہو، اس پر وقف کیا جائے، جیسے فقراء، مسجد و مدرسہ وغیرہ، یہ جہت شخصِ حکمی سمجھی جاتی ہے جو کہ شئی موقوف کی مالک ہوتی ہے اسی وجہ سے اسے اموالِ عامہ کی قبیل سے سمجھا جاتا ہے۔

یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے بہرحال اگر اس نظریہ کو تسلیم کرلیا جائے تو بہت سے اشکالات جو ملکیت وقف سے متعلق جمہور کے موقف پر پیدا ہوتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گے، اس لئے اس مسئلہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے اور فقہی جزئیات کی روشنی میں یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے وقف کے لئے شخصِ حقیقی میں پائے جانے والے اوصاف ثابت کئے ہیں یا نہیں؟ لیکن اس سے پہلے شخصِ قانونی کی تعریف اور شریعت میں اس کے ثبوت پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

---

(۱) عثمانی، محمد تقی العثمانی، اسلام اور جدید معشیت و تجارت، کراچی، ادارة المعارف (۸۰) و كذا فی تكملة فتح الملهم (۱۲۵/۲)

(۲) الزرقاء، مصطفى احمد الزرقاء. احكام الاوقاف، دمشق (۲۵/۱)

شخصِ قانونی (حکمی، معنوی) کی تعریف:

شیخ مرزوقی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الوصف القائم بالشئی بحیث یکون له وجود حکمی مستقل و ذمة تؤهله لأن یکون له حقوق و علیه واجبات. (۱)

کسی چیز کا مستقل وجود حکمی ہونا اور اس کا ایسا ذمہ ہونا کہ جو اسے اس بات کا اہل بنائے کہ اس کے لئے حقوق ثابت کئے جاسکیں اور اس کے ذمہ واجبات مقرر کئے جاسکیں۔

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء لکھتے ہیں:

الشخص الاعتباری هو شخص یتکون من عناصر أشخاص أو اموال یقدر له التشریع کیاناً (قانونیاً) مستمداً منها مستقلا عنها (قابلا للالزام والالتزام). (۲)

شخصِ اعتباری وہ شخص ہے جو کچھ اشخاص یا اموال کے عناصر سے مل کر بنے، اس کے لئے مستقل حیثیت سے قانونی طور پر احکام ثابت کئے جاسکیں، وہ اس قابل ہو کہ اس پر کوئی چیز لازم کی جاسکے اور وہ خود بھی کسی چیز کو اپنے ذمہ میں لازم کر سکے۔

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو شخصِ قانونی کا وجود محض اعتباری اور فرضی ہوتا ہے، جبکہ شخصِ حقیقی کا وجود حسی ہوتا ہے، اور دوسرے شخص قانونی ہمیشہ اشخاص حقیقی یا اموال کے مجموعہ کے تابع ہوتا ہے جنی ان کے بغیر شخصِ قانونی کا وجود نہیں ہوسکتا، جبکہ شخصِ حقیقی اپنے وجود میں مستقل ہوتا ہے کسی کے تابع ہیں ہوتا، تیسرے یہ کہ مستقل طور پر اس کے حقوق ہوتے ہیں اور اس کے ذمہ واجبات بھی ہوتے ہیں اس بں الزام اور التزام دونوں کی صلاحیت ہوتی ہے۔

شریعت اسلامیہ میں شخصِ قانونی کا ثبوت:

شریعت میں اگرچہ شخصِ قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی لیکن اس کی نظائر موجود ہیں، ذیل ں چند نظائر ذکر کی جاتی ہیں۔

---

(۱) المرزوقی، الدکتور صالح بن زابن المرزوقی. شرکة المساهمة فی النظام السعودی. مکة المکرمة، مطابع صفاء ۱۴۰۶ھ (۱۹۶)

(۲) الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء، المدخل الفقهی العام، دمشق، ادیب، الطبعة التاسعة ۱۹۶۷م (۲۷۳/۳)

ا۔ بیت المال:

بیت المال کے مال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، اور بیت المال دوسروں کو مالک بھی بناتا ہے، اسی طرح وہ ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا مستحق بھی بیت المال ہوتا ہے، مقدمات میں بیت المال فریق بھی بنتا ہے اگرچہ اس کی نمائندگی امین بیت المال کرتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ تمام اوصاف شخص کے ہیں وہی مالک بنتا ہے اور وہی مستحق و مدعی بنتا ہے، معلوم ہوا کہ شرعاً بیت المال کو شخص حکمی و قانونی فرض کیا گیا ہے، بلکہ فقہاء کرام کی عبارات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر مد ایک مستقل شخصِ قانونی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بیت المال کی چار مدات ہیں:

ا۔ بیت مال الخراج والجزیہ ۲۔ بیت مال الزکاۃ والعشر

۳۔ بیت خمس الغنائم ۴۔ بیت اللقطات والترکات التی لا وارث لھا

ان تمام مدات کے مصارف الگ الگ ہیں اور امام کی ذمہ داری ہے کہ ہر مد کا الگ انتظام رکھے، حتی کہ اگر کبھی کسی مد میں رقم نہ ہو تو دوسری مد سے قرض لے لے لیکن اس مد میں رقم آجانے پر وہ قرض کی رقم دوسری مد کو واپس کرے، علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وعلى الامام أن يجعل لكل نوع من هذه الأنواع بيتا يخصه فلا يخلط بعضه ببعض، لأن لكل نوع حكماً يختص به، فان لم يكن في بعضها شئى فللامام أن يستقرض عليه من النوع الآخر و يصرفه الى أهل ذلك، ثم اذا حصل من ذلك النوع شئى رده الى المستقرض منه. (۱)

اور امام پر لازم ہے کہ ان مدات میں ہر مد کے لئے ایک مخصوص بیت مقرر کرے، انہیں آپس میں خلط ملط نہ کرے، کیونکہ ہر مد کے مخصوص احکام ہیں، اگر ان مدات میں سے کسی میں کچھ نہ رہے تو امام کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی دوسری مد میں سے قرض لے لے اور اس مد کے مصارف پر خرچ کرے، پھر اگر اس مد میں کچھ آجائے تو جس مد سے قرض لیا تھا اسے قرض واپس لوٹا دے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۱۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ جس مد سے قرض لیا گیا ہے وہ دائن اور جس مد کے لئے قرض لیا گیا ہے وہ مدیون ہے، دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال اور اس کی مختلف مدات کو شخصِ حکمی و قانونی قرار دیا گیا ہے۔(۱)

۲۔ مملکت:

دوسری نظیر مملکت ہے، دولۃ اور مملکت ایک شخصِ حکمی و قانونی ہے جس کی نمائندگی تصرفات، حقوق، واجبات اور مصالح میں رئیس مملکت اور سلطان کرتا ہے۔

چنانچہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حکومت کے وزراء، عمال وغیرہ سلطان کے مرنے سے معزول نہیں ہوں گے، کیونکہ سلطان کی حیثیت تو صرف مملکت کے نمائندہ کی ہے۔(۲) یہ تمام وزراء اور عمال مملکت کے ملازم ہیں، اور مملکت بہرصورت باقی ہے کیونکہ مملکت عامۃ المسلمین کے مجموعہ کا نام ہے۔

اسی طرح علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع الصنائع میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر قاضی سے فیصلہ میں غلطی ہوگئی مثلاً گواہی کی بنیاد پر اس نے چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیدیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ گواہ قابلِ اعتماد نہیں تھے تو اب ہاتھ کاٹنے کا ضمان نہ قاضی پر آئے گا اور نہ ہی جلاد پر بلکہ یہ دیت حکومت ادا کرے گی، کیونکہ قاضی حکومت اور عامۃ المسلمین کی خدمت انجام دے رہا ہے لہٰذا اس کی غلطی کی ذمہ داری بھی مملکت پر ہوگی۔ علامہ لکھتے ہیں:

> الأصل أن القاضي اذا اخطأ في قضائه بأن ظهر ان الشهود كانوا عبيداً أو محدودين في قذف أنه لايؤاخذ بالضمان، لأنه بالقضاء لم يعمل لنفسه بل لغيره فكان بمنزلة الرسول فلا تلحقه العهدة ...... وأما اذا كان من حقوق الله عزوجل خالصاً فضمانه في بيت المال، لأنه

---

(۱) دیکھئے: عثمانی، محمد تقی العثمانی، اسلام اور جدید معیشت و تجارت، کراچی، ادارۃ المعارف (۸۰) شرکۃ المساھمۃ فی النظام السعودی (۲۰۸) الشرکات فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الوضعی (۱/۲۱۸)

(۲) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۵/۳۹۳) و کذا فی بدائع الصنائع (۵/۴۶۰) یقول العلامۃ الکاسانیؒ: والخليفة اذا مات أو خلع لا تنعزل قضاته وولاته ...... والقاضي لايعمل بولاية الخليفة وفي حقه بل بولاية المسلمين وفي حقوقهم، وانما الخليفة بمنزلة الرسول عنهم لهذا لم تلحقه العهدة كالرسول في سائر العقود والوكيل في النكاح واذا كان رسولاً كان فعله بمنزلة فعل عامة المسلمين وولايتهم بعد موت الخليفة باقية فبقي القاضي على ولايته."

عـمل فيها لعامة المسلمين لعود منفعتها اليهم وهو الزجر فكان خطأه عـليهـم لـما قلنا فيؤدى من بيت مالهم ولا يضمن القاضى لما قلنا ولا الجلاد ايضاً لأنه عمل بأمر القاضى.(۱)

اصل یہ ہے کہ جب قاضی سے فیصلہ میں غلطی ہو جائے مثلاً گواہوں کا غلام ہونا یا محدود فی القذف ہونا ظاہر ہو جائے تو قاضی پر ضمان نہیں آئے گا، کیونکہ قاضی نے فیصلہ کر کے اپنا کوئی کام نہیں کیا بلکہ دوسروں کا کام کیا ہے، لہٰذا اس کی حیثیت محض پیغام رساں کی ہے، اس پر کوئی ذمہ داری نہیں آئے گی، اگر یہ فیصلہ خالص حق اللہ کے بارے میں کیا گیا ہو تو اس کا ضمان بیت المال پر آئے گا کیونکہ اس نے یہ فیصلہ عامۃ المسلمین کے فائدہ کے لئے کیا تھا کہ مجرم جرم سے رک جائے، لہٰذا اس کی غلطی بھی عامۃ المسلمین پر ہوگی اور ان کے بیت المال سے ضمان ادا کیا جائے گا قاضی پر ضمان نہیں ہوگا اور جلاد پر بھی ضمان نہیں آئے گا کیونکہ اس نے تو قاضی کے کہنے پر عمل کیا۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ فقہاء نے مملکت اور دولۃ کو شخص حکمی و قانونی فرض کیا ہے، اس کے لئے اہلیت اور مستقل ذمہ کا بھی اعتراف کیا ہے البتہ اس کی نمائندگی سلطان اور دیگر عمالِ مملکت کرتے ہیں۔(۲)

۳۔ ترکہ مستغرقہ بالدین:

شخص قانونی کی تیسری نظیر ترکہ مستغرقہ بالدین ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مقروض انسان اس حالت میں مر جائے کہ اس کا سارا ترکہ قرض کی رقوم کے برابر ہو، یعنی قرض ادا کرنے کے بعد اس میں کچھ نہ بچے تو اس صورت میں قرض خواہ کا مدیون نہ میت ہے (اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی مدیون نہیں ہوتا) اور نہ ورثاء مدیون ہیں کیونکہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں، لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا، حالانکہ دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ ترکہ کو بھی شخصِ قانونی مانا گیا ہے۔(۳)

---

(۱) الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۴۵۹/۵)

(۲) الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء، المدخل الفقهی العام، دمشق، ادیب، الطبعة التاسعة ۱۹۶۷م (۲۶۱/۳)

(۳) عثمانی، محمد عمران اشرف عثمانی، شرکت و مضاربت عصر حاضر میں، کراچی، ادارة المعارف، طبع اول ۲۰۰۰م (۳۲۳)

۴۔ خلطۃ الشیوع:

چوتھی نظیر خلطۃ الشیوع ہے یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق تو نہیں بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر مالِ زکوۃ کئی افراد کی مشترک ملکیت ہو تو زکوۃ ہر شریک کے انفرادی حصہ پر واجب نہیں ہوتی بلکہ مجموعہ پر ہوتی ہے، مثلاً سو بکریاں اگر دو آدمیوں میں مشترک ہوں تو زکوٰۃ ہر شخص کے الگ حصے پر واجب نہیں ہوگی، بلکہ مجموعی سو بکریوں پر واجب ہوگی، چنانچہ صرف ایک بکری زکوٰۃ میں دی جائے گی، حالانکہ اگر ہر شخص کے الگ حصے پر زکوٰۃ واجب ہوتی تو پچاس پچاس بکریاں ہر ایک کے حصے میں آنے کی وجہ سے ہر شخص پر ایک ایک بکری علیحدہ واجب ہوتی، لیکن صرف ایک بکری مجموعہ پر واجب ہورہی ہے معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قابلِ زکوٰۃ مال کا مجموعہ ایک شخصِ قانونی و حکمی ہے۔[1]

۵۔ کمپنی:

موجودہ دور میں شخصِ قانونی کی واضح نظیر ''کمپنی'' ہے، معاصر فقہاء کرام نے اسے شخصِ قانونی و حکمی قرار دیا ہے اور قانون بھی اسے ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع و شراء کرسکتا ہے مدعی اور مدعی علیہ ہوسکتا ہے، اور دائن مدیون بن سکتا ہے، یہ ساری صفات شخص حقیقی کی ہیں جنہیں کمپنی کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔

استاذ محترم شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم فرماتے ہیں:

> یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترھویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لئے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کرسکتے تھے تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کر کے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا، اس نظام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کی الگ الگ ملکیت متصور ہوتی ہے مگر اس نظام میں کئی افراد کے مجموعہ کو ایک شخص قانونی قرار دیا جاتا ہے، جس کی وضاحت انشاءاللہ آگے آئے گی۔ اس شخصِ قانونی کو کارپوریشن کہتے ہیں جس کی ایک قسم کمپنی ہے...... کارپوریٹ لاءاتھارٹی کی طرف سے اجازت مل گئی تو اب کمپنی وجود میں آچکی ہے اور قانون اب اس کو

---

(۱) دیکھئے: عثمانی، محمد تقی العثمانی، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، کراچی، ادارۃ المعارف (۱۸۱)

ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے، جو بیع وشراء کرے گا مدعی ومدعی علیہ بنے گا، دائن اور مدیون ہوگا۔[1]

ان تمام نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصِ قانونی کا تصور فی نفسہٖ کوئی ناجائز تصور نہیں اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی نامانوس تصور ہے، البتہ یہ اصطلاح جدید ضرور ہے۔

وقف اور شخصِ قانونی

وقف کے فقہی احکام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام نے وقف کو بھی شخصِ قانونی و حکمی فرض کیا ہے اس کے لئے بھی شخص حقیقی کے اوصاف ثابت کئے ہیں، مثلاً:

ا۔ وقف میں مالک بننے کی صلاحیت ہے:

مختلف فقہی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ وقف میں مالک بننے کی صلاحیت ہے مسجد یا وقف کو چندہ دیا جائے یا کوئی اور چیز دی جائے تو وہ چندہ یا دیگر عطایات وقف نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے وقف ہونے کی تصریح نہ کردی جائے، بلکہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں اور وقف ان کا مالک ہوتا ہے۔ علامہ اندریتی رحمہ اللہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

ولو قال وهبت داری للمسجد أو أعطيتها له صح ويكون تمليكاً ......
وفی مجموع النوازل: سئل شيخ الاسلام ابو الحسن عن رجل قال وقفت داری علی مسجد كذا ولم يزد علی هذا وسلمها الی المتولی صح وان لم يشترط التابيد ولم يجعل آخره للفقراء، قال وعلی هذا يكون تمليكا للمسجد وهبة فيتم بالقبض، واثبات الملك للمسجد يصح، وكذا من اعطی دراهم فی عمارة المسجدأ ونفقة المسجد أو مصالح المسجد يصح، وكذا اذا اشتری المتولی عبدا يخدم المسجد يصح كل ذلك، فصح هذا بطريق التمليك بالهبة وان كان لايصح بطريق الوقف.[2]

---

(۱) دیکھئے: عثمانی، محمد تقی العثمانی، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، کراچی، ادارۃ المعارف (۱۸۱)

(۲) الاندريتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندريتی. الفتاوی التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ١٤١١ھ (٥٥/٥ ـ ٨٥٣)

اگر کسی نے کہا کہ میں نے اپنا گھر مسجد کو ہبہ کردیا یا اسے دیدیا تو یہ صحیح ہوگا اور یہ مسجد کو مالک بنانا ہوگا...... مجموع النوازل میں ہے کہ شیخ الاسلام ابوالحسن سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی نے کہا کہ میں نے اپنا گھر فلاں مسجد پر وقف کردیا اور اس نے اس سے آگے مزید کچھ نہیں کہا اور گھر متولی کے حوالہ کردیا تو کیا یہ صحیح ہوجائے گا؟ حالانکہ اس نے نہ تو تابید کی شرط لگائی ہے اور نہ اسے بالآخر فقراء کے لئے قرار دیا ہے؟ شیخ نے فرمایا یہ مسجد کو ہبۃً مالک بنانا ہے لہٰذا قبضہ سے ہبہ تام ہوجائے گا، اور مسجد کے لئے ملکیت ثابت کرنا صحیح ہے، اسی طرح مسجد کی عمارت، اخراجات اور مصالح کے لئے اگر کسی نے کچھ درہم دئے تو یہ صحیح ہے اور اسی طرح اگر متولی نے مسجد کی خدمت کے لئے کوئی غلام خریدا تو یہ بھی صحیح ہے، ان تمام صورتوں کو وقف قرار دے کر تو صحیح نہیں کہا جاسکتا، ہاں ان سب صورتوں میں ہبۃً مسجد کو مالک بنا کر انہیں صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

رجل أعطى درهما فی عمارة المسجد أو نفقة المسجد أو مصالح المسجد صح ...... فاثبات الملک للمسجد على هذا الوجه صحيح فيتم بالقبض ...... ولو قال وهبت داری للمسجد أو أعطيتها له صح ويكون تمليكا فيشترط التسليم كما لو قال وقفت هذه المائة للمسجد يصح بطريق التمليک اذا سلمه للقيم.[1]

ایک شخص نے مسجد کی تعمیر یا اخراجات یا مصالح کے لئے درہم دیئے تو مسجد کو اس طرح مالک بنانا صحیح ہے اور یہ ہبہ قبضہ سے مکمل ہوجائے گا اور اگر کسی شخص نے کہا کہ میں نے اپنا گھر مسجد کو ہبہ کیا یا اسے دیدیا تو یہ صحیح ہے یہ مسجد کو مالک بنانا ہے لہٰذا تسلیم شرط ہوگی، جیسے کسی نے کہا کہ یہ سو درہم میں نے مسجد کے لئے وقف کئے تو یہ مسجد کو مالک بنانے کی حیثیت سے درست ہوگا کہ درہم قیم کے حوالہ کردیئے جائیں۔

اسی طرح کے اور جزئیات جامع الفصولین اور فتاویٰ انقرویہ میں بھی پائے جاتے ہیں جن سے معلوم

---

(۱) نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاوى الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۲/۴۶۰)

ہوتا ہے کہ مسجد میں مالک بننے کی صلاحیت ہے۔[1]

ماہنامہ البلاغ میں ایک سوال کے جواب میں استاذ محترم حضرت مولانا محمود اشرف عثمانی زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں:

پہلی اور دوسری عبارت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص اپنی کوئی رقم مسجد (یا مدرسہ) کے حساب میں جمع کرادے تو وہ رقم اس شخص کی ملکیت سے نکل کر مسجد کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے۔[2]

صرف فقہ حنفی ہی میں نہیں بلکہ دیگر ائمہ کے یہاں بھی ایسی نصوص پائی جاتی ہیں، چنانچہ فقہ مالکی کی مشہور کتاب شرح الزرقانی علی مختصر سیدی خلیل میں ہے:

(الموقوف عليه) يجب أن يكون اهلاً للملك حكماً كالمسجد أو حسا كالأدمى. [3]

موقوف علیہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں مالک بننے کی صلاحیت ہو چاہے حکماً جیسے مسجد یا حساً جیسے آدمی۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ مسجد میں حکماً مالک بننے کی صلاحیت ہے۔

مشہور شافعی فقیہ علامہ رملی اپنی کتاب نہایۃ المحتاج میں فرماتے ہیں:

والأصح جواز بيع حصر المسجد اذا بليت وجذوعه اذا انكسرت أو أشرفت على الانكسار ...... ومحل الخلاف فى الموقوفة ولو بأن اشتراها الناظر ووقفها بخلاف المملوكة للمسجد بنحو شراء فانها تباع جزماً. [4]

مسجد کی چٹائیاں جب وہ پرانی ہوجائیں یا مسجد کے شہتیر جب وہ ٹوٹ جائیں اصح قول کے مطابق انہیں بیچنا جائز ہے، محلِ اختلاف وہ چٹائیاں یا شہتیر ہیں جو وقف ہوں اگرچہ انہیں

---

(۱) دیکھئے: الانکوری، محمد بن حسین الانکوری. فتاوی الانقرویه، بولاق، المطبعة المصرية (۱/۲۲۰) ابن سماوه، محمود بن اسماعيل الشهير بابن قاضى سماوه. جامع الفصولين، کراچی، اسلامی کتب خانه ۱۴۰۲ھ (۱/۱۸۸)

(۲) دارالعلوم، جامعه دارالعلوم کراچی. ماهنامه البلاغ جلد۳۳ شماره: ۳ ربيع الاول ۱۴۱۹ھ

(۳) الزرقانی، السيد عبد الباقى الزرقانى. شرح الزرقانى على مختصر خليل، بيروت، دار الفكر، الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۱م (۷/۸۰)

(۴) الرملی، محمد بن ابى العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدين الرملى. نهاية المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربى. (۵/۳۹۲)

متولی نے خرید کر ہی وقف کیوں نہ کیا ہو۔ بخلاف ان چٹائیوں یا شہتیروں کے جو مسجد کے مملوک ہیں انہیں بہر صورت بیچا جائے گا۔

اس عبارت میں واضح طور پر مسجد کی چٹائی اور شہتیر کو مسجد کا مملوک قرار دیا گیا ہے اسی طرح حنابلہ کے یہاں وقف کے صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ وقف ایسی ذات پر کیا جائے جس میں مالک بننے کی صلاحیت ہو، اس کے باوجود انہوں نے مساجد اور سقایات وغیرہ پر وقف کو جائز قرار دیا ہے۔[1] اس سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی مساجد و دیگر اوقاف میں مالک بننے کی صلاحیت ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ تمام فقہاء اربعہ کے یہاں وقف میں مالک بننے کی صلاحیت ہے جو کہ شخصِ حقیقی کے اوصاف میں سے ہے۔

۲۔ وقف کو حقِ شفعہ حاصل ہوتا ہے:

وقف کو حق شفعہ بھی حاصل ہوتا ہے، ایک مشترک زمین میں ایک شریک نے اپنے حصہ کو مسجد بنا دیا، دوسرا شریک اگر اپنا حصہ بیچے گا تو وقف کو حق شفعہ حاصل ہوگا اور ناظر وقف شفعہ میں وقف کی نمائندگی کرے گا۔ شیخ زکریا انصاری فتح الوہاب بشرح منہج الطلاب میں فرماتے ہیں:

کمسجد له شقص لم یوقف فباع شریکه یاخذ له الناظر بالشفعه. [2]

مسجد کے برابر کا حصہ جو وقف نہیں اس کے مالک نے اسے بیچا تو ناظر حق شفعہ دائر کر کے وہ لے لے گا۔

شفعہ کا حقدار ہونا شخصِ حقیقی کے اوصاف میں سے ہے جسے فقہاء کرام نے وقف کے لئے بھی ثابت کیا ہے۔

۳۔ وقف دائن اور مدیون بھی بنتا ہے:

وقف دائن اور مدیون بھی بنتا ہے، مثلاً اگر وقف کے فنڈ میں رقم نہ ہو اور وقف کو رقم کی اشد

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۱۵۴۱. ۰۶۲۰ه. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۵/۸)

(۲) الانصاری، شیخ الاسلام زکریا بن محمد بن احمد بن زکریا الانصاری. فتح الوهاب بشرح منهج الطلاب، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۸م (۴۰۷/۱) وراجع: علیش، محمد علیش المالکی. منح الجلیل علی مختصر خلیل، بیروت، دار الفکر (۵۸۴/۳)

ضرورت ہو تو متولی وقف وقف کے لئے قرض لے سکتا ہے اور یہ قرض متولی پر نہیں ہوگا بلکہ وقف پر ہوگا اور وقف مدیون کہلائے گا۔[1]

اگر وقف کی فنڈ میں ضرورت سے زائد رقم ہو اور اچانک کوئی شدید ملکی ضرورت سامنے آجائے مثلاً کسی نے ملک پر حملہ کر دیا اور بیت المال میں انتظامات کے لئے فنڈ نہ ہو تو ایسی صورت میں قاضی کے لئے گنجائش ہے کہ وہ وقف کے فنڈ سے بقدرِ ضرورت رقم بطور قرض بیت المال کو دیدے ایسی صورت میں وقف دائن ہوگا اور بیت المال مدیون۔ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو اجتمع مال للوقف ثم نابت نائبة من الكفرة فاحتيج الى مال لدفع شرهم قال الشيخ الامام ماكان من غلة وقف المسجد الجامع يجوز للحاكم ان يصرفه الى ذلک على وجه القرض. [2]

اگر واقف کا مال جمع ہو اور کفار کی طرف سے کوئی حملہ ہو جائے اور ان کے شر کو دور کرنے کے لئے مال کی ضرورت ہو تو شیخ نے فرمایا کہ مسجد کے وقف کی آمدنی حاکم کے لئے اس کام میں بطور قرض خرچ کرنا جائز ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں اس جزئیہ پر یہ اضافہ ہے:

فللقاضي أن يصرف ذلک على وجه القرض فيكون دينا فى مال الفئى. [3]

قاضی کے لئے مسجد کی آمدنی کفار کے اس شر کو دور کرنے کے لئے خرچ کرنا جائز ہے لیکن یہ بطور قرض ہوگا اور مال فئی کی مد پر دین ہوگا۔

اسی طرح اگر امام یا مدرس وغیرہ نے اپنی خدمات انجام دیں لیکن حق الخدمت وصول کرنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی یہ تنخواہ وقف پر دین ہوگی، اور ان کے ورثہ کو ادا کی جائے گی۔[4]

---

(۱) دیکھئے: نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادى عشر. الفتاوى الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۴۲۴/۲) "وتفسير الاستدانة أن لاتكون للوقف غلة فيحتاج الى القرض والاستدانة، اما اذا كان للوقف غلة فأنفق من مال نفسه لاصلاح الوقف كان له أن يرجع بذلک فى غلة الوقف."

(۲) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۵۰/۵)

(۳) نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرآن الحادى عشر. الفتاوىٰ الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۴۶۴/۲)

(۴) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴۱۷/۴)

۴۔ وقف موجر اور مستاجر بنتا ہے:

وقف موجر اور مستاجر بھی بنتا ہے چنانچہ علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے الدر المختار میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر متولی وقف نے وقف کی زمین اجارہ پر دی اور پھر متولی کا انتقال ہو گیا تو یہ اجارہ فسخ نہیں ہوگا، حالانکہ اصول تو یہ ہے کہ احد العاقدین کے انتقال سے اجارہ فسخ ہو جاتا ہے اس صورت میں فسخ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حقیقت میں موجر متولی نہیں ہے بلکہ خود وقف یعنی جہت وقف موجر ہے، اور جہتِ وقف باقی ہے لہٰذا اجارہ فسخ نہیں ہوگا، معلوم ہوا کہ جہت وقف کو موجر بھی قرار دیا گیا ہے، اسی طرح وقف مستاجر بھی بن سکتا ہے۔

۵۔ وقف مدعی اور مدعی علیہ بھی بن سکتا ہے:

وقف مدعی اور مدعی علیہ بھی بن سکتا ہے اگر چہ اس کی طرف سے پیروی اور نمائندگی متولی وقف کرے گا۔(1)

مذکورہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوا کہ وقف مالک، دائن اور مدیون، موجر و مستاجر اور مدعی و مدعی علیہ بن سکتا ہے اور وقف کو حقِ شفعہ بھی حاصل ہوتا ہے حالانکہ یہ تمام اوصاف شخصِ حقیقی کے اوصاف ہیں جنہیں وقف کے لئے ثابت کیا گیا ہے معلوم ہوا کہ وقف کو شخص حکمی و قانونی فرض کیا گیا ہے اگر چہ فقہاء کرام نے اس کے لئے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی لیکن جیسا کہ ہم پیچھے تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں کہ یہ اصطلاح اگر چہ جدید ہے لیکن اس کے نظائر شریعت میں موجود ہیں اس لئے ان نظائر کی روشنی میں اگر وقف کے لئے بھی یہ اصطلاح استعمال کی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

خلاصہ یہ کہ وقف کی فقہی حیثیت شخص قانونی کی ہے اس اصطلاح کے تناظر میں اگر وقف کے حکم کے سلسلہ میں جمہور علماء کے مسلک کو دیکھیں تو وہ سارے اشکالات دور ہو جاتے ہیں جو اس فقہی حیثیت کو پیش نظر نہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

---

(۱) عثمانی، محمد تقی العثمانی، اسلام اور جدید معشیت و تجارت، کراچی، ادارۃ المعارف (۸۰)

ٹرسٹ

انگلش قانون میں وقف سے ملتی جلتی ایک شکل ملتی ہے جسے ٹرسٹ کہا جاتا ہے، عام طور پر اسے اور وقف کو مترادف سمجھا جاتا ہے، یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، ذیل میں ٹرسٹ کی تعریف، وقف اور ٹرسٹ میں فرق بیان کیا جاتا ہے۔

ٹرسٹ کی تعریف:

ٹرسٹ انگریزی قانون کی اصطلاح ہے بلیک لاء ڈکشنری میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

A property interest held by one person (The Trustee) at the request of another (The settler) for a benefit of a third party (the beneficiary). (1)

کوئی جائیداد کسی مالک کی درخواست پر کوئی ٹرسٹی اپنے قبضہ میں رکھے اور اس کا مقصد کسی تیسرے فریق (بینیفشریز) کو فائدہ پہنچانا ہو۔

اس تعریف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹرسٹ اسلام کے نظام وقف سے کافی حد تک مشابہت رکھتا ہے، جس طرح وقف میں کوئی چیز موقوف علیہم کے منافع کے لئے مختص کردی جاتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں اور اس کا انتظام وانصرام متولی وقف سنبھالتا ہے اسی طرح ٹرسٹ میں بھی ہوتا ہے، لیکن دونوں نظاموں کے اصول وضوابط میں غور کرنے سے دونوں میں کوئی فرق بھی معلوم ہوتے ہیں، مثلا:

---

(1)Garner. Brayan A.Garner, Black's Law Dictionary. America West Group, Seventh Adition. (page;1515)

وقف اور ٹرسٹ میں فرق:

۱۔ ٹرسٹ کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قانونی لحاظ سے جائز مقصد (Lawful purose) کے لئے قائم کیا جائے، ٹرسٹ ایکٹ 1882 میں ہے:

A Trust may be created for any lawful purpose.(۱)

اس کے مقصد میں اس کا کوئی لحاظ نہیں ہے کہ وہ شریعت کی نگاہ میں بھی جائز اور باعثِ قربت ہو یا نہ ہو جبکہ وقف کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے مقصد کے لئے قائم کیا جائے جو شرعاً جائز اور باعثِ قربت ہو۔

۲۔ وقف تو ہمیشہ کے لئے قائم کیا جاتا ہے وہ واقف کی ملکیت میں واپس نہیں آ سکتا، جبکہ ٹرسٹ میں یہ ضروری نہیں، وہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ مقصد حاصل ہوجائے تو ٹرسٹ ختم ہوجائے اسی طرح ٹرسٹ میں مالک اپنے لئے یہ اختیار بھی رکھ سکتا ہے کہ وہ جب چاہے اس ٹرسٹ کو ختم کرسکتا ہے، ٹرسٹ کی اقسام میں قابل تنسیخ ٹرسٹ (Revocable Turst) ایک خاص قسم ہے۔ بلیک لاء ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

A trust in which the settler reserves the right to terminate the trust and recover the trust property and any undistributed income.(۲)

قابلِ تنسیخ ٹرسٹ وہ ٹرسٹ کہلاتا ہے جس میں ٹرسٹ قائم کرنے والا اپنے لئے یہ اختیار رکھتا ہے کہ وہ جب چاہے یہ ٹرسٹ ختم کرسکتا ہے اور ٹرسٹ پراپرٹی اور غیر منقسم شدہ ٹرسٹ کی آمدنی لے سکتا ہے۔

۳۔ وقف اگر ناقابلِ انتفاع ہوجائے تو جمہور فقہاء کرام کے راجح قول کے مطابق وہ واقف کی ملکیت میں اپس نہیں آتا بلکہ اسے بیچ کر دوسری نفع بخش چیز خرید کر وقف کردی جاتی ہے ورنہ بعینہٖ اس کی باقیات کو صدقہ کردیا جاتا ہے، جبکہ ٹرسٹ اگر ناقابل انتفاع ہوجائے تو وہ ختم ہوجاتا ہے، ٹرسٹ ایکٹ 1882 میں ہے:

---

(۱)The Trust Act 1882. Karachi, Pioneer Book House, Reproduced Edition 1999

(۲)Garner. Brayan A.Garner, Black's Law Dictionary. America West Group Seventh Adition. (page;1517)

A trust is extinguished when the fulfilment of its purpose become impossible by destruction of trust-property.(1)

ٹرسٹ جس مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہے اگر اس مقصد کو پورا کرنا کسی وجہ سے ناممکن ہو جائے مثلاً ٹرسٹ پراپرٹی تباہ ہو جائے تو ٹرسٹ تحلیل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ وقف اور ٹرسٹ اپنے نظریہ کے اعتبار سے تو تقریباً ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن مقاصد اور عملی تطبیق کے اعتبار سے ان میں فرق موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اور پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان میں ٹرسٹ سے متعلق قوانین کو وقف کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا اور وقف کے لئے مستقل قوانین مرتب کئے گئے۔

---

(1)The Trust Act 1882. Karachi, Pioneer Book House, Reproduced Edition 1999 page;30)

بابِ دوم

وقف کی شرائط

دوسرا باب

وقف کی شرائط

فصل اول: وقف کی شرائط:

وقف فی نفسہٖ تبرع ہی کی ایک صورت ہے، اس لئے متبرع میں جن شرائط کا شریعت میں لحاظ رکھا گیا ہے وہ تمام شرائط واقف میں بھی ملحوظ رکھی جائیں گی ذیل میں ہم ترتیب وار ان شرائط کا جائزہ لیتے ہیں:

پہلی شرط: عقل (مجنون کا وقف):

وقف کی صحت کے لئے سب سے پہلی شرط واقف میں عقل کا ہونا ہے، چنانچہ مجنون کا وقف درست نہیں۔(۱) اس پر تمام فقہاء کرامؒ متفق ہیں ہمارے علم کے مطابق اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شریعت نے عقل نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کلام کا اعتبار نہیں کیا ہے اور اسے لغو قرار دیا ہے اس لئے اس کے کلام و اعمال پر کوئی حکم مرتب نہیں کیا جا سکتا۔

جنون کی تعریف:

جنون سے مراد عقل میں ایسا خلل واقع ہو جانا ہے کہ اس کی وجہ سے عقل کے مقتضیٰ کے مطابق اقوال و افعال صادر نہ ہو سکیں، علامہ جرجانی رحمۃ اللہ علیہ جنون کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) دیکھئے: الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۱۰) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الصغیر، مصر، دار المعارف، طبع فی سنة ۱۳۹۲ھ (۱۰۱/۴) الرملی، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدین الرملی. نهایة المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی. (۳۵۶/۵) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۷۷/۲)

الجنون هو اختلال العقل بحيث يمنع جريان الأفعال والأقوال على نهج العقل الا نادراً. (١)

جنون عقل میں ایسے خلل پیدا ہو جانے کا نام ہے جس کی وجہ سے اقوال وافعال مقتضیٔ عقل کے مطابق صادر نہ ہوں۔

اور ظاہر ہے جب جنون کی وجہ سے عقل ہی میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو مجنون کے اقوال وافعال کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

مجنون کے تصرفات کا حکم:

علماءِ اصول نے مجنون کے احکام پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مجنون میں فی نفسہٖ اہلیتِ وجوب موجود ہے یہی وجہ ہے کہ اگر اس سے کوئی نیک عمل صادر ہو تو اس پر اسے ثواب بھی ملتا ہے اور اس میں وارث بننے کی اور کسی چیز کی ملکیت حاصل کرنے کی بھی صلاحیت موجود ہے بلکہ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر مجنون کسی کو نقصان پہنچائے یا کسی کا مال ضائع کر دے تو اس پر ضمان بھی واجب ہوتا ہے۔

فخر الاسلام بزدویؒ اصول بزدوی میں لکھتے ہیں:

ان الجنون لاينافي اهلية الوجوب لانه لاينافي الذمة ولاينافي حكم الواجب وهو الثواب في الآخرة اذا احتمل الأداء الايرى أن المجنون يرث ويملك ذلک ولاية الا أن ينعدم الاداء فيصير الوجوب عدماً بناءً عليه ولهٰذا قلنا ان المجنون مؤاخذ بضمان الأفعال في الاموال على الكمال. (٢)

لیکن چونکہ اس میں عقل اور تمیز مفقود ہوتی ہے اس لئے شریعت نے اس کی عبارات وکلام کا اعتبار نہیں کیا، اور اس کے اقوال کو غیر معتبر قرار دیا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کے اقوال پر پابندی لگائی ہے، چنانچہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے تحریر فرمایا کہ تصرفاتِ قولیہ تین طرح کے ہوتے ہیں:

---

(١) الجرجاني، علي بن محمد بن علي الجرجاني ٨١٦هـ. كتاب التعريفات، بيروت، دار الفكر الطبعة الاولىٰ ١٩٩٧م (٥٨) نیز ملاحظہ فرمائیے: ابن امير الحاج ٨٧٩هـ. التقرير والتحبير، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الثانية ١٩٨٣م (١٧٣/٢)

(٢) البزدوي، فخر الاسلام علي بن محمد البزدوي ٤٨٢هـ. اصول البزدوي على متن الكافي، رياض، مكتبة الرشد، الطبعة الاولىٰ ٢٠٠١م (٢٢٠٥/٥)

۱۔ وہ اقوال و افعال جو نافع محض ہوں جیسے قبولِ ہبہ، صدقہ اور وصیت۔
۲۔ وہ اقوال جو ضارِ محض ہوں جیسے طلاق، عتاق، ہبہ کرنا اور صدقہ کرنا وغیرہ۔
۳۔ وہ اقوال جو نفع اور ضرر کے درمیان دائر ہوں جیسے بیع و شراء وغیرہ۔

مجنون کے تینوں قسم کے تصرفاتِ قولیہ پر پابندی ہے، نہ اس کی طلاق اور عتاق معتبر ہے نہ ہی اس کی بیع و شراء کا اعتبار ہے اور نہ ہی اس کا ہبہ، صدقہ اور وصیت قبول کرنا معتبر ہے۔

علامہ کاسانی تحریر فرماتے ہیں:

أما المجنون فلا تصح منه التصرفات القولية كلها فلايجوز طلاقه وعتاقه و كتابته و اقراره ولاينعقد بيعه و شرائه حتى لاتلحقه الاجازة ولا يصح منه قبول الهبة والصدقة والوصية.(۱)

مجنون کے تمام تصرفاتِ قولیہ شرعاً معتبر نہیں، اس کی طلاق، اعتاق، مکاتب بنانا اور اقرار کرنا جائز نہیں، اور اس کی بیع و شراء بھی منعقد نہیں ہوگی یہاں تک کہ اگر اس نے بیع و شراء کرلی تو ولی کی اجازت سے بھی وہ درست نہیں ہوگی، اس طرح اس کا ہدیہ، صدقہ اور وصیت قبول کرنا بھی صحیح نہیں۔

وقف بھی ان قولی تصرفات میں سے ہے جو کہ ضارِ محض ہیں یعنی وقف کرنے میں ظاہری طور پر واقف کا نقصان ہوتا ہے کہ ایک چیز جو اس کی ملکیت تھی وہ وقف کرنے کے بعد اس کی ملکیت نہیں رہتی، اس لئے مجنون کا وقف معتبر نہیں ہوگا۔

ایسے مجنون کے وقف کا حکم جسے کبھی افاقہ ہوجاتا ہو:

البتہ اگر مجنون کا جنون دائمی نہ ہو بلکہ کبھی کبھار اسے بالکل افاقہ ہوجاتا ہو اور جنون زائل ہوجاتا ہو تو ایسی صورت میں اس کا وقف معتبر ہوگا یا نہیں؟

علامہ شلبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر اس شخص کے افاقہ کا وقت متعین ہو کہ مثلاً وہ روزانہ ایک متعینہ وقت پر صحیح ہوجاتا ہو تو حالتِ افاقہ میں کئے ہوئے اس کے تصرفات معتبر ہوں گے لہٰذا اس کا

---

(۱) الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۷/۱۷۱) مزید ملاحظہ فرمایئے: رد المحتار (۶/۱۴۴) طحطاوی علی الدر (۴/۸۲) شرح المجلة للاتاسی (۳/۵۳۷ مادہ: ۹۷۹)

وقف بھی درست ہوگا اور اگر اس کے افاقہ کا کوئی وقت متعین نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کے حالتِ افاقہ میں کیئے گئے تصرفات موقوف رہیں گے، لہٰذا اگر اس دوران وہ کوئی وقف کرتا ہے تو وہ بھی نافذ نہیں ہوگا بلکہ موقوف رہے گا۔[۱]

لیکن علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی وقت مجنون کا جنون بالکلیہ زائل ہو جاتا ہے اور وہ بالکل صحیح ہو جاتا ہے تو اس کا حکم اس وقت عاقل بالغ شخص کا ہے اور اس کے تمام تصرفات معتبر ہوں گے چنانچہ اس دوران اگر وہ وقف کرتا ہے تو وہ بھی معتبر ہوگا اور وقف نافذ ہو جائے گا۔[۲]

ترجیح:

یہی رائے راجح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل انسان میں عقل کا ہونا ہے۔ جنون ایک عارض ہے شریعت نے جنون کی وجہ سے اس کے تصرفات پر پابندی لگادی تھی لیکن جب جنون ختم ہوگیا تو پھر اس کے ساتھ عاقل والا معاملہ کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں۔

معتوہ کا وقف:

مجنون ہی کے قریب قریب معتوہ بھی ہے اس کے وقف پر بحث کرنے سے پہلے عتہ کی تعریف ذکر کرنا مناسب ہے۔

عِتہ کی تعریف:

عتہ کی تعریف کرتے ہوئے علامہ شریف جرجانی فرماتے ہیں:

العته عبارة عن افة ناشئة عن الذات توجب خللافی العقل فیصیر صاحبه مختلط العقل فیشبه بعض کلامه کلام العقلاء و بعضه کلام المجانین.[۳]

---

(۱) الشلبی، عبد القادر بن توفیق الشلبی. حاشیة الشلبی علی تبیین الحقائق، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۰م (۲۵۳/۲)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۱۴۵/۲)

(۳) الجرجانی، علی بن محمد بن علی الجرجانی ۸۱۶ھ. کتاب التعریفات، بیروت، دار الفکر الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۷م (مادہ: عته) مزید دیکھئے: الجوهری، اسماعیل بن حماد الجوهری. الصحاح، بیروت، دار الحضارة العربیة، الطبعة الاولیٰ ۱۹۷۵م (۲۲۳۹/۲)

عتہ سے مراد وہ آفت ہے جو ناشی عن الذات ہوتی ہے (یعنی کسی خارجی چیز کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی) اور عقل میں خلل کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ جسے یہ بیماری ہوجاتی ہے وہ مختلط العقل ہوجاتا ہے۔ اس کی بعض باتیں عقلاء کی طرح ہوتی ہے اور بعض مجانین کی طرح۔

معتوہ کے بارے میں علامہ سغناقی رحمۃ اللہ علیہ الکافی میں فرماتے ہیں:

المعتوہ من هو مختلط الكلام يشبه كلامه مدة بكلام العقلاء و مدة بالمجانين. [1]

معتوہ وہ شخص ہے جس کی باتیں مختلط ہوں کبھی تو اس کی باتیں عقلاء کے کلام کے مشابہ ہوں اور کبھی اس کی باتیں مجانین کے کلام کے مشابہ ہوں۔

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ معتوہ میں فہم کم ہوتی ہے اور اس کی عقل میں نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے افعال و اقوال بعض اوقات عقلاء کی طرح ہوتے ہیں اور بعض اوقات مجانین کی طرح، لیکن بہر حال اس کی کیفیت جنون سے کم ہوتی ہے۔

عتہ اور جنون میں فرق:

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء عتہ اور جنون میں فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والفرق بين العته والجنون أن العته ضعف في العقل ينشأعنه ضعف في الوعي والادراک أما الجنون فهو اختلال في العقل ينشاعنه اضطراب أو هيجان. [2]

عتہ اور جنون میں فرق یہ ہے کہ عتہ عقل میں ضعف پیدا ہوجانے کا نام ہے۔ اس کی وجہ سے حافظہ اور قوتِ ادراک میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے اور جنون عقل میں خلل واقع ہوجانے کا نام ہے اس کی وجہ سے اضطراب اور ہیجان پیدا ہوتا ہے۔

---

(۱) السغناقی، حسین بن علی بن حجاج السغناقی ۷۱۴ھ. الکافی شرح اصول البزدوی، ریاض مکتبۃ الرشد الطبعۃ الاولیٰ ۲۰۰۱م (۲۲۱۴/۵) نیز دیکھئے: النسفی، عبد اللہ بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیۃ الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۸۶م (۳۸۴/۲)

(۲) الزرقاء، مصطفیٰ احمد الزرقاء. المدخل الفقہی العام، دمشق، دار الفکر، الطبعۃ التاسعۃ ۱۹۶۷م (۸۰۰/۲)

معتوہ کے احکام:

بعض اوقات معتوہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی قوتِ ادراک اور تمیز بالکل ختم ہوجاتی ہے اور اس کی عقل بالکل زائل ہوجاتی ہے۔ ایسے معتوہ کے تو وہی احکام ہیں جو مجنون کے ہیں۔

علامہ سغناقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قيد المعتوه بالعاقل احتراز عن المعتوه غير العاقل فانه والمجنون سواء.(۱)

معتوہ کو عاقل کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اس سے معتوہ غیر عاقل سے احتراز کرنا مقصود ہے کیونکہ معتوہ غیر عاقل اور مجنون برابر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان بھی اصول فقہ پر اپنی کتاب الوجیز فی اصول الفقہ میں یہی فرماتے ہیں:

وهو نوعان، الأول عته لايبقى معه ادراک ولا تمييز وصاحبه يكون كالمجنون فتنعدم فيه أهلية الأداء دون الوجوب ويكون فى الأحكام كالمجنون.(۲)

عتہ کی دو قسمیں ہیں: نمبرا۔ وہ عتہ کہ اس کی وجہ سے ادراک اور تمیز باقی نہ رہے ایسا شخص مجنون کی طرح ہوتا ہے، اس میں اہلیت اداء تو نہیں رہتی لیکن اہلیتِ وجوب ہوتی ہے، اور تمام احکام میں یہ مجنون کی طرح ہے۔

اور اگر معتوہ اپنی عام حالت پر ہے یعنی اس کی عقل میں تو ضعف ہے لیکن اس کی قوتِ ادراک اور تمیز بالکل ختم نہیں ہوئی تو اس کا حکم صبی ممیّز کا ہے۔

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ کشف الاسرار میں فرماتے ہیں:

أما الصبى العاقل والمعتوه العاقل فلايفترقان أى فى كل الأحكام.(۳)

صبی عاقل اور معتوہ عاقل میں تمام احکام میں کوئی فرق نہیں۔

---

(۱) السغناقی، حسین بن علی بن حجاج السغناقی ۷۱۴ھ. الكافی شرح اصول البزدوی، رياض مكتبة الرشد الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۱م (۲۲۱۶/۵)

(۲) زيدان، الدكتور عبد الكريم زيدان. الوجيز فى اصول الفقه، بيروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۰۴)

(۳) النسفی، عبد الله بن احمد المعروف بحافظ الدين النسفی ۷۱۰ھ كشف الاسرار، بيروت، دار الكتب العلمية الطبعة الاولىٰ ۱۹۸۶م (۴۸۴/۲) نیز دیکھئے: الكافی (۲۲۱۴/۵) التقرير والتحبير (۲۷۶/۲)

صبی (بچے) کے احکام پر ہم آگے تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ وہی احکام معتوہ کے بھی ہیں لیکن یہاں مختصراً ذکر کرنا مناسب ہے تاکہ معتوہ کے وقف کا حکم معلوم ہو سکے۔

علماءِ اصول فقہ نے تحریر کیا ہے کہ معتوہ میں صبی عاقل کی طرح اہلیتِ وجوب موجود ہے، چنانچہ اگر معتوہ شخص اسلام لاتا ہے تو اس کا اسلام معتبر ہے اسی طرح اگر وہ کسی کو مالی نقصان پہنچادے تو اس پر اس کا ضمان بھی لازم ہوگا، اور اگر وہ عبادات انجام دیتا ہے تو وہ بھی معتبر ہیں اور اسے ثواب بھی ملے گا اسی طرح اس میں مالک بننے کی صلاحیت بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس میں اہلیتِ ادا پوری طرح نہیں پائی جاتی اس لئے اس پر عبادات وعقوبات واجب نہیں۔

اور جہاں تک اس کے قولی تصرفات کا تعلق ہے تو جو تصرفات اس کے لئے نافعِ محض ہیں جیسے قبولِ ہبہ وصدقہ وغیرہ اس کی اسے اجازت ہے، اور جو تصرفات ضارِّ محض ہیں جیسے طلاق، عتاق، ہدیہ دینا، صدقہ کرنا وغیرہ ان کی اسے اجازت نہیں اور اگر وہ یہ تصرفات کرتا ہے تو شرعاً معتبر نہیں، اور جو تصرفات نفع اور ضرر کے درمیان دائر ہیں جیسے بیع وشراء وغیرہ تو علماء نے لکھا ہے کہ یہ تصرفات اس کے ولی کی اجازت پر موقوف ہیں اگر وہ انہیں اس کے حق میں مفید سمجھتا ہے تو اجازت دیدے ورنہ منع کردے۔ التقریر والتحبیر میں ہے:

(المعتوه) كالصبى العاقل فى صحة فعله ...... وقوله الذى هو نفع محض وهو اهل لاعتباره منه كأسلامه ...... بخلاف ماهو ضرر محض كالطلاق والعتاق فانه لايصح منه لاباذن وليه ولا بدون اذنه كما لايصح من الصبى العاقل و بخلاف ماهو متردد بين الضرر والنفع كالشراء لنفسه فانه يصح منه باذن الولى لابدون اذنه كما فى الصبى العاقل ايضاً.[1]

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان تحریر فرماتے ہیں:

وتكون تصرفاته صحيحة نافذة اذا كانت نافعة له نفعاً محضاً وباطلة اذا كانت مضرة له ضرراً محضاً وموقوفة على اجازة الولى اذا كانت دائرة بين النفع والضرر.[2]

---

(۱) ابن امير الحاج ۸۷۹ھ. التقرير والتحبير، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۱۷۶/۲)

(۲) زيدان، الدكتور عبد الكريم زيدان. الوجيز فى اصول الفقه، بيروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۰۴)

معتوہ کے تصرفات صحیح اور نافذ ہیں اگر وہ اس کے لئے نافع محض ہوں اور باطل ہیں اگر وہ اس کے لئے ضارِ محض ہوں اور اگر وہ نفع اور ضرر کے درمیان دائرہ ہوں تو ولی کی اجازت پر موقوف ہیں۔

اور ہم مجنون کے وقف کے ذیل میں تحریر کر چکے ہیں کہ وقف بھی ان تصرفات میں سے ہے جو ضارِ محض ہیں یعنی ان میں متصرف کا خالصۃً نقصان ہے کیونکہ اس میں ایک چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور ظاہری طور پر دنیا میں اس کے عوض کچھ ملتا نہیں اس لئے اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ معتوہ کا وقف بھی شرعاً صحیح اور نافذ نہ ہو۔

نائم اور مغمیٰ علیہ (بیہوش) کا وقف

نیند اور بیہوشی کے عالم میں بھی انسانی عقل میں چونکہ فترۃ پیدا ہو جاتی ہے اور تمییز و ادراک کی قوت ختم ہو جاتی ہے اس لئے ان دونوں حالتوں میں بھی کئے گئے قولی تصرفات معتبر نہیں لہٰذا نیند اور بیہوشی کے عالم میں طلاق، عتاق، ایمان اور ارتداد وغیرہ کا اعتبار نہیں اسی طرح اس کے وقف کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوگا، علامہ نسفی تحریر فرماتے ہیں:

> وینا فی الاختیار اصلاً حتی بطلت عباراته فی الطلاق والعتاق والاسلام والردة ولم یتعلق بقراءته وکلامه وقهقهته فی الصلاة حکم. (۱)

> اور نیند اختیار کے بالکل منافی ہے یہاں تک کہ سونے والے کا کلام اور اس کی عبارات طلاق، عتاق اسلام اور ارتداد کے سلسلہ میں بالکل باطل ہیں اور نماز میں نائم کی قراءت، کلام اور قہقہہ سے کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا۔

---

(۱) النسفی، عبد الله بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیة الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۶م (۴۸۸/۲)

سکران (نشہ میں موجود شخص) کا وقف

سکران سے مراد وہ شخص ہے جس کی عقل نشہ آور اشیاء مثلاً خمر، افیون، بھنگ، ہیروئن وغیرہ کے استعمال کی وجہ سے زائل ہوگئی ہو اور اس کے کلام کا زیادہ تر حصہ ہذیان پر مشتمل ہو۔(۱)

سکران کی دو قسمیں:

سکران کی فقہاء کرام رحمہم اللہ نے دو قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) سکران بطریقِ مباح (۲) سکران بطریقِ محظور

سکران بطریق مباح سے مراد وہ شخص ہے جس کی عقل یا تو ایسی چیز کے استعمال سے زائل ہوئی جس کا استعمال شرعاً مباح تھا لیکن کسی وجہ سے اس سے نشہ پیدا ہوگیا مثلاً دوا استعمال کی اور اس سے نشہ پیدا ہوگیا اور عقل زائل ہوگئی یا اس کی عقل نشہ آور حرام چیز سے زائل ہوئی لیکن وہ اس کے استعمال پر مضطر تھا یا اسے اکراھاً اس پر مجبور کیا گیا تھا۔

اور سکران بطریق محظور سے مراد وہ شخص ہے جس کی عقل ایسی نشہ آور چیز کے استعمال سے زائل ہوئی جو کہ شرعاً حرام اور ممنوع تھی اور وہ اس کے استعمال پر مجبور بھی نہیں تھا۔ ان دونوں قسموں کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ نسفی کشف الاسرار میں تحریر فرماتے ہیں:

وهو نوعان: سكر بطريق مباح و سكر بطريق محظور، اما السكر بطريق المباح فمثل: سكر المكره على شرب الخمر بالقتل او قطع العضو فانه يباح له ذلک و كذلک المضطر اذا شرب منها مايريد به

---

(۱) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۳۹/۳) زيدان، الدكتور عبد الكريم زيدان. الوجيز فى اصول الفقه، بيروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۲۸)

العطش و سکربه ...... وکذالک اذا شرب دواء فسکربه. واما السکر المحظور فهو السکر من کل شراب محرم. (۱)

سکر کی دو قسمیں ہیں: نمبرا۔ وہ نشہ جو مباح طریقے کے اختیار کرنے سے پیدا ہو گیا ہو۔ نمبر۲۔ وہ نشہ جو حرام اور ناجائز طریقے کے اختیار کرنے سے پیدا ہو۔ وہ سکر (نشہ) جو مباح طریق سے پیدا ہو اس کی مثال جیسے وہ شخص جسے قتل وغیرہ کی دھمکی دے کر خمر پینے پر مجبور کیا گیا ہو، ایسے ہی مضطر شخص جو صرف اتنی خمر پیئے جس سے پیاس بجھ جائے لیکن اس سے نشہ پیدا ہو جائے، اس طرح کوئی دواء پی اس سے نشہ پیدا ہو گیا، اور سکر بطریق محظور سے مراد وہ نشہ ہے جو حرام اور ممنوع شراب پینے سے پیدا ہوا ہو۔

سکران بطریق مباح کا حکم:

اگر نشہ ایسی چیز کے استعمال سے پیدا ہوا جسے اختیار کرنے کی شریعت نے اجازت دی تھی (سکر بطریق مباح) جیسا کہ اس کی مثالیں ابھی ذکر کی گئی ہیں تو اس صورت میں تمام علماء کرام اس پر متفق ہیں کہ ایسا شخص نشہ کی حالت میں کسی چیز کی ادائیگی کا مکلّف نہیں اور اس کی عبارات اور تصرفات قولیہ کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں کیونکہ نشہ کی وجہ سے اس کی عقل اور تمیز ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کی طلاق، نکاح، ہبہ وصیت اور صدقہ وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں، البتہ اگر وہ کسی کو مالی یا بدنی نقصان پہنچا دے تو اس کا وہ ضامن ہوگا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

والسکر وهو ان کان من مباح کشرب الدواء و شرب المکره والمضطر فهو کالاغماء فیمنع صحة الطلاق والعتاق و سائر التصرفات. (۲)

اور نشہ اگر مباح طریقے کے اختیار کرنے سے پیدا ہوا ہو جیسے دواء پینے کی وجہ سے یا مضطر اور مکروہ کو خمر پینے کی وجہ سے نشہ ہو گیا ہو تو یہ اغماء (بیہوشی) کی طرح ہے، لہٰذا طلاق، عتاق اور دیگر تمام تصرفات سے مانع ہے۔

---

(۱) النسفی، عبد اللہ بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیة الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۶م (۵۳۷/۲) مزید دیکھئے: الکافی (۲۳۵۲/۵) التقریر والتحبیر (۱۹۲/۲)

(۲) حوالہ بالا نیز دیکھئے: رد المحتار (۳۴۰/۳) الوجیز فی اصول الفقه (۷۲۸)

سکران بطریق محظور کا حکم:

اور اگر نشہ ایسی چیز سے پیدا ہوا ہو جس کا استعمال شرعاً ممنوع تھا اور نہ ہی وہ اس کے استعمال پر مجبور تھا (سکران بطریق محظور) تو ایسی صورت میں سکران کے تصرفات کا کیا حکم ہے؟

فقہاء کرام کی آراء:

اس میں بنیادی طور پر فقہائے کرام رحمہم اللہ کی دو رائے ہیں:

۱۔ اہلِ ظواہر اور حنابلہ کی راجح روایت کے مطابق اس کے بھی اقوال اور تصرفات شرعاً معتبر نہیں لہٰذا اس کی طلاق، وصیت، ہبہ، قرض، استقراض وغیرہ شرعاً نافذ نہیں۔[1] ابن ابی شیبہؒ نے اپنی مصنف میں حضرت عکرمہؒ طاؤسؒ، عطاء اور قاسمؒ کے بارے میں روایات ذکر کی ہیں کہ یہ حضرات سکران کی طلاق کے قائل نہیں تھے۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک سکران کے تصرفات معتبر نہیں ہیں۔

۲۔ جمہور فقہاء حنفیہ وشافعیہ ومالکیہ کی رائے یہ ہے کہ اس (سکر بطریق محظور کی) صورت میں سکران کے تمام قولی تصرفات شرعاً معتبر ہیں چنانچہ اس کی طلاق بھی واقع ہوجائے گی اس کا ہبہ اور صدقہ بھی درست ہے اور اس کی بیع وشراء بھی منعقد ہے، علامہ نسفی رحمہ اللہ علیہ کشف الاسرار میں تحریر فرماتے ہیں:

فیلزمه احکام الشرع کلها و تصح عباراته بالطلاق و العتاق والبیع والشراء والاقرار بالدین والعین و تزویج الصغیر والصغیرة والاقراض والاستقراض والهبة والصدقة.[3]

اس (سکران بطریق محظور) پر شریعت کے تمام احکام لازم ہوں گے اور اس کی طلاق، عتاق، بیع، شراء، دین یا عین کے اقرار، تزویج الصغیر او الصغیرۃ، اقراض، استقراض، ہبہ اور صدقہ وغیرہ سے متعلق تمام عبارات صحیح ہوں گی۔

---

(۱) دیکھئے: زیدان، الدکتور عبد الکریم زیدان. الوجیز فی اصول الفقه، بیروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۰۴)
النووی، یحییٰ بن اشرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دارالفکر (۶۲/۱۷)

(۲) ابن ابی شیبه، عبد الله بن محمد بن ابی شیبه. مصنف ابن ابی شیبه ۲۲۵ھ، کراچی، ادارة القرآن ۱۹۸۷م (۳۹/۵)

(۳) النسفی، عبد الله بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیة الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۶م (۵۸۳/۲) التقریر والتحبیر (۱۹۳/۲)

ابن ابی شیبہؒ نے اپنی مصنف میں حضرت مجاہدؒ، حسنؒ، محمدؒ، سعید بن المسیبؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابراہیمؒ، میمونؒ، زہریؒ، حمید بن عبدالرحمٰنؒ، شریحؒ اور امام شعبیؒ وغیرہ سے متعلق روایات نقل فرمائی ہیں کہ یہ تمام حضرات سکران کی طلاق کو نافذ قرار دیتے تھے اور اسے معتبر مانتے تھے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حضرات تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک سکران کے تمام تصرفات اور عبارات معتبر ہیں اور ان پر شرعی احکامات مرتب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان تحریر کرتے ہیں:

> ذهب بعض الفقهاء الى ان عبارة السكران ساقطة فلايعتد بشيء من اقواله ولايترتب عليها أى اثر شرعى فلايقع طلاقه ولابيعه ولاشرائه ولا أى عقد من عقوده وهٰذا مذهب الظاهرية والجعفرية و عثمان البتى والليث وهى احدى الروايات عن احمد بن حنبل ...... (والقول الثانى) تعتبر اقواله و يعتد بها و تترتب عليها اثارها الشرعية فيقع طلاقه و سائر تصرفاته القولية وهذا مذهب الحنفية والشافعية والمالكية.[2]

البتہ جہاں تک اس کے عمل سے پہنچنے والے مالی و بدنی نقصان کا تعلق ہے تو وہ اس کا ضامن ہوگا اسی طرح اگر اس سے کوئی موجبِ حد جرم سرزد ہوجائے تو اس پر بالاتفاق حد بھی جاری ہوگی اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔[3]

جو حضرات سکر بطریقِ محظور میں بھی سکران کے تصرفات کو معتبر قرار نہیں دیتے ان کا کہنا یہ ہے کہ تکلیف کا دارومدار عقل و تمیز پر ہے، سکر بطریقِ مباح ہو یا سکر بطریقِ محظور بہرصورت سکران کی عقل اور تمیز ختم ہوجاتی ہے اس لئے اسے مکلّف بنا کر اس کے تصرفات قولیہ وغیرہ کو معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا، اس سلسلہ میں سکر بطریقِ مباح اور سکر بطریقِ محظور میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ الوجیز میں ہے:

> ان أقل مايصح به التصرف القصد او مظنته وليس للسكران واحد منهما. لافرق بين من سكر بطريق مباح وبين من سكر بطريق محظور فالاثنان لاعقل لهما ولا تمييز فيجب ان يتساويا فى الحكم.[4]

---

(۱) دیکھئے: ابن ابی شیبہ، عبد الله بن محمد بن ابی شیبہ. مصنف ابن ابی شیبہ ۲۲۵ھ، کراچی، ادارة القرآن ۱۹۸۷م (۵/۳۷) مزید ملاحظہ فرمائیے: النووی، یحییٰ بن اشرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دارالفکر (۲۳/۱۷)

(۲) زیدان، الدکتور عبد الکریم زیدان. الوجیز فی اصول الفقه، بیروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۲۹)

(۳) دیکھئے: حوالہ بالا اور التقریر و التحبیر (۱۹۳/۲)

(۴) حوالہ بالا

جمہور کے دلائل:

جمہور فقہائے کرام سکر بطریق مباح اور سکر بطریق محظور میں فرق کرتے ہیں کہ پہلی صورت میں سکران کے تصرفات قولیہ کو معتبر قرار نہیں دیتے اور دوسری صورت میں اس کے تصرفات قولیہ کو معتبر قرار دیتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بنیادی طور پر سکر (نشہ) خطاب کے منافی نہیں کیونکہ قرآن کریم میں سکران سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

یا ایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکریٰ[1]

اے ایمان والو تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔

اگر یہ خطاب نشہ کی حالت میں ہو تو پھر تو مدعیٰ کا ثابت ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ خطاب حالت صحو (ہوش وحواس کی حالت) میں ہو تب بھی یہ دلالت کر رہا ہے کہ نشہ کی حالت خطاب کے منافی نہیں کیونکہ حالتِ صحو میں اس خطاب کا مطلب یہ ہوگا کہ "اذا سکرت فلا تقرب الصلوٰۃ" "تم جب نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جانا، ظاہر ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں خطاب کا اہل ہوگا تبھی تو اس کو یہ حکم دیا جا رہا ہے اس کے برخلاف جنون خطاب کے منافی ہے اس لئے جنون میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ "اذا جننت فلا تفعل کذا" "تم جب حالتِ جنون میں ہو تو یہ کام نہ کرنا، ان دونوں مثالوں کے فرق سے سکر اور جنون میں فرق واضح ہے، لہٰذا جب سکر خطاب کے منافی نہیں تو سکران کی اہلیت بھی باطل نہیں ہوئی اور جب اس میں اہلیت موجود ہے تو اس پر تمام احکام شرع لازم ہوں گے اور اس کے تصرفات قولیہ بھی معتبر ہوں گے کیونکہ ان احکامات اور تصرفات کا مدار ہی اہلیت پر ہے۔[2]

البتہ سکر بطریق مباح کی صورت میں سکران کی فہمِ خطاب کی قدرت اس کے اختیار کے بغیر آفتِ سماویہ کی وجہ سے فوت ہوگئی ہے۔ اس لئے یہ اس سے خطاب کے ساقط ہونے کا سبب بن جائے گی کیونکہ اگر اس حالت میں بھی اس سے خطاب ساقط نہ ہو تو تکلیفِ مالا یطاق لازم آئے گا اور جب خطاب ہی نہ رہا تو اس پر شریعت کے احکام بھی لازم نہیں ہوں گے۔

---

۱) القرآن (۴۳/۴)

۲) دیکھئے: النسفی، عبد اللہ بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب لعلمیۃ الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۸۶م (۵۳۸/۲)

اور سکران بطریقِ محظور کی صورت میں سکران نے اپنی فہم خطاب کی قدرت کو قصداً ایک معصیت کے ذریعہ ضائع کیا ہے وہ چاہتا تو شراب نہ پیتا اور اس قدرت کو ضائع ہونے سے بچا لیتا۔ لیکن چونکہ اس نے اپنے اختیار سے اس قدرت کو ضائع کیا ہے، اس لئے سزا کے طور پر زجراً وتنکیلاً فہم خطاب کی قدرت کو تقدیراً باقی سمجھا جائے گا اور اس کی طرف شریعت کا خطاب بدستور متوجہ رہے گا۔ چنانچہ اس پر شریعت کے تمام احکام لازم ہوں گے اور اس کے تصرفات قولیہ وفعلیہ شرعاً معتبر ہوں گے اور شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے کہ ایک چیز حقیقۃً زائل ہوگئی ہے لیکن زجراً اسے باقی سمجھا جا رہا ہے۔ جیسے کسی وارث نے اپنے مورث کو قتل کر دیا تو شرعاً یہ وارث مورث کی میراث سے محروم رہتا ہے اور اس کے حق میں مورث کو زجراً وعقوبۃً زندہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح سکر بطریقِ محظور کی صورت میں اگرچہ نشہ کی وجہ سے سکران کی قدرتِ فہم خطاب فوت ہوگئی ہے لیکن زجراً وعقوبۃً اسے باقی رکھا جائے گا اور اس پر شریعت کے تمام احکامات لازم ہوں گے۔ (۱)

سکران کی طلاق کے سلسلہ میں مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حکمؒ کا یہ اثر منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

من طلق فی سکر من الله فلیس طلاقه بشیء ومن طلق فی سکر من الشیطان فطلاقه جائز. (۲)

جس نے ایسے نشہ میں طلاق دی جو منجانب اللہ پیدا ہوگیا تھا تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوگی، اور جس نے ایسے نشہ میں طلاق دی جو منجانب الشیطان تھا تو اس کی طلاق واقع ہے۔

یہ اثر اس میں صریح ہے کہ سکران کی مختلف حالتوں میں فرق ہے اور جب طلاق کا یہ حکم ہے تو دیگر تصرفاتِ قولیہ کا بھی یہی حکم ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نشہ ایسی چیز کے استعمال سے پیدا ہوا ہو جس کا استعمال شرعاً مباح تھا یا نشہ تو نشہ آور چیز کے استعمال سے پیدا ہوا لیکن وہ اس کے استعمال پر مجبور تھا یا مضطر تھا تو ایسی صورت میں بالاتفاق تمام فقہاء کرامؒ کے نزدیک سکران احکاماتِ شرع کا مخاطب نہیں اور اس پر احکامِ شرعیہ لازم نہیں ہوں گے

---

(۱) دیکھئے: النسفی، عبد الله بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیة الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۶م (۵۳۸/۲)، نیز ملاحظہ فرمائیے: البخاری، الشیخ عبد العزیز البخاری. کشف الاسرار، مصر، مکتب الصنائع ۱۳۰۷ھ (۱۴۷۴/۴) الوجیز (۱۳۱)

(۲) ابن امیر الحاج ۸۷۹ھ. التقریر والتحبیر، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۳۷/۵)

اور اس کے تصرفاتِ قولیہ کا اعتبار نہیں ہوگا۔

اور اگر نشہ ایسی نشہ آور چیز کے استعمال سے پیدا ہو جس کا استعمال شرعاً ممنوع تھا اور وہ شخص اس کے استعمال پر مجبور بھی نہیں تھا اور مضطر بھی نہیں تھا تو ایسی صورت میں جمہور فقہاء کرامؒ کے نزدیک وہ شریعت کا مخاطب ہے اور اس پر تمام احکام شرعیہ لازم ہوں گے اور اس کے تصرفاتِ قولیہ بھی معتبر ہوں گے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے سکران کے وقف کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ پہلی صورت یعنی سکر بطریقِ مباح میں اس کے دیگر تصرفاتِ قولیہ کی طرح اس کا وقف بھی معتبر نہیں ہوگا، اور دوسری صورت یعنی سکر بطریقِ محظور کی صورت میں اس کے دیگر تصرفاتِ قولیہ کی طرح اس کا وقف بھی معتبر ہوگا اور نشہ کی حالت میں اس کا کیا ہوا وقف شرعاً درست اور لازم ہوگا۔

دوسری شرط: بلوغ (صبی کا وقف)

واقف کے لئے دوسری شرط بلوغ ہے۔ نابالغ بچے کا وقف شرعاً معتبر نہیں، علماءِ اصول نے تحریر فرمایا ہے کہ صباء (نابالغیت) کا زمانہ دو حصوں میں منقسم ہے، ایک بچہ کی پیدائش سے لے کر اس کے سنِ تمییز تک، دوسرا سنِ تمییز سے لے کر بلوغ تک۔

صبا کا پہلا مرحلہ:

پہلے مرحلے میں صبی کے اندر اگر چہ اہلیت وجوب پائی جاتی ہے لیکن اہلیت ادا نہیں پائی جاتی، اس لئے اس مرحلے میں جن چیزوں کی ادائیگی بچہ کی جانب سے ممکن ہے اہلیتِ وجوب پائے جانے کی وجہ سے بچہ پر ان کا وجوب بھی ہوگا، اور جن چیزوں کی ادائیگی بچہ کی جانب سے ممکن نہیں تو وہاں ان کا وجوب بھی بچہ پر نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں اس کی اہلیتِ وجوب کالعدم سمجھی جائے گی، مثلاً بچے نے اگر کسی کا مالی نقصان کر دیا تو اس پر ضمان لازم آئے گا، کیونکہ اس میں اہلیتِ وجوب تو ہے اور مال کی ادائیگی بچے کی جانب سے ممکن بھی ہے کہ اس کا ولی اس کی طرف سے ادا کرے اس لئے اس پر مال واجب ہوگا۔ اسی طرح اگر اس کا نکاح کرا دیا جائے تو اس پر بیوی کا نفقہ بھی لازم ہوگا کیونکہ نفقہ احتباس کا عوض ہے اور احتباس پایا گیا، نفقہ کی کی ادائیگی بچے کی جانب سے ممکن بھی ہے کہ ولی اس کی طرف سے ادا کرے اس لئے اس پر نفقہ واجب ہوگا۔

لیکن قصاص بچے پر واجب نہیں ہوگا کیونکہ اس میں مقصود عقوبت ہے اور بچہ عقوبت کا محل نہیں اور

نہ ہی اس میں نیابت ممکن ہے اس لئے فی نفسہٖ اہلیتِ وجوب موجود ہونے کے باوجود اس پر قصاص لازم نہیں ہوگا اسی طرح حقوق اللہ میں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ بھی اس پر واجب نہیں ہوں گے کیونکہ ان عبادات کا مقصد دنیا میں ابتلاء اور آخرت میں جزا و سزا ہے جبکہ بچے میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لئے ان چیزوں کا اس پر وجوب بھی نہیں ہوگا۔[1]

اور اس مرحلے میں صبی کے اندر اہلیتِ ادا چونکہ بالکل موجود نہیں ہوتی اس لئے اس کے اقوال اور تصرفات شرعاً معتبر نہیں، اس کی بیع وشراء، نکاح وطلاق، عتاق وہبہ اور صدقہ وغیرہ شرعاً درست نہیں، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان تحریر فرماتے ہیں:

> **ولعدم أهليته للأداء لايترتب على أقواله و تصرفاته أى أثر شرعى فعقوده و تصرفاته القولية باطلة لايعتدبها.** [2]
>
> اور صبی میں اہلیتِ ادا نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اقوال اور تصرفات پر کوئی اثر شرعی مرتب نہیں ہوگا اور اس کے عقود اور تصرفاتِ قولیہ باطل ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

صبا کا دوسرا مرحلہ:

صبا (نابالغیت) کا دوسرا مرحلہ سنِ تمیز سے بلوغ تک ہے، سنِ تمیز سے مراد عمر کا وہ حصہ ہے جس میں بچے کے اندر اتنا شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اچھے برے، خیر وشر اور نفع وضرر میں فرق کر لیتا ہے۔[3] اور حقیقت میں عمر کے لحاظ سے اس کی کوئی تحدید نہیں کی جا سکتی کہ اتنا شعور کس عمر میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ عمر بچے کی فطری صلاحیت اور ذکاوت کے لحاظ سے کم وبیش ہو سکتی ہے، لیکن فقہاء کرام نے ضرورت کی وجہ سے اپنے تجربات کے پیشِ نظر سنِ تمیز سات سال مقرر فرمایا ہے کہ عام طور پر سات سال میں بچے میں اس درجہ شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اچھے برے اور نفع ونقصان میں فرق کر سکے۔[4]

ایک حدیث سے بھی اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) ملاحظہ فرمائیے: النسفی، عبد الله بن احمد المعروف بحافظ الدين النسفی ۷۱۰ھ كشف الاسرار، بيروت، دار الكتب العلمية الطبعة الاولىٰ ۱۹۸۶م (۲/۴۶۱) كشف الاسرار للبخاری (۴/۱۳۶۱) الوجيز (۹۵)

(۲) زيدان، الدكتور عبد الكريم زيدان. الوجيز فی اصول الفقه، بيروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۹۶)

(۳) الزرقاء، مصطفىٰ احمد الزرقاء. المدخل الفقهی العام، دمشق، دار الفكر، الطبعة التاسعة ۱۹۶۷م (۲/۷۵۹)

(۴) دیکھئے: حوالہ بالا، نیز ملاحظہ فرمائیے: حاشية الوجيز (۹۵)

مروا اولادکم بالصلاۃ وھم ابناء سبع.

اپنی اولادکونماز کاحکم دوجبکہ وہ سات سال کے ہوجائیں۔

بہرحال ''صباء'' کا دوسرا مرحلہ سنِ تمییز سے بلوغ تک ہے۔اس مرحلے میں صبی کے اندر اہلیتِ وجوب تو کامل ہوتی ہی ہےاس کے ساتھ ساتھ اہلیتِ ادا بھی پائی جاتی ہے،البتہ اہلیت ادا ناقص ہوتی ہے کیونکہ کمالِ اہلیتِ ادا کادارومدارکمالِ عقل پر ہےاوروہ اسے حاصل نہیں۔

ناقص اہلیتِ ادا موجود ہونے کی وجہ سے اس مرحلہ میں اگرصبی ایمان لاتا ہےتواس کاایمان معتبر ہےاوراگروہ دیگرعباداتِ بدنیہ نماز،روزہ وغیرہ اداکرتا ہےتوان کی ادائیگی بھی شرعاً درست ہےلیکن چونکہ اہلیتِ ادا کامل طور پرموجود نہیں اس لئے ان عبادات کی ادائیگی اس پرواجب نہیں ہوگی۔اوران کےترک کی وجہ سے وہ گناہگارنہیں ہوگا۔[۱]

اور جہاں تک اس مرحلہ میں اس کےتصرفاتِ قولیہ کاتعلق ہےتواس میں درج ذیل تفصیل ہے:

(۱) وہ تصرفات جوصبی کےحق میں نافعِ محض ہیں جیسے قبولِ ہبہ وصدقہ وغیرہ،ایسےتصرفات بالاتفاق صحیح اورشرعاً معتبر ہیں،لہٰذااس مرحلہ میں صبی ہدیہ وصدقہ وغیرہ قبول کرسکتا ہے۔

(۲) وہ تصرفات جوصبی کےحق میں ضارِمحض ہیں جیسے طلاق،عتاق،وصیت کرنا،ہدیہ دینااورقرض دینا وغیرہ۔یہ تصرفات صبی کے لئے بالکل مشروع نہیں ہیں چنانچہ صبی اگرطلاق دیدےتواس کی طلاق واقع نہیں ہوگی وہ کسی کے لئے وصیت نہیں کرسکتا،اورکسی کوہدیہ نہیں دےسکتا۔

(۳) وہ تصرفات جونفع اورنقصان کےدرمیان دائر ہیں جیسے خریدوفروخت وغیرہ۔اس قسم کےتصرفات کاحکم یہ ہے کہ وہ ولی کی اجازت سےاگرکئے جائیں تودرست ہیں ورنہ نہیں۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ بدائع الصنائع میں تحریرفرماتے ہیں:

وأما الصبی العاقل فتصح منه التصرفات النافعة بلاخلاف ولا تصح منه التصرفات الضارة المحضة بالاجماع. واما الدائرة بين الضرر والنفع كالبيع والشراء والاجارة ونحوها فينعقد عندنا موقوفاً على اجازة وليه فان اجاز جاز وان ردبطل.[۲]

---

(۱) دیکھئے:ابن امیر الحاج ۸۷۹ھ. التقریر والتحبیر، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۱۷۰/۵، ۱۷۱)

(۲) الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۱۷۱/۷) مزید دیکھئے: کشف الاسرار للنسفی (۴۷۲/۲) الکافی (۲۱۸۲/۵) التقریر والتحبیر (۱۷۲/۲)

صبی عاقل کے تصرفاتِ نافعہ بلا اختلاف درست ہیں اور تصرفاتِ ضارہ بالا جماع صحیح نہیں اور وہ تصرفات جو نفع اور ضرر کے مابین دائر ہیں جیسے بیع وشراء اور اجارہ وغیرہ ہمارے نزدیک یہ ولی کی اجازت پر موقوف ہوکر منعقد ہو جائیں گے، اگر ولی اجازت دے دیگا تو درست ہو جائیں گے اور اگر رد کر دے گا تو باطل ہو جائیں گے۔

صبی ممیّز کے تصرفات قولیہ سے متعلق بیان کردہ اس تفصیل سے اس کے وقف کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ اس کا وقف شرعاً درست اور معتبر نہیں کیونکہ وقف ان تصرفات میں سے ہے جو ضار محض ہیں اس میں ایک چیز صبی کی ملکیت سے نکل جاتی ہے۔ شیخ مصطفیٰ احمد الزرقا تحریر فرماتے ہیں:

التصرفات التی هی ضرر مالی محض فی حق الصغیر و ذلک کالتبرعات بجمیع انواعها من هبة أو صدقة أو وقف أو اعارة أو غیرها. فهذا التبرع لایملک الصغیر فعله و لایملک أحد من ولی أو وصی أو قاض أن یجیزه له أو یفعله عنه، فاذا وقع کان باطلاً حمایة لحقوق الصغیر بمقتضی قصور اهلیته.(۱)

وہ تصرفات جو صغیر کے حق میں محض مالی نقصان ہیں جیسے تمام تبرعات بشمول ہبہ، صدقہ، وقف اعارہ وغیرہ، صغیر اس نوع سے متعلق تمام تصرفات کا مالک نہیں اور نہ ہی کسی ولی، وصی اور قاضی کو یہ اختیار ہے کہ اس کی اجازت دے یا اس کی طرف سے یہ تصرفات انجام دے اور اگر یہ تصرفات وقوع پذیر ہوں گے تو صغیر کی قصور اہلیت کے پیش نظر اس کے حقوق کی حفاظت کی خاطر یہ باطل ہوں گے۔

اور ڈاکٹر عبدالکریم زیدان تحریر فرماتے ہیں:

التصرفات الضارة بالصغیر ضرراً محضاً، وهی تلک التی یترتب علیها خروج شیء من ملکه دون مقابل کالهبة والوقف ونحوهما وهذه التصرفات لاتصح من الصغیر بل لاتنعقد أصلاً.(۲)

دوسری قسم وہ تصرفات جو کہ صغیر کے حق میں بالکل نقصان دہ ہیں، اس سے مراد وہ تصرفات

---

(۱) الزرقاء، مصطفیٰ احمد الزرقاء. المدخل الفقهی العام، دمشق، دار الفکر، الطبعة التاسعة ۱۹۶۷م (۲/۷۶۲)

(۲) زیدان، الدکتور عبد الکریم زیدان. الوجیز فی اصول الفقه، بیروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۹۷)

ہیں جن کی وجہ سے کوئی چیز بلاعوض صغیر کی ملکیت سے نکل جاتی ہے جیسے ہبہ اور وقف وغیرہ، یہ تصرفات صغیر کی جانب سے صحیح نہیں بلکہ یہ بالکل منعقد ہی نہیں ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نابالغ بچے کا وقف شرعاً معتبر نہیں چاہے وہ ممیّز ہو یا غیر ممیّز۔ اگر نابالغ بچہ غیر ممیّز یعنی سات سال سے کم کا ہے تو اس میں اہلیتِ ادا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا وقف درست نہیں اور اگر وہ صبی ممیّز ہے تو اس میں اگرچہ اہلیتِ ادا ہوتی ہے لیکن وقف ان تصرفات میں سے ہے جو کہ ضارِّ محض ہیں اس لئے اس کا بھی وقف شرعاً معتبر نہیں۔

تیسری شرط: عدم حجر:

واقف کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مجور نہ ہو یعنی قاضی یا حاکم کی طرف سے اس کے تصرفات پر پابندی نہ لگی ہوئی ہو۔

اس سے پہلے کہ ہم ان اسباب پر غور کریں جن کی وجہ سے پابندی لگائی جاتی ہے، اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ شرعاً کسی عاقل بالغ کے تصرفات پر پابندی لگانے کی گنجائش ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حد تک ہے؟

حجر کی شرعی حیثیت:

جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ بعض مخصوص حالات مثلاً سفاہت، دین وغیرہ کی وجہ سے عاقل بالغ شخص کے تصرفات پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔[1] جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی عاقل بالغ شخص پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فرمانا ہے کہ جب ایک شخص عاقل بالغ ہے، اس میں نفسِ وجوب بھی کامل طریقہ سے پایا جاتا ہے اور وجوبِ ادا بھی کامل پائی جاتی ہے تو اس کی عبادات اور تصرفات پابندی لگا کر

---

(۱) دیکھئے: ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۴۱ھ ـ ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۴۸/۶) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الصغیر، مصر، دار المعارف، طبع فی سنۃ ۱۳۹۲ھ (۳۸۱/۳) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی. الحاوی الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۴ھ (۳۵۶/۶)

انہیں غیر معتبر قرار دینا کوئی معنی نہیں رکھتا، اس میں تو ایک طرح سے اس کی اہانت ہے کہ آپ نے اس پر پابندی لگا کر اسے آدمیت کے درجہ سے بھی گرا دیا اور جانوروں کی طرح بالکل مہمل قرار دیدیا۔[1]

جمہور کے دلائل:

جمہور فقہاء اپنے موقف پر مختلف دلائل پیش کرتے ہیں:

پہلی دلیل:

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر دیون کی وجہ سے پابندی لگا دی تھی۔[2]

دوسری دلیل:

عبداللہ ابن جعفر عام طور پر خرید و فروخت میں دھوکہ کھا جاتے تھے مہنگے داموں چیزیں خرید لیا کرتے تھے ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہوں نے ایک زمین چھ لاکھ درہم میں خریدی، حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو علم ہوا تو آپ دونوں نے مشورہ کیا کہ ان پر پابندی لگا دی جائے، عبداللہ ابن جعفر کو پتہ چلا تو وہ فوراً حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم مجھے اس میں شریک کرلو، چنانچہ انہوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اس زمین میں اپنا شریک بنالیا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ انہوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنا شریک بنالیا ہے تو آپ نے فرمایا:

کیف احجر علی رجل فی بیع شریکه فیه زبیر.[3]

میں اس شخص کی بیع پر کیسے پابندی لگا سکتا ہوں جس کے شریک زبیر جیسی شخصیت ہیں۔

---

(۱) دیکھئے: ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۹۳/۸) زیدان، الدكتور عبد الكريم زيدان. الوجيز فى اصول الفقه، بيروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۲۳)

(۲) دیکھئے: الماوردى، ابو الحسن على بن محمد بن حبيب الماوردى. الحاوى الكبير، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۴ھ (۳۵۶/۲) مزید ملاحظه فرمائیے: البيهقى، احمد بن حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۴۸/۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ھ۔ ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۵۳۸/۲)

(۳) دیکھئے: البيهقى، احمد بن حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۶۱/۲) الماوردى، ابو الحسن على بن محمد بن حبيب الماوردى. الحاوى الكبير، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۴ھ (۳۵۶/۲)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما حجر (پابندی لگانے) کو جائز سمجھتے تھے اور انہوں نے اس کا فیصلہ بھی کرلیا تھا لیکن ایک عارض کی وجہ سے پابندی نہیں لگائی۔

تیسری دلیل:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کثرت سے صدقات وغیرہ دیا کرتی تھیں جو بھی آتا اللہ کی راہ میں خرچ کردیا کرتی تھیں ایک مرتبہ ایسی ہی کوئی صورت پیش آئی کہ آپ کا ایک قیمتی باغ تھا آپ نے اسے بیچ دیا تاکہ اس کی قیمت ضرورت مندوں پر صدقہ کردیں، آپ کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا:

واللہ لتنتھین عائشة او لا حجرن علیھا.

خدا کی قسم عائشہ یا تو اس سے باز آجائیں ورنہ میں ان پر پابندی لگادوں گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے قسم کھالی کہ آئندہ عبداللہ بن زبیر سے بات نہیں کریں گی، چنانچہ ان سے ایک عرصہ تک ترک کلام کئے رکھا، بالآخر ان کی انتہائی معذرت اور مختلف لوگوں کی سفارشات کے بعد ان سے راضی ہوگئیں اور اپنی قسم توڑ دی، اس کے کفارہ میں چالیس غلام آزاد کئے۔[1] یہ روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ذکر کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں بھی حجر (پابندی) کا تصور تھا۔

ان دلائل کی وجہ سے جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ بعض مواقع پر ضرورت پڑنے پر قاضی عاقل بالغ پر پابندی عائد کرسکتا ہے۔

قولِ راجح:

اس مسئلہ میں جمہور ہی کا قول راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اول تو علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجر (پابندی) کی مشروعیت پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع نقل کیا ہے۔[2]

---

(۱) البخاری، الامام ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاھور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۱۰/۳۹۲ رقم الحدیث: ۶۰۷۵) نیز دیکھئے: البیھقی، احمد بن حسین بن علی البیھقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۶۱/۶)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ۔ ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷ م (۶/۵۹۰)

دوسرے یہ کہ صبی پر شریعت نے ازخود پابندی لگائی ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ امکان ہے کہ وہ کہیں ایسے تصرفات نہ کر بیٹھے جس سے اس کو نقصان پہنچے، جب محض اس امکان کی وجہ سے صبی پر پابندی لگائی گئی ہے تو سفیہ وغیرہ پر تو بطریق اولیٰ پابندی ہونی چاہئے کیونکہ وہاں تصرفاتِ ضارّہ کا محض امکان ہی نہیں وقوع اور تحقق ہے۔

تیسرے یہ کہ سفیہ اور مدیون مفلس وغیرہ جن پر جمہور فقہاء رحمہم اللہ علیہ حجر (پابندی) کے قائل ہیں ان کے تصرفات کا ضرر محض ان کی ذات کی حد تک محدود نہیں بلکہ اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے مثلاً سفیہ کی تبذیر اور اسراف سے صرف اس کا مال ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ مال ختم ہو جانے کے بعد وہ اپنے اہل اور بیت المال پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور جن افراد کی عائلی ذمہ داری اس پر ہے وہ اس کی ادائیگی کے قابل نہیں رہتا اسی طرح مدیون مفلس کے تصرفات سے قرض داروں کو ضرر برداشت کرنا پڑتا ہے اور ان کا قرضہ ڈوب جاتا ہے۔ معاشرہ کو ان کے ضرر سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کے ذاتی تصرفات پر پابندی کو گوارا کرنا پڑے گا، جیسا کہ مفتی ماجن اور طبیبِ جاہل کے شرور سے معاشرہ کو بچانے کے لئے ان پر پابندی کے تمام فقہاء قائل ہیں۔

فقہاء احناف رحمہم اللہ نے بھی اس مسئلہ میں جمہور کے قول کو راجح قرار دیا ہے اور اس پر فتویٰ دیا ہے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> **بقولهما يفتى، به صرح قاضيخان فى كتاب الحيطان...... وجعل عليه الفتوىٰ مولانا فى فوائده منح، وفى حاشية الشيخ صالح، وقد صرح فى كثير من المعتبرات بان الفتوى على قولهما وفى القهستانى عن التوضيح أنه المختار وأفتى به البلخى وأبوا القاسم.** (۱)
>
> صاحبین ہی کے قول پر فتویٰ ہے علامہ قاضی خان نے کتاب الحیطان میں اس کی صراحت کی ہے اور ہمارے مولانا نے بھی منح اور حاشیہ الشیخ صالح میں اس پر فتویٰ دیا ہے، اور فقہ کی بہت سی معتبر کتابوں میں ہے کہ فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے، قہستانی میں توضیح کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ صاحبین ہی کا قول مختار ہے علامہ بلخی اور شیخ ابوالقاسم نے بھی اس پر فتویٰ دیا ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعيد كمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۱۴۸/۶)

اسبابِ حجر

اب ہم ان اسباب پر غور کرتے ہیں جن کی وجہ سے جمہور فقہاء کے نزدیک کسی شخص پر پابندی عائد کی جاسکتی ہے، اور ساتھ ہی اس پابندی کے دائرہ کار اور اس کے اثرات کا بھی انشاء اللہ جائزہ لیا جائے گا۔

ا۔ سفاہت:

سفاہت کی تعریف فقہاء کرام نے مختلف الفاظ میں بیان فرمائی ہے، علامہ بر باتی رحمہ اللہ ہدایہ کی شرح عنایہ میں اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

السفه هو خفة تعترى الانسان فتحمله على العمل بخلاف موجب الشرع والعقل مع قيام العقل. [1]

سفاہت یہ ایک طرح کی حماقت ہے جو انسان کو پیش آجاتی ہے اور اسے شریعت اور عقل کے تقاضوں کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتی ہے، حالانکہ اس میں عقل موجود ہوتی ہے۔

علامہ ابن الملک شرح للمنار میں تحریر فرماتے ہیں:

وفى اصطلاح الفقهاء عبارة عن التصرف فى المال بخلاف مقتضى الشرع والعقل بالتبذير فيه والاسراف مع قيام حقيقة العقل. [2]

فقہاء کرام کی اصطلاح میں سفاہت سے مراد اپنے مال میں تبذیر اور اسراف کے ساتھ ایسا تصرف کرنا ہے جو شریعت اور عقل کے تقاضوں کے خلاف ہو، حالانکہ حقیقتِ عقل موجود ہے۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

(۱) البابرتی، محمد بن محمود البابرتی. العنایه بهامش فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۹۱/۸)

(۲) ابن عبد الملک، عبد اللطیف بن عبد العزیز بن الملک ۸۰۱ھ. شرح المنار لابن عبد الملک، مطبعه عثمانیه ۱۳۱۵ھ (۹۸۸) و کذافی الوجیز (۱۱۸)

هو تبذير المال وتضييعه على خلاف مقتضى الشرع والعقل ولو في الخير كأن يصرفه في بناء المسجد ونحو ذلك.[1]

سفاہت: مال کو شریعت وعقل کے مقتضی کے خلاف فضول خرچ کرنا اور ضائع کرنا، خواہ یہ خرچ خیر کے راستہ ہی میں کیوں نہ ہو مثلاً مسجد کی تعمیر وغیرہ میں سارا مال خرچ کردے۔

ان تعریفوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس میں سفاہت پائی جاتی ہے یعنی سفیہ میں عقل موجود ہوتی ہے لیکن حماقت کی وجہ سے وہ مال خرچ کرنے میں تبذیر اور اسراف سے کام لیتا ہے یا تو شر میں اسراف کرتا ہے جیسے گانا گانے والوں یا کھیل کود کرنے والوں پر مال لٹاتا ہے، اسی طرح اپنے گھر پر محفلیں منعقد کرتا ہے اور فساق وفجار کو جمع کرکے پیتا پلاتا ہے، اور انہیں انعامات اور تحائف وغیرہ سے نوازتا ہے، یا وہ خیر کے راستہ میں خرچ کرنے میں اسراف اور تبذیر سے کام لیتا ہے۔ مثلاً اپنا سارا مال مسجد کی تعمیر وغیرہ میں خرچ کردیتا ہے یا اپنی ضروریات سے قطع نظر اپنا سارا مال رفاہی امور میں خرچ کرتا ہے، بہرحال امورِ شر میں اسراف اور تبذیر ہو یا امورِ خیر میں ایسا شخص سفیہ کہلائے گا۔ جمہور فقہاء کے نزدیک، قاضی ایسے سفیہ پر پابندی عائد کرسکتا ہے۔

سفیہ کا حکم:

زیادہ تر معاملات میں سفیہ مجور کا حکم وہی ہے جو صغیر ممیّز کا ہے البتہ تھوڑا سا فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ تصرفات جن میں ہزل اور جد برابر ہیں دوسرے الفاظ میں وہ تصرفات جن میں فسخ کی صلاحیت نہیں جیسے نکاح، طلاق، عتاق وغیرہ ان میں سفیہ کا حکم صبی ممیّز سے مختلف ہے یعنی اس کے یہ تمام تصرفات معتبر ہیں اگر اس پر قاضی کی طرف سے پابندی لگائی گئی ہے تو وہ پابندی ان تصرفات پر اثر انداز نہیں ہوگی، ان کے علاوہ بعض جزوی مسائل میں بھی اس کا حکم صغیر ممیّز سے مختلف ہے اس کی تفصیل فقہ کی معروف کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جہاں تک ان تصرفات کا تعلق ہے جو قابلِ فسخ ہیں اور ان میں جد وہزل برابر نہیں نیز ان میں نفع و نقصان دونوں پہلو ہیں جیسے بیع وشراء، اجارہ وغیرہ ان میں مفتیٰ بہ قول کے مطابق حجر موثر ہے اور سفیہ مجور کے یہ تصرفات صبی ممیّز کی طرح ولی کی اجازت پر موقوف رہیں گے، اور وہ تصرفات جو کہ نافعِ محض ہیں جیسے قبول ہبہ ووصیت وغیرہ اس کی اسے اجازت ہے۔

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۱۴۷/۶)

اور وہ تصرفات جو کہ ضارِ محض ہیں صبی ممیّز کی طرح اسے اس کی اجازت نہیں ہوگی، اور اس کے یہ تصرفات شرعاً معتبر بھی نہیں ہوں گے، جیسے کسی کو اپنی مملوکہ چیز ہبہ کرنا، صدقہ کرنا، وغیرہ۔[1]

سفیہ کے وقف کا حکم:

اوپر ذکر کردہ تفصیل سے سفیہ مجور کے وقف کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ وقف ان تصرفات میں سے ہے جو کہ ضارِ محض ہیں کیونکہ اس میں ایک چیز بلاعوض مالک کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اس لئے وہ سفیہ جس کے تصرفات پر پابندی لگی ہوئی ہو اس کا وقف شرعاً معتبر نہیں۔ امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ احکام الوقف میں تحریر فرماتے ہیں:

> **قلت: فماتقول في رجل حجر عليه القاضي لسفه أو الدين عليه فوقف أرضاً له يجوز وقفه؟ قال لايجوز ذلک من قبل أن السفيه انما حجر عليه القاضي لئلايبذر ماله ولا يخرج من ملكه شيئا والذي عليه الدين انما حبس عليه القاضي ماله لئلا يخرج من ماله شيئا عن ملكه، فلو جاز وقفه لم يكن للحجر معنى.** [2]
>
> میں نے عرض کیا کہ جس شخص پر قاضی نے سفاہت یا دین کی وجہ سے پابندی لگادی ہو، اگر وہ اپنی زمین وقف کرے تو کیا یہ جائز ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جائز نہیں کیونکہ سفیہ پر قاضی نے اس لئے پابندی لگائی ہے کہ وہ اپنے مال میں فضول خرچی نہ کرے اور اپنی ملکیت سے کچھ نہ نکالے۔ اور جس پر دین ہے قاضی نے اس کے مال کو اس لئے روکا ہوا ہے کہ وہ اپنی ملکیت سے اسے نہ نکال سکے، اگر ان کے وقف کو جائز قرار دیدیا جائے گا تو اس پابندی کا کوئی مطلب نہیں رہے گا۔

تاہم علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ممانعت کی علت کو دیکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر سفیہ وقف کرے اور یہ شرط لگادے کہ اپنی زندگی میں میں خود اس کی آمدنی استعمال کروں گا، اور یہ میرے مرنے

---

(۱) دیکھئے: زيدان، الدكتور عبد الكريم زيدان. الوجيز في اصول الفقه، بيروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۲٦)
المرغيناني، برهان الدين ابوالحسن علي بن ابي بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۹۵/۸)
نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادي عشر. الفتاوى الهنديه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۵۵/۵)
(۲) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۵۰)

کے بعد یہ فقراء کے لئے وقف ہے تو یہ وقف معتبر ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت میں سفیہ کا تصرف اس کے حق میں نقصان دہ نہیں ہے، اس چیز کا فائدہ اسے اپنی زندگی میں مل رہا ہے اس کے مرنے کے بعد اس کا فائدہ موقوف علیہم کو پہنچے گا۔ علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وینبغی انه اذا وقفها فی الحجر للسفه علی نفسه ثم لجهة لاتنقطع ان یصح علی قول ابی یوسف وهو الصحیح عند المحققین و عند الکل اذا حکم به حاکم. (۱)

جب وہ شخص کہ جس پر سفاہت کی وجہ سے پابندی لگائی گئی ہے اپنی ذات پر زمین وقف کرے اور اپنے بعد ایسی جہت پر وقف کرے جو منقطع ہونے والی نہ ہو تو مناسب ہے کہ یہ وقف امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول (کہ وقف الواقف علی نفسہ جائز ہے) کے مطابق جو کہ محققین کے نزدیک راجح ہے صحیح ہونا چاہئے اور اگر حاکم بھی اس کے مطابق فیصلہ کردے تو تمام فقہاءِ احنافؒ کے نزدیک صحیح ہونا چاہئے۔

اس پر علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر سفیہ اپنی ذات پر بھی وقف کرے گا تو بھی یہ تبرع ہے اور وہ تبرع کا اہل نہیں۔ (۲)

علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس صورت میں یہ تبرع علی نفسہ ہوگا نہ کہ تبرع علی الغیر اور سفیہ کو تبرع علی نفسہ کا اختیار حاصل ہے۔ (۳) کیونکہ درحقیقت تبرع علیٰ نفسہ تبرع میں داخل ہی نہیں ہے۔

علامہ طحطاوی، علامہ ابن عابدین اور دیگر فقہاء کرام رحمہم اللہ علیہم اجمعین نے سفیہ محجور کے وقف کے سلسلہ میں اسی تفصیل کو اختیار کیا ہے۔ (۴)

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۱۷/۵)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۸۹/۵)

(۳) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۸۹/۵)

(۴) دیکھئے: الطحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی. حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار، کوئٹه، المکتبة العربیة (۵۲۹/۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۱/۴)

۲۔ غفلت:

اسبابِ حجر میں سے دوسرا سبب غفلت ہے۔

موسوعہ فقہیہ میں غفلۃ اور غافل کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

الغفلة فی اللغة غیبة الشئی عن بال الانسان وعدم تذکره له، ورجل مغفل علی لفظ اسم مفعول من التغفیل وهو الذی لافطنة له، والغفلة فی اصطلاح الفقهاء ضد الفطانة، وذوا الغفلة (المغفل) هو من اختل ضبطه وحفظه ولا یهتدی الی التصرفات الرابحة فیغبن فی البیاعات لسلامة قلبه وعدم استعماله القوة المنبهة مع وجودها. (۱)

لغت میں غفلت کے معنی ہیں کہ کسی چیز کا انسان کے ذہن سے غائب ہوجانا اور اسے یاد نہ رہنا، اور رجل مغفل اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں فطانت یعنی ہوشیاری نہ ہو اور فقہاء کرام کی اصطلاح میں غفلت فطانت یعنی ہوشیاری کی ضد ہے اور غفلت والا یعنی مغفل اور غافل اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے حافظے اور ضبط میں کچھ خلل ہو اور وہ نفع بخش تصرفات و معاملات نہ کر پاتا ہو، اپنے سلامتِ قلب کی وجہ سے اور قوتِ منبہہ کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے خرید وفروخت میں نقصان اٹھالیتا ہو حالانکہ اس میں قوتِ منبہہ موجود ہوتی ہے لیکن اس کا استعمال نہیں کر پاتا۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ غفلت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا سادہ ہو اس میں فطانت اور ہوشیاری نہ ہو جس کی وجہ سے لوگ خرید وفروخت اور دیگر معاملات میں اسے بیوقوف بنا دیتے ہوں اور وہ نقصان اٹھالیتا ہو، یہ شخص سفیہ کی طرح اسراف اور تبذیر نہیں کرتا لیکن سلامتِ قلب کی وجہ سے اور ہوشیاری نہ ہونے کی وجہ سے نفع بخش تصرفات نہیں کر پاتا بلکہ وہ اپنے نقصان دہ تصرفات سے باز بھی نہیں آتا۔ (۲)

جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک ایسے شخص پر بھی قاضی پابندی لگا سکتا ہے اور اسے تصرفات سے روک سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ چونکہ کسی کے تصرفات پر حجر (پابندی) کے قائل نہیں اس لئے وہ سفیہ کی طرح غافل پر بھی پابندی لگانے کو درست تصور نہیں کرتے۔

---

(۱) الموسوعة الفقهیة، وزارة الاوقاف والشئون الاسلامیه، کویت الطبعة الاولیٰ (مادہ: غفلت، ۳۱/۳۶)

(۲) دیکھئے: الزیلعی، فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی ۷۴۳ھ. تبیین الحقائق، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۰م (۲۶۷/۶)

جمہور فقہاءِ کرام رحمہم اللہ کے نزدیک اگر قاضی نے غافل کے تصرفات پر پابندی لگائی ہو تو اس کے بھی وہی احکام ہیں جو سفیہ مجور کے ہیں اس کی مکمل تفصیل گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی اصول الفقہ الاسلامی میں تحریر فرماتے ہیں:

الغفلة ملحقة بالسفه من ناحية الحجر وعدمه. (۱)

غفلت حجر اور عدمِ حجر کے لحاظ سے سفاہت سے ملحق ہے (یعنی دونوں کے احکام ایک ہی ہیں)

غافل کا وقف:

وقف چونکہ ان تصرفات میں سے ہے جو کہ ضارِ محض ہیں اس لئے غافلِ مجور کا وقف شرعاً معتبر نہیں البتہ ''وقف علی النفس'' کے بارے میں وہی تفصیل ہونی چاہئے جو کہ سفیہ کے ''وقف علی النفس'' کے بارے میں ذکر کی گئی ہے۔

۳۔ دَین:

اگر کسی شخص پر اتنا دین ہو کہ وہ اس کے اصل سرمایہ سے تجاوز کر جائے تو قاضی دائنین کے مطالبہ پر اسے مفلَّس قرار دے سکتا ہے اور اس کے ان تصرفات پر پابندی لگا سکتا ہے جن سے غرماء یعنی دائنین کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ (۲)

یہ جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ چونکہ حجر یعنی کسی کے تصرفات پر پابندی لگانے کے قائل نہیں ہیں جیسے کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اس لئے وہ دین کی وجہ سے بھی کسی کو مفلس قرار دینے اور اس کے مالی تصرفات پر پابندی لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔

جمہور فقہاء کرام کا استدلال:

خاص طور پر دین کی وجہ سے پابندی لگانے کے سلسلے میں جمہور کا استدلال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر پابندی لگا دی تھی اور ان کا دین

---

(۱) الزحیلی، الدکتور وهبة الزحیلی. اصول الفقه الاسلامی، طهران، دار احسان ۱۴۱۷ھ (۱/۱۸۶)

(۲) دیکھئے: نظام، الشیخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاوی الهندیه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳ م (۵/۵۵) الاتاسی، الشیخ خالد الاتاسی. شرح المجلة، کوئٹه، مکتبه اسلامیه الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۳ھ (۳/۵۵۴)

ادا کرنے کے لئے ان کا مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچ دیا تھا، سنن بیہقی میں کعب بن مالکؓ کی اپنے والد سے روایت ہے فرماتے ہیں:

ان النبی صلی الله علیه وسلم حجر علی معاذ ابن جبل ماله وباعه فی دین کان علیه. (۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ پر ان کے مال کے سلسلہ میں پابندی لگادی تھی اوران پر جو دیون تھے انہیں ادا کرنے کے لئے ان کا مال بیچ دیا تھا۔

اس کی تفصیل ایک دوسری روایت میں آئی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ بڑا کشادہ تھا، جو بھی سوال کرنے آتا اسے رد نہ فرماتے چاہے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ قرض اتنا بڑھ گیا کہ ان کا سارا سرمایہ قرض میں ڈوب گیا۔ اب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ قرض خواہوں سے آپ قرض معاف کرنے یا کم کرنے کی بات کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قرض خواہوں سے بات کی لیکن کوئی بھی قرض چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ بالآخر مجبور ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا سارا سرمایہ بیچا اوراسے ان کے قرض خواہوں کے درمیان تقسیم فرمادیا۔(۲)

اسی طرح جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کا استدلال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اثر سے بھی ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطاء میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص اسیفع نامی تھا۔ ایام حج میں اس کی کوشش ہوتی تھی وہ تمام حاجیوں سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچے تا کہ لوگ یہ کہیں کہ اس سال سب سے پہلے حج کے لئے اسیفع پہنچا، اس مقصد کے لئے وہ لوگوں سے تیز رفتار اونٹنیاں مہنگے داموں ادھار خریدا کرتا تھا اس طرح وہ ہر سال سب سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ جاتا۔ رفتہ رفتہ اس پر لوگوں کا قرض اتنا بڑھ گیا کہ وہ مفلس ہوگیا اور ادائیگی سے قاصر ہوگیا۔ قرض خواہوں نے اس کا معاملہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے اٹھایا، آپ نے سارے واقعہ کی تفصیل سن کر لوگوں کو جمع فرمایا اور اس کے بارے میں فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا:

امابعد! ایها الناس فان الأسیفع اسیفع جهینة رضی من دینه و امانته بأن یقال سبق الحاج، ألا وانه ادّان معرضاً، فأصبح قدرِیْن به، فمن کان له

---

(۱) البیهقی، احمد بن حسین بن علی البیهقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۴۸/۶)
(۲) دیکھئے: حوالہ بالا

علیہ دین فلیئتنا بالغداۃ نقسم مالہ فیما بینھم وایاکم والدین فانہ اوّلہ ھمّ وآخرہ حرب.(۱)

امابعد! اے لوگو قبیلہ جھینہ سے تعلق رکھنے والا ''اسیفع'' صرف اتنی سی بات کے لئے کہ لوگ یہ کہیں کہ ''اسیفع تمام حاجیوں سے سبقت لے گیا'' اپنے دین اور لوگوں کی تمام امانتوں کو ضائع کرنے پر تیار ہوگیا۔ وہ ادھار سواریاں خریدتا رہا دیون کی ادائیگی کی پرواہ کئے بغیر۔ چنانچہ لوگوں کا اس کے ذمہ قرض اس کے سرمایہ سے بھی بڑھ گیا۔ پس جس شخص کا اس پر قرض ہو وہ کل صبح ہمارے پاس آئے ہم اس کا مال قرض خواہوں کے درمیان تقسیم کردیں گے، تم لوگ قرض سے بچتے رہو کیونکہ اس کا آغاز غم سے ہوتا ہے اور اس کی انتہاء جنگ پر ہوتی ہے۔

علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

یرید انہ قد ضاقت مالہ عن دیونہ فحجر علیہ عمر التصرف فیہ وجمعہ لیوزّعہ علی غرمائہ بقدر حصصھم ممّالھم عندہ.(۲)

مراد یہ ہے کہ اسیفع کا مال دیون کی ادائیگی کے لئے ناکافی تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے تصرفات پر پابندی لگادی اور اس کا سارا مال جمع کیا تاکہ دائنین میں ان کے دیون کے حساب سے وہ مال تقسیم کردیا جائے۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

ذھب الجمھور الی أن من ظھر فلسہ فعلی الحاکم الحجر علیہ فی مالہ حتی یبیعہ و یقسمہ بین غرمائہ علی نسبۃ دیونھم.(۳)

جمہور اس طرف گئے ہیں کہ جس شخص کا مفلس ہونا ظاہر ہوجائے حاکمِ مسلمین پر لازم ہے کہ اس کے مال میں تصرفات پر پابندی لگادے اور اس کا موجود مال بیچ کر دائنین میں بقدر

---

(۱) مالک، الامام مالک بن انس الاصبعی. کتاب المؤطاء مع شرح اوجز المسالک، ملتان، ادارہ تالیفات اشرفیہ (۱۲/۳۷۳)

(۲) الباجی، القاضی ابو الولید سلیمان بن خلف بن سعد الباجی ۴۰۳ھ. ۴۹۴ھ. المنتقی شرح المؤطاء مصر، مطبعۃ السعادۃ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۳۲ھ (۶/۱۹۷)

(۳) ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاھور، دار نشر للکتب الاسلامیۃ (۵/۲۶)

دیون تقسیم کردے۔

مذکورہ بالا دلائل سے واضح ہے کہ ایسے شخص پر قاضی پابندی لگا سکتا ہے۔

مدیونِ مفلس کا حکم:

مدیون مفلس پر پابندی (حجر) چونکہ دائنین کے مصالح کے پیش نظر لگائی جاتی ہے اس لئے مدیونِ مفلس کے ہر ایسے تصرف پر پابندی ہوگی جس سے دائنین کو نقصان پہنچ سکتا ہو، چنانچہ پابندی کے بعد وہ اپنے مال میں سے کسی کو ہبہ نہیں کرسکتا، صدقہ نہیں دے سکتا، اسی طرح کوئی چیز غبن فاحش کے ساتھ بیچ نہیں سکتا کہ مثلاً دس روپے کی چیز پانچ میں بیچ دے تو اس کی اجازت نہیں ہوگی کیونکہ اس میں دائنین (قرض خواہوں) کا نقصان ہے کہ انہیں قرض کی مد میں دس کے بجائے پانچ روپے مل سکیں گے اگر مدیونِ مفلس کسی کے حق میں اقرار کرے تو وہ بھی فی الحال نافذ نہیں ہوگا، البتہ دائنین کا قرض اتارنے کے بعد اگر اس کے پاس کچھ رقم بچے تو پھر یہ اقرار پورا کرنا لازم ہوگا۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

كل تصرف يؤدى الى ابطال حق غرمائه فالحجر يؤثر فيه و ذلك كالهبة و الصدقة و ما أشبهه. (۱)

ہر وہ تصرف جس سے دائنین (قرض خواہوں) کا حق باطل ہوتا ہو اس میں یہ پابندی مؤثر ہوگی۔ جیسے ہبہ، صدقہ اور ان کے مشابہ دیگر تصرفات۔

صاحبِ مجلّہ تحریر فرماتے ہیں:

لاتعتبر تصرفات المديون المفلس وتبرعاته وسائر عقوده المضرة بحقوق الغرماء. (۲)

مدیونِ مفلس کے تمام تصرفات، تبرعات اور وہ سارے عقود غیر معتبر ہیں جو دائنین (قرض خواہوں) کے حقوق کے لئے نقصان دہ ہوں۔

---

(۱) نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادى عشر. الفتاوىٰ الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۵/۶۲)

(۲) الاتاسى، الشيخ خالد الاتاسى. شرح المجلة، كوئٹه، مكتبه اسلاميه الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۳ھ (۳/۵۵۶) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: المرغينانى، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۸/۲۰۶)

مدیونِ مفلس کے وقف کا حکم:

وقف بھی چونکہ عقودِ تبرع ہی کی قبیل سے ہے اس لئے حجر (پابندی) کے بعد مدیونِ مفلس کا وقف معتبر نہیں کیونکہ اس سے دائنین کو ضرر پہنچے گا۔ علامہ اندریتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رجل حجر علیه القاضی لسفهه أو لدین علیه فوقف أرضاً لم یجز.[۱]

جس شخص پر قاضی نے سفاہت یا دین کی وجہ سے پابندی لگادی ہو وہ اگر وقف کرے تو جائز نہیں۔

اسی طرح امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صراحت فرمائی ہے کہ حجر (پابندی) کے بعد مدیونِ مفلس کا وقف جائز نہیں ورنہ یہ پابندی بے فائدہ رہ جائے گی۔[۲]

البتہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے سفیہ کی طرح مدیونِ مفلس کے وقف کی بھی ایک صورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ اگر مدیونِ مفلس اپنی ذات پر وقف کرے اور اپنے بعد کسی جہتِ غیر منقطعہ پر وقف کردے تو اس صورت میں وقف درست ہو جائے گا کیونکہ اپنی ذات پر وقف کرنا درحقیقت تبرع نہیں۔ فرماتے ہیں:

اما بعده (الحجر) فلایصح (وقف المدیون) وقد منا أول الباب عند قوله وشرطه سائر التبرعات عن الفتح أنه لوقف علی نفسه ثم علی جهة لاتنقطع ینبغی أن یصح علی قول أبی یوسف المصحح وعند الکل اذا حکم به حاکم اه وتقدم هناک الکلام علیه و حاصله: أن وقفه علی نفسه لیس تبرعاً.[۳]

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصار الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۷۲۱)

(۲) الخصاف، ابو بکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیة ۱۹۹۹م (۲۵۰) مزید دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۹۷) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیه، کوئٹه مکتبه رشیدیه (۱/۱۱۴)

(۳) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۹۷)

پابندی کے بعد مدیون کا وقف درست نہیں، ہم نے اس باب کے شروع میں مصنف کے قول: ''وشرطه شرط سائر التبرعات'' کے ذیل میں فتح القدیر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ اگر یہ شخص اپنی ذات پر وقف کرے اور پھر کسی جہتِ غیر منقطعہ پر تو یہ وقف صحیح ہونا چاہئے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول (وقف علی نفسہ جائز ہے) پر جسے صحیح قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر حاکم اس وقف کا فیصلہ کردے تو تب تو سب کے نزدیک یہ صحیح ہونا چاہئے، اس کی تفصیل سابق میں (صفحہ ۳۴۱ ج ۴) پر گذر چکی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مجور کا اپنی ذات پر وقف تبرع نہیں۔

لیکن احقر کی ناقص رائے میں سفاہت کی وجہ سے اگر کسی شخص پر پابندی لگائی گئی ہو تو اس کے حکم سے تو اس صورت کا استثناء بالکل درست ہے، لیکن اگر دین کی وجہ سے کسی پر پابندی لگائی گئی ہو تو اس کے حکم سے اس صورت کا استثناء بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ مدیونِ مفلس پر حجر (پابندی لگانے) کا مقصد تو یہ ہے کہ دائنین کو نقصان نہ پہنچے اور اس صورت میں اپنی ذات پر وقف کیا جارہا ہے تو بھی دائنین کو تو ضرر پہنچ رہا ہے۔

جبکہ سفاہت کی وجہ سے اگر پابندی لگائی جائے تو اس کا مقصد خود سفیہ کو نقصان اور ضرر سے بچانا ہے اپنی ذات پر وقف کرنے کی صورت میں چونکہ اس کے اپنے حق میں ضرر نہیں پایا جارہا ہے اس لئے یہ صورت جائز ہونی چاہئے۔ صاحبِ ہدایہ ایک جگہ دونوں میں فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أن الحجر على السفيه انما جوّز اه نظرا له وفى هذا الحجر نظر للغرماء. [1]

سفیہ پر حجر کو صاحبین نے سفیہ کی رعایت رکھتے ہوئے جائز قرار دیا ہے اور مدیون پر حجر میں دائنین کا خیال رکھا گیا ہے۔

اس فرق کی وجہ سے احقر کے نزدیک مدیونِ مفلس کے وقف کے عدمِ جواز کے حکم سے ذکر کردہ صورت کا استثناء درست نہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۸/۲۰۶)

حجر سے پہلے مدیون کے وقف کا حکم:

حجر (پابندی) سے پہلے مدیون کا وقف ائمہ ثلاثہ کے نزدیک درست ہے چاہے اس کا دین اس کے اصل سرمایہ سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ جب تک مدیون کے تصرفات پر پابندی نہیں لگائی جاتی اس وقت تک دائنین کا دین مدیون کے ذمہ میں واجب الاداء ہے اس کے اموال کے عین کے ساتھ ان کا حق متعلق نہیں ہوا لہٰذا اپنے اموال میں وہ جو تصرفات کرنا چاہے کرسکتا ہے اس سے دائنین کو ضرر پہنچتا ہو یا نہ پہنچتا ہو۔ علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لو وقف المديون الصحيح وعليه ديون تحيط بماله فان وقفه لازم لاينقضه أزباب الديون اذا كان قبل الحجر بالاتفاق لأنه لم يتعلق حقهم بالعين في حال صحته. (۱)

اگر صحت مند مدیون جس کا دین اس کے مال سے زیادہ ہو پابندی سے پہلے وقف کرے تو اس کا وقف لازم ہو جاتا ہے دائنین اسے ختم نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کا حق مدیون کی حالتِ صحت میں اس کے اموال کے عین کے ساتھ متعلق نہیں ہوا۔

البتہ امام مالک رحمۃ اللہ کے نزدیک حجر سے پہلے بھی دائنین کی اجازت کے بغیر مدیون کا وقف درست نہیں۔ (۲)

لیکن جمہور کا کہنا ہے کہ پابندی سے پہلے دائنین کا حق محض اس کے ذمہ میں واجب ہے۔ اس کے پاس موجود مال سے ان کا براہِ راست حق وابستہ نہیں ہے اس لئے وہ اس میں تصرف کرسکتا ہے یہی موقف راجح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پابندی سے پہلے مدیون دائنین کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے وقف کرے تو اس غلط ارادہ اور قصد کی وجہ سے اس کا وقف معتبر ہو گیا یا نہیں؟

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندري المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۴/۵) مزید دیکھئے: رد المحتار (۳۹۷/۴)

(۲) ابن قيم، ابو عبد الله محمد بن ابى بكر الدمشقي المعروف بابن قيم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين مكة المكرمة، مكتبة نزار مصطفىٰ الباز، الطبعة الثانية ۲۰۰۳م (۱۱۵۳/۴)

مدیون دائنین کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے وقف کرے تو اس کا حکم:

مدیون اگر پابندی سے پہلے دائنین کو نقصان پہنچانے کی نیت سے وقف کرے تو جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک اس کا وقف شرعاً درست ہوگا اور نافذ بھی ہوگا البتہ اس غلط نیت کی وجہ سے وہ گناہگار ضرور ہوگا۔ حنفی فقیہ علامہ طرسوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ذكر في الذخيره: رجل عليه ديون وله ضيعة تساوى عشرة الاف درهم فوَقفها وشرط غلا تها الى نفسه قصداً منه الى المماطلة وشهد الشهود على افلاسه جاز الوقف وجازت الشهادة اما جواز الوقف فلمصادفته ملكه ...... لووقف عل جهة أخرى غير نفسه قصداً منه للمماطلة صح عند الكل. (۱)

ذخیرہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص پر دیون ہیں اور اس کی ایک زمین ہے جس کی قیمت دس ہزار درہم ہے وہ اسے وقف کر دیتا ہے اور یہ شرط لگاتا ہے کہ اس وقف کی آمدنی مجھے ملے، مقصد دین میں ٹال مٹول سے کام لینا ہے اور گواہ بھی اس کے افلاس پر گواہی دے رہے ہیں ایسی صورت میں وقف بھی جائز ہے اور افلاس پر گواہی بھی درست ہے، وقف کے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے اس نے اپنی مملوکہ زمین وقف کی ہے ......اور اگر یہ مدیون اپنے علاوہ کسی اور جہت پر وقف کرے دین میں ٹال مٹول کے ارادہ سے تو یہ وقف سب کے نزدیک درست ہے۔

علامہ خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سئل في الرجل الصحيح الجسد الكامل العقل اذا باع بنيه أو وقف جميع مايملكه من عقار و منقول معلوم لهم بثمن معلوم هل ينفذبيعه لهم ووقفه ولا يمنع من نفاذه دين مستغرق بذمته أم لا؟ أجاب: نعم ينفذبيعه وابراءه ولا يمنع من ذلك الدين المستغرق كما صرحت به علماؤنا قاطبه معللين بأن حق الغرماء لم يتعلق بعين ماله وانما هو

---

(۱) الطرسوسي، ابراهيم بن علي الطرسوسي. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۱۵۰)

متعلق بذمته فيصح فيه سائر التصرفات الشرعية كالبيع والوقف ونحو ذلك.[۱]

جو شخص جسم اور عقل کے اعتبار سے بالکل تندرست ہو اس کے بارے میں پوچھا گیا کہ اگر وہ اپنی اولاد کو اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد بیچ دے یا اپنی تمام جائیداد ان پر وقف کر دے تو کیا اس کی یہ بیع اور وقف نافذ ہو جائیں گے؟ اور کیا اس کے ذمہ جو دینِ مستغرق ہے وہ ان کے نفاذ سے مانع ہوگا یا نہیں؟ علامہ نے جواب دیا کہ اس کی بیع وابراء وغیرہ نافذ ہو جائیں گے دینِ مستغرق ان کے نفاذ سے مانع نہیں جیسا کہ ہمارے تمام علماء نے اس کی صراحت کی ہے اور اس کی علت یہ بیان کی کہ غرماء یعنی دائنین کا حق اس کے مال کے عین سے متعلق نہیں بلکہ وہ اس کے ذمہ سے متعلق ہے لہٰذا وہ مال میں تمام تصرفاتِ شرعیہ کر سکتا ہے جیسے بیع، وقف وغیرہ۔

فتاویٰ ابن نجیمؒ میں ہے:

سئل عمن وقف وقفاً وعليه ديون ولا مال له هل يصح الوقف أولا يصح وهل يوفى من غلته الديون أولا؟ اجاب: الوقف صحيح فان وقفه على نفسه اشترط أن يوفى دينه من غلته يصح الشرط ويوفى الدين من غلته وان لم يشرط يوفى من الفاضل عن كفايته بلااسرف وان وقفه على غيره وجعل الغلة له فهى لمن جعلها له خاصة.[۲]

علامہ سے سوال کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے وقف کیا اور اس پر دیون ہیں اور اس کے علاوہ کوئی مال بھی نہیں ہے تو کیا اس کا وقف درست ہے؟ اور وقف کی آمدنی سے پہلے دین ادا کیا جائے گا یا نہیں؟ جواب دیا کہ وقف تو بہرحال صحیح ہے البتہ اگر اس نے اپنی ذات پر وقف کیا اور یہ شرط لگا دی کہ اس وقف کی آمدنی سے اس کے دیون ادا کئے جائیں گے تو یہ شرط درست ہے اور دیون وقف کی آمدنی سے ادا کئے جائیں گے اور اگر یہ شرط نہ لگائی تو اس کی

---

(۱) الرمل، خير الدين الرملى. الفتاوىٰ الخيرية بهامش العقود الدريه فى تنقيح الفتاوى الحامديه، كوئنه، مكتبه رشيديه (۱/ ۳۷۰)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. فتاوى ابن نجيم بهامش الفتاوىٰ الغياثية كوئٹه، مكتبه اسلاميه ۱۴۰۳ھ (۹۵)

ضرورت سے بلا اسراف جو بچ جائے گا اس سے دیون ادا کئے جائیں گے۔ اور اگر کسی اور پر وقف کیا اور وقف کی آمدنی بھی اس کے لئے خاص کر دی تو ایسی صورت میں وقف کی آمدنی اسی موقوف علیہ کو ملے گی اس سے دیون ادا نہیں کئے جائیں گے۔

مشہور شافعی فقیہ علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

کما لو استغرق الدين ماله فوقف عقاره خوفاً من الحجر عليه وبيعه فيه والوقف في ذلک كله صحيح لازم. [1]

جس شخص کا دین اس کے مال کو محیط ہو وہ اس خوف سے اپنی جائیداد وقف کر دے کہ اس پر پابندی نہ لگ جائے اور یہ جائیداد ادائیگی دین کے لئے بیچ نہ دی جائے تو یہ وقف صحیح ہے اور لازم ہے۔

فقیہ حنابلہ علامہ بہوتی رحمۃ اللہ علیہ وقف کی تعریف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

قوله "تقرباً الى الله" ولعل المراد اعتبار ذلک لترتب الثواب عليه لالصحة الوقف فكثير من الواقفين لايقصد ذلک بل منهم من يقصد قصداً محرماً كمن عليه ديون وخاف بيع عقاره فيها. [2]

وقف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہونا چاہئے شاید یہ شرط ثواب کے مرتب ہونے کے لئے ہے۔ وقف کی صحت کے لئے یہ شرط نہیں، بہت سے واقفین ثواب کا ارادہ نہیں کرتے بلکہ بہت سے تو حرام امور کا قصد کرتے ہیں جیسے جس شخص پر دیون ہوں اور اسے یہ خوف ہو کہ اس کی زمین دیون کے عوض بیچ دی جائے گی وہ اسے وقف کر دیتا ہے تو وقف تو درست ہے لیکن ارادہ حرام چیز کا ہے۔

علامہ نجدی منتہی الارادات کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

قوله "تقرباً الى الله تعالیٰ" انماهو في وقف يترتب عليه الثواب فان الانسان قد يقف على غيره تودداً أو على ولده خشية بيعه بعد موته واتلاف ثمنه أو خشية أن يحجر عليه ويباع في دينه أو رياءً او نحوه

---

(۱) المناوی، عبد الرؤف بن تاج العارفين المناوی الشافعي. تيسير الوقوف، مكة مكرمة، مكتبه نزار المصطفى الباز الطبعة الاولىٰ، ۱۹۹۸م (۱/۱۷)

(۲) البهوتي، منصور بن يونس بن ادريس البهوتي ۱۰۵۱ھ. كشف القناع عن متن الاقناع، مكة المكرمة مطبعة الحكومة، الطبعة الاولىٰ ۱۳۹۴ھ (۴/۲۶۷)

وهو وقف لازم لاثواب فيه لأنه لايبتغي به وجه الله تعالىٰ.[١]

وقف اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا چاہئے یہ وقف پر ترتبِ ثواب کے لئے شرط ہے ورنہ بسا اوقات انسان کسی پر محبت کے لئے وقف کردیتا ہے کبھی اولاد پر وقف کردیتا ہے اس ڈر سے کہ اس کے مرنے کے بعد اسے ضائع نہ کردیا جائے اور کبھی اس خوف سے وقف کردیتا ہے کہ یہ زمین اس کے اوپر واجب الاداء دین کے عوض بیچ نہ دی جائے یا دکھلاوے کے لئے وقف کرتا ہے ان تمام صورتوں میں وقف درست اور لازم ہوجاتا ہے لیکن اس پر ثواب نہیں ملتا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں چاہ رہا۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ احناف، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مدیون دائنین کو نقصان پہنچانے کی نیت سے وقف کرے تو شرعاً درست ہوگا البتہ اس نیت فاسدہ کا گناہ اسے ملے گا۔

مالکیہ کے نزدیک چونکہ حجر سے پہلے بھی مدیون کے وہی احکام ہیں جو حجر کے بعد ہیں اس لئے ان کے نزدیک حجر سے پہلے بھی مدیون کا وقف درست نہیں۔ وقف کے صحیح نہ ہونے کی وجہ فسادِ نیت نہیں بلکہ دائنین کے حقوق کا متعلق ہوجانا ہے۔ علامہ دسوقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

الحالة الأولى احاطة الدين بماله قبل التفلس فلايجوز له في هذه الحالة اتلاف شيء من ماله بغير عوض فيما لايلزمه فلايجوز له هبة ولاصدقة ولاعتق ولاحبس ولا اقرار بدين لمن يتهم عليه واذا فعل شيئا من ذلک کان للغرماء ابطاله.[٢]

پہلی حالت یہ ہے کہ تفلیس سے پہلے دین نے اس کے مال کا احاطہ کیا ہوا ہو اس حالت میں اس کے لئے اپنا کوئی مال بلاعوض خرچ کرنا جائز نہیں، لہٰذا ہبہ، صدقہ، عتق، وقف اور دین کا اقرار وغیرہ یہ سب درست نہیں۔ اور اگر وہ یہ تصرفات کرے گا تو دائنین کو ان کے ابطال کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مالکیہ کے علاوہ مذاہب ثلاثہ میں پابندی سے پہلے اگر مدیون دائنین کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے وقف کرے تو اس کی اس غلط نیت کی وجہ سے وقف متاثر نہیں ہوگا، وقف درست ہوجائے گا البتہ غلط نیت کا اسے گناہ ہوگا۔

---

(١) ابن قائد، عثمان بن احمد بن سعيد النجدی المعروف بابن قائد ١٠٩٧ھ. حاشيه منتهى الارادات، بيروت، موسسة الرساله ١٤١٩ھ (٣٣١/٣)

(٢) الدسوقی، شمس الدين محمد عرفه الدسوقی. حاشية الدسوقی على الشرح الكبير، بيروت، دار الفكر (٢٦٣/٣ و كذا ٨٠/٤)

مرض الوفات میں وقف کرنے کا حکم

مرض الوفات میں وقف کی تعلیق علی الموت:

مرض الوفات میں وقف کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وقف کو اپنی موت پر معلق کردے کہ اگر میرا انتقال ہوگیا تو میرا یہ مکان وقف ہوگا۔ اس صورت میں وقف تو معتبر نہیں ہوگا کیونکہ وقف کو کسی شرط پر معلق کرنا جائز نہیں ہے البتہ یہ الفاظ اس مکان کے منافع کو معین مصرف پر خرچ کرنے کی وصیت سمجھے جائیں گے۔ اس شخص کے انتقال کے بعد اس کے تہائی ترکہ کی حد تک اس وصیت پر عمل کیا جائے گا اور اس پر تمام احکام وصیت کے جاری ہوں گے۔ لہٰذا اگر انتقال سے پہلے وہ اس وصیت کو باطل کرنا چاہے تو باطل بھی کرسکتا ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ تحریر کرتے ہیں:

والحاصل انه اذا علقه بموته كما اذا قال اذا مت فقد وقفت داري على كذا فالصحيح انه وصية لازمة لكن لم يخرج عن ملكه فلايتصور التصرف فيه ببيع ونحوه بعد موته لما يلزم من ابطال الوصية وله أن يرجع قبل موته كسائر الوصايا وانما يلزم بعد موته وانما لم يكن وقفا لما قد منا من انه لايقبل التعليق بالشرط.[1]

حاصل یہ ہے کہ اگر کسی نے وقف کو اپنی موت پر معلق کردیا، مثلاً یوں کہا کہ اگر میں مرجاؤں تو میرا یہ گھر اس مصرف پر وقف ہے تو صحیح یہ ہے کہ یہ وصیت ہے جسے پورا کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ گھر فی الحال اس کی ملکیت سے نہیں نکلے گا اور اس کے مرنے کے بعد اس گھر میں بیع وغیرہ کا تصرف نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس میں وصیت کو باطل کرنا لازم آئے گا

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۹۳/۵) نیز دیکھئے: الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۷/۴)

اور انتقال سے پہلے وہ اپنی دیگر وصایا کی طرح اس وصیت سے رجوع بھی کرسکتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد یہ وصیت لازم ہوگی۔ اس وصیت کے وقف نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وقف تعلیق بالشرط کو قبول نہیں کرتا۔ (یہاں تو اس نے وقف کو مرنے پر معلق کیا ہے اس لئے اسے وقف کہنا مشکل ہے ہاں وصیت کہنا درست ہے)

مرض الوفات میں منجز اً وقف کرنا:

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص مرض الوفات میں منجز اً وقف کردے کہ میں نے اپنا یہ مکان فلاں مصرف پر وقف کردیا تو ایسی صورت میں بالاتفاق سب کے نزدیک یہ وقف تہائی ترکہ کی حد تک نافذ ہوجائے گا کہ اگر اس کا کل ترکہ اس مکان سمیت دس لاکھ روپے ہے اور مکان کی قیمت تین لاکھ روپے ہے تو یہ پورا مکان فی الحال وقف ہوجائے گا اور اس کی آمدنی اس کے متعین کردہ مصرف پر خرچ کی جائے گی اور اگر مکان کی قیمت چار لاکھ روپے ہے تو (۳۳۳۰۰۰) کے بقدر تو وقف فوراً نافذ ہوجائے گا بقیہ ۶۶ ہزار کے بقدر مکان کے حصہ کا وقف ہونا ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوگا وہ اجازت دیدیں گے تو وہ بھی وقف ہوجائے گا ورنہ وہ ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

اور صرف تہائی مال کی حد تک اس وقف کو نافذ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مرض الوفات میں اس مریض کے اموال کے ساتھ ورثہ اور دیگر دائنین اگر ہوں تو ان کا حق معلق ہوچکا ہے لہٰذا جس طرح اس کے دیگر تبرعات بمنزلہ وصیت ہوکر تہائی مال کی حد تک نافذ ہوتے ہیں اسی طرح اس کا وقف بھی بمنزلہ وصیت ہوکر تہائی مال کی حد تک نافذ ہوگا۔ علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

> وجملته ان الوقف فی مرض الموت بمنزلة الوصية فی اعتباره من ثلث المال لأنه تبرع فاعتبر فی مرض الموت من ثلث كالعتق والهبة واذا خرج من الثلث جاز من غير رضا الورثة ولزم وما زاد على الثلث لزم الوقف منه فی قدر الثلث ووقف الزائد على اجازة الورثة لانعلم فی هذا خلافاً عند القائلين بلزوم الوقف وذلک لأن حق الورثة تعلق بالمال بوجود المرض فمنع التبرع بزيادة على الثلث كالعطايا والعتق. [1]

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۱۶/۸)

خلاصہ یہ ہے کہ مرض الموت میں وقف بمنزلہ وصیت ہے اس لحاظ سے کہ وقف کا تہائی مال کی حد تک اعتبار کیا جائے گا کیونکہ یہ وقف بھی تبرع ہے۔ مرض الموت میں تہائی مال کی حد تک اس کا اعتبار ہوگا جیسے کہ عتق اور ہبہ میں بھی تہائی مال کی حد تک تبرع کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اگر یہ وقف ترکہ کی تہائی میں ہوجاتا ہوتو ورثہ کی اجازت کے بغیر بھی یہ جائز ہے اور لازم ہے اور اگر یہ وقف اس کے تہائی مال سے زائد ہے تو تہائی کی حد تک تو وقف لازم ہوجائے گا اور زائد کا وقف ورثہ کی اجازت پر موقوف ہوگا، جولوگ وقوف کے لزوم کے قائل ہیں ان میں سے کسی کا اختلاف اس مسئلہ میں ہمارے علم میں نہیں ہے اور تہائی مال کی حد تک وقف معتبر ماننے کی وجہ یہ ہے کہ اس مریض کے مال کے ساتھ مرض کی وجہ سے ورثہ کا حق متعلق ہو چکا ہے لہٰذا ایک تہائی سے زیادہ میں کسی بھی تبرع سے یہ حق مانع ہوگا جیسے ہدیہ اور عتق میں بھی مانع ہے۔

الاسعاف میں ہے:

الوقف فی مرض الموت لازم ولكنه كالوصية فی حق نفوذه من الثلث كالتدبير المطلق ...... فاذا وقف المريض ارضه او داره فی مرض موته يصح فی كلها ان خرجت من ثلث ماله وان لم تخرج واجازته الورثة فكذلک والاتبطل فيما زاد علی الثلث. [1]

مرض الوفات میں وقف لازم ہے لیکن تہائی مال کی حد تک نافذ ہونے میں یہ وصیت کی طرح ہے۔ جیسے کوئی اپنے غلام کو مدبر بنائے تو یہ بھی تہائی مال کی حد تک درست ہے۔ اگر مریض نے مرض الوفات میں اپنا گھر یا اپنی زمین وقف کی تو اگر یہ تہائی مال کے اندر اندر ہو تو جائز ہے اور اگر تہائی مال سے زیادہ اس کی مالیت ہو تو ورثہ کی طرف سے اجازت کی صورت میں بھی یہ پورا گھر یا زمین وقف ہوجائے گا اور اگر وہ زائد کی اجازت نہ دیں تو تہائی سے زیادہ میں وقف نافذ نہیں ہوگا۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ(۳۵)مزید دیکھئے: الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانی المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۰۲)

مرض الوفات میں وارث پر وقف کرنا:

یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ مرض الوفات میں وقف کرنا بمنزلۂ وصیت ہے اس لئے تہائی ترکہ کی حد تک یہ وقف نافذ ہوگا لیکن وصیت کے حکم میں ہونے کے باوجود مرض الوفات میں مریض اپنے ورثہ پر بھی وقف کرسکتا ہے حالانکہ ان کے لئے وصیت تہائی کی حد تک بھی نہیں کی جاسکتی۔ علامہ خصاف ؒ لکھتے ہیں:

ولو ان رجلا مريضاً جعل ارضاً له صدقة موقوفة لله عزوجل ابدا على ولده وولد ولده و نسله وعقبه ابداً ماتناسلوا ثم من بعدهم على المساكين فان كانت هذه الارض تخرج من الثلث اخرجت و كانت موقوفة تستغل ثم تقسم غلتها على جميع ورثته على قدر مواريثهم عنه.[1]

اگر مرض الوفات میں مبتلا شخص نے اپنی زمین اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد اور ان کی نسل کے لئے وقف کی اور اگر یہ سب نہ رہیں تو پھر فقراء کو اس کا مصرف قرار دیا تو اگر یہ زمین اس کے تہائی مال کے اندر اندر ہے تو یہ وقف درست ہو جائے گا، جن ذرائع سے آمدنی حاصل ہوسکتی ہے اس زمین کو اس میں لگایا جائے گا جو آمدنی حاصل ہوگی وہ اس شخص کے ورثہ میں ان کے حصہ میراث کے بقدر تقسیم کی جائے گی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وارث پر اگر وقف کیا جائے تو اسے زیادہ سے زیادہ عارضی طور پر اس وقف کی منفعت کا حق حاصل ہوتا ہے۔ وقف کی ذات اس کی ملکیت میں نہیں آتی اور یہ منفعت بھی ہمیشہ کے لئے اسے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کا اصل مستحق فقیر ہوتا ہے اس لئے اس وقف کے نفاذ میں اس کا وارث ہونا مانع نہیں ہوگا۔ جبکہ وصیت میں موصیٰ لہ وصیت کردہ چیز کا ہمیشہ کے لئے مالک ہوتا ہے اس میں اس کے علاوہ کسی اور کا حق نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہاں وراثت کے علاوہ اور کوئی جہت جہتِ استحقاق نہیں ہوتی اس وجہ سے وصیت میں وراثت مانع بنتی ہے، اس لئے وارث کے لئے وصیت کرنا بالکل جائز نہیں البتہ مرض الموت میں وقف تہائی کی حد تک نافذ ہو جائے گا۔ علامہ ابن نجیم ؒ تحریر فرماتے ہیں:

والحاصل ان المريض اذا وقف على بعض ورثته ثم من بعدهم على اولادهم ثم على الفقراء فان اجاز الوارث الاخر كان الكل وقفا واتبع

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۰۶)

الشرط والاکان الثلثان ملکا بین الورثة والثلث وقفا من ان الوصیة للبعض لاتنفذ فی شیء لانه لم یتمحض للوارث لانه بعده لغیره فاعتبر الغیر بالنظر الی الثلث واعتبر الوارث بالنظر الی غلة الثلث الذی صار وقفا. [۱]

حاصل یہ ہے کہ مریض نے اگر اپنے بعض ورثہ پر وقف کیا اور ان کے بعد فقراء پر تو اگر دیگر ورثا اجازت دیدیں تو یہ پورا گھر وقف ہو جائے گا اور اگر اجازت نہ دیں تو اس کے دوتہائی تو ورثہ کی ملکیت ہوں گے اور ایک تہائی وقف ہوگا۔ حالانکہ وصیت تو وارث کے لئے جائز نہیں وجہ یہ ہے کہ وقف محض وارث کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد وارث کے علاوہ کسی اور کو مثلاً فقراء کو ملتا ہے لہٰذا ایک تہائی مال کی حد تک وقف کو نافذ قرار دینے میں اس غیر یعنی فقیر کا اعتبار کیا گیا ہے اور وہ ایک تہائی مال جو وقف ہوگیا ہے اس کی آمدنی کے لئے وارث جس کے لئے وقف کیا گیا ہے اس کا اعتبار کیا تا کہ اسے اس کی آمدنی مل سکے۔

جس سے زبردستی وقف کرایا گیا ہو اس کے وقف کی شرعی حیثیت:

اگر کسی شخص سے زبردستی دھمکی دے کر وقف کرایا گیا تو یہ وقف شرعاً نافذ نہیں ہوگا۔ اکراہ کے زائل ہونے کے بعد اسے اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس وقف کو نافذ کرنا چاہے تو نافذ کردے ختم کرنا چاہے تو ختم کردے، کیونکہ احناف کے نزدیک مُکْرَہ کے ایسے تصرفات جو فسخ کا احتمال رکھتے ہوں اور ہزلاً درست نہیں ہوتے وہ فاسد کے حکم میں ہیں، اس اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ مُکْرَہ کا وقف بھی فاسد ہو۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ کشف الاسرار میں تحریر فرماتے ہیں:

وان کان یحتمله ای الفسخ ویتوقف علی الرضا کالبیع ونحوه ای الاجارة یقتصر علی المباشر الا انه یفسد لعدم الرضا. [۲]

اگر عقد ایسا ہو جو فسخ کا احتمال رکھتا ہو اور فریقین کی رضامندی پر موقوف ہو جیسے بیع اجارہ وغیرہ تو ایسا عقد مباشر ہی پر مقتصر رہتا ہے ہاں اس کی رضامندی نہ ہونے کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۱۹۵/۵)

(۲) النسفی، عبد اللہ بن احمد المعروف بحافظ الدین النسفی ۷۱۰ھ. کشف الاسرار، بیروت، دار الکتب العلمیة الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۷م (۵۷۶/۲)

وان كانت من التصرفات القولية التى تحتمل الفسخ ولا تبطل بالهزل كالنكاح والطلاق والرجعة ثبت حكمها وهو وقوعها صحيحة نافذة فلا اثر للاكراه فيها ...... اما اذا كانت التصرفات القولية انشاء ات تحتمل الفسخ ولا تصح مع الهزل كالبيع فان اثر الاكراه فيها الفساد فتقع فاسدة لاباطلة وهذا عند الحنفية ...... وعند الشافعية والجعفرية والحنابلة وغيرهم لايترتب على قول المكره الفاعل حكم بل تهدر اقواله فلا يقع طلاقه ولا بيعه ولا اى تصرف قولى. (۱)

مکرہ کا تصرف اگر ایسے تصرفات کی قبیل سے ہے جو فسخ کا احتمال رکھتے ہیں اور ہزل سے باطل نہیں ہوتے جیسے نکاح، طلاق اور رجعت وغیرہ تو یہ تصرفات درست سمجھے جائیں گے اور ان کا حکم جو بھی ہوگا وہ نافذ ہوگا، اکراہ کا ان میں کوئی اثر نہیں ہوگا، اگر اس کا تصرف ان تصرفات کی قبیل سے ہے جو انشاءات ہیں فسخ کا احتمال رکھتے ہیں ہزل سے درست نہیں ہوتے جیسے بیع وغیرہ تو ان میں اکراہ کا اثر ظاہر ہوگا کہ یہ فاسد ہوں گے، باطل نہیں ہوں گے احناف کے نزدیک، شوافع حنابلہ اور جعفریہ کے نزدیک مکرہ کے قول اور تصرف پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اس کے اقوال سب بیکار ہیں اس کی طلاق اور بیع وغیرہ نافذ نہیں ہوں گے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ نے مبسوط میں ایک مسئلہ کے ضمن میں مکرہ کے وقف کے صحیح نہ ہونے کی صراحت بھی کی ہے، لکھتے ہیں:

و محمد يقول ان تمام الوقف يعتمد تمام الرضاء مع اشتراط الخيار لايتم الرضا فيكون ذلك مبطلا للوقف بمنزلة الاكراه على الوقف. (۲)

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف میں مکمل رضامندی ضروری ہے، خیار کی شرط اگر لگائی جائے گی تو مکمل رضامندی نہیں پائی جائے گی جس سے وقف باطل ہوجائے گا جیسے اگر وقف پر مجبور کیا جائے تو وقف باطل ہوجاتا ہے۔

---

(۱) زیدان، الدکتور عبد الکریم زیدان. الوجیز فی اصول الفقه، بیروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م (۱۳۸)

(۲) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۱۲/ ۴۲) مزید دیکھئے: الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۲/ ۳۷۷) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۴/ ۷۷)

غیر مسلم کا وقف

واقف کے لئے مسلمان ہونا بالاتفاق ضروری نہیں، غیر مسلم بھی وقف کرسکتا ہے البتہ اس کے لئے ضابطہ یہ ہے کہ وہ ایسی جہت پر وقف کرے جو مسلمانوں کے نزدیک اور غیر مسلموں کے نزدیک قربت ہو، اگر وہ جہت کسی ایک کے نزدیک باعثِ قربت ہو تو یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ علامہ طرابلسیؒ یہ اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الأصل فی هذا الباب أن ماکان وقفه أو الوقف علیه قربة عندنا وعندهم یصح وقفه والوقف علیه وماکان قربة عندنا فقط أو عندهم فقط لایصح وقفه ولا الوقف علیه. [1]

اس باب میں اصل یہ ہے کہ جس چیز کا وقف یا جس جہت پر وقف کیا جارہا ہے اس پر وقف کرنا ہمارے اور ان کے نزدیک قربت ہو تو وہ وقف درست ہوجائے گا، جو صرف ہمارے نزدیک قربت ہو یا صرف ان کے نزدیک قربت ہو اس کا وقف کرنا یا اس پر وقف کرنا درست نہیں ہوگا۔

اس اصول پر درج ذیل مسائل متفرع ہوتے ہیں:

۱۔ غیر مسلم اگر اپنے عبادت خانوں کے لئے وقف کریں تو یہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ یہ ان کے نزدیک تو باعثِ قربت ہے، ہمارے نزدیک باعثِ قربت نہیں۔

۲۔ غیر مسلم حج یا عمرہ کرانے کے لئے وقف کریں، یہ وقف بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ حج یا عمرہ کرانا مسلمانوں کے نزدیک تو باعث قربت ہے لیکن غیر مسلموں کے نزدیک باعثِ قربت نہیں البتہ اگر وہ اسے خود اپنے لئے قربت کا ذریعہ سمجھیں تو گنجائش ہے۔

۳۔ غیر مسلم بیت المقدس کی تعمیر یا اس کی ضروریات پورا کرنے کے لئے وقف کریں تو یہ وقف درست ہوگا کیونکہ بیت المقدس کی تعمیر اور اس کی ضروریات پر خرچ کرنا مسلمانوں اور

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ(۸۲)

غیر مسلموں دونوں کے نزدیک باعثِ قربت ہے، یہی حکم فقراء، مساکین، یتامیٰ، مسافر خانوں وغیرہ پر وقف کا ہوگا۔ احکام الاوقاف میں ہے:

قلت: فان قال تكون غلة هذا الوقف فى ثمن الزيت والاسراج فى بيت المقدس؟ قال: هذا جائز من قبل أن أهل الذمة يتقربون بذلک وهو عند المسلمين قربة ايضاً. (۱)

میں نے عرض کیا کہ اگر غیر مسلم بیت المقدس میں چراغ جلانے اور روشنی کے اخراجات کے لئے وقف کرے تو کیا یہ درست ہے؟ امام نے فرمایا کہ جائز ہے کیونکہ یہ جس طرح مسلمانوں کے نزدیک باعث قربت ہے اسی طرح اہل ذمہ بھی اسے باعث قربت سمجھتے ہیں۔

علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

قال احمد فى نصارى وقفوا على البيعة ضياعاً كثيرة وماتوا ولهم ابناء نصارىٰ فأسلموا والضياع بيد النصارىٰ فلهم أخذها وللمسلمين عونهم حتى يستخرجوها من أيديهم وهذا مذهب الشافعى ولانعلم فيه خلافا وذلک لأن مالايصح من المسلم الوقف عليه لايصح من الذمى كالوقف على غير معين. (۲)

کچھ نصاریٰ نے اپنے عبادت خانہ کے لئے کافی زمینیں وقف کیں اور مر گئے، ان کی اولاد جو عیسائی تھی وہ مسلمان ہوگئی، یہ زمینیں نصاریٰ کے قبضہ میں چلی گئیں، تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ ان مسلمان اولاد کے لئے وہ زمینیں نصاریٰ سے لینا جائز ہے اور مسلمانوں کو بھی ان کی مدد کرنی چاہئے تاکہ وہ اپنی زمینیں نصاریٰ سے حاصل کرلیں، یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور اس میں کسی کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے کیونکہ جس جہت پر مسلمان کے لئے وقف کرنا جائز نہیں ہے اس جہت پر ذمیوں کے لئے بھی وقف کرنا بھی جائز نہیں جیسے غیر معین پر وقف کرنا۔

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۹۹۹م (۲۹۰)

(۲) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۴۱ـ ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۲۳۵/۸)

غیر مسلم کا مسجد کے لئے کوئی جائیداد وقف کرنا یا مسجد کے لئے چندہ دینا:

مذکورہ بالا اصول سے اس صورت کا حکم بھی واضح ہے کہ اگر یہ اس کے مذہب اور عقیدہ کے مطابق باعثِ قربت ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں، ہمارے اکابر کے فتاویٰ میں اس سلسلہ میں جو متضاد فتاویٰ پائے جاتے ہیں ان میں اختلاف درحقیقت اس اصول کے انطباق میں اختلاف پر مبنی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ میں ایک جگہ اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ کیا ہندو آریہ کا اپنا مکان مسجد کے لئے وقف کر دینا درست ہے؟ اس پر مسجد بن سکتی ہے یا نہیں؟ فرماتے ہیں:

> عبارت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ کافر کا وقف اس شرط کے ساتھ صحیح ہوسکتا ہے کہ کسی ایسے کام کے لئے وقف کرے جو ہمارے مذہب میں اور اس کافر کے مذہب میں بھی ثواب ہو، مسجد بنانا ظاہر ہے کہ صرف ہمارے مذہب میں ثواب ہے آریہ مذہب میں مسجد بنانا کوئی ثواب نہیں ہے، اس آریہ کا یہ وقف ہی صحیح نہیں، اور نہ اس پر مسجد بنانا صحیح ہے۔ (۱)

جبکہ امداد الفتاویٰ کے مختلف فتاویٰ سے ہندوؤں کے مسجد تعمیر کرنے یا ان سے چندہ لینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ (۲)

مبنیٰ دونوں بزرگوں کے فتاویٰ کا یہی تحقیق ہے کہ مسجد تعمیر کرنا یا اس میں چندہ دینا ہندوؤں کے نزدیک باعثِ قربت ہے یا نہیں؟

کن صورتوں میں غیر مسلموں کا چندہ قبول نہیں کرنا چاہیئے:

لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اگر یہ احتمال غالب ہو کہ غیر مسلم چندہ دے کر مسلمانوں پر احسان کرنے لگیں گے یا مسلمان ان کے چندہ سے مرعوب ہو کر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت کرنے لگیں گے یا ان کی خاطر اپنے مذہبی شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے تو ان صورتوں میں بالاتفاق غیر مسلم کا چندہ یا وقف قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہو کر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے اس شرط سے قبول کرنا جائز ہے۔ (۳)

---

(۱) شفیع، مفتی اعظم مفتی محمد شفیع۔ امداد المفتین، کراچی، دارالاشاعت ۱۹۷۷م (۷۹۶)

(۲) تھانوی، حکیم الامۃ اشرف علی تھانوی۔ امداد الفتاویٰ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم (۲/۶۶۳-۶۶۴)

(۳) تھانوی، حکیم الامۃ اشرف علی تھانوی۔ امداد الفتاویٰ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم (۲/۶۶۳-۶۶۴)

مرتد کا وقف

مرتد اگر حالتِ ارتداد میں وقف کرے تو امام ابوحنیفہؒ کے اصول کے مطابق تو اس کا وقف موقوف رہے گا، اگر اسے قتل کر دیا جائے یا دار الحرب چلے جانے کی وجہ سے اس کی شہریت دار الاسلام سے ختم کر دی جائے یا اسی ارتداد کی حالت میں وہ طبعی موت مر جائے تو ان تمام صورتوں میں اس کا وقف باطل ہو جائے گا اور اگر وہ دوبارہ اسلام قبول کر لے تو وقف صحیح سمجھا جائے گا۔

جبکہ حضرت امام محمدؒ کے نزدیک اس نے ارتداد کے بعد جو مذہب اختیار کیا ہے ان کے وقف کا جو حکم ہوگا وہ اس مرتد کے وقف کا بھی حکم ہوگا، یعنی غیر مسلموں کے وقف کے بارے میں ہم نے جو اصول تحریر کیا ہے وہ اس پر بھی لاگو ہوگا۔

مرتدہ کو چونکہ قتل نہیں کیا جاتا اس لئے اس کے وقف کے بارے میں امام صاحب رحمہ اللہ کا بھی وہی مؤقف ہے جو امام محمد رحمہ اللہ کا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

لو وقف في حال ردته فهو موقوف عند الامام فان عاد الى الاسلام صح والافان مات أو قتل على ردته أو حكم بلحاقه بطل، ولا رواية فيه عن أبي يوسف وعند محمد يجوز منه مايجوز من القوم الذين انتقل الى دينهم ويصح وقف المرتدة لأنها لاتقتل الا ان يكون على حج أو عمرة ونحو ذلك فلايجوز كما في شرح الوهبانية.[1]

اگر کسی نے حالتِ ارتداد میں وقف کیا تو امام صاحبؒ کے نزدیک یہ وقف موقوف رہے گا اگر وہ اسلام کی طرف لوٹ آتا ہے تو یہ صحیح ہو جائے گا ورنہ اگر وہ مر گیا یا ارتداد کی وجہ سے قتل کر دیا گیا اس کی دار الاسلام کی شہریت ختم کر دی گئی تو یہ وقف باطل ہو جائے گا،

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۰۰) مزید دیکھئے: احکام الاوقاف للخصاف (۲۹۰) الفتاوی التتارخانیہ (۵/۸۸۳)

امام ابو یوسفؒ سے اس سلسلہ میں کوئی روایت نہیں ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک اس کے وہ تصرفات درست ہیں جو اس مذہب والوں کے درست سمجھے جاتے ہیں جن کا مذہب اس نے اختیار کیا ہے (لہٰذا وقف کا بھی یہی حکم ہوگا) البتہ مرتدہ کا وقف درست ہے کیونکہ اسے قتل نہیں کیا جاتا، ہاں حج اور عمرہ وغیرہ کے لئے وہ وقف کرے تو وہ معتبر نہیں ہوگا۔

حالتِ اسلام میں کئے گئے وقف پر ارتداد کا اثر:

کسی شخص نے مسلمان ہونے کی حالت میں وقف کیا اور پھر نعوذ باللہ مرتد ہوگیا تو جمہور فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کا موقف تو یہ ہے کہ اس کا وقف باطل ہوجائے گا کیونکہ مرتد ہوتے ہی اس کے سارے اعمال حبط ہوگئے اس لئے اس کا وقف بھی کالعدم ہوجائے گا۔ امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قلت: أرايت الرجل المسلم اذا وقف أرضا له وقفا صحيحاً على المساكين ثم انه ارتد عن الاسلام بعد ذلك فقتل على ردته أو مات؟ قال: يبطل الوقف وتصير الأرض ميراثا بين ورثته من قبل أن عمله قد حبط وهذا انما هو قربة الى الله تعالىٰ فلايتم ذلك. [1]

میں نے عرض کیا کہ ایک مسلمان نے اپنی زمین مساکین پر وقف کی پھر نعوذ باللہ وہ اسلام سے مرتد ہوگیا اور ارتداد کی حالت میں مرگیا یا اس کی وجہ سے قتل کردیا گیا تو اس کے وقف کا کیا حکم ہوگا؟ امام نے فرمایا کہ اس کا وقف باطل ہوجائے گا، اور یہ زمین اس کی میراث بن جائے گی کیونکہ ارتداد کی وجہ سے اس کے اعمال ضائع ہوگئے وقف بھی ایک قربت ہے اور ارتداد کی حالت میں درست نہیں ہوگی۔

ردالمحتار میں ہے:

لو وقف ثم ارتد والعياذ بالله تعالىٰ بطل وقفه وان عاد الى الاسلام مالم يعد وقفه بعد عوده لحبوط عمله بالردة. [2]

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۳۰۲)

(۲) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولى ۱۴۰۶ھ (۳۹۹/۶)

اگر وقف کیا پھر اللہ کی پناہ وہ مرتد ہوگیا تو اس کا وقف باطل ہوجائے گا، پھر اگر اسلام لے بھی آتا ہے تو وقف درست نہیں ہوگا الا یہ کہ اسلام لانے کے بعد دوبارہ وقف کرے، کیونکہ ارتداد کی وجہ سے اس کے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔

علامہ اندریتیؒ بھی تحریر فرماتے ہیں:

وأما اذا وقف وقفا صحيحا وجعل آخره للمساكين ثم ارتد الواقف بعد ذلك وقتل على ردته أو مات بطل الوقف ويصير ميراثا لورثته فان رجع الى الاسلام فان وقف بعد مارجع جاز وان لم يفعل لم يجز.[1]

اگر کسی نے مساکین پر بالکل صحیح وقف کیا اور پھر نعوذ باللہ مرتد ہوگیا اور ارتداد پر ہی قتل کردیا گیا یا مرگیا تو وقف باطل ہوجائے گا اور اس کی میراث بن جائے گا، اگر اسلام لے آتا ہے اور پھر دوبارہ وقف کرتا ہے تو صحیح ہے ورنہ وقف درست نہیں ہوگا۔

یہی رائے علامہ ابن نجیمؒ کی بھی ہے۔[2]

جمہور احناف کے مذہب پر اعتراض:

عرصہ سے یہ سوال ذہن میں تھا کہ اگر ایک شخص نے اسلام کی حالت میں وقف کیا تو اس کی ملکیت ختم ہوچکی ہے، اب اس کے مرتد ہونے سے اس کے سابقہ وقف پر اثر کیسے پڑ رہا ہے؟ حالانکہ اس وقف سے فقراء کا حق بھی متعلق ہوچکا ہے اس کے ارتداد سے وہ کیوں متاثر ہورہے ہیں؟

علامہ رافعیؒ کا موقف:

کافی تلاش وجستجو کے بعد اس کا جواب علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر میں ملا، پہلے تقریرات رافعی کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

قال عبد الحليم فى اول وقف الدرر مانصه ...... وأما الثانى فانه اذا وقف حال اسلامه وقفا صحيحا ثم ارتد بعد ذلك وقتل على ردته أو مات بطل الوقف و صار ميراثا لحبوط عمله وقال صاحب المحيط

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التاتارخانیه، کراچی، ادارۃ القرآن، الطبعة ۱۴۱۱ھ (۵/۸۸۳)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۱۸۹)

وعنده فی هذه المسئلة نظر فان حبوط عمله ینبغی أن یکون فی ابطال ثوابه لا ابطال مایتعلق به حق الفقراء وصار الیهم فانه ینبغی أن لا یبطل حقهم بفعله اه اقول ومن الله الاعانة والتوفیق أن هذا النظر مدفوع عن اخره لما أن هذه المسئلة مبنیة علی قول أبی حنیفة والوقف عنده حبس العین علی ملک الواقف ومن ذلک صح تملیکه وارثه والرجوع عنه بعد کونه وقفا صحیحا فاذا بقی الوقف فی ملکه لم یبق فرق بین الوقف قبل الارتداد وبعده ...... خلافا لهما فیهما فانه ان وقف حال الاسلام فعند أبی یوسف خرج عن ملکه بمجرد قوله وقفت هذا لهذا وعند محمد خرج عنه به وبالتسلیم والقبض فلم یبق فی ملکه عندهما فلایبطل بالردة الخ.[1]

علامہ عبدالحلیمؒ نے درر کے وقف کے شروع میں ارشاد فرمایا کہ دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کی حالت میں کسی نے وقف کیا پھر وہ مرتد ہوگیا اور ارتداد کی وجہ سے قتل کردیا گیا یا ارتداد کی حالت میں مرگیا تو اس کا وقف باطل ہوجائے گا اور اس کی میراث بن جائے گا کیونکہ اس کا عمل ضائع ہوگیا ہے ارتداد کی وجہ سے، صاحب محیط نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں مجھے اشکال ہے کیونکہ اعمال کے حبط ہونے کا اثر اس کے ثواب کے باطل ہونے میں ہونا چاہئے نہ کہ اس چیز کے باطل ہونے میں جس سے فقراء کا حق متعلق ہوچکا ہے اس کے عمل ارتداد کی وجہ سے وقف کو باطل قرار دے کر فقراء کے حق کو باطل کردینا مناسب نہیں، میں (علامہ رافعی) عرض کرتا ہوں کہ یہ اشکال بالکل ختم ہوجاتا ہے اسی تفصیل سے کہ ارتداد کی وجہ سے وقف کو باطل قرار دینے والا مسئلہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر مبنی ہے کہ ان کے نزدیک وقف میں موقوفہ چیز کی ذات واقف کی ملکیت ہی میں رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ وقف کرنے کے بعد کسی اور کو اس کا مالک بناسکتا ہے اس کی میراث اس میں جاری ہوتی ہے وہ وقف سے رجوع بھی کرسکتا ہے جب امام صاحب کی رائے کے مطابق واقف کی ملکیت اس میں باقی ہے تو ارتداد سے پہلے وقف کیا ہو یا ارتداد کی حالت میں وقف کیا ہو دونوں صورتوں میں

(۱) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۷۶/۴)

کوئی فرق نہیں ہوگا اس کی ملکیت باطل ہو جائے گی۔ بخلاف صاحبین کے موقف کے کہ ان کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے امام ابو یوسف کے نزدیک ''وقفتُ'' کہنے سے اور امام محمدؒ کے نزدیک متولی کے حوالہ کردینے سے، لہٰذا جب موقوفہ چیز میں واقف کی ملکیت ہی باقی نہیں رہی تو ارتداد کی وجہ سے یہ وقف باطل نہیں ہوگا اور اس میں واقف کے ارتداد کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا کیونکہ اب اس موقوفہ چیز کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔

علامہ رافعیؒ کے موقف کا حاصل یہ ہے کہ جمہور فقہاءِ احنافؒ نے مرتد کے حالت اسلام میں کئے گئے وقف کو ارتداد کی وجہ سے جو باطل قرار دیا ہے وہ درحقیقت وقف کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کے موقف پر مبنی ہے امام صاحبؒ کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی اسے اس میں تمام تصرفات کا حق حاصل ہوتا ہے اس میں اس کی میراث بھی جاری ہوتی ہے لہٰذا جب اس کی ملکیت وقف پر باقی ہے تو اس کے دیگر تصرفات کی طرح یہ تصرف بھی باطل ہو جائے گا۔

جبکہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک وقف کرنے سے موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اس لئے ان کے موقف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ارتداد سے وقف پر کوئی اثر نہ پڑے گا کیونکہ اس کا اب وقف سے کسی قسم کا کوئی مالکانہ تعلق باقی نہیں ہے۔

ترجیح:

ہم جیسا کہ پہلے باب کے تحت تفصیل سے تحریر کر چکے ہیں کہ ملکیت وقف کے سلسلہ میں حضرات صاحبین رحمہما اللہ کا قول راجح ہے کہ وقف کردہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے اور یہی جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کا بھی موقف ہے اس لئے اس مسئلہ میں بھی اسی قول پر عمل ہونا چاہئے، اور واقف کے مرتد ہونے سے اس کے حالت اسلام میں کئے گئے وقف پر اثر نہیں ہونا چاہئے، خصوصاً جبکہ اس وقف سے فقراء اور دیگر مستحقین اور موقوف علیہم کا حق بھی متعلق ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم

دوسری فصل:

موقوف کی شرائط

اس فصل میں ہم ان شرائط کا جائزہ لیں گے جو وقف کردہ چیز میں پائی جانی چاہئیں۔

پہلی شرط: موقوفہ چیز مالِ متقوم ہو:

پہلی شرط یہ ہے کہ موقوفہ چیز مالِ متقوم ہو، مالِ متقوم سے مراد ایسی چیز ہے جو انسان کے قبضہ میں ہو اور شریعت کی نگاہ میں اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہو۔

لہٰذا اگر کوئی چیز انسان کے قبضہ میں نہیں ہے تو اس کا وقف درست نہیں مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اس جنگل میں جتنے جانور ہیں وہ میں نے وقف کئے تو یہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ یہ جانور اس کے قبضہ میں نہیں ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی چیز قبضہ میں تو ہو لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کی شرعاً اجازت نہ ہو تو اس کا وقف بھی درست نہیں، جیسے خنزیر اور شراب وغیرہ، علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

ومحله المال المتقوم. (۱)

وقف کا محل مال متقوم ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

ولا وقف مالا يجوز بيعه كأم الولد والمرهون والكلب والخنزير و سائر البهايم التى لاتصلح للصيد وجوارح الطير التى لايصاد بها لأنه نقل للملك فيها فى الحياة فأشبه البيع ولأن الوقف تحبيس الاصل

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۱۸۸)

وتسبيل المنفعة ومالا منفعة فيه لايحصل فيه تسبيل المنفعة.(۱)

جس چیز کی بیع جائز نہیں اس کا وقف بھی جائز نہیں جیسے ام الولد، مرہونہ چیز، کتے، خنزیر، اور ایسے درندے یا پرندے جن سے شکار نہیں کیا جا سکتا وغیرہ، کیونکہ ایک بات یہ ہے کہ وقف زندگی میں انتقالِ ملک کا نام ہے لہٰذا یہ بیع کے مشابہ ہوگیا اور دوسری بات یہ ہے کہ وقف موقوفہ چیز کی ذات کو باقی رکھتے ہوئے اس کے منافع راہ خدا میں خرچ کرنے کا نام ہے، اگر اس چیز میں منفعتِ (مباحہ) ہی نہیں ہے تو وہ خرچ کیسے کی جائے گی؟

اس عبارت سے اس وقف کے ناجائز ہونے کی وجہ بھی واضح ہے کہ وقف میں موقوفہ چیز کی منفعت سے کسی کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے اگر کوئی چیز واقف کے قبضہ ہی میں نہیں ہے یا قبضہ میں تو ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت شریعت نے اسے نہیں دی ہے تو وہ وقف کر کے کسی اور کو اس سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟

دوسری شرط: معلوم ومتعین ہو

دوسری شرط یہ ہے کہ جو چیز وقف کی جارہی ہے وہ معلوم اور متعین ہونی ضروری ہے، اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ میں نے اپنا کوئی گھر وقف کر دیا تو وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ وہ گھر متعین نہیں ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

السادس عدم الجهالة. فلو وقف من أرضه ولم يسمه كان باطلاً لأن الشيئى يتناول القليل والكثير ولو بين بعد ذلک ربما يبين شيئاً قليلا لايوقف عادة ...... ولو وقف هذه الأرض أو هذه الأرض وبين وجه الصرف كان باطلا لمكان الجهالة.(۲)

وقف کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ اس میں جہالت نہ ہو، اگر کسی نے اپنی زمین میں سے کچھ وقف کیا اور اسے معین نہیں کیا تو وقف باطل ہوگا، کیونکہ کچھ تو قلیل وکثیر سب کو شامل ہے، وہ بعد میں اگر بیان کرے تو ہوسکتا ہے کہ اتنی معمولی چیز بیان کرے جو عام طور پر وقف ہی نہیں

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۰/۸)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۸۸/۵)

کی جاتی، اور اگر کہا کہ میں یہ زمین یا یہ زمین وقف کرتا ہوں اور مصرف بیان کر دیا تو یہ بھی باطل ہوگا جہالت کی وجہ سے۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

ولا يصح الوقف فيما ليس بمعين كعبد فى الذمة و دار و سلاح لان الوقف ابطال لمعنى الملك فيه فلم يصح فى عبد مطلق كالعتق. (١)

غیر معین کا وقف درست نہیں جیسے ایک غیر معین غلام یا گھر یا اسلحہ وقف کیا، کیونکہ وقف کے ذریعہ آدمی موقوفہ چیز میں اپنی ملکیت باطل کرتا ہے تو وہ غیر معین غلام میں جائز نہیں۔

ہاں اگر گھر متعین کر دیا لیکن اس کی حدود بیان نہیں کی تو اس سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، مثلاً گھر کا نمبر بتا دیا کہ گلشن اقبال میں بلاک D مکان B/525 وقف کیا تو اتنا کہنا کافی ہے اس کی حدود اربعہ بتانا ضروری نہیں۔ (٢)

تیسری شرط: ملکیت

موقوفہ چیز کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ واقف کی ملکیت میں ہو، اگر کوئی چیز واقف کی ملکیت میں نہ ہو تو اسے وقف کرنا جائز نہیں، اس شرط پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے اور درج ذیل مسائل اس پر متفرع ہوتے ہیں:

(الف) غاصب کا وقف:

ایک شخص نے دوسرے کی زمین غصب کر کے وقف کر دی اور بعد میں مالک کو اس کا ضمان ادا کر دیا تو یہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ وقف کرتے وقت یہ اس کی ملکیت میں نہیں تھی، امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قلت: فما تقول فى رجل غصب من رجل ضيعة فوقفها على قوم ومن

---

(١) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ٥٤١ـ ٦٢٠ه. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ١٩٩٧م (٢٣١/٨)

(٢) دیکھئے: ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (٢٠١/٥) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ه (٣٦١/٤)

بعدهم على المساكين ثم انه اشتراها من صاحبها ودفع اليه الثمن أو صالح صاحبها على مال دفع ذلك اليه هل يجوز الوقف؟ قال: لايجوز وقفه اياها من قبل انه ملكها بعد ماوقفها. (۱)

میں نے عرض کیا کہ ایک شخص نے کسی کی زمین غصب کر کے متعین لوگوں پر اور ان کے بعد مساکین پر وقف کردی، پھر اس نے یہ زمین اصل مالک سے خرید لی اور اسے اس کی قیمت ادا کردی یا اس سے کچھ مال دے کر صلح کردی تو کیا یہ وقف درست ہو جائے گا؟ امام نے فرمایا کہ یہ وقف جائز نہیں کیونکہ یہ وقف کرنے کے بعد اس زمین کا مالک بنا ہے۔

(ب) ارضِ مستحق کا وقف:

ایک شخص نے زمین خریدی اور اسے وقف کردیا بعد میں اس زمین کا کوئی مستحق نکل آیا اور اس نے اس پر دعویٰ کر کے یہ زمین لے لی تو یہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ استحقاق نکل آنے سے ظاہر ہوا کہ یہ زمین بائع کی تھی ہی نہیں اس لئے واقف کی خریداری درست نہیں ہوئی اور جب خریداری درست نہیں ہوئی تو اس کی ملکیت بھی نہیں آئی چنانچہ وقف درست نہیں ہوگا۔ (۲)

(ج) فضولی کا وقف:

اگر کوئی شخص دوسرے کی زمین اس کی طرف سے وقف کردے تو اگرچہ یہ بھی غیر مملوک کا وقف ہے لیکن چونکہ وہ یہ وقف اپنی طرف سے نہیں کر رہا بلکہ اصل مالک کی طرف سے کر رہا ہے اس لئے اسے فضولی کا وقف کہا جائے گا اور یہ فضولی کے دیگر تصرفات کی طرح اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر وہ اجازت دیدے گا اور اس وقف کو نافذ کردے گا تو یہ وقف درست ہو جائے گا ورنہ درست نہیں ہوگا۔

علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

ومن الشروط الملك وقت الوقف حتى لو غصب أرضا فوقفها ثم اشتراها من مالكها و دفع ثمنها اليه أو صالح على مال دفعه اليه

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۴۷)

(۲) دیکھئے حوالہ بالا

لاتكون وقفا لأنه انما ملكها بعد أن وقفها هذا على أنه هو الواقف أمالو وقف ضيعة غيره على جهات فبلغ الغير فأجازه جاز ...... وهذا هو المراد بجواز وقف الفضولي.(۱)

وقف کی شرائط میں سے ایک ملکیت بھی ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اس کا مالک بھی ہو، لہٰذا اگر کسی کی زمین غصب کر کے اسے وقف کردیا پھر اسے مالک سے قیمت دے کر خرید لیا یا کچھ مال دے کر صلح کر لی تو یہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ وہ وقف کرنے کے بعد اس کا مالک بنا ہے یہ مسئلہ اس وقت ہے جبکہ وہ دوسرے کی زمین اپنی طرف سے وقف کردے، اگر دوسرے کی زمین کسی جہت پر وقف کرے، اسے اس کی اطلاع ہو اور پھر وہ اس وقف کو نافذ کردے تو یہ جائز ہے فضولی کے وقف کے جائز ہونے سے یہی صورت مراد ہے۔

(د) اراضی اقطاعات کا وقف اور اس کی مختلف صورتیں:

اقطاعات سے مراد وہ زمینیں ہیں جو امام المسلمین نے کسی کو مکمل طور پر مالک بنا کر دیدی ہوں یا صرف ان کے منافع حاصل کرنے کے لئے عارضی یا مستقل طور پر دیدی ہوں، ایسی زمینوں کے وقف میں تفصیل ہے:

۱۔ اگر امام نے کسی کو یہ زمینیں محض ان کے منافع سے فائدہ اٹھانے کے لئے دی ہیں تو ان کا وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ یہ شخص ان زمینوں کا مالک نہیں ہے۔

۲۔ اور اگر امام المسلمین نے یہ زمینیں کسی کو مکمل طور پر مالک بنا کر دیدی ہوں تو اگر یہ ارض موات ہوں تو یہ شخص ان زمینوں کا مالک بن جائے گا اور اس کا وقف درست ہوگا۔

۳۔ یا یہ زمین امام کی اپنی ذاتی ملکیت تھیں اور اس نے کسی کو مالک بنا کر دیدیں تو ایسی صورت میں بھی اس کا وقف درست ہوگا کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہیں۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

ان وصلت الى يده باقطاع السلطان اياها له ...... فان كانت مواتا أو

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندري المتوفى ۸٦۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۱۷/۵) و كذا في الاسعاف (۳۰)

ملکا للسطان صح وقفها.(۱)

اگر یہ زمین اسے بادشاہ کے دینے سے ملی ہے تو اگر یہ ارض موات میں سے ہو یا بادشاہ کی ملکیت ہو تو یہ وقف درست ہے۔

۴۔ اور اگر کسی نے یہ زمین بیت المال سے خریدی ہو تب بھی اس کے لئے اسے وقف کرنا جائز ہے کیونکہ بیت المال سے خریدنے کی وجہ سے وہ اس کا مالک بن گیا ہے۔

۵۔ اگر یہ زمین نہ ارض موات میں سے ہو اور نہ ہی امام کی ذاتی ملکیت ہو بلکہ بیت المال کی ملکیت ہو اور امام نے کسی کو یہ دیدی ہو تو اس کا وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ امام کے دینے سے یہ شخص اس زمین کا مالک نہیں بنا، امام جب چاہے اس سے خالی کراسکتا ہے اور اس کے انتقال کے بعد تو یہ واپس بیت المال میں چلی ہی جائے گی اس لئے اگر یہ قابض شخص یہ زمین وقف کرنا چاہے تو وہ درست نہیں۔

ردالمختار میں ہے:

وان كانت من حق بيت المال لايصح، قال الشيخ قاسم ان من أقطعه السلطان أرضا من بيت المال ملك المنفعة بمقابلة ما أعد له فله اجارتها وتبطل بموته أو اخراجه من الاقطاع لأن للسلطان أن يخرجها منه.(۲)

اور اگر بادشاہ نے جو زمین کسی کو دی ہے وہ بیت المال کی ہے تو اس کا وقف صحیح نہیں ہے شیخ قاسمؒ نے فرمایا کہ جسے بادشاہ نے بیت المال کی زمین مخصوص کر کے دیدی وہ اس کی منفعت کا تو مالک بن جاتا ہے اس کے لئے اسے اجارہ پر دینا بھی جائز ہے، لیکن یہ اس کی موت سے یا اسے اس زمین سے نکالنے سے باطل ہو جاتا ہے کیونکہ بادشاہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے اسے نکال دے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۹۳/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۹۳/۴)

(ہ) اراضی بیت المال کا وقف:

امام المسلمین اگر مسلمانوں کی عمومی مصلحت کی خاطر بیت المال کی اراضی وقف کرے تو شرعاً یہ وقف نہیں ہوگا کیونکہ وقف کے لئے ضروری ہے کہ موقوفہ چیز واقف کی ملکیت ہو، بیت المال کی اراضی حاکم کی ملکیت نہیں، ہاں اس عمل کو وقف کے بجائے ارصاد کہا جائے گا جس کی تفصیل ہم پہلے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

وان كان الواقف لها السلطان من بيت المال من غير شراء فأفتى العلامة قاسم بأن الوقف صحيح ...... قلت: وما أفتى به العلامة قاسم مشكل لما تقدم من أنها ان كانت من حق بيت المال لايصح ...... لأن أصلها لبيت المال أى فلم تكن وقفا حقيقة بل هى ارصاد أخرجها الامام من بيت المال وعينها لمن يستحق منه من العلماء و نحوهم. [1]

اگر بادشاہ بیت المال سے زمین خریدے بغیر اسے وقف کر دے تو علامہ قاسمؒ نے فتویٰ دیا ہے کہ وقف صحیح ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ علامہ قاسمؒ کا یہ فتویٰ اشکال سے خالی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ پہلے گذرا ہے کہ اگر زمین بیت المال کی ہے تو اس کا وقف درست نہیں کیونکہ وہ بادشاہ کی ملکیت ہی نہیں ہے بیت المال کی ملکیت ہے اس لئے یہ وقف نہیں ہے بلکہ ارصاد ہے کہ بادشاہ نے وہ زمین بیت المال سے نکال کر ایسے لوگوں کے لئے خاص کر دی ہے جنہیں بیت المال سے لینے کا حق ہے جیسے علماء وغیرہ۔

البتہ جیسا کہ ارصاد کی بحث کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ جس مقصد کے لئے سلطان نے وقف کیا ہے اگر وہ مصارفِ بیت المال کی قبیل سے ہو تو اسے باقی رکھا جائے گا اس میں تبدیلی یا اسے ختم کرنے کا اختیار دیگر سلاطین کو نہیں ہوگا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اور اگر امام نے بغیر تملیک وتملک کے بیت المال کی اراضی میں سے کسی زمین کو خاص کام کے لئے وقف کر دیا مثلاً بناء مساجد و مدارس یا مسافر خانے اور خانقاہیں وغیرہ تو یہ وقف

---

۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۹۳/۴)

اگر چہ حقیقۃً وقف نہیں ہوگا کیونکہ اس کے لئے ملک وتصرف شرط ہے اور یہاں وقف کنندہ امام اس زمین کا مالک نہیں لیکن عمومی احکام میں یہ بھی بحکم اوقاف ہیں کہ جس مصرف خاص کے لئے امام نے مقرر کر دیا ہے اسی میں صرف کیا جائے گا تغیر وتبدل کا اختیار نہ ہوگا بشرطیکہ وہ مصرف مصارف بیت المال میں سے ہو، اس قسم کے اوقاف سلطانیہ کو اصطلاحاتِ فقہاء میں ارصادات کہا جاتا ہے (شامی ج ۳ صفحہ ۳۵۷) ۷۸۰ھ میں سلطان نظام المملکت برقوق نے یہ ارادہ کیا کہ اس قسم کے اوقاف کو توڑ دیں کیونکہ وہ درحقیقت اوقاف نہیں بلکہ بیت المال سے نکالے گئے ہیں، اس کے لئے علماء کی ایک مجلس بغرض مشورہ وفتویٰ طلب کی گئی جس میں شیخ سراج الدین بلقینی اور شیخ اکمل الدین بابرتی شارح ہدایہ اور شیخ برہان بن جماعت وغیرہ حضرات تشریف لائے۔ شیخ بلقینی نے فیصلہ دیا کہ اس قسم کے اوقاف جو علماء طلباء کے لئے کئے گئے ہیں جن کا حق بیت المال میں ہے وہ بدستور باقی رکھے جاویں اور جو بلا وجہ شرعی کسی غیر مستحق کے لئے مخصوص کر دیئے گئے وہ توڑ دیئے جاویں، دوسرے علماء نے بھی اس کی موافقت کی۔ [1]

مشہور شافعی فقیہ علامہ شربینی رحمہ اللہ نے اراضی بیت المال کے وقف کو جائز قرار دیا ہے اور اسے ملکیت کی شرط سے مستثنیٰ کیا ہے [2] لیکن استثناء کی کوئی واضح وجہ ان کے کلام سے معلوم نہیں ہوتی۔ غالبًا تعاملِ سلاطین ہی کی بنیاد پر استثناء کیا ہوگا، لیکن اگر اسے ارصاد قرار دیا جائے تو مقصدِ وقف حاصل ہو جائے گا اور استثناء کی ضرورت بھی نہیں رہے گی، جیسا کہ ہم ماقبل میں تحریر کر چکے ہیں۔

(و) ارضِ حوز کا وقف:

ارض حوز سے مراد وہ زمین ہے جو بیت المال کی ہو، اسے آباد کرنے کے لئے حاکم مزارعین کو وہاں آباد کر دے کہ وہ اس میں زراعت کریں، اس زمین کا وقف بھی درست نہیں کیونکہ یہ مزارعین اس زمین کے مالک نہیں ہیں، امام خصافؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) اسلام کا نظام اراضی صفحہ ۲۷

(۲) دیکھئے: الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۷۸/۲)

قلت: فما تقول فی أرض الحوز یوقف انسان منها شیئاً هل یجوز؟
قال: الحوز هو شیء قد حازه السلطان وأدخل فیه مزارعین یعمرونه فانما هم أکرة فی ذلک للسلطان له أن یخرجهم من ذلک متی شاء فان وقف أحد من هولاء المزارعین شیئا من أرض الحوز لم یجز. (۱)

میں نے عرض کیا کہ آپ ارضِ حوز کے بارے میں کیا فرماتے ہیں اگر کوئی انہیں وقف کرے امام نے فرمایا کہ ارضِ حوز سے مراد وہ زمین ہے جسے بادشاہ الگ مخصوص کرلے اور ان میں کاشتکاروں کو رہائش دیدے کہ وہ اسے آباد کریں، یہ لوگ بادشاہ کے ملازم ہوتے ہیں اور جب چاہے بادشاہ انہیں نکال سکتا ہے، اگر ان مزارعین میں سے کوئی یہ زمین وقف کرتا ہے تو اس کا وقف درست نہیں ہوگا۔

چوتھی شرط: افراز

وقف اگر مسجد یا مقبرہ وغیرہ ہے تو بالاتفاق تمام فقہاء کرامؒ کے نزدیک اس میں افراز ضروری ہے یعنی وہ جگہ واقف اور کسی اور کی مشترکہ ملکیت نہ ہو بلکہ واقف کی تنہا ملکیت ہو، کیونکہ اگر مشترکہ اور مشاع جگہ کو ایک شریک اپنے حصہ کے بقدر مسجد کے لئے وقف کردے تو یہ وقف دوسرے شریک پر لازم نہیں ہوگا، اب اگر یہ جگہ نا قابلِ تقسیم ہو اور یہاں زمانہ کے لحاظ سے باری مقرر کی جائے تو جب واقف کے استعمال کی باری ہوگی اس وقت تو اس جگہ کو بطورِ مسجد استعمال کیا جائے گا اور جب دوسرے شریک کی باری آئے گی تو اسے اس میں تمام تصرفات کا اختیار حاصل ہوگا، چنانچہ وہ یہاں اگر جانور باندھنا چاہے تو اسے روکا نہیں جاسکتا، چنانچہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ مشترکہ جگہ ایک مہینہ مسجد کے طور پر استعمال ہوگی اور ایک مہینہ بطور اصطبل، یہی صورتحال قبرستان میں بھی ہوسکتی ہے، اس سے بچنے کے لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے مسجد اور قبرستان کے وقف میں افراز اور عدم مشاع کی شرط لگائی ہے۔ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

وانما اتفقوا علی منع وقف المشاع مطلقا مسجداً أو مقبرة لأن الشیوع یمنع خلوص الحق لله تعالیٰ ولأن جواز وقف المشاع فیما

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م (۳۲)

لایحتمل القسمة یحتاج فیه الی التهایؤ والتهایؤ فیه یؤدی الی أمر مستقبح وهو أن یکون المکان مسجداً سنة واصطبلا للدواب سنة ومقبرة عاما و مزرعة عاما أو میضاة عاما.[1]

فقہاء کرامؒ اس پر متفق ہیں کہ مسجد اور مقبرہ کا غیر منقسم حالت میں وقف بالکل جائز نہیں ہے کیونکہ شیوع سے یہ چیزیں خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں رہتیں، اور دوسری بات یہ ہے کہ غیر قابل تقسیم چیز کے وقف میں باری مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور مسجد ومقبرہ میں باری متعین کرنا نہایت قبیح ہے، اس کا نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ایک جگہ ایک سال مسجد ہو اور ایک سال اصطبل، اسی طرح ایک سال قبرستان ہو اور ایک سال کھیت یا وضوخانہ وغیرہ ہو۔

نا قابلِ تقسیم مشاع کا وقف:

اگر زمین نا قابل تقسیم ہو، جیسے مشترکہ حوض یا مشترکہ کنواں یا مشترکہ پن چکی تو ایسی صورت میں بلاافراز کوئی بھی شریک اپنا حصہ بالاتفاق وقف کرسکتا ہے۔ تنقیح الحامدیہ میں ہے:

اتفق ابویوسف و محمد علی جواز وقف مشاع لاتمکن قسمته کالحمام والبئر والرحی.[2]

امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کا ایسی مشترکہ چیز کے وقف کے جواز پر اتفاق ہے جو تقسیم نہ کی جاسکے جیسے حمام، کنواں اور پن چکی وغیرہ۔

قابلِ تقسیم مشاع کا وقف:

قابلِ تقسیم مشاع چیز کے وقف میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے، امام محمدؒ قابل تقسیم مشاع جگہ کے وقف کی اجازت نہیں دیتے جبکہ حضرت امام ابویوسفؒ اور جمہور فقہاء، شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک مشاع جگہ کا وقف جائز ہے۔

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸٦۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۲٦/۵)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیه، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۱۰/۱)

حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا یہ اختلاف درحقیقت اس اصولی اختلاف پر مبنی ہے کہ وقف کی تکمیل کے لئے اس پر متولی کا قبضہ یا موقوف علیہم کا قبضہ ضروری ہے یا نہیں، حضرت امام محمدؒ کے نزدیک چونکہ وقف کی تکمیل کیلئے متولی کا قبضہ ضروری ہے اس لئے وہ مشاع کے وقف کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اس پر قبضہ نہیں ہو سکے گا۔ علامہ سرخسیؒ امام محمدؒ کے موقف کے بارے میں لکھتے ہیں:

وأما عند محمد لايتم الوقف من الشيوع فيما يحتمل القسمة لأن على مذهبه أصل القبض شرط لتمام الوقف فكذلک مايتم به القبض وتمام القبض فما يحتمل القسمة بالقسمة واعتبره بالصدقة المنفذة فانها لاتتم فى مشاع يحتمل القسمة كالهبة. (۱)

امام محمدؒ کے نزدیک قابل تقسیم مشترکہ چیز کا وقف بغیر تقسیم کے درست نہں کیونکہ ان کے نزدیک وقف کے مکمل ہونے کے لئے نفس قبضہ شرط ہے لہٰذا جس چیز کے ذریعہ قبضہ تام ہوگا وہ بھی شرط ہوگی، قابل تقسیم اشیاء میں تقسیم کے بغیر قبضہ تام نہیں ہوتا لہٰذا اس کے وقف کے لئے تقسیم ضروری ہوگی، وہ اسے صدقہ منفذہ پر قیاس کرتے ہیں جیسے ہبہ وغیرہ کہ یہ تقسیم کے بغیر تام نہیں ہوتے۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف کی تکمیل کے لئے صرف واقف کا زبانی وقف کر دینا کافی ہے اسے متولی کے قبضہ میں دینا ضروری نہیں اس لئے ان کے نزدیک مشاع کا وقف مطلقاً جائز ہے، امام ابو یوسفؒ کی دلیل مبسوط میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

لان القسمة من تتمة القبض فان القبض للحيازة وتمام الحيازة فيما يقسم بالقسمة، ثم أصل القبض عنده ليس بشرط فى الصدقة الموقوفة فكذلک ماهو من تتمة الوقف وهذا لان الوقف على مذهبه قياس العتق والشيوع لايمنع العتق فكذلک لايمنع الوقف. (۲)

---

(۱) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۱۲/۳۷)

(۲) حوالہ بالا، نیز دیکھئے: المرغینانی، برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۴۲۵)

تقسیم قبضہ کا تتمہ ہے کیونکہ قبضہ حیازہ کے لئے ہوتا ہے اور تمامِ حیازہ قابل تقسیم اشیاء میں تقسیم ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، پھر ان کے نزدیک نفسِ وقف میں قبضہ شرط نہیں تو جو وقف کا تتمہ ہو اس میں بھی قبضہ ضروری نہیں ہوگا، کیونکہ امام ابو یوسفؒ کے مذہب کے مطابق وقف کو عتق پر قیاس کیا جاتا ہے اور شیوع عتق سے مانع نہیں لہٰذا وقف سے بھی مانع نہیں ہوگا۔

جمہور کا موقف:

جمہور فقہاء کی رائے بھی امام ابو یوسفؒ کے مطابق ہے کہ قابلِ تقسیم مشاع میں اگر کوئی ایک شریک اپنا غیر منقسم حصہ وقف کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ شافعی فقیہ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

ویصح وقف عقار و منقول ومشاع. [1]

زمین، منقول اشیاء اور مشاع جگہ کا وقف درست ہے۔

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ اپنا موقف مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں:

ویصح وقف المشاع و بهذا قال مالک والشافعی وابویوسف...... ولنا أن فی حدیث عمر انه أصاب مائة سهم من خیبر واستأذن النبی صلى الله علیه وسلم فیها فأمره بوقفها، وهذا صفة المشاع ولأنه عقد یجوز علی بعض الجملة مفرزا فجاز علیه مشاعا کالبیع أو عرضه یجوز بیعها فجاز وقفها کالمفرزة ولأن الوقف تحبیس الأصل و تسبیل المنفعة وهذا یحصل فی المشاع کحصوله فی المفرز. [2]

مشاع کا وقف جائز ہے یہی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں، ہمارا استدلال حضرت عمرؓ کے واقعہ سے ہے کہ آپ کو خیبر کے سو حصے ملے تھے آپ نے حضور سے انہیں وقف کرنے کی اجازت لی، حضور نے انہیں وقف کرنے کا حکم دیدیا تھا، یہ مشاع ہی حصے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ اس زمین کے بعض حصے الگ کر کے جب وقف کیا جاسکتا

---

(۱) النووی، یحییٰ بن اشرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دارالفکر (۲/۳۷۷)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۸/۲۳۳)

ہے تو مشاعاً بھی وقف کرنے کی اجازت ہونی چاہئے جیسے بیع، تیسری بات یہ ہے کہ وقف اصل کو باقی رکھتے ہوئے اس کے منافع خرچ کرنے کا نام ہے، یہ مقصد جس طرح منقسم چیزوں میں حاصل ہوسکتا ہے اسی طرح مشاع میں بھی حاصل ہونا چاہئے۔

مالکی فقیہ علامہ دردیرؒ لکھتے ہیں:

صح وقف مملوک...... أو كان مشتركا شائعا فيما يقبل القسمة ويجبر عليها الواقف ان أرادها الشريک. (۱)

مملوک کا یا قابل تقسیم مشترک چیز کا غیر منقسم حالت میں وقف درست ہے، اور اگر شریک تقسیم چاہے گا تو واقف کو اس پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

جمہور کے موقف پر اعتراض:

جمہور کے موقف پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر مشاع کے وقف کی اجازت دی جائے گی تو وقف ہونے کے بعد شریک کے مطالبہ پر اس کی تقسیم اور افراز ضروری ہوگا یہ تقسیم تو بیع کے حکم میں ہے حالانکہ وقف کی بیع جائز نہیں۔

اس کا جواب علامہ دسوقیؒ نے ایک تو یہ دیا کہ مشاع کی تقسیم میں جہاں بیع کا امکان ہے وہاں ایک امکان یہ بھی ہے کہ ہم تقسیم مشاع کو بیع تصور نہ کریں بلکہ تمییز فرض کریں جو کہ راجح ہے، تمییز فرض کرنے کی صورت میں بیع کا اعتراض لازم نہیں آئے گا اور اگر ہم تقسیم مشاع میں بیع کے پہلو ہی کو غالب سمجھیں تو پھر یہ جواب ہوسکتا ہے کہ واقف نے جب اپنا حصہ مشاع وقف کیا تھا تو اس وقت ہی یہ واضح تھا کہ اس کی تقسیم کی نوبت آئے گی جو بحکم بیع ہوگی تو گویا اس کی طرف سے دلالۃً بیع کی اجازت پائی گئی۔ (۲)

ترجیح:

راجح حضرت امام ابو یوسفؒ اور جمہور کا قول ہی معلوم ہوتا ہے کہ قابلِ تقسیم مشاع کا وقف جائز ہونا چاہئے کیونکہ مشاع میں ہر شریک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تقسیم کا مطالبہ کرے، لہٰذا اگر ابتداءً وقف کا

---

۱) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الکبیر بهامش الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۲۶۳/۳ و کذا ۷۶/۴)

۲) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۷۶/۴)

حصہ مشاع تھا تو وقف کرنے کے بعد واقف کو یا اس کے مقرر کردہ متولی کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ اگر وقف کے انتظام میں مشکل پیش آئے تو وہ تقسیم کا مطالبہ کر کے وقف کو الگ کروالے، نیز تیسرے باب میں ہم تفصیل سے ذکر کریں گے کہ وقف کی تکمیل کے لئے اس پر قبضہ ضروری نہیں اور اس میں بھی امام ابو یوسفؒ اور جمہور کا قول راجح ہے لہٰذا جب قبضہ ہی ضروری نہیں تو موقوفہ چیز کا مشاع ہونا وقف کی صحت کے لئے مانع نہیں ہوگا۔ فتاویٰ کاملیہ میں ہے:

سئلت ماهو المعمول به فی وقف المشاع فالجواب ان وقف المشاع فیه الخلاف، جوزه ابویوسف ومنعه محمد رحمهما الله واختلف التصحیح وقد نقل الکفوی الخلاف ثم قال والمتأخرون افتوا بقول ابی یوسف انه یجوز وهو المختار وعمل القضاة والمفتیین فی بلادنا علی قول أبی یوسف. (۱)

مجھ سے سوال کیا گیا کہ مشاع چیز کے وقف کے بارے میں کیا حکم ہے؟ جواب یہ ہے کہ مشاع کے وقف میں اختلاف ہے، امام ابو یوسفؒ نے اسے جائز قرار دیا ہے، امام محمدؒ نے منع کیا ہے، تصحیح میں بھی اختلاف ہے، علامہ کفوی نے اختلاف نقل کر کے فرمایا ہے کہ متاخرین نے امام ابو یوسف کے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ مشاع کا وقف جائز ہے اور یہی مختار ہے، ہمارے بلاد میں قاضیوں اور مفتیان کرام کا عمل اسی پر ہے۔

امام بخاریؒ نے بھی اسے راجح قرار دیا ہے اور بخاری شریف میں دو احادیث سے اس پر استدلال کیا ہے ایک تو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے کہ جب غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کے واقعہ میں ان کی توبہ قبول ہوگئی تو آپ نے حضور سے عرض کیا کہ میں اپنا سارا مال وقف کرنا چاہتا ہوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أمسک علیک بعض مالک فهو خیر لک.

اپنا کچھ مال اپنے پاس رکھ لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مال اپنے پاس سے رکھنے اور کچھ مال وقف کرنے کا مشورہ دیا اور وہ کچھ مال مقسوم بھی ہوسکتا ہے اور مشاع بھی، لہٰذا اس سے مشاع

---

(۱) کامل، محمد کامل بن مصطفی بن محمود الطرابلسی. الفتاوی الکاملیه، قندهار، دارالاشاعة العربیة (۵۲)

کے وقف کی اجازت ثابت ہوئی، دوسرا استدلال مسجد نبوی کی تعمیر کے واقعہ سے کیا ہے کہ وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تعمیر فرمانا چاہتے تھے کچھ لوگوں کی مشترک ملکیت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خریدنا چاہا تو انہوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا اور اسے مسجد کے لئے دیدیا، اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے اپنی مشترکہ زمین جو مشاع تھی مسجد کے لئے بغیر تقسیم کے دیدی، معلوم ہوا کہ مشاع کا وقف جائز ہے۔[1]

کمپنی کے شیئرز کا وقف:

جمہور کے موقف ہی کی بنیاد پر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الاحکام میں کمپنی کے شیئرز کے وقف کی اجازت دی ہے کیونکہ شیئرز درحقیقت کمپنی میں حصہ مشاعہ کی ملکیت پر دلالت کرتے ہیں وہ حصہ مشاعہ کمپنی کی غیر منقولہ اور منقولہ اشیاء دونوں پر مشتمل ہیں، حضرت تحریر فرماتے ہیں:

> چونکہ ان حصوں کا وقف متعارف ہے اس لئے جائز ہے اگر خریدار کی ملک میں مکانات و دوکانات وغیرہ ہیں جب تو یہ وقف عین مشاع ہے اور وقف مشاع امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صحیح ہے اور اگر خریدار کی ملک میں مکانات و دوکانات نہیں بلکہ صرف رقم اور اس کا منافع ہے تو یہ وقف دراہم کی جنس سے ہے جو امام محمدؒ کے نزدیک بوقتِ تعارف جائز ہے اس لئے بہرحال ان حصص کا وقف جائز ہے۔[2]

البتہ شیئرز کے وقف ہو جانے کے بعد ان پر تمام احکام وقف جاری ہوں گے کہ اگر ان کی قیمت میں نقصان نہیں ہو رہا تو انہیں بیچنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ عام حالات میں وقف کی بیع جائز نہیں، ان سے حاصل ہونے والی آمدنی واقف کے مقرر کردہ مصارف پر خرچ کی جائے گی اور اگر قیمت میں مسلسل کمی ہو رہی ہے اور اضافہ کا امکان بھی کم ہے تو ایسی صورت میں استبدال وقف کی شرائط ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں بیچ کر دوسرے شیئرز خریدنا جن میں وقف کا فائدہ ظاہر ہو جائز ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

---

(۱) البخاری، الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاھور، دار نشر للکتب الاسلامیۃ (۳۸۶/۵، ۳۹۸ رقم الحدیث: ۲۷۵۷، ۲۷۷۱)

(۲) عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی. امداد الاحکام، مکتبہ دارالعلوم کراچی (۱۰۷/۳)

پانچویں شرط: انتفاع مع بقاء العین:

پانچویں شرط موقوفہ چیز کے لئے یہ ہے کہ اس کی ذات کو باقی رکھتے ہوئے اس کے منافع سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو جیسے گھر وقف کیا جائے کہ اس میں موقوف علیہم رہائش رکھیں یا اسے کرایہ پر دے کر موقوف علیہم کو اس کا کرایہ دیا جائے تو یہاں پر گھر باقی رہے گا اور اس کے منافع سے مستحقین فائدہ اٹھاتے رہیں گے، اسی طرح گاڑی وقف کی کہ اسے کرایہ پر دے کر مستحقین کو اس کا کرایہ دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے اور وقف درست ہو جائے گا۔ علامہ بہوتیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ویعتبر فی العین الموقوفة ایضاً أن یمکن الانتفاع بها دائما مع بقاء عینها عرفا کاجارة واستغلال ثمره ونحوه لأن الوقف یراد للدوام لیکون صدقة جاریة ولایوجد ذلک فیما لاتبقی عینه. [1]

وقف کردہ چیز میں یہ ضروری ہے کہ اس کے عین کو عرفاً باقی رکھتے ہوئے اس کے عین سے ہمیشہ فائدہ اٹھانا ممکن ہو جیسے اجارہ پر دے کر یا دیگر ذرائع آمدنی اختیار کر کے، کیونکہ وقف کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہے تاکہ صدقہ جاریہ رہے اور یہ بات ان چیزوں میں متحقق نہیں ہو سکتی، جن کی ذات باقی نہ رہتی ہو۔

علامہ نے اس شرط کی وجہ بھی بتادی کہ وقف صدقہ جاریہ کی ایک صورت ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ موقوفہ چیز ہمیشہ باقی رہے اور مستحقین اس کے منافع سے فائدہ اٹھاتے رہیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اس چیز کو باقی رکھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے، اگر کوئی چیز ایسی ہے جسے ختم کئے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تو اس کا وقف جائز نہیں ہوگا کیونکہ اسے وقف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، واقف مستحقین کو اس سے مستفید کرنا چاہتا ہے تو وہ بطور صدقہ بھی کر سکتا ہے وقف کی کیا ضرورت۔ اس شرط پر درج ذیل مسائل وقف متفرع ہوں گے:

(الف) غذائی اجناس کا غذا کے لئے وقف:

کھانے پینے کی اشیاء اگر وقف کی جائیں کہ یہ فقراء میں تقسیم کر دی جائیں تو یہ وقف درست نہیں

---

(۱) البهوتی، منصور بن یونس بن ادریس البهوتی ۱۰۵۱ھ. کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۴ھ (۲۶۹/۴)

ہوگا کیونکہ یہ اشیاء استعمال سے ختم ہو جائیں گی۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

لا يصح وقف مالا يدوم الانتفاع به كالمطعوم والرياحين المشمومة لسرعة فسادها. [1]

جن چیزوں سے ہمیشہ انتفاع ممکن نہیں ان کا وقف درست نہیں جیسے کھانے کی چیزیں، خوشبودار پھول وغیرہ۔

ہندیہ میں ہے:

وأما وقف مالا ينتفع به الا بالاتلاف كالذهب والفضة والماكول والمشروب فغير جائز في قول عامة الفقهاء. [2]

جن چیزوں کو تلف کئے بغیر ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں جیسے سونا، چاندی اور کھانے پینے کی چیزیں ان کا وقف عام فقہاء کے قول کے مطابق جائز نہیں۔

(ب) حقوق ومنافع کا وقف:

اس شرط کا تقاضہ یہ ہے کہ حقوق مجردہ اور کسی چیز کی محض منفعت کا وقف بھی جائز نہ ہو، مثلاً ایک شخص یہ کہے کہ مجھے اس راستہ سے گذرنے کا حق ہے یا مجھے حق شرب حاصل ہے، میں یہ حق فلاں مدرسہ کے لئے وقف کرتا ہوں یا اگر کسی نے گھر کرایہ پر لیا ہے تو وہ اس کی منفعت کا مالک بن چکا ہے اب وہ یہ منفعت وقف کرنا چاہتا ہے تو وقف کی یہ صورتیں درست نہیں ہوں گی کیونکہ حقوق ومنافع تو اعیان کی قبیل سے ہی نہیں ہیں اور بعض فقہاء کرام کے یہاں تو ان کا شمار اموال میں بھی نہیں ہے، اس لئے ان کا وقف معتبر نہیں ہوگا۔ علامہ شربینیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وشرط الموقوف مع كونه عينا معينة مملوكة ملكا يقبل النقل ويجعل منها فائدة أو منفعة يستأجر لها ...... فخرج بالعين المنفعة. [3]

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دار الفکر (۳۱۵/۵) نیز دیکھئے: المغنی لابن قدامه (۲۲۹/۸)

(۲) نظام، الشیخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاوی الهندیه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۳۶۲/۲)

(۳) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۷۷/۲) مزید دیکھئے: المناوی، عبد الرؤف بن تاج العارفین المناوی الشافعی. تیسیر الوقوف، مکه مکرمه، مکتبه نزار المصطفی الباز الطبعة الاولیٰ، ۱۹۹۸م (۳۸/۱)

موقوفہ چیز کے لئے متعین اور مملوک ہونے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے منتقل کیا جاسکتا ہو اور اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو اس کی منفعت کرایہ پر دے کر حاصل کی جاسکتی ہو، عین کی قید سے منفعت نکل گئی ہے کہ اس کا وقف جائز نہیں۔

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے:

فقال الحنفية يشترط فى الموقوف أربعة شروط هى مايأتى: الف: أن يكون الموقوف مالامتقوما عقاراً فلا يصح وقف ماليس بمالكالمنافع وحدها دون الأعيان وكالحقوق المالية مثل حقوق الارتفاق لأن الحق ليس بمال عندهم ...... واشتراط الشافعية والحنابلة أن يكون الموقوف عينا معينة ...... فلايصح وقف المنفعة وحدها دون الرقبة كمنفعة العين المستأجرة أو المنفعة الموصى له بها. [1]

حنفیہ کے نزدیک موقوفہ چیز میں چار شرائط پائی جانی چاہئیں، ایک یہ کہ موقوفہ چیز مال متقوم زمین ہو، جو چیز مال کی قبیل سے نہیں ہیں ان کا وقف جائز نہیں جیسے عین کے بغیر تنہا منافع وقف کرنا اور اسی طرح حقوق مالیہ وقف کرنا یہ جائز نہیں ہوگا، شوافع وحنابلہ کے نزدیک بھی عین متعین ہونا شرط ہے لہٰذا ان کے نزدیک بھی ذات کے بغیر صرف منفعت کا وقف درست نہیں ہوگا جیسے کوئی کرایہ کے گھر کی منفعت وقف کردے یا جس منفعت کی وصیت اس کے لئے کسی نے کی ہے وہ وقف کردے۔

(ج) سونے، چاندی کا وقف تقسیم کے لئے:

اسی طرح اگر کسی نے سونا، چاندی وقف کیا کہ اسے فقراء میں تقسیم کردیا جائے تو یہ وقف بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں بھی موقوفہ چیز کا عین اور اس کی ذات باقی نہیں رہ رہی۔ المغنی میں ہے:

وما لاينتفع به الا بالاتلاف مثل الذهب والورق والماكول والمشروب فوقفه غير جائز. [2]

---

(۱) الزحیلی، الدکتور وھبۃ الزحیلی. الفقہ الاسلامی وادلتہ، بیروت، دار الفکر، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۸۴م (۱۸۷.۸۴/۸)

(۲) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۴۱ھ۔ ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۲۲۹/۸)

جن چیزوں سے تلف کئے بغیر فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا ان کا وقف جائز نہیں جیسے سونا، چاندی، کھانے پینے کی چیزیں۔

البتہ اگر سونا چاندی کا زیور اس مقصد کے لئے وقف کیا جارہا ہے کہ خواتین ضرورت کے موقعہ پر اسے پہنیں اور پھر متولی کو واپس کردیں، جب کسی اور کو ضرورت پیش آئے تو وہ استعمال کرلے، اس وقف کی اجازت ہوگی کیونکہ اب سونے چاندی کے عین کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے، علامہ ابن قدامہؒ نے خلّال کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیس ہزار درہم میں زیورات خریدے تھے اور انہیں آل خطاب کی عورتوں کے لئے وقف کردیا تھا۔[1] یہ واضح دلیل ہے اس وقف کے جواز پر۔

چھٹی شرط: موقوفہ چیز غیر منقول ہو یا اس کے وقف کا عرف ہو:

چھٹی شرط جو کہ درحقیقت پانچویں شرط ہی کا نتیجہ ہے یہ ہے کہ موقوفہ چیز غیر منقول ہو، یعنی زمین، گھر، دوکان وغیرہ ہو جو کہ ہمیشہ باقی رہ سکے اور اس سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے، عام حالات میں غیر منقول کا وقف جائز نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

ويجوز وقف العقار لأن جماعة من الصحابة رضوان الله عليهم اجمعين وقفوه ولايجوز وقف ماينقل ويحول، قال رضى الله عنه وهذا على الارسال قول أبى حنيفة.[2]

زمین کا وقف جائز ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت نے اسے وقف کیا ہے اور منقولہ چیزوں کا وقف درست نہیں، یہ علی الاطلاق امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

وہ صورتیں جن میں منقول اشیاء کا وقف درست ہے:

صاحب ہدایہ کی عبارت سے جیسا کہ واضح ہے کہ عام حالات میں منقول اشیاء کے وقف کی

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۲۹/۸)

(۲) المرغينانى، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۹/۵)

اجازت نہیں کیونکہ ان سے وقف کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، البتہ کچھ مخصوص صورتوں میں فقہاءِ حنفیہ نے منقول اشیاء کے وقف کی اجازت دی ہے۔

۱۔ منقول غیر منقول کے تابع ہو:

پہلی صورت یہ ہے کہ اصالۃً تو زمین وغیرہ وقف کی جارہی ہے لیکن وہ زمین کچھ غیر منقول اشیاء پر بھی مشتمل ہے تو زمین کے وقف کرنے سے وہ غیر منقول اشیاء بھی خود بخود وقف ہو جائیں گی جیسے زمین پر عمارت بنی ہوئی ہے وہ عمارت خود بخود وقف ہو جائے گی اسی طرح گھر وقف کیا اور اس میں درخت لگے ہوئے ہیں تو وہ بھی وقف سمجھے جائیں گے۔ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ویدخل البناء فی وقف الأرض تبعا فیکون وقفا معها وفی دخول الشجر فی وقف الأرض روایتان ذکرهما فی الخلاصة وفی فتاوی قاضیخان تدخل الاشجار والبناء فی وقف الأرض کما تدخل فی البیع ویدخل الشرب والطریق استحسانا لأن الأرض لاتوقف الا للاستغلال وذلک لایمکن الابالماء والطریق فیدخلان کما فی الاجارة.(۱)

زمین کے وقف میں عمارت بھی تبعاً داخل ہو جائے گی وہ بھی اس کے ساتھ وقف ہوگی، البتہ زمین کے وقف میں درخت کے داخل ہونے میں دو روایتیں ہیں جنہیں خلاصہ میں ذکر کیا ہے، فتاویٰ قاضیخان میں ہے کہ زمین کے وقف میں عمارت اور درخت بھی داخل ہوں گے جیسے بیع میں داخل ہوتے ہیں اسی طرح حق شرب اور راستہ بھی استحساناً داخل ہوں گے کیونکہ زمین اس لئے وقف کی جاتی ہے کہ اس سے انتفاع حاصل کیا جائے اور یہ پانی اور راستہ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے یہ وقف میں شامل ہوں گے جیسے کہ اجارہ میں شامل ہوتے ہیں۔

کبھی غیر منقول اشیاء زمین کے اس طرح تابع تو نہیں ہوتیں کہ زمین کے وقف کرنے سے وہ بھی خود بخود وقف ہو جائیں لیکن وہ زمین کی متعلقات میں سے ہوتی ہیں، وقف کرتے وقت اگر واقف ان کے

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۲۹/۵)

وقف کی بھی صراحت کردے تو زمین کے تابع کر کے ان کا وقف بھی صحیح سمجھا جاتا ہے مثلاً زرعی زمین وقف کی اور یہ صراحت کر دی کہ اس زمین میں کاشتکاری کے جو اوزار یا جانور وغیرہ ہیں وہ بھی وقف ہیں تو زمین کے ساتھ ان کا وقف بھی درست سمجھا جائے گا۔

الاسعاف میں ہے:

ومنها لو وقف دارا بجميع مافيها وفيها حمامات يطرن أو بيتاً وفيه كورات عسل يدخل الحمام والنحل تبعا للدار والعسل كما لووقف ضيعه وذكر مافيها من العبيد والدواليب والالات الحراثة فانها تصير وقفا تبعاً لها وان لم يجز اصالة كالماء والهواء والأطراف فى بيع الأراضى. (۱)

اگر گھر تمام اسباب و سامان سمیت وقف کیا اور اس میں کچھ کبوتریں ہیں یا اس میں شہد کا چھتہ ہے تو کبوتر، شہد کی مکھی اور شہد بھی وقف میں داخل ہوں گے، جیسے کسی نے زمین وقف کی اور اس کے ساتھ زمین پر کام کرنے والے غلام، زرعی آلات وغیرہ کا بھی ذکر کیا تو یہ بھی زمین کے تابع ہو کر وقف ہو جائیں گے ورنہ اصالتہً ان کا وقف جائز نہیں ہے جیسے پانی، ہوا اور اطراف وغیرہ کی بیع کا حکم ہے زمین کی بیع کرتے وقت۔

۲۔ منقول ایسی چیز ہو جس کے وقف کے بارے میں نص آئی ہو:

منقولی اشیاء کے وقف کے صحیح ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ ان کے اصالتہً وقف کے بارے میں نص آئی ہو تو ان اشیاء کا وقف جائز ہوگا، مثلاً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بخاری شریف میں آیا ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قد احتبس أدراعه واعتده فى سبيل الله. (۲)

خالد نے تو اپنی زرہیں راہ خدا میں وقف کی ہوئی ہیں۔

---

(۱) الطرابلسى، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ه، (۲۰)

(۲) البخارى، الامام ابوعبد الله محمد بن اسماعيل البخارى. صحيح البخارى مع فتح البارى، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (كتاب الزكاة باب: ۳۳ باب العرض فى الزكاة)

علامہ ابن الہمامؒ نے طبرانی کے حوالہ سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی یہ وصیت ذکر کی ہے:

اذا أنامت فانظر و اسلاحی و فرسی فاجعلوه عدة فی سبیل الله. (۱)

جب میری وفات ہو جائے تو میرے اسلحہ اور گھوڑے کا خیال رکھنا اسے اللہ کے راستہ میں جہاد کی تیاری کے لئے خاص کر دینا۔

جن اشیاء کا ان روایات میں ذکر ہے ان کا وقف محض اس وجہ سے جائز ہوگا کہ ان کا ذکر نص میں آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ صاحبِ ہدایہ نے اسے استحسان قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

وقال محمد یجوز حبس الکراع و السلاح ومعناه وقفه فی سبیل الله وابویوسف معه فیه علی ماقالوا وهو استحسان و القیاس أن لایجوز لما بیناه من قبل وجه الاستحسان الأثار المشهورة فیه. (۲)

امام محمدؒ نے فرمایا کہ گھوڑے اور ہتھیار وغیرہ کا وقف جہاد کے لئے جائز ہے امام ابو یوسف بھی ان کے ساتھ ہیں یہی استحسان ہے قیاس تو یہ ہے کہ یہ وقف جائز نہ ہو، استحسان کی وجہ آثارِ مشہورہ ہیں۔

۳۔ ایسی منقولی اشیاء جن کے وقف کا عرف ہو:

منقولی اشیاء کے وقف کی تیسری صورت یہ ہے کہ ان کے وقف کا عرف ہو کہ اس جگہ اور اس زمانہ میں لوگ ان منقولی اشیاء کا وقف کرتے ہوں تو عرف کی وجہ سے یہ وقف درست ہو جائے گا، مثلاً قرآن کریم کا وقف، کتب دینیہ کا وقف، جنازہ کی چارپائی کا وقف وغیرہ، احناف میں سے یہ امام محمدؒ کا قول ہے جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر منقولی اشیاء پہلی دو صورتوں کی قبیل سے نہیں ہیں تو محض عرف کی وجہ سے ان کے وقف کی اجازت نہیں ہوگی۔ علامہ مرغینانیؒ دونوں اماموں کا موقف یوں بیان کرتے ہیں:

وعن محمد انه یجوز وقف مافیه تعامل من المنقولات کالفأس والمرو والقدوم والمنشار والجنازة و ثیابها والقدور والمرجل

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۰/۵)

(۲) المرغینانی، برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۰/۵)

والمصحف وعند أبی یوسف لایجوز لأن القیاس انما یترک بالنص والنص ورد فی الکراع والسلاح فیقتصر علیه و محمد یقول القیاس قد یترک بالتعامل کما فی الاستصناع وقد وجد التعامل فی هذه الأشیاء.[1]

امام محمدؒ سے مروی ہے کہ جن منقولی چیزوں کے وقف کا عرف ہوا نہیں وقف کرنا جائز ہے جیسے کلہاڑی، بیلچہ، درانتی، جنازہ کی چارپائی، اس کا کپڑا، دیگچیاں اور مصحف وغیرہ، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان کا وقف جائز نہیں کیونکہ قیاس کو تو ہم نے نص کی وجہ سے چھوڑا تھا، نص گھوڑے اور ہتھیار میں تو ہے ان میں نہیں لہٰذا اس اجازت کو مورد نص پر ہی منحصر رکھا جائے گا، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قیاس کو تعامل کی وجہ سے بھی ترک کردیا جاتا ہے جیسے استصناع میں تعامل کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا ہے ان اشیاء کے وقف کا تعامل ہے۔

علامہ حصکفیؒ نے صراحت کی ہے کہ اس مسئلہ میں فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے۔[2] لہٰذا مفتیٰ بہ قول کے مطابق جب منقولی اشیاء کے وقف کے جواز کا مدار عرف پر ہے تو اس میں ہر زمانہ اور جگہ کے عرف کا الگ اعتبار ہوگا، جہاں جس منقول چیز کے وقف کا عرف ہو وہاں اس کے وقف کی اجازت ہوگی دوسری جگہ اگر اس کا عرف نہ ہو تو اس جگہ اس منقولی چیز کے وقف کی اجازت نہیں ہوگی، مثال کے طور پر امام محمدؒ نے کلہاڑی، تیشہ اور درانتی وغیرہ کے وقف کی اجازت دی لیکن ہمارے یہاں اس کے وقف کا عرف نہیں تو ہمارے ہاں اس کے وقف کی اجازت نہیں ہوگی۔

مصحف کے وقف کا عرف ان کے یہاں بھی تھا ہمارے یہاں بھی ہے اس لئے آج کل بھی مصحف کے وقف کی اجازت ہوگی۔

ہسپتال میں استعمال ہونے والی منقولہ اشیاء جیسے اسٹریچر، ایمبولینس، چارپائی، مختلف مشینیں ان کے وقف کا عرف ان کے زمانہ میں نہیں تھا لیکن آج کل اس کا عرف ہے اس لئے آج اگر کوئی انہیں وقف کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

---

(۱) المرغینانی، برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۱/۵)

(۲) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۵/۴)

آج کل لوگ مسجد میں مریض نمازیوں کے لئے کرسیاں یا وھیل چیئر وقف کر دیتے ہیں اس کا بھی اب عرف ہو گیا اس لئے یہ بھی جائز ہوگا۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وظاهر مامر في مسألة البقرة اعتبار العرف الحادث فلايلزم كونه من عهد الصحابة ...... وعلى هذا فالظاهر اعتبار العرف في الموضع أوزمان الذي اشتهر فيه دون غيره فوقف الدراهم متعارف في بلاد الروم دون بلادنا ووقف الفأس والقدوم كان متعارفا في زمن المتقدمين ولم نسمع به في زماننا فالظاهر انه لايصح الآن ولئن وُجدنادراً لايعتبر.[1]

بقرہ کے مسئلہ میں جو تفصیل آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید عرف کا اعتبار ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس چیز کے وقف کا عرف صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے ہو، لہٰذا جس زمانہ اور جگہ میں ہوں اسی کا عرف معتبر ہوگا، کہیں اور کا عرف معتبر نہیں ہوگا، دراہم کا وقف بلاد روم میں رائج ہے، ہمارے یہاں اس کا عرف نہیں ہے، اسی طرح کلہاڑ کا وقف متقدمین کے یہاں رائج ہوگا ہمارے یہاں رائج نہیں اور ہم نے اپنے زمانہ میں اس کے بارے میں سنا بھی نہیں اس لئے ظاہر یہی ہے کہ آج ان اشیاء کا وقف جائز نہیں ہونا چاہئے، اور اگر کہیں یہ نادر طور پر کبھی ہو بھی رہا ہو تو اس کا اعتبار نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک جو منقولہ اشیاء غیر منقول کے تابع کر کے وقف جائیں یا ان کے وقف کے بارے میں کوئی نص آئی ہو یا ان کے وقف کا عرف ہو تو ان صورتوں میں انہیں وقف کرنا جائز ہے ورنہ نہیں۔

منقولہ اشیاء کے وقف کے بارے میں دیگر ائمہ کا وقف:

حنابلہ اور شوافع کے یہاں منقول اور غیر منقول کی کوئی تفریق نہیں ان کے نزدیک اصول یہ ہے کہ

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۴/۴)

موقوفہ چیز ایسی ہونی چاہئے جسے باقی رکھتے ہوئے اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہو خواہ وہ منقول ہو یا غیر منقول، چنانچہ حیوان، درخت، استعمال کے لئے زیورات وغیرہ کا وقف ان کے نزدیک درست ہے لیکن غذائی اجناس کا وقف کھانے کے لئے ان کے نزدیک جائز نہیں ہے کیونکہ انہیں باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ المنہاج میں ہے:

الموقوف دوام الانتفاع به لامطعوم و ريحان و يصح وقف عقار ومنقول.[1]

موقوفہ چیز ایسی ہونی چاہئے جس سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا جا سکے لہٰذا کھانے کی چیزوں اور پھول کا وقف جائز نہیں، زمین اور دیگر منقولی اشیاء کا وقف جائز ہے۔

علامہ شربینیؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

قوله "وقف منقول" كعبد و ثوب لقوله عليه السلام أما خالد فانكم تظلمون خالد فانه احتبس ادراعه وأعبده ...... واتفقت الأمة فى الاعصار على وقف الحصر والقناديل والزلالى فى المساجد من غير نكير.[2]

منقول سے مراد جیسے غلام، کپڑے وغیرہ کا وقف، یہ جائز ہے حضور کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ تم خالد پر ظلم کر رہے ہو، اس نے تو اپنی زرہیں اور غلام جہاد کے لئے وقف کر رکھے ہیں، اس زمانہ میں مساجد کے لئے چٹائیاں، قندیلیں وغیرہ وقف کرنے کا دستور چلا آ رہا ہے امت اس پر متفق ہے کسی نے اس پر نکیر نہیں کی۔

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ تحریر کرتے ہیں:

وجملة ذلك أن الذى يجوز وقفه ماجاز بيعه وجاز الانتفاع به مع بقاء عينه وكان اصلا يبقى بقاءً متصلا كالعقار والحيوانات والسلاح والاثاث واشباه ذلك...... وهذا قول الشافعى.[3]

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. المنهاج مع شرحه مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۷۷/۲)

(۲) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۷۷/۲)

(۳) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ ـ ۶۲۰ھ. المغنی، لریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۱/۸)

کن چیزوں کا وقف جائز ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جس کی بیع جائز ہے اور جس کی ذات کو باقی رکھتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے اور وہ چیز ایسی ہو جو باقی رہ سکتی ہو تو ان تمام چیزوں کا وقف جائز ہے جیسے زمین، حیوانات، اسلحہ اور گھریلو سامان وغیرہ، یہ امام شافعیؒ کا قول بھی ہے۔

مالکیہ کے نزدیک بھی فی الجملہ منقول اشیاء کے وقف کی اجازت ہے۔[1]

قرآن کریم اور دیگر کتب وقف کرنے کا حکم:

قرآن کریم اور کتبِ وقف کرنے پر تمام ائمہ متفق ہیں احناف کے نزدیک تو اس وجہ سے جائز ہے کہ اس کا عرف ہے، علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

وجوز الفقيه ابو الليث وقف الكتب و عليه الفتوىٰ كذا في النهاية ولم يجوزه محمد بن سلمة وهو ضعيف وفي الخلاصة اذا وقف مصحفا على أهل مسجد لقراء ة القرآن ان كانوا يحصون جاز، وان وقف على المسجد جاز.[2]

فقیہ ابو اللیث نے کتابوں کے وقف کو جائز قرار دیا ہے اسی پر فتویٰ ہے، محمد بن سلمہ اسے جائز قرار نہیں دیتے تھے لیکن ان کا قول ضعیف ہے، خلاصہ میں ہے کہ اگر کسی مسجد والوں پر قرآن وقف کیا تو اگر وہ قابلِ شمار ہیں تو یہ جائز ہے اور اگر مسجد پر وقف کیا تو بھی جائز ہے۔

اور بقیہ ائمہ کے نزدیک اس وجہ سے ان کا وقف جائز ہوگا کہ ان کے عین کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔

نقود (کرنسی) کا وقف:

نقود خواہ دراہم یا دنانیز کی شکل میں ہوں یا آج کل رائج کرنسیوں کی شکل میں ان کا وقف تقریباً تمام فقہاء کرام کے نزدیک فی الجملہ جائز ہے۔

---

(۱) الدسوقي، شمس الدين محمد عرفه الدسوقي. حاشية الدسوقي على الشرح الكبير، بيروت، دار الفكر (۴/۷۷)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۰۲)

احناف کے نزدیک غیر منقول چیزوں کے علاوہ دیگر اشیاء کے وقف کا مدار عرف پر ہے کہ اگر ان کے وقف کا عرف ہو تو ان کے وقف کی اجازت ہوگی ورنہ نہیں، چنانچہ بہت سے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے اپنے یہاں کے عرف کی وجہ سے نقود کے وقف کے جائز ہونے کی صراحت کی ہے۔ تاتارخانیہ میں ہے:

وفي وقف الأنصاري وكان من اصحاب زفر: قال: قالت: اذا وقف الرجل الدراهم والطعام أو مايكال أو مايوزن أتراه جائز قال: نعم.[1]

انصاری جو امام زفر کے اصحاب میں سے ہیں ان سے دریافت کیا کہ اگر کوئی دراہم، طعام اور مکیلی وموزونی چیزیں وقف کرے تو کیا آپ اسے جائز سمجھتے ہیں فرمایا، ہاں۔

علامہ شامیؒ منح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ولماجرى التعامل في زماننا في البلاد الرومية وغيرها في وقف الدراهم الدنانير دخل تحت قول محمد المفتى به في وقف كل منقول فيه تعامل كما لايخفى.[2]

ہمارے زمانہ میں جب بلادِ روم میں دراہم ودنانیر کے وقف کا تعامل جاری ہے تو یہ بھی امام محمد کے اس قول میں داخل ہوگا کہ منقول اشیاء کے وقف کا اگر تعامل ہو تو یہ جائز ہے۔

حنفی فقیہ علامہ ابوسعود شارح الاشباہ والنظائر نے نقود کے وقف کے جواز پر مستقل ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو چند سال قبل "رسالة في جواز وقف النقود" کے نام سے دار ابن حزم، بیروت سے شائع ہوا ہے۔

ائمہ ثلاثہ میں سے حضرات مالکیہ تو منقول اشیاء کے وقف کے جواز میں سب سے زیادہ وسعت رکھتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک بھی اس کی اجازت ہونی چاہئے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں مالکیہ کی طرف وقفِ نقود کی اجازت کی نسبت کی ہے وہ فرماتے ہیں:

ومذهب مالك صحة وقف الأثمان للقرض ذكره صاحب التهذيب وغيره في الزكاة وأوجبوا فيها الزكاة.[3]

---

(۱) الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوى التتارخانيه، كراچي، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ١٤١١ھ (١٢/٥)

(٢) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (٣٦٣/٤)

(٣) ابن تيميه، شيخ الاسلام احمد بن عبد الحليم المعروف بابن تيميه. مجموع فتاوىٰ ابن تيميه، رياض، مطابع الرياض ١٣٨٣ھ (٢٣٤/٣١)

امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ نقود کا وقف قرض دینے کے لئے جائز ہے اسے صاحب تہذیب وغیرہ نے زکاۃ میں ذکر کیا ہے اوران نقود پر زکاۃ بھی واجب کی ہے۔

حضرات شوافع وحضرات حنابلہ کے یہاں جواز وعدم جواز دونوں طرح کی روایتیں ہیں علامہ نوویؒ شرح المہذب میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد اختلف أصحابنا فی الدراهم والدنانیر فمن قال بجواز أن تکون لها ثمرة دائمة کالاجارة اجاز وقفها ومن قال بعدم جواز الاجارة قال بعدم جواز الوقف فیها. (۱)

ہمارے اصحاب کا دراہم ودنانیر کے وقف میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے کیونکہ اس سے مستقل طور پر منافع حاصل ہوسکتے ہیں جیسے انہیں اجارہ پر دینا جائز ہے اور جو لوگ ان کے اجارہ کو جائز قرار نہیں دیتے وہ ان کے وقف کو بھی جائز قرار نہیں دیتے۔

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ومالاینتفع به الا بالاتلاف لایصح فیه ذلک وقیل فی الدراهم والدنانیر یصح وقفها علی قول من أجاز اجارتها. وقیل لایصح لأن تلک المنفعة لیست المقصود الذی خلقت له الأثمان. (۲)

جس چیز کی ذات کو تلف کئے بغیر اس سے انتفاع حاصل نہیں کیا جاسکتا اس کا وقف درست نہیں، دراہم ودنانیر کے وقف میں ایک قول تو یہ ہے کہ یہ جائز ہے جیسے انہیں اجارہ پر دینا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ جائز نہیں کیونکہ یہ ان کی منفعتِ مقصودہ نہیں ہے جن کے لئے یہ بنائے گئے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے نقود کے وقف کے جواز کو حنابلہ کا راجح مسلک قرار دیا ہے۔ (۳)

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دارالفکر (۳۲۵/۱۵)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ـ ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۲۹/۸)

(۳) دیکھئے: ابن تیمیه، شیخ الاسلام احمد بن عبد الحلیم المعروف بابن تیمیه. مجموع فتاویٰ ابن تیمیه، ریاض، مطابع الریاض ۱۳۸۳ھ (۲۳۵/۳۱)

امام بخاری نے امام زہریؒ کا اثر نقل کیا ہے جو نقود کے وقف کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔[1]

نقود کے وقف پر ایک اعتراض:

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا ہے کہ نقود یعنی کرنسی کا وقف جمہور فقہاء کرام کے نزدیک فی الجملہ جائز ہے اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ہم نے پانچویں شرط موقوفہ چیز کے لئے یہ لگائی تھی کہ موقوفہ چیز ایسی ہونی چاہئے جسے باقی رکھتے ہوئے اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکے، اگر نقود وقف کئے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ انہیں بعینہٖ باقی رکھتے ہوئے تو ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکے گا، انہیں خرچ کرنا ہوگا یا تجارت میں لگانا ہوگا تو یہاں پانچویں شرط پر عمل نہیں ہوسکے گا۔

نقود اگر وقف کئے جائیں تو انہیں کیسے استعمال کیا جائے گا؟

پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ فقہاء کرام نے جہاں نقود کے وقف کی اجازت دی ہے وہاں یہ بھی صراحت کی ہے کہ ان نقود کو خرچ کرکے ختم نہیں کیا جائے گا اور نہ بعینہٖ یہ نقود مستحقین کو دیئے جائیں گے بلکہ انہیں تجارت میں لگایا جائے گا کسی کو بطور مضاربت دیدیا جائے گا تاکہ وہ ان سے تجارت کرکے نفع حاصل کرے، حاصل شدہ نفع مستحقین پر خرچ کیا جائے گا، اسی طرح اگر کسی نے نقود وقف کئے کہ اس سے ضرورت مندوں کو قرض دیا جائے گا تو اس صورت میں بھی یہ نقود بطور قرض ہی دیئے جائیں گے اور پھر واپس لے لئے جائیں گے۔ الاسعاف میں ہے:

> وفی فتاویٰ الناطفی عن محمد بن عبد الله الانصاری من اصحاب زفرؒ انه یجوز وقف الدراهم والطعام والمکیل والموزون فقیل له وکیف یصنع بالدراهم قال یدفعها مضاربة ویتصدق بالفضل.[2]

---

(۱) البخاری، الامام ابوعبد الله محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب الاسلامیة (۵/۴۰۵ کتاب الوصایا باب: ۳۱)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۲۲) وراجع ایضاً: ابن تیمیه، شیخ الاسلام احمد بن عبد الحلیم المعروف بابن تیمیه. مجموع فتاویٰ بن تیمیه، ریاض، مطابع الریاض ۱۳۸۳ھ (۳۱/۲۳۴)

فتاویٰ ناطفی میں محمد بن عبد اللہ انصاری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ دراہم، طعام اور مکیلی موزونی چیزوں کا وقف درست ہے، دریافت کیا گیا کہ دراہم کا کیا جائے گا؟ فرمایا اسے بطورِ مضاربت دیدیا جائے گا اور جو نفع حاصل ہوگا وہ صدقہ کر دیا جائے گا۔

جواب:

اس وضاحت کے بعد ہم اصل سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں، پانچویں شرط میں جو کہا گیا ہے کہ عین کو باقی رکھتے ہوئے اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکے یہ شرط نقود کے وقف میں بھی پائی جارہی ہے کیونکہ موقوفہ نقود اگر مستحقین کو بطور قرض دیئے جارہے ہیں تو وہ مقروض کے ذمہ باقی ہیں لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرض دینے کی وجہ سے ان کا عین معدوم ہوگیا۔ ان کا عین باقی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے وہ متولی وقف کے پاس تھے اور اب مقروض کے پاس ہیں اور اگر یہ موقوفہ نقود تجارت میں لگائے گئے ہیں اور کسی کو بطورِ مضاربت دیئے گئے ہیں تو جب تک مضارب نے انہیں خرچ نہیں کیا اس وقت تک تو بعینہٖ یہ باقی ہیں اور اگر انہیں خرچ کر کے ان سے کوئی سامانِ تجارت خرید لیا گیا تو اب یہ سامان تجارت کی شکل میں موجود ہیں ان سے انتفاع کی صورت غذائی اجناس سے انتفاع کی کیفیت سے مختلف ہے، غذائی اجناس اگر کھانے کے لئے وقف کی جائیں تو ان کا وقف درست نہیں ہوتا کیونکہ کھانے کے بعد ان کا عین اپنی اصلی شکل یا کسی اور شکل میں باقی نہیں رہتا جبکہ یہ نقود اپنی اصلی شکل میں یا کسی اور عین کی شکل میں باقی رہتے ہیں، ان سے حاصل ہونے والا نفع مستحقین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اس جواب کی طرف علامہ ابو سعود حنفی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ میں اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

> نزل بقاء أمثالها منزلة بقاء أعيانها وبذلك تم صدق التعريف و ترتب الاحكام عليها واليه أشار بقوله: الدراهم تقرض للفقراء أو تدفع مضاربة و يتصدق بالربح والحنطة تقرض للفقراء ثم تؤخذ منهم فقد جعل بقاء مافي ذمة المستقرض أو يد المضارب بمنزلة بقاء العين فكانه يشير بصورة الاقراض الى انتفاع الفقير بعين الوقف وبصورة المضاربة الى انتفاع بغلته. (۱)

---

(۱) ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفى الآفندي ۹۸۲ھ. رسالة في جواز وقف النقود، بيروت، دار ابن حزم ۱۹۹۷م (۳۰)

ان دراہم وغیرہ کے امثال کے بقاء کو بعینہٖ ان کا بقاء سمجھا جائے گا، اس تصور سے ان پر وقف کی تعریف اور احکام کا ترتب درست ہو جائے گا، اس کی طرف اس بات سے اشارہ ہے کہ دراہم فقراء کو قرض کے طور پر دیئے جائیں گے یا مضاربت پر دے کر نفع صدقہ کیا جائے گا، اور گندم فقراء کو قرض دے جائے گی پھر ان سے لے لی جائے گی تو گویا مستقرض کے ذمہ میں جو باقی ہے یا مضارب کے پاس جو موجود ہے اسے یہ سمجھا جائے گا کہ بعینہٖ اصل موقوفہ چیز باقی ہے اور اقراض سے اشارہ اس طرف ہے کہ فقیر ان دراہم وغیرہ کے عین سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور مضاربت سے اشارہ اس طرف ہے کہ وہ ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص گندم وقف کرے اس مقصد کیلئے کہ یہ گندم غریب کاشتکاروں کو بطورِ قرض دے دی جائے اور وہ اسے بیج کے طور پر استعمال کر سکیں، جب ان کی فصل تیار ہو جائے تو وہ یہ گندم جو بطور قرض دی گئی تھی واپس کر دیں۔ اس صورت کو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے جائز قرار دیا ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

قال فعلى هذا القياس اذا وقف هذا الكرمن الحنطة على شرط ان يقرض للفقراء الذين لابذرلهم ليذرعوه لأنفسهم ثم يؤخذ منهم بعد الادراك قدر القرض ثم يقرض لغيرهم من الفقراء ابداً على هذا السبيل يجب أن يكون جائزا قال و مثل هذا كثير في الري. (۱)

اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کسی نے گندم وقف کی اس شرط پر کہ اسے ان فقراء کو بطور قرض دیا جائے جن کے پاس بیج نہ ہوتا کہ وہ اپنے لئے کھیتی باڑی کر سکیں، غلہ تیار ہونے کے بعد ان سے یہ گندم واپس لے لی جائے پھر کسی اور کو بطور قرض دیدی جائے یہی کام ہمیشہ کیا جائے تو یہ صورت جائز ہونی چاہئے، اس طرح کے وقف کا رواج رَےّ میں بہت زیادہ ہے۔

کیونکہ موقوفہ گندم اگر بطور قرض دی جائے گی تو بیشک اس کا عین ظاہری طور پر باقی نہیں رہے گا،

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۰۳)

لیکن وہ کاشتکار کے ذمہ قرض رہے گی، کاشتکار کے ذمہ قرض رہنے کی وجہ سے اسے بالکل معدوم نہیں سمجھا جائے گا۔

اور نقود کے وقف میں یہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ نقود (کرنسی) متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے وہ مافی الذمہ ہی ہوتے ہیں، وقف کرنے کے بعد جب انہیں متولی کے حوالہ کیا جائے گا تو اس کے ذمہ میں واجب رہیں گے اور جب متولی انہیں بطور قرض یا بطور مضاربت کسی اور کو دیدے گا تو اس کے ذمہ رہیں گے اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ان کے عین کے باقی رہنے کی جو صورت ہے وہ وقف کرتے وقت اور مستحقین کو دینے کے بعد یکساں ہی ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مستحقین کو دینے کے بعد ان کا عین باقی نہیں رہے گا، ہر چیز کے عین باقی رہنے کی صورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔

خلاصہ یہ ہے کہ نقود کا وقف فی الجملہ جمہور فقہاء کرام کے نزدیک جائز ہے اور موقوفہ نقود کو فقراء میں تقسیم نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں اس طرح استعمال کیا جائے گا کہ ان کی اصل مقدار ہمیشہ باقی رہے اور ان کے عین سے بطور قرض یا ان سے حاصل ہونے والے نفع سے فقراء اور واقف کے متعین کردہ مصارف فائدہ اٹھاتے رہیں۔

کرائے پر دی ہوئی زمین وقف کرنے کا حکم:

یہ چھ شرائط اگر موقوفہ چیز میں پائی جائیں تو اس کا وقف درست ہے یہی وجہ ہے کہ کرایہ پر دی ہوئی زمین اگر مالک زمین وقف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے کیونکہ وہ اس کا مکمل مالک ہے، کرایہ دار کو تو اس سے منفعت حاصل کرنے کا ایک وقت مقررہ تک حق حاصل ہے چنانچہ اجارہ ختم ہونے کے بعد اس کے منافع مستحقین وقف کو ملیں گے۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

> **ثم اعلم انه لايشترط لصحته عدم تعلق حق الغير به فلو وقف مافي اجارة الغير صح ولاتبطل الاجارة فاذا انقضت أو مات احدهما صرفت الى جهات الوقف.** [1]

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۰۳)، نیز دیکھئے: ابن الھمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۴۱۷)

وقف کے صحیح ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس موقوفہ چیز سے کسی کا تعلق متعلق نہ ہو، لہٰذا اگر ایسی زمین وقف کی جو کسی کو اجارہ پر دی ہوئی ہے تو یہ صحیح ہے، اجارہ باطل نہیں ہوگا، جب اجارہ ختم ہو جائے یا موجر ومستأجر میں سے کوئی مرجائے تو اب اس زمین کو جہاتِ وقف پر خرچ کیا جائے گا۔

مرھونہ زمین کا وقف:

اسی طرح اگر کوئی زمین کسی شخص کے پاس بطور رہن رکھوا کر اس سے کسی نے قرض لیا ہے تو یہ مقروض اپنی مملوکہ رہن رکھی ہوئی زمین وقف کر سکتا ہے اور یہ وقف درست ہو جائے گا، البتہ اگر یہ مالدار ہو تو قاضی اسے مجبور کرے گا کہ قرض ادا کرو، قرض ادا کرنے کے بعد یہ زمین دائن سے واپس لے لی جائے گی، اور مصارف وقف میں استعمال کی جائے گی اور اگر واقف تنگدست ہو کہ اس کے پاس قرض ادا کرنے کی اور کوئی صورت نہ ہو تو پھر قاضی یا حاکم اس کے وقف کو باطل قرار دے کر زمین بیچے گا اور اس کے ذمہ واجب الاداء قرض اتارا جائے گا۔ الاسعاف میں ہے:

ولو وقف...... مارهنه بعد تسليمه صح ويجبره القاضى على دفع ماعليه ان كا موسرا وان كان معسرا أبطل الوقف وباعه فيما عليه. [1]

اگر رہن دائن کے حوالہ کرنے کے بعد اس کا مالک اسے وقف کر دے تو یہ صحیح ہے وہ اگر مالدار ہو تو قاضی اسے قرض کی ادائیگی پر مجبور کرے گا اور اگر تنگدست ہو تو وقف کو باطل قرار دیدے گا۔

اور اگر مرھونہ زمین وقف کرنے کے بعد واقف کا انتقال ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ اس نے اتنا مال ترکہ میں چھوڑا ہے کہ جس سے قرض ادا کیا جا سکے؟ اگر چھوڑا ہو تو وقف نافذ ہوگا اور اس کے ترکہ سے قرض ادا کر دیا جائے گا اور اگر قرض کی ادائیگی کے بقدر مال نہ چھوڑا ہو تو حاکم مسلمین یا قاضی اس وقف کو باطل قرار دیدے گا اور اسے بیچ کر اس کا قرض ادا کیا جائے گا، کیونکہ اس مال کے ساتھ دائن کا حق متعلق ہو چکا ہے اسے محروم کر کے وقف کرنا معتبر نہیں ہوگا۔ [2]

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ(۲۱)

(۲) دیکھئے: ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۱۹۰) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۱۷)

بغیر زمین کے صرف عمارت کا وقف:

اگر بغیر زمین کے صرف عمارت وقف کی جائے تو اس میں فقہاء کرام کا کافی اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ اگر کسی جگہ صرف عمارت کے وقف کا عرف ہو تو وہاں صرف عمارت کا وقف صحیح ہے بشرطیکہ اصل زمین واقف کی ذاتی ملکیت یا کسی اور کی ذاتی ملکیت نہ ہو، کیونکہ اگر زمین اس کی ذاتی ملکیت ہو یا کسی اور کی ذاتی ملکیت ہو تو مالکِ زمین کے انتقال کے بعد وہ اس کی میراث میں تقسیم ہوگی، ورثاء کو اختیار ہوگا کہ یہ زمین واپس لے لیں، واپس لینے کی صورت میں یہ عمارت باقی نہیں رہے گی اور وقف میں تابید کی جو شرط ہے وہ پوری نہیں ہو سکے گی۔

زمین مملوکہ نہ ہو تو صرف وہی صورت رہ جائے گی کہ وہ یا تو کسی اور جہت پر وقف ہو یا وہ زمین ارض محتکرہ ہو کہ اسے آباد کرنے کے لئے امام المسلمین نے کسی کو طویل المدت اجارہ پر دیدی ہو تو ان دو صورتوں میں صرف عمارت کسی خاص مصرف پر بغیر زمین کے وقف کی جاسکتی ہے۔[1]

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۹/۴) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الأولیٰ ۱۴۱۱ھ (۷۱۱/۵) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۰۳/۵)

بابِ سوم

وقف کا رکن

تیسرا باب

وقف کا رکن

رکن سے مراد:

رکن سے مراد وہ ہے جس پر کسی چیز کا وجود موقوف ہو اور اس کے بغیر وہ چیز وجود میں نہ آسکے اور وہ اس چیز کی داخل ماہیت ہو اور اس کا جزء ہو۔[1]

احناف کے نزدیک وقف کا رکن صرف ایک چیز ہے یعنی ''صیغہ وقف'' وہ الفاظ جن کے ذریعہ وقف کیا جائے۔علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

وامارکنه: فالألفاظ الخاصة الدالة عليه.[2]

وقف کا رکن وہ خاص الفاظ ہیں جو وقف پر دلالت کرتے ہیں۔

دیگر ائمہ نے وقف کے ارکان چار ذکر کئے ہیں:

۱۔واقف ۲۔موقوف ۳۔موقوف علیہ ۴۔صیغہ۔[3]

یہ قول احناف کے مؤقف سے کچھ مختلف نہیں کیونکہ ان کے نزدیک اگر چہ صیغہ وقف کا رکن ہے لیکن ظاہر ہے کہ صیغہ کے لئے بولنے والا اور وقف کی جانے والی چیز وغیرہ تو ضروری ہیں اسلئے احناف نے صیغہ اور الفاظِ وقف سے رکن ہونے کی حیثیت سے بحث کی ہے اور واقف، موقوف علیہ کے بارے میں وقف کی شرائط کے تحت گفتگو کی ہے۔

---

(۱) الجرجانی، علی بن محمد بن علی الجرجانی ۸۲۶ھ. كتاب التعريفات، بيروت، دار الفكر الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۷م (ماده ركن، قال: وهو ما يتم به الشيء وهو داخل فيه)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۱۹۰)

(۳) دیکھئے: الشربينى، الشيخ محمد الشربينى، مغنى المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربى (۲/۳۷۶) الخرشى، محمد بن عبد الله بن على الخرشى المالكى. شرح الخرشى على مختصر سيدى خليل، بيروت، دار صادر (۷/۷۸)

وہ الفاظ جن سے وقف منعقد ہوتا ہے

وہ الفاظ جو وقف کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں کہ ''کسی چیز سے مالکانہ تعلق ختم کر کے وہ چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دیدی جائے لیکن اس کے منافع اللہ کے بندوں کو پہنچائے جائیں'' اس مفہوم سے وقف منعقد ہوجاتا ہے۔

جیسے لفظ وقف استعمال کرنا یا تسبیل اور تحبیس استعمال کرنا، ان تینوں الفاظ کو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے وقف کے الفاظِ صریحہ میں شمار کیا ہے کہ عام طور پر عرف میں ان الفاظ کے استعمال سے وہ خاص صورت ہی متعین سمجھی جاتی ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں وقف کہا جاتا ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

الفاظ الوقف ستة ثلاثة صريحة و ثلاثة كناية فالصريحة وقفت و حبّست و سبّلت. متى أتى بواحدة من هذه الثلاث صار وقفا من غير انضمام أمر زائد لأن هذه الألفاظ ثبت بها عرف الاستعمال بين الناس وانضم إلى ذلک عرف الشرع بقول النبی ﷺ لعمر: "إن شئت حبّست أصلها و سبلت ثمرتها" فصارت هذه الكلمات فی الوقف كلفظ التطليق فی الطلاق.[1]

وقف کے الفاظ چھ ہیں، تین صریح ہیں اور تین کنایہ، الفاظ صریحہ وقفت، حبست اور سبلت ہیں، جب ان میں سے کسی لفظ سے وقف کیا جائے تو وقف ہوجاتا ہے کسی اور لفظ یا قرینہ کے ملانے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ ان الفاظ کو وقف کے لئے استعمال کرنے کا عرف ہے اور اس عرف کے ساتھ شریعت کا عرف بھی مل گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی الفاظ استعمال کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وقف کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تو گویا یہ الفاظ وقف میں ایسے ہی ہیں جیسے لفظِ طلاق، طلاق کے باب میں بالکل صریح ہے۔

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبدالله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ ـ ۶۲۰ . المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۹/۸) نیز دیکھئے: الرملی، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدين الرملی. نهاية المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربی (۳۶۸/۵)

علامہ نووی تحریر فرماتے ہیں:

الفاظ الوقف على مراتب، أحداها: قوله: وقفت كذا أو حبّست أو سبّلت أو أرضى موقوفة أو محبّسة أو مسبلة فكل لفظ من هذا صريح هذا هو الصحيح الذى قطع به الجمهور.(۱)

وقف کے لئے استعمال کئے جانے والے الفاظ کے کئی مراتب ہیں ان میں سے ایک مرتبہ لفظ وقفت، حبّست، سبّلت وغیرہ کا ہے ان میں سے ہر لفظ وقف کے انعقاد کے لئے صریح ہے، یہی صحیح ہے اور اس پر جمہور نے جزم کا اظہار کیا ہے۔

ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں الفاظ اور ان کے مشتقات وقف کے صریح الفاظ ہیں۔

وقف کے الفاظِ کنایہ:

ان تین الفاظ کے علاوہ بقیہ الفاظ جو وقف کا احتمال بھی رکھتے ہیں اور غیر وقف کا احتمال بھی رکھتے ہیں انہیں فقہاء کرام نے وقف کے الفاظ کنایہ میں شمار کیا ہے جیسے لفظ صدقہ، نذر، **جعلت مالى للفقراء، جعلت مالى فى سبيل الله**، لفظ تحریم، تابید وغیرہ یہ تمام الفاظ جہاں وقف کا احتمال رکھتے ہیں وہاں ان میں غیر وقف کا بھی احتمال ہے مثلاً صدقہ کا مفہوم وقف کے علاوہ کسی چیز کا عین فقیر کو دیدینا بھی ہے اسی طرح ''جعلت مالی فی سبیل اللہ'' کا جہاں مفہوم وقف کرنا ہے وہاں اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسے اللہ کے راستہ میں صدقہ کرنا اور اس کے عین کو خرچ کرنا مقصود ہے۔ دونوں احتمال رکھنے کی وجہ سے یہ الفاظ کنایہ میں داخل ہیں، ان الفاظ سے وقف منعقد ہونے کے لئے تین باتوں میں سے کسی ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ ان کے ساتھ وقف کے الفاظ صریحہ میں سے کوئی مل جائے جیسے صدقہ موقوفہ، صدقہ محبسہ، صدقہ مسبلہ یا تابید پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ ملا دیا جائے جیسے صدقہ مؤبّدہ وغیرہ۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان الفاظِ کنایہ کے ساتھ وقف کی صفات ذکر کر دی جائیں مثلاً کہا جائے ''**صدقة لا تباع ولا توهب ولا تورث**'' یعنی ایسا صدقہ جسے نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہبہ کیا

---

(۱) النووى، يحيىٰ بن شرف النووى. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۲۲/۵)

جا سکتا ہے اور نہ اس میں میراث جاری ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اوصاف وقف ہی کے ہیں اس لئے اس قرینہ کی وجہ سے صدقہ سے مراد وقف ہوگا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ الفاظ کنایہ استعمال کرتے وقت وقف کی نیت ہو تو اس صورت میں بھی ان الفاظ سے وقف منعقد ہو جائے گا لیکن یہ وقف ''دیانۃً فیما بینہ وبین اللہ'' منعقد ہوگا عدالت کے ذریعہ اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نیت تو دل کا عمل ہے جس پر اللہ تعالیٰ ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔ المغنی میں ہے:

فإن انضم إليها (كنايات الوقف) أحد ثلاثة أشياء حصل الوقف بها أحدها أن ينضمّ إليها لفظة أخرىٰ تخلصها من الألفاظ الخمسة ...... الثاني أن يصفها بصفات الوقف فيقول صدقة لا تباع ولاتوهب ولاتورث لأن هذه القرينة تزيل الاشتراک، الثالث أن ينوى الوقف فيكون على ما نوى إلا أن النية تجعله وقفا في الباطن دون الظاهر.[1]

ان الفاظ کنایہ کے ساتھ تین باتوں میں سے کوئی ایک بات پائی جائے تو ان سے وقف منعقد ہو جائے گا، ایک بات تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ وقف کے الفاظِ صریحہ میں سے کوئی پایا جائے، دوسرے یہ کے وقف کی صفات کے ساتھ یہ الفاظ متصف ہوں مثلاً کسی نے کہا کہ میں یہ زمین صدقہ کرتا ہوں اس طرح کہ اسے نہ بیچا جا سکے گا، نہ ہبہ کیا جا سکے گا اور نہ اس میں میراث جاری ہوگی۔ ان اوصاف کی وجہ سے ان الفاظ میں جو اشتراک تھا وہ ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ واقف کی طرف سے نیت پائی جائے البتہ اس نیت کی وجہ سے باطناً وقف منعقد ہو جائے گا، ظاہراً نہیں ہوگا۔

انعقادِ وقف کے لئے لفظ ''وقف'' کا استعمال ضروری نہیں:

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ وقف کے انعقاد کے لئے لفظ وقف استعمال کرنا شرعاً ضروری

---

(۱) ابن قدامہ، موفق الدين ابو محمد عبدالله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷ء (۱۸۹/۸) نیز دیکھئے: الشيرازی، الامام ابو اسحاق الشيرازی، المهذب، مصر، عيسى البابی (۴۴۲/۱)

نہیں اس کے بغیر بھی اگر وقف کا مفہوم صراحۃً یا دلالۃً پایا جائے تو وقف درست ہوگا۔ ہر لغت اور زبان میں اور ہر جگہ کے عرف میں اس کے لئے مختلف الفاظ ہو سکتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص اردو میں کہے کہ ''میں نے اپنا گھر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دیدیا اسے ہمیشہ باقی رکھتے ہوئے اس کی آمدنی فقراء میں تقسیم کی جائے'' یا اس جگہ کو میں نے مسجد بنادیا یا اس طرح کے دیگر جملے استعمال کرے تو ان سے وقف منعقد ہو جائے گا کیونکہ ان جملوں میں وقفِ شرعی کا مفہوم پوری طرح پایا جا رہا ہے۔

المحیط البرہانی میں ہے:

وإذا قال "أرضي هذه للسبيل" ولم يزد على هذا فإن كان هذا الرجل من قوم هذا اللفظ في تعارفهم وقف فهو وقف وإن لم يكن من قوم تعارفهم أن هذا وقف يسأل عنه إن أراد به الوقف فهو وقف وإن أراد به الصدقة فهو صدقة ...... إذا قال "ضيعتي هذه للسبيل" ولم يزد على هذا لم يصر وقفا إلا إذا كان القائل في ناحية يفهم أهل تلك الناحية بها الوقف المؤبد بشرائطه لأن المطلق ينصرف إلى المتفاهم فيصير كالتصريح بالوقف.(۱)

اگر کسی نے کہا کہ ''میں نے یہ زمین اللہ کے راستہ کے لئے خاص کردی'' اس سے زاید کچھ نہیں کہا تو اگر اس کا تعلق ایسے قبیلہ یا ملک سے ہے جن کے عرف میں یہ الفاظ وقف کیلئے استعمال ہوتے ہیں تو یہ زمیں وقف ہو جائے گی، اور اگر ان کے عرف میں یہ الفاظ وقف کیلئے استعمال نہیں ہوتے تو اس سے پوچھا جائے گا اگر اس سے وہ وقف کا ارادہ کرے تو یہ وقف ہوگا اور اگر صدقہ کا ارادہ کردے تو صدقہ ہوگا، اسی طرح اگر کسی نے کہا کہ ''ضیعتی ھذہ للسبیل'' تو ان الفاظ سے وقف نہیں ہوگا الا یہ کہ یہ شخص ایسے علاقہ سے تعلق رکھتا ہو جہاں ان الفاظ سے ہمیشہ باقی رہنے والا وقف سمجھا جاتا ہو تو پھر وقف منعقد ہو جائے گا۔ کیونکہ مطلق لفظ کو عرف میں استعمال ہونے والے اس کے مفہوم پر محمول کیا جاتا ہے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے اس نے صراحۃً وقف کے الفاظ استعمال کئے ہوں۔

---

(۱) ابن مازہ البخاری، برهان الدين ابو المعالي محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاري ۶۱۶ھ. المحيط البرهاني، كراچی ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۴۸۸/۸) نیز دیکھئے: الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوىٰ التتارخانية، كراچي، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۲۹۲/۵)

بغیر لفظ کے صرف فعل سے وقف کے انعقاد کا حکم:

شوافع کے علاوہ تقریباً تمام فقہاء کرام کے نزدیک فعل سے بھی وقف منعقد ہو جاتا ہے، بشرطیکہ وہ فعل عرف میں وقف پر دلالت کرنے والا سمجھا جاتا ہو۔ مثلاً ایک شخص نے مسجد بنائی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدی تو شرعاً یہ جگہ مسجد بن گئی اور اس مقصد کیلئے وقف ہوگئی اگرچہ اس نے وقف کے الفاظ استعمال نہیں کئے۔ علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

> **إنه لایحتاج فی جعله مسجدا إلی قوله "وقفته" ونحوه لأن العرف جار بالإذن فی الصلاة علی وجه العموم و التخلیة بکونه وقفا علی هذه الجهة کالتعبیر به ...... بخلاف الوقف علی الفقراء لم تجر عادة فیه بالتخلیة و الإذن بالاستغلال ولو جدت به فی عرف اکتفینا بذلک کمسئلتنا و بقولنا قال مالکؒ و أحمدؒ خلافا للشافعیؒ.**[1]
>
> کسی جگہ کے مسجد ہونے کے لئے بنانے والے کا "وقفت"، یعنی میں نے وقف کیا کہنا ضروری نہیں، کیونکہ عرف میں کسی جگہ نماز پڑھنے کی عمومی اجازت دینے اور اس جگہ سے اپنا حق ختم کر لینے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ جگہ اس جہت پر وقف ہے لہٰذا یہ عمل ایسے ہی ہے جیسے اس نے زبان سے وقف کے الفاظ ادا کئے ہوں بخلاف فقراء پر وقف کے کہ وہاں کسی چیز سے فقراء کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دینے اور تخلیہ کر دینے سے وقف نہیں سمجھا جاتا اس لئے وقف علی الفقراء میں اس فعل سے وقف منعقد نہیں ہوگا۔ ہاں اگر کہیں اس میں بھی یہی عرف ہو تو پھر وقف منعقد ہو جائے گا۔ یہی امام مالک و احمد رحمہما اللہ بھی فرماتے ہیں، امام شافعیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کھانے کی چیز یا نقد رقم لوگوں میں دینے کے لئے پھینکے تو جو اسے پکڑ لے گا وہ اس کا مالک بن جائے گا کیونکہ اس کا عمل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ جس کے ہاتھ میں یہ چیز آ جائے اسی کی ہوگی حالانکہ دینے والے نے زبان سے کوئی لفظ استعمال نہیں کیا۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۴۸/۵)

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وظاهر مذهب أحمد أن الوقف يحصل بالفعل مع القرائن الدالةعليه مثل أن يبني مسجدا و يأذن للناس الصلاة فيه أو مقبرة و يأذن في الدفن فيها أو سقاية و يأذن في دخولها...... ولنا أن العرف جار بذلک و فيه دلالة على الوقف فجاز أن يثبت به كالقول وجرى مجرى من قدّم إلى ضيفه طعاما كان إذنا في أكله ومن ملأ خابية ماء على الطريق كان تسبيلا له ومن نثر على الناس نثارا كان إذنا في التقاطه و أبيح أخذه.(۱)

امام احمد کا ظاہر مذہب یہی ہے کہ عمل سے بھی وقف منعقد ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ ایسے قرائن پائے جائیں جو وقف پر دلالت کرتے ہوں۔ مثلاً کوئی شخص مسجد بنائے اور لوگوں کو اس میں نماز کی اجازت دے دے یا اپنی زمین کو قبرستان بنادے اور اس میں دفن کرنے کی اجازت دے دے۔ یا پانی پینے کی جگہ بنائے اور اس میں لوگوں کو آنے کی اجازت دے دے تو ان تمام صورتوں میں ان افعال سے وقف منعقد ہو جائے گا۔ کیونکہ ان تمام صورتوں میں عرفاً وقف سمجھا جاتا ہے، اوران میں وقف پر دلالت بھی پائی جارہی ہے۔ لہٰذا قول کی طرح ان افعال سے وقف منعقد ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مہمان کے سامنے کھانا پیش کرے تو یہ کھانے کی اجازت سمجھا جاتا ہے اسی طرح جس نے پانی کا مشکیزہ بھر کے راستہ میں رکھ دیا تو اس کی طرف سے پینے کی اجازت ہوتی ہے اسی طرح کوئی شخص لوگوں پر کوئی چیز اچھالے تو یہ بھی اجازت ہوتی ہے کہ اسے لینا جائز ہے اور جو بھی پکڑ لے گا وہ اس کا مالک بن جائے گا۔

فقہ مالکی کی مشہور کتاب حاشیۃ الدسوقی میں ہے:

قوله:" بحبّست ووقفت" أى أو مايقوم مقامهما كالتخلية بين كمسجد و بين الناس وإن لم يخص قوما دون قوم ولا فرضا دون نفل

---

۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبدالله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ . المغنى، رياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۸/۱۹۰)

فإذا بنى مسجدا أو أذن فيه للناس فذٰلک کالتصريح بأنه وقف وإن لم يخص زمانا ولا قوما.(۱)

وقف کے لئے یا تو الفاظِ وقف ہونے چاہئیں یا ایسی کوئی چیز ہونی چاہئے جو الفاظِ وقف کے قائم مقام ہو جیسے مثلاً مسجد اور لوگوں کے درمیان تخلیہ کر دینا کہ مسجد بنائی اور اس میں لوگوں کو آنے کی اجازت دے دی تو یہ گویا اس بات کی تصریح ہے کہ اس نے یہ جگہ وقف کر دی ہے اگر چہ اس نے وقف اور نمازیوں کی تعیین نہ کی ہو۔

شافعیہ کا موقف

البتہ حضرات شوافع وقف کے لئے الفاظ وقف کو ضروری قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک فعل سے وقف منعقد نہیں ہوتا۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

فلا يصح الوقف إلا بلفظ لأنه تمليک للعين و المنفعة أو المنفعة فأشبه سائر التمليکات لأن العتق مع قوته وسرايته لا يصح إلا بلفظ فهذا أولىٰ، فلو بنى علىٰ هيئة المسجد أو على غير هيئتها و أذن فى الصلاة فيه لم يصر مسجدا و کذا لو أذن الدفن فى ملکه لم يصر مقبرة سواء صلى فى ذٰلک و دفن فى ذا أم لا.(۲)

وقف صرف الفاظِ وقف ہی سے درست ہے، کیونکہ یہ عین اور منفعت دونوں یا صرف منفعت کے مالک بنانے کا نام ہے تو یہ دیگر عقود کی طرح ہو گیا جن میں کسی چیز کا مالک بنایا جاتا ہے۔ عتق اپنی قوت اور سرایت کے باوجود صرف لفظ سے درست ہے تو وقف کو تو بطریقِ اولیٰ صرف الفاظ سے منعقد ہونا چاہئے، لہٰذا اگر کسی نے مسجد کی ہیئت کے مطابق کوئی عمارت تیار کی یا اس کی ہیئت کے بغیر عمارت تیار کی اور لوگوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت دیدی تو وہ جگہ مسجد نہیں بنے گی۔ اسی طرح اگر لوگوں کو اپنی مملوکہ زمین میں دفن

---

(۱) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشية الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۲۶۳/۳ و کذا ۸۴/۴)

(۲) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بیروت، مکتب اسلامی ۱۹۸۵ (۳۲۲/۵)

کرنے کی اجازت دی تو اس کی زمین وقف نہیں ہوگی خواہ نماز پڑھی گئی ہو اور مردہ دفن کیا گیا ہو یا نہیں۔

ترجیح:

راجح رائے جمہور کی ہے کہ ایسے افعال سے بھی وقف منعقد ہو جائے گا جو وقف پر دلالت کرتے ہوں وقف کے لئے الفاظ استعمال کرنا ضروری نہیں، کیونکہ الفاظ میں بھی اعتبار سب کے نزدیک دلالت کا ہے یہی وجہ ہے کہ حضراتِ شوافع کے یہاں بھی الفاظِ وقف صریح اور کنایہ دونوں معتبر ہیں تو جب الفاظ میں اصل مقصد پر دلالت کو کافی سمجھا گیا ہے تو فعل میں بھی کافی سمجھنا چاہئے کوئی معتدبہ فرق دونوں میں نہیں ہے۔

تحریر کے ذریعہ وقف کا حکم

تحریر کے ذریعہ اگر وقف کیا جائے تو وہ وقف بالاتفاق شرعاً منعقد ہو جاتا ہے کیونکہ تحریر کا حکم عام طور پر تکلم ہی کا ہے اس لئے جس طرح زبان سے کہنے سے وقف منعقد ہو جاتا ہے اسی طرح تحریر کے ذریعہ سے بھی وقف منعقد ہو جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے اصول بیان کیا ہے کہ:

الكتاب كالخطاب.[1]

تحریر زبانی خطاب ہی کے حکم میں ہے۔

صاحب عنایہ اس کے تحت فرماتے ہیں:

لأن الكتاب من الغائب كالخطاب من الحاضر لأن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبلغ تارة بالكتاب و تارة بالخطاب.[2]

غائب کی طرف سے کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے موجود کی طرف سے خطاب، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی لکھ کر تبلیغ فرمایا کرتے تھے اور کبھی خطاب کے ذریعہ۔

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن علی بن ابی بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۶۱/۵)

(۲) البابرتي، محمد بن محمود البابرتي. العنايه بهامش فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۶۱/۵)

قانون العدل والانصاف میں تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ کے حوالہ سے لکھا ہے:

الکتابة علی ثلاثة مراتب مستبین مرسوم وهو أن یکون معنونا أی مصدرا بالعنوان من فلان بن فلان فهو کالنطق حجة.[۱]

کتابت کے تین مراتب ہیں، ایک مرتبہ یہ ہے کہ تحریر عام رسم الخط کے مطابق ہو اور واضح ہو اور اس میں عنوان وغیرہ موجود ہو کہ یہ فلان ابن فلان کی طرف سے ہے تو ایسی تحریر زبانی تکلم کی طرح حجت ہے۔

شیخ زحیلی ایک موقعہ پر لکھتے ہیں:

و الدلیل علی جواز الاکتفاء بالکتابةأن الکتابة لا تقل فی بیان المراد عن العبارة بل هی أقویٰ منها عند الحاجة إلی الإثبات.[۲]

تحریر پر اکتفاء کرنے کے جواز پر دلیل یہ ہے کہ مراد پر دلالت کرنے میں تحریر زبانی عبارت سے کم نہیں بلکہ جب اس بات کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو تحریر زبانی عبارت سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

یہ تمام عبارات واضح ہیں کہ واضح تحریر کا حکم تکلم ہی کا ہے اس لئے تحریر سے بھی وقف منعقد ہو جائے گا۔

تحریری وقف نامہ کی اہمیت:

وقف کرتے وقت تحریری طور پر وقف نامہ تیار کرنے کی اہمیت سے انکار ہرگز نہیں کیا جاسکتا، قرآن کریم میں بھی معاہدات تحریر میں لانے کی تاکید کی گئی ہے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

یاأیها الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوه فلیکتب بینکم کاتب بالعدل.[۳]

---

(۱) باشا، محمد قدری باشا. قانون العدل والانصاف، مصر، مکتبه الاهرام ۱۹۲۸م (۲۱۷)

(۲) الزحیلی، الدکتور وهبة الزحیلی. الفقه الاسلامی وادلته. بیروت، دار الفکر، الطبعة الاولیٰ، ۱۹۸۴م (۱۷/۸)

(۳) القرآن: (۲/۲۸۳)

اے ایمان والو! جب معاہدہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعادِ متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو اور یہ ضروری ہے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان یہ معاہدہ انصاف کے ساتھ لکھے۔

علامہ ابن العربی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

یرید أن یکون صکاً لیستذکر به عند أجله لما یتوقع من الغفلة فی المدة التی بین المعاملة وبین حلول الأجل و النسیان موکل بالإنسان و الشیطان ربما حمل علی الإنکار والعوارض من موت و غیرہ تطرأ فشرع الکتاب والإشهاد و کان ذٰلک فی الزمان الأول.(۱)

اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ یہ دستاویز بن جائے تا کہ متعینہ وقت پر اس کے ذریعہ یاددہانی حاصل ہو سکے، کیونکہ معاملہ اور مقررہ وقت کی آمد کے درمیان جو وقت ہے اس میں غفلت ممکن ہے، انسان بھول بھی جاتا ہے، کبھی شیطان بھی انکار پر ابھارتا ہے اور موت وغیرہ عوارض بھی پیش آتے ہیں اس لئے تحریر اور اس پر گواہ بنانا مشروع کیا گیا اور یہ سلسلہ قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔

اس کے بعد علامہ ابن العربی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سب سے پہلی دستاویز خود اللہ تعالیٰ نے اس وقت لکھی تھی جب حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ ان کی عمر کے چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کو دیدئے جائیں اور اس دستاویز پر فرشتوں کو گواہ بھی بنایا تھا، بعد میں جب حضرت آدم علیہ السلام یہ واقعہ بھول گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ دستاویز انہیں دکھائی۔

وقف بھی ایک طرح سے معاہدہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہے کہ اب میں اس چیز سے اپنے مالکانہ تعلق ختم کر کے اسے آپ کے ضرورت مند بندوں کے لئے مخصوص کر دوں گا اور موقوف علیہم متعین ہوں تو انہیں مطالبہ کا بھی حق ہوتا ہے اس لئے اس آیت کی دلالت النص سے وقف کی دستاویز لکھوانے کا بھی استحباب ثابت ہوتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ کی دستاویز وقف:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے وقف کی دستاویز لکھوائی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) ابن العربی، محمد بن عبد الله المعروف بابن العربی. احکام القرآن، مصر، مطبعة عیسیٰ البابی (۱/۲۴۷)

کے مشورہ سے آپ نے اپنا باغ تو فوراً ہی وقف فرما دیا تھا۔ لیکن اپنے دورِ خلافت میں آپ نے اس کی تحریری دستاویز تیار کروائی تھی جسے آپ کے کاتب حضرت معیقیب نے لکھا تھا اور عبداللہ بن ارقم اس کے گواہ تھے، کتب حدیث میں یہ دستاویز نقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لما كتب عمر بن الخطاب صدقته في خلافته دعا نفرا من المهاجرين و الأنصار فأحضرهم ذلك و أشهدهم عليه فانتشر خبرها.(۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے دور خلافت میں اپنے وقف کی دستاویز لکھوائی تھی تو حضرات مہاجرین وانصار کی ایک بڑی جماعت کو بلایا تھا اور انہیں اس پر گواہ بنایا تھا، پھر اس تحریر کی خبر خوب پھیل گئی۔

أبوداؤد شریف میں یحییٰ بن سعید کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے عبدالحمید بن عبد اللہ بن عمرؓ نے مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف کی دستاویز نقل کر کے دی جس میں لکھا تھا:

هذا ما كتب عبد الله عمر في ثمغ ...... و كتب معيقيب و شهد عبد الله بن الأرقم.(۲)

یہ وہ تحریر ہے جو اللہ کے بندہ عمرؓ نے ثمغ کے بارے میں لکھوائی ہے۔ معیقیب نے لکھی ہے اور عبداللہ بن أرقم نے اس پر گواہی دی ہے۔

حضرت علیؓ کی دستاویزِ وقف:

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اپنے وقف کی دستاویز لکھوائی تھی۔ عمر بن شبّہ نے تاریخ المدینہ المنورۃ میں أبوغسان کے حوالہ سے یہ دستاویز بعینہٖ نقل کی ہے، اس کے ناقل ابوغسان کہتے ہیں:

هذه نسخة كتاب صدقة علي بن أبي طالبؓ حرفا بحرف نسختها على نقصان هجائها و صورة كتابتها أخذتها من أبي أخذها من حسن

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۹۹۹م (۸)

(۲) السجستانی، ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ. سنن ابی داؤد بیروت، مؤسسة الريان ۱۹۹۸م (کتاب الوصایا باب ما جاء فی الرجل یوقف الوقف)

بن زيد. بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم، هذا ما أمر به وقضىٰ به في ماله عبد اللّٰه علی امير المؤمنين ابتغاء وجه اللّٰه ليولجني اللّٰه به الجنة ويصرفني عن النار ويصرف النار عني يوم تبيض وجوه وتسود وجوه. الخ.[1]

یہ حضرت علی بن ابی طالب کے وقف کی دستاویز کی حرف بحرف نقل ہے میں نے اسے بعینہٖ اس کی ہجاء میں کمی اور کتابت کی شکل کے ساتھ نقل کیا ہے اسے میں نے اپنے والد سے لیا، انہوں نے حسن بن زید سے یہ تحریر نقل کی تھی اس میں درج تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ دستاویز وہ ہے جس کے ذریعہ اللہ کے بندہ علی نے اپنے مال کے بارے میں وقف کا فیصلہ کیا محض اللہ کی رضا کے لئے تا کہ کہ وقف مجھے جنت میں داخل کردے اور جہنم سے مجھے بچالے جس دن بعض چہرے منور ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔

دستاویز کی ضرورت:

دستاویز کی ضرورت بھی واضح ہے کہ واقف وقف کرتے وقت اس کی تفصیلات طے کرتا ہے کہ اس نے کیا چیز وقف کی ہے کن کن افراد یا مصارف پر وقف کی ہے ان میں استحقاق کے لئے کیا کیا شرائط ملحوظ ہوں گی یہ تمام امور زبانی طے کردینے سے اگر چہ وقف درست ہوجائے گا لیکن واقف کے انتقال کے بعد مرورِ زمانہ سے یہ تمام تفاصیل رفتہ رفتہ مندرس ہونا شروع ہوجائیں گی اور پھر کچھ عرصہ بعد یہ وقف وقفِ مجہول شمار کیا جانے لگے گا، اس لئے وقف کرتے وقت تمام تفاصیل تحریری طور پر درج کر لینی چاہئیں تا کہ متولی اس کے مطابق عمل کرے اور ضرورت کے وقت عدالت اس کے مطابق فیصلہ کرسکے۔

تحریر پر گواہ بھی بنانے چاہئیں:

اور قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق اس تحریر پر گواہ بھی بنا لینے چاہئیں، سورۃ آلِ عمران کی ذکر کردہ آیت میں جہاں معاہدات تحریر کرنے کا ذکر ہے وہاں اس کے بعد گواہ بنانے کا بھی ذکر ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] ابن شبة، عمر بن شبة النميری المصری. تاريخ مدينه منورة، جده، دارالاصفهان ۱۳۹۳ھ (۱/۲۲۵)

یہاں تک معاملات میں دستاویز لکھنے اور لکھوانے کے اہم اصول کا بیان تھا آگے یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی تحریر کو کافی نہ سمجھیں بلکہ اس پر گواہ بھی بنالیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض تحریر حجتِ شرعی نہیں جب تک کہ اس پر شرعی شہادت موجود نہ ہو۔ خالی تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج کل عام عدالتوں کا بھی یہی دستور ہے کہ تحریر پر زبانی تصدیق وشہادت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتیں۔(۱)

تحریری وقف نامہ کی عدالتی حیثیت:

محض تحریری وقف نامہ کی بنیاد پر عدالت کسی جائیداد کے وقف ہونے نہ ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتی بلکہ اس کے لئے گواہ ضروری ہیں جو اس بات پر گواہی دیں کہ واقف نے ہمارے سامنے یہ جائیداد وقف کی اور اس پر یہ تحریر لکھوائی۔ کیونکہ تحریر میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ اصلی نہ ہو کسی نے کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے اور اس کی مملوکہ جائیداد سے اسے محروم کرنے کے لئے جعلی طور پر تیار کرلی ہو اس لئے جب تک اس کی تائید گواہوں سے نہیں ہو جاتی اس وقت تک یہ قابل قبول نہیں اور اس سے کسی جائیداد کے وقف ہونے کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ہندیہ میں ہے:

رجل فی یده ضیعة جاء رجل وادعی أنها وقف وجاء بصک فیه خطوط عدول و قضاة قد انقرضوا وطلب من القاضی القضاء به لیس للقاضی أن یقضی بذالک الصک، کذا فی الخلاصة، و کذٰلک لو کان لوح مضروب علی باب الدار ینطق بالوقف لایقضی به مالم یشهد الشهود بالوقف، کذا فی المحیط.(۲)

ایک شخص کے قبضے میں زمین ہے، دوسرے نے دعویٰ کیا کہ یہ وقف ہے اور وہ ایک دستاویز لے کر آیا جس میں کچھ قاضیوں کی تحریریں تھیں جو فی الحال قاضی نہیں رہے تھے اور اس مدعی نے قاضی القضاۃ سے اس کے وقف ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے مطالبہ کیا تو قاضی محض

---

(۱) شفیع، مفتی اعظم مفتی محمد شفیع. معارف القرآن، کراچی ادارة المعارف (۱/۶۳۲)
(۲) نظام الدین، الشیخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاویٰ الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجد الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۲/۴۴۱)

اس دستاویز کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی گھر کے باہر تختی لگی ہوئی ہو جس سے اس کا وقف ہونا معلوم ہوتا ہو تو محض اس کی بنیاد پر اس کو وقف ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا جب تک گواہ اس کے وقف ہونے کی گواہی نہ دیں۔

علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

ولو ادعىٰ على رجل في يده ضيعة أنها وقف وأحضر صكا فيه خطوط العدول و القضاة الماضين وطلب من القاضي القضاء بذٰلک الصک قالوا ليس للقاضي أن يقضي بذٰلک الصک لأن القاضي إنما يقضي بالحجة والحجة إنما هي البينة أو الإقرار، أما الصک فلا يصلح حجة لأن الخط يشبه الخط، و كذا لو كان على باب الدار لوح مضروب ينطق بالوقف لا يجوز للقاضي أن يقضي ما لم تشهد الشهود.(۱)

ایک شخص کے قبضہ میں کوئی زمین ہے، اس پر کسی نے دعویٰ کیا کہ یہ زمین وقف ہے اور اس نے ایک دستاویز پیش کی جس میں کچھ سابقہ قاضیوں تحریریں تھیں اور یہ پیش کر کے مدعی نے قاضی سے اس کے مطابق فیصلہ کرنے کی ادّعا کی۔ علماء نے لکھا ہے کہ قاضی کو اس دستاویز کے مطابق فیصلہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ قاضی تو دلیل کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے اور دلیل گواہی یا اقرار ہے، دستاویز ثبوت نہیں بن سکتی کیونکہ ایک تحریر دوسری تحریر کے مشابہ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے گھر کے دروازہ پر تختی لگی ہو جس سے اس گھر کا وقف ہونا معلوم ہوتا ہو تو قاضی کے لئے اس کے مطابق فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے جب تک اس کے وقف ہونے پر گواہ گواہی نہ دیں۔

علامہ رافعیؒ اِسعاف اور خانیہ کی اس عبارت کے بارے میں لکھتے ہیں:

وما في الخانية و الاسعاف في عدم العمل بالصكوک لإثبات أصل الوقف ولا سبيل للعمل بها لإثباته ولو كانت موافقة لما في السجل و

الطرابلسي، ابراهيم بن موسىٰ بن ابي بكر الطرابلسي. الاسعاف في احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه، ۱۹۱۲ (۱۹۱) و كذا في الخانية (۳/ ۳۴۱)

هـذا يـوافق ما نقله بعد عن الخيرية من عدم ثبوت الوقف بوجوده فى الدفتر السلطانى هذا هو الموافق لنصوص المذهب المعتمدة.(۱)

خانیہ اور اسعاف میں اصل وقف کو ثابت کرنے کے لئے دستاویز پر عمل نہ کرنے کا جو حکم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دستاویز اگر عدالتی ریکارڈ کے مطابق ہو تب بھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا اور یہ خیریہ کی عبارت کے مطابق ہے کہ عدالتی ریکارڈ کی بنیاد پر وقف کے ثبوت کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا، یہی معتمد نصوص کے مطابق ہے۔

یہ عبارات واضح ہیں کہ اگر جائیداد کسی کے قبضہ میں ہے اور وہ اس پر ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہے تو دوسرا شخص محض تحریری وقف نامہ کی بنیاد پر اسے عدالت میں وقف ثابت نہیں کرسکتا، اس کے لئے گواہ ضروری ہیں۔

کس صورت میں دستاویزِ وقف بغیر گواہوں کے معتبر ہے؟

البتہ اگر کوئی زمین ایسی ہو جس کی ملکیت کا کوئی مدعی نہ ہو تو وہاں تحریری دستاویز کے ذریعہ عدالتی ریکارڈ کے ذریعہ اس کا وقف ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں اس تحریر کے ذریعہ کسی کی ملکیت ختم نہیں کی جارہی بلکہ اس جائیداد کی حیثیت کی تعیین کی جارہی ہے۔

اس کی صراحت فقہی عبارتوں میں تو واضح طور پر نہیں ملتی لیکن فقہاء کرامؒ جہاں وقف کی تحریری دستاویز پر گواہی کی شرائط عائد کر رہے ہیں وہاں صورتِ مسئلہ کسی شخص پر دعویٰ ہی کی بیان کر رہے ہیں اس لئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر دعویٰ نہ ہو تو یہ تحریر کافی ہے گواہی کی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ ہے وقف کے بارے میں شہادۃ بالتسامع یعنی محض اس کی وقفیت کی شہرت کی وجہ سے گواہی دینے کے سلسلہ میں علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بحث کی ہے اس پر قیاس کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

علامہ رافعیؒ تحریر فرماتے ہیں:

إن شهادة التسـامـع إنما تقبل إذا لم يكن فى يد من يدعى ملكيته ولذا قـال شيـخـى زاده فـى شـرح الملتقىٰ اٰخر كتاب الوقف هذا إذا كان الـوقف لـم يستنـد إلـى ملك شرعى أما إذا استند فلا تقبل الشهادة بالشهرة بـل لا بد من الشهادة عـلـى تسـجيـله و به يفتى اليوم لأن

---

(۱) الرافعي، عبد القادر الرافعي. تقريرات الرافعي ملحق برد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۲/۴

الـمـلـک الشرعی لا ینزع من ید المالک إلا بالشهادة علی تسجیل الوقف لا بالتسامع.(۱)

شہرت کی بنیاد پر کسی زمین کے وقف ہونے کے بارے میں گواہی اس وقت قبول کی جائے گی جب یہ زمین کسی شخص کے قبضہ میں نہ ہو جو اس پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہو، اسلئے شیخی زادہ نے شرح الملتقیٰ میں لکھا ہے کہ یہ گواہی اس وقت قابل قبول ہے جب یہ وقف کسی ملکِ شرعی پر مستند نہ ہو۔ اگر وہ کسی ملک پر مستند ہو یعنی کوئی اسے اپنی طرف بطور ملکیت منسوب کرتا ہو تو ایسی صورت میں محض شہرت کی بنیاد پر گواہی قبول نہیں کی جائے گی بلکہ یہ ضروری ہوگا کہ عدالتی ریکارڈ میں اس کے اندراج پر گواہی پیش کی جائے، آج اس پر فتویٰ ہے، کیونکہ مالک کے قبضہ سے اس کی مملوکہ چیز وقف کے اندراج پر گواہی کے بغیر نہیں نکالی جاسکتی۔

اور اگر کسی کی ملکیت کا دعویٰ وقف پر نہ ہو تو ایسی صورت میں شهادة بالتسامع کے قابل قبول ہونے کی علت یہ بیان کی ہے:

لأنـه وإن كـان قـولا مـمـا يقصد الإشهاد عليه والحكم به فی الابتداء لـكـنـه فـی تـوالـی الأعـصار تبيد الشهود و الأوراق مع اشتهار وقفية فتبـقـی فـی البـقـاء سـائبة إن لـم تـجـز فيه الشهادة بالتسامع فمست الحاجة إلی ذٰلک.(۲)

وقف کے بارے میں محض شہرت کی بنیاد پر گواہی قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ابتداً تو وقف ایسی چیز ہے کہ اس پر گواہ بنانے چاہئیں اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے، لیکن مرورِ زمانہ سے گواہ اور دستاویزات باقی نہیں رہتیں جبکہ اس جگہ کا وقف ہونا معروف ہوتا ہے تو اگر شہرت کی بنیاد پر گواہی قبول نہ کی جائے تو اس زمین کا سائبہ ہونا یعنی کسی کی ملکیت میں نہ ہونا لازم آتا ہے، تو اسے سائبہ ہونے سے بچانے کے لئے اس کی وقفیت کے بارے میں شہرت کی بنیاد پر گواہی قبول کر لی جاتی ہے۔

---

(۱) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۹۱/۴)

(۲) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۹۱/۴)

یہی علت اس صورت میں بھی پائی جارہی ہے کہ ایک زمین پر کسی کی طرف سے ملکیت کا اثبات نہ ہو اور اس کا وقف ہونا معروف بھی ہو تو اگر تحریری دستاویز اور حکومتی ریکارڈ کے مطابق اسے وقف قرار نہیں دیا جائے گا تو وہ زمین ''سائبہ'' ہوجائے گی یعنی اس کا کوئی مالک نہیں رہے گا۔ اس سے بچانے کے لئے جس طرح شھادۃ بالتسامع قبول کرلی جاتی ہے حالانکہ وہ حقیقی گواہی نہیں (گواہی تو دیکھنے کے بعد دیجاتی ہے شہرت کی بنیاد پر گواہی نہیں دیجاتی) اسی طرح اس کی وقفیت ثابت کرنے کے لئے تحریری دستاویزات بھی قابل قبول ہونی چاہئیں۔ واللہ اعلم۔

تحریر کے ذریعہ عدالت میں واقف کی شرائط کا اثبات:

واقف کی عائد کردہ شرائط بالاتفاق اس کی تحریر کے ذریعہ یا عدالتی وحکومتی ریکارڈ کے ذریعہ ثابت کی جاسکتی ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے عدالت ہدایت جاری کرسکتی ہے۔

علامہ شامیؒ فتاویٰ خیریہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

و فی الخیریة ان کان للوقف کتاب فی دیوان القضاء المسمیٰ فی عرفنا بالسجل وھو فی أیدیھم اتبع ما فیه استحسانا إذا تنازع أھله فیه.[1]

خیریہ میں ہے کہ اگر عدالتی محفوظ ریکارڈ میں وقف کی کوئی دستاویز محفوظ ہو تو اس میں جو تفصیلات ہیں ان کی اتباع کی جائے گی اگر اہل وقف ان میں تنازع کرنے لگیں۔

علامہ رافعیؒ خیریہ کی اس عبارت کے بارے میں فرماتے ہیں:

لأن ماھنا فی العمل بما فی دواوین القضاۃ بالنسبة لشرائطه المجھولة مع التصادق علی ذات الوقف.[2]

خیریہ میں جو عدالتی ریکارڈ پر عمل کرنے کی بات ہے اس سے مراد وقف کی شرائط مجہولہ کے سلسلہ میں اس پر اعتماد کرنا ہے جب کہ وقف کی ذات پر سب کا اتفاق ہو کہ یہ وقف ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۴/۴۱۳)

(۲) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۴/۹۲)

وہ اوصاف جو الفاظِ وقف یا تحریر وقف میں ہونے ضروری ہیں

جن الفاظ کے تکلم یا تحریر سے وقف شرعاً منعقد ہوتا ہے ان الفاظ میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر ان اوصاف میں سے کوئی ایک وصف نہیں پایا گیا تو وقف منعقد نہیں ہوگا۔

ا۔ جزم:

وقف کیلئے تکلم یا تحریر میں جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ جزماً وقف پر دلالت کرتے ہوں، اگر ان میں جزم نہ پایا جائے محض ارادہ کا اظہار ہو یا وعدہ ہو تو ایسے الفاظ سے وقف منعقد نہیں ہوگا، مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میرا وقف کرنے کا ارادہ ہے یا میں وقف کرنے کا وعدہ کرتا ہوں یا عنقریب وقف کروں گا تو ان تمام صورتوں میں وقف منعقد نیہں ہوگا۔ کیونکہ وہ حتمی طور پر فی الحال وقف نہیں کر رہا، جزم نہیں پایا جارہا۔

۲۔ تنجیز:

دوسری شرط یہ ہے کہ وقف منجزاً ہو فی الحال کیا جائے اسے کسی شرط پر معلق نہ کیا جائے اور نہ مستقبل کی طرف منسوب کیا جائے، کیونکہ وقف ان عقود کی قبیل سے ہے جو تملیکات کہلاتے ہیں، اس میں بھی موقوف علیہم کو وقف کردہ چیز کی منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے اور جو عقود تملیکات کی قبیل سے ہیں انہیں نہ شرط پر معلق کیا جاسکتا ہے اور نہ مستقبل کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کہے کہ اگر کل بارش ہوئی تو میری یہ زمین وقف ہے یا اگر کل زید آیا تو میرا گھر وقف ہے یا کل سے یا اگلے مہینہ سے میرا گھر وقف ہے تو ان تمام صورتوں میں تنجیز نہ پائے جانے کی وجہ سے

وقف منعقد نہیں ہوگا۔ امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قلت: فإن قال: إذا كان غد فأرضي هذه صدقة موقوفة؟ قال: الوقف باطل لأنه لم يجلها الساعة وقفا وإنما جعلها وقفا غدا و غد هو على غاية. قلت وكذٰلك إذا قال: رأس الشهر أو قال إذا جاء الحول فأرضي هذه صدقة موقوفة؟ قال هذا كله باطل ولا تكون الأرض وقفا. قلت: وكذٰلك لو قال إذا قدم فلان فأرضي هذه صدقة موقوفة؟ قال: الوقف باطل من قبل انه جعلها وقفا على غاية ألا ترى أن له أن يبيعها وأن يخرجها عن ملكه قبل الوقف.[1]

میں نے عرض کیا کہ اگر کسی نے کہا کہ کل میری زمین وقف ہے تو کیا حکم ہے؟ امام نے فرمایا کہ وقف باطل ہے کیونکہ اس نے فی الحال وقف نہیں کیا ہے، بلکہ کل وقف کیا ہے اور کل موھوم ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر کسی نے کہا کہ جب اگلا مہینہ شروع ہو یا سال شروع ہو تو میری زمین وقف ہے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ یہ باطل ہے، زمین وقف نہیں ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر کسی نے کہا کہ اگر فلاں آئے یا اگر فلاں سے میں نے بات کی یا اگر فلاں عورت سے میں نے نکاح کیا تو میری یہ زمین وقف ہے اس کا کیا حکم ہے؟ امام نے فرمایا کہ ان تمام صورتوں میں وقف باطل ہے کیونکہ اس نے امر موہوم پر وقف کو معلق کیا ہے، یہ اس واقعہ سے پہلے اس زمین کو بیچ بھی سکتا ہے اور اپنی ملکیت سے نکال بھی سکتا ہے۔

امام نے کئی مثالوں سے اس اصول کی وضاحت کردی کہ وقف کے لئے تنجیز ضروری ہے، تعلیق یا اضافۃ اِلی المستقبل سے وقف منعقد نہیں ہوگا۔

علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

إذا علق الوقف فقال: إذا جاء رأس الشهر أو قدم فلان فقد وقفته لم يصح على المذهب.[2]

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۰۹)

(۲) النووي، يحييٰ بن شرف النووي. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۲۸/۵)

اگر وقف کو معلق کیا مثلاً کہا کہ جب مہینہ شروع ہو یا فلاں آئے تو میری یہ زمین وقف ہے تو راجح قول کے مطابق وقف درست نہیں۔

المغنی میں ہے:

ولا يجوز تعليق ابتداء الوقف على شرط فى الحياة مثل أن يقول إذا جاء رأس الشهر فدارى وقف أو فرسى حبس أو إذا ولد لى ولد أو إذا قدم لى غائبى ونحو ذلك ولا نعلم فى هذا خلافا. لأنه نقل للملك فيما لم يبن على التغليب و السراية فلم يجز تعليقه على شرط كالهبة.[1]

ابتداءِ وقف کو زندگی میں کسی شرط پر معلق کرنا جائز نہیں، مثلاً کوئی یوں کہے کہ جب مہینہ شروع ہو یا میری اولاد ہو یا جب فلاں آئے تو میری زمین یا میرا گھوڑا وقف ہے، اس میں کسی کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں، کیونکہ یہ ایسی چیز میں ملکیت کو منتقل کرنا ہے جو سرایت کا احتمال نہیں رکھتی، لہٰذا اسے شرط پر معلق کرنا درست نہیں ھبہ کی طرح۔

وقف بصورتِ نذر:

یہی وجہ ہے کہ اگر وقف بصورتِ نذر کیا جائے اور الفاظِ نذر استعمال کئے جائیں کہ فلاں مریض صحیح ہو گیا تو میں نذر مانتا ہوں کہ اپنی زمین وقف کروں گا تو ان الفاظ سے نذر منعقد ہو جائے گی، لیکن تنجیز نہ پائے جانے کی وجہ سے وقف منعقد نہیں ہوگا البتہ اس نذر کی وجہ سے کام ہو جانے پر زمین کا صدقہ ضروری ہوگا۔ علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

فلو قال: إن كلمت فلانا إذا قدم أو إن برئت من مرضى هذا فأرضى صدقة موقوفة يلزمه التصدق بعينها إذا وجد الشرط لأن هذا بمنزلة النذر واليمين.[2]

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبدالله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۱۶/۸)

(۲) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۱/۴) نیز دیکھئے: الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۰۹)

اگر کہا کہ فلاں کے آنے کے بعد میں نے اس سے بات کی یا اگر میں اس مرض سے شفایاب ہو گیا تو میری زمین وقف ہے تو اس پر اس زمین کے عین کا صدقہ کرنا لازم ہے شرط پائے جانے کی صورت میں کیونکہ اس کا یہ کلام نذر اور یمین کی طرح ہے۔

وقف اگر موت پر معلق ہو:

اسی طرح اگر کوئی شخص وقف کو اپنی موت پر معلق کرے تو اس شرط کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ وقف منعقد نہ ہو البتہ چونکہ یہ تعلیق بمنزلہ وصیت کے ہے اسلئے وصیت ہونے کی وجہ سے اس کے انتقال کے بعد تہائی مال کی حد تک اس پر عمل کیا جائے گا۔ البحر الرائق میں ہے:

والحاصل أنه إذا علقه بموته كما إذا مت فقد وقفت داري على كذا فالصحيح أنه وصية لازمة لكن لم تخرج عن ملكه فلايتصور التصرف فيه ببيع و نحوه بعد موته لما يلزم من إبطال الوصية وله أن يرجع قبل موته كسائر الوصايا و إنما يلزم بعد موته و إنما لم يكن وقفا لما قدمنامن أنه لايقبل التعليق بالشرط...... وعلى ما عرفت بأن صحته إذا أضيف الىٰ ما بعد الموت يكون باعتباره وصية.[1]

حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی وقف کو اپنی موت پر معلق کر دے کہ اگر میں مر جاؤں تو میرا گھر فلاں مصرف پر وقف ہے تو صحیح یہ ہے کہ یہ وصیت ہے جسے پورا کرنا لازم ہے۔ لیکن فی الحال یہ گھر اس کی ملکیت سے نہیں نکلا اس کے انتقال کے بعد اسے بیچا نہیں جا سکتا کیونکہ اس میں اس کی وصیت کو باطل کرنا لازم آئے گا اور اپنے انتقال سے پہلے وہ اس وصیت سے رجوع بھی کر سکتا ہے اپنی دیگر وصایا کی طرح اس کی موت کے بعد یہ لازم ہوگی۔ وقف نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وقف تعلیق بالشرط کو قبول نہیں کرتا، اس کا صحیح ہونا وصیت ہونے کی سے ہے جب اس نے اس کے وقف ہونے کی نسبت اپنی موت کی طرف کی ہو۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۹۳/۵)

۳۔ تابید:

تیسری شرط یہ ہے کہ الفاظ وقف میں تابید پائی جائے یعنی وہ ہمیشہ کے لئے وقف پر دلالت کریں۔ چنانچہ اگر ایک متعینہ وقت تک کے لئے وقف کیا جارہا ہے تو وہ وقف درست نہیں ہوگا۔ جیسے کوئی شخص ایک مہینہ یا ایک سال کے لئے وقف کرے تو یہ وقف شرعاً منعقد نہیں ہوگا۔

امام خصافؒ تحریر فرماتے ہیں:

قلت أرأيت إن قال قد جعلت أرضى هذه صدقة موقوفة لله عز وجل سنة أو يوما أو شهرا؟ قال هذا الوقف باطل قلت: فلم قال هذا؟ قال من قبل أنه قاله سنة أو شهرا أو يوما ولم يزد على هذا فلم يجعله مؤبدا.[1]

اگر کسی نے کہا کہ میں نے یہ زمین ایک سال کے لئے یا ایک مہینہ کے لئے اللہ رب العزت کی رضا کی خاطر وقف کی تو کیا یہ وقف صحیح ہوگا؟ امام نے فرمایا کہ یہ وقف باطل ہے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو امام نے فرمایا کہ صرف سال اور مہینہ کے ذکر کرنے سے یہ ہمیشہ کے لئے وقف نہیں ہوا، تابید نہیں پائی گئی اس لئے یہ وقف درست نہیں ہوگا۔

علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

لو قال: وقفت هذا سنة فالصحيح الذى قطع به الجمهور أن الوقف باطل.[2]

اگر کسی نے کہا کہ میں نے یہ ایک سال کے لئے وقف کیا تو صحیح قول جس کے جمہور قائل ہیں یہ ہے کہ یہ وقف باطل ہے۔

المغنی میں ہے:

وإن علق انتهائه على شرط نحو قوله دارى وقف إلى سنة أو إلى أن

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۰۸)

(۲) النووى، يحيىٰ بن شرف النووى. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۲۵/۵)

یقدم الحاج لم یصح فی أحد الوجهین لأنه ینافی مقتضى الوقف فإن مقتضاه التابید.[1]

اگر وقف کی انتہاء کو کسی شرط پر معلق کیا جیسے کہا کہ میرا گھر وقف ہے ایک سال کیلئے یا جب تک حاجی حج کر کے نہ آئیں تو ایک روایت کے مطابق یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ وقف کے مقتضیٰ کے خلاف ہے، وقف کا مقتضیٰ تو تابید ہے یعنی ہمیشہ کے لئے وقف کیا جائے۔

البتہ اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہوا ہے کہ الفاظِ وقف میں تابید پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کا پایا جانا بھی ضروری ہے یا محض تابید کے منافی امور سے خالی ہونا کافی ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک تابید پر دلالت کرنے والے کسی لفظ کا پایا جانا ضروری ہے جبکہ جمہور فقہاء کرامؒ کے نزدیک تابید کے منافی کسی بات کا نہ پایا جانا کافی ہے چنانچہ اگر کسی نے کہا کہ میں نے اپنی زمین وقف کی تو جمہور کے نزدیک تو ان الفاظ سے وقف منعقد ہو جائے گا امام محمدؒ کے نزدیک وقف منعقد نہیں ہوگا۔

فریقین کے دلائل پر ہم پانچویں باب کی پہلی فصل میں گفتگو کریں گے اور وہاں یہ بھی واضح کریں گے کہ راجح جمہور کا قول ہے۔

یہ وہ بنیادی امور ہیں جن کا وقف کے الفاظ میں ہونا ضروری ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک وصف بھی نہیں پایا گیا تو وقف منعقد نہیں ہوگا۔

---

(۱) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۴۱ ـ ۶۲۰ . المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۲۱۷/۸)

وقف کی دستاویز تیار کرتے وقت کن چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے؟

وقف کے لئے دستاویز تیار کرتے وقت اس میں درج ذیل امور کا لحاظ رکھنا مناسب ہے تا کہ بعد میں وقف کے سلسلہ میں مشکلات پیش نہ آئیں:

۱۔ جو جگہ وقف کی جارہی ہے اس کی مکمل حدودِ اربعہ لکھی جائے یا اگر کسی خاص نام سے وہ معروف ہو تو وہ نام لکھا جائے۔

۲۔ مصرف کی تعیین ضرور کی جائے اور اس میں مکمل وضاحت کی جائے کہ مثلاً اگر اپنی اولاد کے لئے وقف کیا جارہا ہے تو یہ واضح کیا جائے کہ اولاد سے مراد بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہیں یا کوئی ایک۔ اسی طرح اولاد کی اولاد پر بھی وقف کیا جارہا ہو تو اس میں صرف بیٹوں کی اولاد مراد ہے یا بیٹیوں کی اولاد بھی مراد ہے۔ اسی طرح مزید کون کون لوگ اس وقف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور واقف کن صفات سے متصف اشخاص کو اس وقف سے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔

۳۔ مصرف میں تغییر اور تبدیل کا اختیار بھی واقف کو اپنے لئے یا متولی کے لئے رکھنا چاہئے، تا کہ بوقتِ ضرورت کسی اہم دینی ضرورت کے پیش آنے پر اسے وقف سے پورا کیا جا سکے۔

۴۔ اسی طرح استبدالِ وقف کا اختیار بھی رکھنا چاہئے کہ ضرورت کے موقعہ پر واقف اس وقف کے بجائے دوسری جگہ وقف کر سکے۔

۵۔ ان اختیارات کے استعمال میں احتیاط پیشِ نظر رکھنے کے لئے واقف انہیں محض اپنے یا متولی کی صوابدید پر نہ چھوڑے بلکہ فیصلہ کا اختیار حالات سے باخبر کچھ متدین اور اہلِ علم لوگوں کی کمیٹی کے سپرد کر دے۔

۶۔ وقف کے متولی کی تعیین کی جائے،اس کے اختیارات اورتصرفات کی حدودبھی بیان کی جائیں اور اگرکسی خاص وصف یا اوصاف سے متصف شخص کوتولیت دینا چاہتا ہےتو وقف نامہ میں وہ اوصاف ضرورذکرکئے جائیں۔

۷۔ یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ وقف کرتے وقت واقف جوشرائط مصرف،تولیت،اور وقف سے انتفاع کیلئے لگانا چاہےاسے اس کامکمل اختیار حاصل ہےاوران پرعمل درآمد ہرایک کے لئے ضروری ہے۔لیکن اگر وقف کرتے وقت یہ شرئط نہیں لگائی گئیں تو بعد میں واقف کوبھی ان کا اختیارنہیں رہےگا،اس لئے وقف کی دستاویز تیارکرتے وقت خوب سوچ سمجھ کروقف کی بہتری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اوراسے ہمیشہ صدقہ جاریہ کےطور پر باقی رکھنے کے لئے مناسب شرائط واقف کولگانی چاہئیں۔تاکہ اس وقف سے بہتر انداز میں اورزیادہ سے زیادہ عرصہ فائدہ اٹھایا جاتا رہےاورواقف کواس کاثواب ہمیشہ ہمیشہ ملتارہے۔

۸۔ وقف کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جوعرف میں اورقانونی طور پربھی وقف کے مقصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہوں۔

۹۔ دستاویز وقف پرگواہ بھی بنالئے جائیں تاکہ بوقتِ ضرورت عدالت میں اس دستاویز کے ذریعہ مقدمہ لڑا جاسکے۔

۱۰۔ اگرحکومتی اور قانونی طور پر دستاویزِ وقف لکھنے کے لئے کوئی خاص طریقۂ کارضروری ہو، مثلاً اسٹامپ پیپر پرلکھناوغیرہ تواس کی پابندی کی جائے تاکہ اس دستاویز کی قانونی حیثیت ہو۔

موقوف علیہ کے قبول کی شرعی حیثیت

اس پر تو تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ اگر وقف ابتداءً اجہتِ عامہ پر ہے جیسے مساکین، فقراء، مسافر خانہ، مساجد، مدارس وغیرہ تو ایسی صورت میں وقف کی تکمیل کیلئے موقوف علیہ کا قبول کرنا شرط نہیں کیونکہ ان جہاتِ عامہ میں سے بعض تو وہ ہیں جن میں قبول کرنے کی صلاحیت نہیں جیسے مساجد، مدارس اور مسافر خانہ وغیرہ۔ اور بعض میں قبول کرنے کی صلاحیت تو ہے لیکن اس کے افراد غیر محصور ہیں جیسے فقراء، مساکین وغیرہ ان کے افراد نا قابلِ شمار ہیں تو قبول کیسے کیا جائے گا، اس لئے تمام فقہاء کرام کے نزدیک ان جہاتِ عامہ پر وقف کے لئے موقوف علیہم کا قبول کرنا شرط نہیں۔

علامہ طرابلسیؒ جو حنفی فقیہ ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں:

قبول الموقوف عليه الوقف ليس بشرط ان وقع لأقوام غير معينين كالفقراء و المساكين.(۱)

اگر وقف غیر معین لوگوں پر ہو جیسے فقراء، مساکین وغیرہ تو ان پر وقف کے صحیح ہونے کے لئے ان کا قبول کرنا شرط نہیں۔

شافعی فقیہ علامہ شربینی خطیبؒ لکھتے ہیں:

أما الوقف على جهة عامة كالفقراء أو على مسجد أو نحوه فلا يشترط فيه القبول جزما لتعذره.(۲)

جہت عامہ جیسے فقراء یا مسجد وغیرہ پر وقف ہو تو اس میں موقوف علیہم کا قبول کرنا حتمی طور پر شرط نہیں کیونکہ یہ ناممکن ہے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه، ۱۳۲۰ھ (۱۷)
(۲) الشربينی، الشيخ محمد الشربينی، مغنی المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربی (۲/ ۳۸۳)

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

إن كان الوقف على غير معين كالمساكين أو من لايتصور منه القبول كالمساجد و القناطر لم يفتقر إلى قبول.[1]

اگر وقف غیر معین افراد پر ہو جیسے مساکین وغیرہ یا ایسی جہت پر ہو جس میں قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو جیسے مساجد، پل وغیرہ تو ان صورتوں میں ان کی جانب سے قبول کی حاجت نہیں ہے۔

فقہ مالکی کی الشرح الکبیر میں ہے:

ولا يشترط قبول مستحقه لأنه قد لايكون موجودا وقد لايتصور منه القبول كالمسجد.[2]

وقف کے صحیح ہونے کے لئے مستحق کا قبول کرنا شرط نہیں کیونکہ کہیں تو ہو موجود نہیں ہوتا اور کہیں اس کی طرف سے قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا، جیسے مسجد وغیرہ۔

وقف علی المعین کی صورت میں قبول کا حکم

اور اگر وقف افرادِ معین پر ہو تو اس میں ان معین موقوف علیہم کا قبول کرنا شرط ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

حضراتِ حنفیہؒ کے نزدیک نفسِ وقف کی صحت اور وجود کے لئے تو موقوف علیہم کا قبول کرنا شرط نہیں، ہاں اس وقف کی آمدنی کے استحقاق کے لئے اس معین شخص یا افراد کا قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ رد کردیگا تو پھر آمدنی وقف کی آخری جہت مثلاً فقراء کو دی جائے گی۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

وإن وقع لشخص بعينه وجعل اٰخره للفقراء يشترط قبوله فى حقه فان قبله كانت الغلة له وإن رده تكون للفقراء ويصير كأنه مات.[3]

---

(۱) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۵۴۱ھ۔ ۶۲۰ھ . المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۱۸۷/۸)

(۲) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الکبیر بھامش الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۸۸/۴)

(۳) الطرابلسی، ابراھیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبہ ھندیہ، ۱۳۲۰ھ (۱۷)

اور اگر وقف کسی معین شخص پر ہے اور اس کی آخری جہت فقراء ہیں تو ایسے وقف میں اس معین شخص کا قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ قبول کرے گا تو اسے وقف کی آمدنی دی جائے گی اور اگر رد کرے گا تو یہ آمدنی فقراء کو ملے گی اور یہ ایسا ہی ہوگا کہ گویا اس کا انتقال ہوگیا ہے۔

حضرات شوافع کے یہاں اشتراط قبول وعدم اشتراطِ قبول دونوں روایتیں ہیں۔

علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

وإن كان الوقف على شخص أو جماعة معينين فوجهان: أصحهما عند الامام والآخرين اشتراط القبول...... والثانى لايشترط كالعتق وبه قطع البغوى والرويانى. قال الرويانى: لا يحتاج لزوم الوقف إلى القبول لكن لا يملك عليه إلا بالاختيار.[1]

حنابلہ کے ہاں بھی اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

وإن كان علىٰ آدمى معين ففى اشتراط القبول وجهان أحدهما اشتراطه لأنه تبرع لآدمى معين فكان من شرطه القبول كالهبة والوصية ...... والوجه الثانى لا يشترط القبول لأنه أحد نوعى الوقف فلم يشترط له القبول كالنوع الآخر ولأنه إزالة ملك يمنع البيع والهبة والميراث فلم يعتبر فيه القبول كالعتق.[2]

اگر وقف کسی معین شخص پر ہو تو اس کی طرف سے قبول کے ضروری ہونے نہ ہونے کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ شرط ہے کیونکہ یہ وقف ایک معین شخص کے لئے تبرع ہے لہٰذا اس کی طرف سے قبول کرنا ضروری ہے جیسے ہبہ اور وصیت میں یہ شرط ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا وقف کے صحیح ہونے کے لئے شرط نہیں کیونکہ یہ وقف ہی کی ایک صورت ہے، جس طرح وقف کی دوسری صورت یعنی جہتِ عامہ پر وقف میں قبول ضروری نہیں اسی طرح یہاں بھی قبول ضروری نہیں ہوگا، دوسرے یہ کہ وقف ایسے

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامی ۱۹۸۵م (۳۲۴/۵) وكذا فى مغنى المحتاج (۳۲۴/۲)

(۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبدالله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۷/۸)

ازالۂ ملک کا نام ہے جو ہبہ، بیع، میراث وغیرہ سے مانع ہے لہٰذا یہ عتق کی طرح ہے، جس طرح عتق میں قبول شرط نہیں اسی طرح وقف میں بھی قبول شرط نہیں ہوگا۔

فقہاء مالکیہ کا راجح قول حنفیہ کی طرح یہ ہے کہ وقف کی صحت کے لئے موقوف علیہم کا قبول کرنا شرط نہیں۔ امام خرشیؒ لکھتے ہیں:

فان رد الموقوف عليه المعين ما وقفه الغير عليه فى حياة الواقف أو بعد موته فان الوقف يرجع حبسا للفقراء و المساكين.[1]

اگر موقوف علیہ اس وقف کو رڈ کردے جو اس پر کسی اور نے وقف کیا ہو اپنی زندگی میں یا مرنے کے بعد تو یہ وقف اب فقراء ومساکین کے لئے ہوگا۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ موقوف علیہ کی قبولیت کو وہ مدارِ صحتِ وقف نہیں بناتے، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ قبول نہیں کرتا تو اسے استحقاقِ غلہ حاصل نہیں ہوگا لیکن وقف بہر حال درست رہے گا۔

ترجیح:

ہمیں راجح حضراتِ احناف اور مالکیہ کا مؤقف معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ وقف کو موقوف علیہم کے قبول کرنے پر موقوف نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ وقف میں دو بنیادی چیزیں ہیں ایک موقوفہ چیز کی ذات اور اس کا عین، دوسری موقوفہ چیز کی منفعت، موقوفہ چیز کی ذات پر تو اللہ تعالیٰ کو ملکیت حاصل ہوتی ہے لہٰذا بندہ کے قبول کرنے نہ کرنے کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہئے، جب اپنی ملکیت ختم کرکے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دیدی تو اس چیز کی ذات سے نہ واقف کا تعلق رہا اور نہ موقوف علیہم کا، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ اگر وقف کردہ گھر کا ملبہ گرتا ہے تو اس پر موقوف علیہم کا کوئی حق نہیں ہوگا وہ ان میں تقسیم نہیں کیا جائیگا اور نہ وہ واقف کا ہوگا، جب وقف کی ذات سے موقوف علیہم کا تعلق ہی نہیں ہے تو ان کے قبول نہ کرنے سے وقف کی ذات پر کوئی فرق نہیں پڑھنا چاہئے اور اصلاً وقف منعقد ہوجانا چاہئے۔ البتہ اس وقف کی منفعت سے ان کا تعلق ہے کہ وہ انہیں ملے گی اس لئے منفعت کے سلسلہ میں انہیں قبول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہئے، اگر وہ قبول نہیں کریں گے تو جو بھی آخری مصرف ہوگا اسے اس وقف کی منفعت اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی لینے کا حق حاصل ہوگا۔

---

(۱) الخرشی، محمد بن عبد الله بن علی الخرشی المالكی. شرح الخرشی علی مختصر سيدی خليل، بيروت، دار صادر (۹۲/۷)

وقف کی تکمیل میں قبضہ کا اثر

وقف کی تکمیل کے لئے کیا وقف کردہ چیز پر متولی کا قبضہ ضروری ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرامؒ کی دو رائے ہیں:

پہلی رائے

پہلی رائے بعض فقہاء کرامؒ کی یہ ہے کہ وقف کی تکمیل کے لئے وقف کردہ چیز پر متولی یا موقوف علیہم کا قبضہ ضروری ہے، اگر وقف پر قبضہ نہ کیا جائے تو وقف مکمل نہیں ہوگا اور اس پر وقف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ یہ رائے حضراتِ مالکیہ اور احناف میں سے امام محمدؒ کی ہے۔ مالکی فقیہ علامہ خرشیؒ لکھتے ہیں:

والمعنى أن الوقف إذا كان على كبير ولم يحزه قبل موت الواقف أو قبل فلسه أو قبل مرضه الذى مات فيه فان الحبس يبطل ...... أو لم يحزه ولى صغير قبل موت الواقف ونحوه فان الحبس يبطل لعدم الحوز فالحوز شرط فى دوام الصحة.[1]

مطلب یہ ہے کہ وقف اگر کسی بالغ پر ہو اور وہ واقف کی موت یا اس کی تفلیس یا اس کے مرض الوفات سے پہلے اس پر قبضہ نہ کرسکے تو یہ وقف باطل ہو جاتا ہے اسی طرح اگر نابالغ پر وقف ہو اور اس کی طرف سے اس کا ولی واقف کے مرنے سے پہلے اس وقف پر قبضہ نہ کرے تو یہ وقف بھی باطل ہوگا قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے۔ قبضہ وقف کی صحت کے دوام کے لئے شرط ہے۔

البتہ اگر موقوف علیہم متعین ہوں تو حسی قبضہ ضروری ہے اور اگر موقوف علیہم متعین نہ ہوں جیسے مسجد،

---

(۱) الخرشی، محمد بن عبد الله بن على الخرشى المالكى. شرح الخرشى على مختصر سيدى خليل، بيروت، دار صادر (۸۴/۷)

مسافر خانہ، کنواں وغیرہ وقف کیا تو ان پر موقوف علیہم متعین نہ ہونے کی وجہ سے حسی قبضہ تو ممکن نہیں اس لئے ان صورتوں میں فقہاء مالکیہ نے تخلیہ کو کافی قرار دیا ہے کہ واقف ان چیزوں سے اپنا تعلق ختم کر دے اور لوگوں کو استعمال کی اجازت دیدے تو یہ تخلیہ قبضہ کے قائم مقام ہو جائے گا۔[۱]

امام محمدؒ کے مسلک کے بارے میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

وعند محمدؒ لابد من التسليم إلى المتولى.[۲]

امام محمدؒ کے نزدیک متولی کے حوالہ کرنا ضروری ہے۔

علامہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

عند أبى يوسفؒ...... ان الوقف يتم بفعل الواقف من غير تسليم إلى المتولى وعند محمدؒ لايصير مسجدا مالم يصل الناس فيه بالجماعة بنى على مذهبه أن الوقف لايتم إلا بالتسليم إلى المتولى ...... وروى عن معاذ بن جبلؓ و ابن عباسؓ وشريح والحسن والشعبى رضى الله عنهم قالوا لا تجوز الصدقة حتى يقبض وبه نأخذ.[۳]

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف واقف کے فعل ہی سے مکمل ہو جاتا ہے متولی کے حوالہ کئے بغیر۔ امام محمدؒ کے نزدیک جب تک بنائی گئی مسجد میں لوگ جماعت سے نماز نہ پڑھ لیں اس وقت تک وہ مسجد نہیں بنتی۔ ان کا مسلک اس اصول پر مبنی ہے کہ متولی کے حوالہ کئے بغیر وقف درست نہیں ہوگا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابن عباسؓ اور امام شریح و حسن و شعبی رحمہم اللہ کے نزدیک بغیر قبضہ کے صدقہ درست نہیں ہوگا یہی ہمارا بھی مؤقف ہے۔

---

(۱) الخرشی، محمد بن عبد الله بن على الخرشى المالكى. شرح الخرشى على مختصر سيدى خليل، بيروت، دار صادر (۸۴/۷)

(۲) المرغینانی، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۴/۵)

(۳) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابى سهل السرخسى. المبسوط للسرخسى، بيروت، دار المعرفه ۱۹۹۳م (۳۴/۱۲)

پہلی رائے کی دلیل

جوحضرات اس رائے کے قائل ہیں ان کی ایک دلیل تو حضرت عمر رضی للہ عنہ کا عمل ہے کہ آپ نے اپناوقف اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد فرمایا۔[۱]

جب کہ دوسری دلیل یہ ہے کہ وقف اللہ تعالیٰ کواس چیز کا مالک بنانے کا نام ہے اب ظاہر ہے کہ حسی طور پرتو اللہ تعالیٰ کو مالک نہیں بنایا جاسکتا اس لئے علامتی طور پر اللہ کے بندوں میں سے کسی کے حوالہ اسے کیا جانا چاہئے تاکہ وقف کرنے سے پہلے اور وقف کرنے کے بعد کچھ تو فرق نظر آئے۔[۲]

دوسری رائے

دوسری رائے حضراتِ شوافعؒ، حنابلہؒ اوراحناف میں سے امام ابو یوسفؒ کی ہے کہ وقف کی تکمیل کے لئے اس پر متولی یا موقوف علیہم کا قبضہ ضروری نہیں ہے، محض واقف کے الفاظِ وقف ادا کرنے یا تحریرِ وقف لکھ دینے سے وقف مکمل ہوجاتا ہے۔

شافعی فقیہ شربینی خطیبؒ لکھتے ہیں:

ولا يشترط على القول بالقبول القبض على المذهب.[۳]

جوحضرات وقف کی صحت کے لئے قبول کوشرط قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی وقف کی تکمیل کے لئے قبضہ شرط نہیں۔

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ تحریر کرتے ہیں:

ويلزم الوقف بمجرد اللفظ لأن الوقف يحصل به ...... لأنه تبرع يمنع البيع والهبة والميراث فلزم بمجرده كالعتق و يفارق الهبة فانها

---

(۱) السرخسي، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسي. المبسوط للسرخسي، بيروت، دار المعرفه ۱۹۹۳م (۳۴/۱۲)

(۲) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۴/۵)

(۳) الشربيني، الشيخ محمد الشربيني، مغنى المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربي (۳۸۳/۲)

تـمـليـک مطلق و الوقف تحبيس الأصل وتسبيل المنفعة فهو بالعتق أشبه فالحاقه به أولىٰ.[۱]

وقف محض لفظ سے مکمل ہو جاتا ہے اس کے ذریعہ وقف حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وقف ایسا تبرع ہے جو بیع، ہبہ اور میراث سے مانع ہے لہٰذا یہ محض الفاظ سے مکمل ہو جائے گا جیسا کہ عتق اور یہ ہبہ سے مختلف ہے کیونکہ ہبہ تو مطلقاً عین اور منفعت دونوں کے مالک بنانے کا نام ہے اور وقف میں اصل اور عین کو تو اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں روک لیا جاتا ہے صرف منفعت دی جاتی ہے، اس لئے یہ عتق کے زیادہ مشابہ ہے اور اسے عتق کے ساتھ ملحق کرنا چاہیئے۔

امام ابو یوسفؒ کے مؤقف کے بارے میں علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

أما الـصـدقـه الـمـوقـوفة عـلـى قول أبي يوسفؒ تلزم بالاعلام و ان لم يخرجها من يده الى المتولى.[۲]

امام ابو یوسفؒ کے قول پر وقف محض اعلان کر دینے سے لازم ہو جاتا ہے اگرچہ اسے واقف نے اپنے قبضہ سے نکال کر متولی کے قبضہ میں نہ دیا ہو۔

دوسری رائے کی دلیل:

یہ حضرات اپنی دلیل میں ایک تو حضراتِ صحابہ کرام اضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوقاف سے استدلال کرتے ہیں کہ بہت سے حضرات صحابہ کرامؓ اپنے اوقاف کی خود ہی نگرانی فرمایا کرتے تھے انہوں نے ان پر کسی کو متولی مقرر نہیں کیا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں خود ہی اپنے وقف کی نگرانی کیا کرتے تھے تو ان تمام اوقاف میں متولی یا موقوف علیہم کی طرف سے قبضہ نہیں پایا گیا، معلوم ہوا کہ صحتِ وقف کے لئے وقف کردہ چیز پر متولی یا موقوف علیہم کا قبضہ کرنا ضروری نہیں۔[۳]

دوسری دلیل صاحب ہدایہؒ نے یہ بیان کی ہے کہ وقف اسقاطِ ملک کا نام ہے اور اسقاط کے لئے

---

(۱) ابـن قـدامـه، مـوفق الدين ابو محمد عبدالله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ـ ۶۲۰. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۸۷/۸)

(۲) السـرخسـی، شـمـس الائـمـه مـحـمـد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بيروت، دار المعرفه ۱۹۹۳م (۳۵/۱۲)

(۳) الكبيسی، محمد عبيد الكبيسی. احكام الوقف فی الشريعة الاسلامية، بغداد (۱۹۴/۱)

کسی کو مالک بنانا ضروری نہیں جیسے غلام آزاد کرنا اس میں بھی ازالۂ ملکیت ہے تبھی عتق کے لئے قبضہ کی کسی نے شرط نہیں لگائی۔(۱)

ترجیح:

راجح حضرت امام ابو یوسف اور حضراتِ شوافع وحنابلہ رحمہم اللہ کا مسلک ہی معلوم ہوتا ہے کہ وقف کی تکمیل کے لئے قبضہ شرط نہیں ہونا چاہئے۔ متأخرین احناف رحمہم اللہ نے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ کی صراحت کی ہے۔ علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

كان قول أبي يوسف أوجه عند المحققين وفي المنية الفتوىٰ على قول أبي يوسف و هذا قول مشايخ بلخ.(۲)

امام ابو یوسفؒ کا قول محققین کے نزدیک اُوجہ ہے۔ منیہ میں ہے کہ فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے اور یہی مشائخ بلخ کا قول ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وقف کی مشابہت صدقہ اور ہبہ کے بجائے عتق سے زیادہ ہے کیونکہ وقف میں وقف کردہ چیز کے عین کا کسی کو مالک نہیں بنایا جاتا تبھی موقوف علیہم کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ موقوفہ چیز کو بیچ سکیں اسی طرح ان کی میراث جاری نہیں ہوتی۔ جبکہ صدقہ اور ہبہ میں مستحق یا موہوب لہ کو اس چیز کے عین اور اس کی ذات کا مالک بنایا جاتا ہے اور وہ جو جائز تصرف اس میں کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، اس لئے وقف کو صدقہ یا ہبہ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے بلکہ عتق پر قیاس کرنا چاہئے کہ اس میں بھی صرف ازالۂ ملک اور اسقاطِ ملک پایا جاتا ہے تملیک نہیں پائی جاتی جس کے لئے قبضہ ضروری ہو۔

فریقِ اوّل کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے استدلال بھی مخدوش ہے کہ انہیں نے حضرت حفصہؓ کو اپنے وقف کا متولی بنایا تھا۔ کیونکہ پوری زندگی تو آپ خود ہی اس کی تولیت سنبھالتے رہے۔ حضرت حفصہؓ کی حیثیت تو صرف نگران اور مشرف کی تھی تولیت تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد سنبھالی۔ علامی سرخسیؒ لکھتے ہیں:

واستدل محمدؒ في الكتاب بحديث عمر رضي الله عنه فانه جعل وقفه

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۲۴)

(۲) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ه. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۲۴)

فی ید ابنته حفصة رضی اللّٰہ عنہا وإنما فعل ذٰلک لیتم الوقف ولکن أبو یوسفؒ یقول فعل ذٰلک لکثرة اشتغاله وخاف التقصیر منه فی أوانه أو لیکون فی یدها بعد موته. فأما أن یکون فعله لاتمام الوقف فلا.(۱)

امام محمدؒ نے کتاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے اپنا وقف اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کر دیا تھا اور یہ اس لئے کیا تھا کہ وقف مکمل ہو جائے۔ لیکن امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ نے یہ اپنی مشغولیت میں اضافہ کی وجہ سے کیا تھا انہیں خوف تھا کہ وہ اس وقف کے حق کی ادائیگی میں کہیں کوئی کوتاہی نہ کر جائیں یا حضرت حفصہؓ کے حوالہ اپنے انتقال کے بعد کرنے کی ہدایت کی تھی، یہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ وقف کو مکمل کیا جائے۔

امام خصافؒ نے عامر بن ربیعہ کی روایت نقل کی ہے جس میں واضح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں:

فاذا توفی فھو إلی حفصة بنت عمر.(۲)

معلوم ہوا کہ حضرت حفصہؓ کو تولیت وفات کے بعد دینے کی ہدایت کی تھی۔

اور جہاں تک اس استدلال کا تعلق ہے کہ واقف نے جب اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں وقف دیدیا تو علامتی طور پر کسی کے سپرد کرنا چاہئے۔ یہ کوئی ضروری نہیں، وقف اسی کے پاس ہی اگر رہے اور وہ کسی کو متولی بنا کر اس کے سپرد نہ کرے تب بھی اس کی حیثیت میں فرق آ گیا، پہلے مالک ہونے کی حیثیت سے اس کا اس چیز پر قبضہ تھا اور وہ اس میں تمام تصرفات کر سکتا تھا اور اب وقف کرنے کے بعد محض اس وقف کے متولی ہونے کی حیثیت سے اس پر اس کا قبضہ ہے اور اس کے تصرفات کا دائرہ بھی تبدیل ہو گیا، احکامات بدل گئے، احکامات کا بدلنا بھی دلالت کر رہا ہے کہ وقف کرنے کے بعد واقف کا موقوفہ چیز پر قبضہ پہلے جیسے قبضہ کی طرح نہ رہا۔ دیکھئے اگر باپ اپنے نابالغ بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کرتا ہے یعنی بطورِ ہدیہ دیتا ہے تو اس بچے کے ہاتھ میں دینا ضروری نہیں، ولی ہونے کی حیثیت سے باپ کا قبضہ ہی کافی ہے، تو کیا یہ ہبہ درست نہیں ہوگا؟ معلوم ہوا کہ قبضہ کی حیثیت بدلنا بھی کافی ہے۔

---

(۱) السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دار المعرفه ۱۹۹۳م (۳۶/۱۲)

(۲) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م (۱۰)

بابِ چہارم

وقف کی آمدنی

چوتھا باب

وقف کی آمدنی

وقف کی آمدنی پر بحث کی ضرورت:

واقف کا مقصود وقف سے یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے، اس سے موقوف علیہ اور مستحقین دائمی طور پر فائدہ اٹھاتے رہیں اور یہ اس کے لئے صدقہ جاریہ رہے جس کا ثواب اسے ہمیشہ ملتا رہے، اس لئے وقف کی آمدنی ہونا اور اس کا انتظام کرنا ضروری ہے، اگر واقف نے وقف کرتے وقت یہ صراحت کردی تھی کہ اس وقف کی آمدنی فلاں فلاں مستحقین کو دی جائے تب تو آمدنی ہونے اور اس کے انتظام کرنے کی اہمیت واضح ہے کہ اس کے بغیر واقف کا مقصد ہی حاصل نہیں ہوگا اور موقوف علیہ اس وقف سے فائدہ حاصل نہیں کرسکیں گے۔

اور اگر واقف نے موقوفہ چیز یا جائیداد کے عین سے اور ذات سے موقوف علیہم کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دی جیسے گھر وقف کیا اور موقوف علیہ کو اس میں رہنے کی اجازت دی تو اس صورت میں بھی وقف کے لئے آمدنی ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی بھی چیز مرمت اور مناسب دیکھ بھال کے بغیر زیادہ عرصہ قابل استعمال نہیں رہ سکتی، اس کی مرمت اولاً تو خود موقوف علیہم پر ہی ہے لیکن اگر ان میں استطاعت نہ ہو تو وقف کی آمدنی سے مرمت کرانا ضروری ہے، چنانچہ اس صورت میں بھی وقف کی آمدنی کا انتظام ضروری ہے۔

فقہاء کرامؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت یہ صراحت نہیں کی تھی کہ موقوف علیہم اس وقف کے عین سے فائدہ اٹھائیں گے یا اس کی آمدنی سے تو اسے اس پر ہی محمول کیا جائے گا کہ وہ موقوف علیہم کو وقف کی آمدنی ہی سے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

یفھم من کلام الفتح المذکور ان الواقف اذا اطلق ولم یقید بکونھا للسکنی اوللاستغلال انھا تکون للاستغلال وفی الفتاویٰ الخیریۃ المصرح بھا فی کتبنا ان الواقف اذا اطلق الوقف فھو علی الاستغلال لاالکسنیٰ. (۱)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۷۵)

فتح القدیر کے کلام مذکور سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر واقف نے وقف کو مطلق رکھا اور یہ صراحت نہیں کی یہ کہ وقف رہائش کے لئے ہے یا آمدنی حاصل کرنے کے لئے تو اسے آمدنی ہی کے لئے سمجھا جائے گا، فتاویٰ خیریہ میں ہے کہ ہماری کتابوں میں صراحت ہے کہ اگر واقف وقف کو مطلق رکھے تو وہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے ہی ہوگا۔

اس باب میں ہم اسی کا جائزہ لیں گے کہ وقف کی آمدنی کے لئے متولی وقف کیا کیا صورتیں اختیار کرسکتا ہے اور جو آمدنی حاصل ہوگی وہ وقف ہوگی یا نہیں، اس آمدنی میں کیا کیا تصرفات کئے جاسکتے ہیں، آغاز ہم ان صورتوں اور ذرائع سے کرتے ہیں جنہیں وقف کی آمدنی کیلئے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

وقف کی آمدنی کے لئے واقف کی شرط اور وقف کی بہتری ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

یہاں شروع ہی میں یہ وضاحت مناسب ہے کہ آگے ذکر کردہ ذرائع میں سے اگر کوئی ایک خاص ذریعہ واقف نے متعین کردیا ہو تو عام حالات میں اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا، متولی کو اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدنی اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ اگر واقف نے تعیین نہیں کی تو پھر متولی کو اختیار ہوگا کہ وہ حالات، موقع محل اور وقف کی بہتری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں سے کوئی بھی صورت اختیار کرلے۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

لوشرط الواقف ان لایؤجر المتولی الوقف ولاشیئا منه او أن لایدفعه مزارعة اولا یعامل علی مافیه من الاشجار ...... کان شرطه معتبر اولا یجوز مخالفته ...... ولولم یذکر فی صک الوقف اجارته فرأی الناظر اجارته او دفعه مزارعة مصلحة قال الفقیه ابوجعفرؒ ماکان ادرعلی الوقف وانفع للفقراء جازله فعله۔ (۱)

اگر واقف نے شرط لگائی کہ متولی وقف کو اجارہ پر نہیں دے گا یا مزارعت پر نہیں دے گا یا اس کے درختوں میں مساقاۃ نہیں کرے گا تو اس کی شرط معتبر ہوگی اس کی مخالفت جائز نہیں ہوگی، اور اگر وقف کی دستاویز میں اجارہ کا ذکر نہیں کیا تو امام فقیہ ابوجعفرؒ نے فرمایا کہ اجارہ یا مزارعت میں سے جو بھی وقف کے لئے زیادہ آمدنی کا باعث اور فقراء کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو متولی وقف اسے اختیار کرلے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۶۳)

چنانچہ اگر موقوفہ زمین پر گھر بنا کر دینا زراعت کے مقابلہ میں زیادہ آمدنی کا باعث ہوگا تو متولی موقوفہ زمین میں زراعت کرنے کے بجائے اس پر گھر بنا کر کرایہ پر دے گا تاکہ وقف کو زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ تاتارخانیہ میں ہے:

> واذا اراد ان يبني فيها بيوتا ليستغلها بالاجارة فهذه المسئلة في الاصل على وجهين: ان كانت ارض الوقف متصلة ببيوت المصر يرغب في استئجار بيوتها وتكون غلة ذلك فوق غلة الارض والنخيل كان له ذلك وان كانت أرض الوقف بعيدة عن المصر ولا يرغب في استئجار بيوتها بأجرة تربو منفعتها على منفعة الزراعة فليس له ذلك.(١)

> اگر متولی موقوفہ زمین میں گھر بنا کر انہیں کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرنا چاہے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ موقوفہ زمین شہر کے گھروں سے ملی ہوئی ہو لوگ اسے کرایہ پر لینے میں رغبت رکھتے ہوں اور اس کی آمدنی زرعی پیداوار اور باغ کی آمدنی سے زیادہ ہو تو متولی اس پر گھر بنا کر کرایہ پر دے سکتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ یہ موقوفہ زمین شہر سے دور ہو اور لوگ اس پر بنائے ہوئے گھر کو اتنے کرایہ پر لینے میں رغبت نہ رکھتے ہوں کہ وہ کرایہ زرعی پیداوار کی آمدنی سے زیادہ ہو تو اس صورت میں اس پر کرایہ پر دینے کے لئے گھر تعمیر نہیں کئے جاسکتے۔

یہ تو اجارہ اور مزارعہ کی بات تھی کہ کس کو اختیار کیا جائے گا، اجارہ میں بھی متولی اسے ملحوظ رکھے گا کہ کس قسم کے اجارہ میں وقف کو زیادہ فائدہ ہے، دیکھئے اگر ایک موقوفہ زمین کمرشل جگہ پر ہے اور اس کے آس پاس صرف دوکانیں ہیں یا فیکٹریاں ہیں، ایسی جگہ پر اس موقوفہ زمین کی آمدنی کے لئے اس پر گھر تعمیر کرنا مناسب نہیں ہوگا، بلکہ دوکان یا فیکٹری وغیرہ تعمیر کر کے کرایہ پر دینی چاہئے تاکہ کمرشل جگہ ہونے کی وجہ سے کرایہ زیادہ حاصل ہوسکے۔

اور اگر رہائشی علاوہ میں موقوفہ زمین ہے تو وہاں اس پر فیکٹری قائم کرنا زیادہ مفید نہیں ہوگا، اس پر اگر گھر بنائے جائیں تو لوگ اسے اجارہ پر لینے میں زیادہ دلچسپی لیں گے اور موقوفہ زمین پر گھر بنانے میں بھی اس کے آس پاس کے مکانات اور محلِ وقوع کا جائزہ بھی متولی کو لینا چاہئے تاکہ اس پر تعمیر اس طرح ہو کہ لوگ زیادہ رغبت سے اور بہتر کرایہ دے کر وہ گھر حاصل کریں، وقف کو اور فقراء کو زیادہ فائدہ پہنچے۔

---

(١) الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوى التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ١٤١١ھ (٥/٧٤٦)

اجارہ وقف

وقف کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ اجارہ ہے کہ اگر موقوفہ چیز ایسی ہے جسے شرعاً اجارہ پر دیا جاسکتا ہے اور اس کے عین کو باقی رکھتے ہوئے اس کے بامقصد منافع سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو متولی کیلئے اسے کرایہ پر دینا جائز ہے۔

اجارہ کرتے وقت اجارہ کے اصول وضوابط جو فقہاء کرامؒ نے لکھے ہیں ان کی پابندی تو ضروری ہے، ان کے علاوہ متولی کو مزید چند چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

(۱) اجارہ طویل عرصہ کیلئے نہ کیا جائے:

موقوفہ زمین یا مکان اجرت پر دیتے وقت متولی وقف کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اجارہ طویل عرصہ کے لئے نہ کیا جائے، کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ اگر لوگ طویل عرصہ تک یہ موقوفہ مکان یا زمین اسی کرایہ دار کے پاس دیکھتے رہیں تو رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگیں گے کہ یہ اسی کی ملکیت ہے، اس میں وقف پر قبضہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

لان المدة اذا طالت تؤدى الى ابطال الوقف فان من رأه يتصرف فيها تصرف الملاک علی طول الزمان يظنه مالكاً. (۱)

کیونکہ اگر اجارہ کی مدت طویل ہوگی تو اس سے وقف کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ جو بھی دیکھے گا کہ کرایہ دار طویل عرصہ سے اس میں مالک کے طرح تصرفات کر رہا ہے تو وہ اسے مالک ہی سمجھے گا۔

نیز اگر اجارہ طویلہ کرلیا جائے گا تو ایک طویل عرصہ کے لئے کرایہ متعین ہو جائے گا، اس میں وقف کا نقصان ہے کہ مارکیٹ میں کرایہ بڑھنے کی صورت میں بھی یہاں اضافہ نہیں کیا جاسکے گا۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۶۳)

کیا وقف کے اجارہ کی کوئی مدت متعین ہے؟

فقہاء متقدمین نے تو اجارہ کی کوئی توقیت بیان نہیں کی لیکن حضرات متاخرین نے وقف کی حفاظت کے لئے اجارہ کی مختلف مدتیں بیان کی ہیں، علامہ شامیؒ نے قنالی زادہ کے حوالہ سے آٹھ اقوال نقل کئے ہیں، لیکن راجح یہ ہے کہ موقوفہ مکان ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا، اور موقوفہ زرعی زمین تین سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دی جاسکتی۔ الدرالمختار میں ہے:

وبها اى بالسنة يفتى فى الدار وبثلاث سنين فى الارض. وفى الشامية: اعلم ان المسألة فيها ثمانية اقوال ذكرها العلامه قنالى زاده فى رسالته احدها قول المتقدمين عدم تقدير الاجارة بمدة ورجحه فى انفع الوسائل والمفتى به ماذكره المصنف خوفامن ضياع الوقف كما علمت. (۱)

گھروں میں ایک سال پرفتویٰ دیا جاتا ہے اور زمین میں تین سال پر۔ شامی میں ہے: اس مسئلہ میں آٹھ اقوال ہیں جنہیں علامہ قنالی زادہ نے اپنے رسالہ میں نقل کیا ہے، ایک تو متقدمین کا قول ہے کہ وقف کے اجارہ کی کوئی مدت متعین نہیں ہے، انفع الوسائل میں اس کو ترجیح دی گئی ہے، وقف کے ضائع ہونے کے اندیشہ کے پیش نظر مفتی بہ وہی ہے جسے مصنف نے الدرالمختار میں ذکر کیا ہے۔

یہ مدت چونکہ مخصوص نہیں ہے بلکہ فقہاء کرامؒ نے اپنے زمانہ کے اعتبار سے اس کی احتیاطاً تعیین کی ہے اس لئے زمانہ اور مکان کے بدلنے سے اس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

علامہ حصکفیؒ یہ مدت لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

وهٰذا ممايختلف زمانا و موضعاً. (۲)

یہ مدت زمانہ اور جگہ کے اعتبار سے تبدیل ہوسکتی ہے۔

ہمارے یہاں مکانات میں عام طور پر گیارہ مہینے سے زیادہ کا ایگریمنٹ نہیں کیا جاتا اس لئے

---

(۱) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۰۰)

(۲) حواله بالا (۴/۴۰۱)

موقوفہ مکان اگر کرایہ پر دیا جائے تو گیارہ مہینے سے زیادہ کا ایگریمنٹ نہ کیا جائے، گیارہ مہینے پورے ہونے کے بعد متولی کرایہ دار کا سابقہ ریکارڈ دیکھے اگر وہ قابل اطمینان ہوتو موجودہ وقت کے کرایہ کے مطابق کرایہ میں اضافہ کر کے اس سے اگلے گیارہ مہینے کے اجارہ کا ایگریمنٹ کر لے اور اگر قابل اطمینان صورتحال نہ ہو تو کسی اور کو کرایہ پر دیدے۔

البتہ کمرشل جگہوں میں عام طور پر پانچ سے دس سال تک کے لئے اجارہ کا معاہدہ کیا جاتا ہے، چھ مہینے یا ایک سال کا کرایہ ایڈوانس بھی دیا جاتا ہے، نیز کرایہ میں ہر سال اضافہ کے لئے کوئی معیار بھی طے کرلیا جاتا ہے، اگر وقف کمرشل محلِ وقوع پر موجود ہے تو متولی کیلئے اس جگہ کے عرف کے مطابق زیادہ عرصہ کیلئے بھی کرایہ پر دینے کی گنجائش ہوگی کیونکہ وقف کی مصلحت بظاہر اسی میں ہے، قلیل عرصہ کے لئے مناسب کرایہ پر کوئی شخص یہ جگہ کرایہ پر نہیں لے گا، کیونکہ وہ یہاں کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ ایک سال تو اسے صرف تعارف اور بنیادی ڈھانچہ کھڑا کرنے ہی میں لگے گا، اس سے اگر ایک سال بعد دوکان یا دفتر لے لیا جائے تو اسے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا، وقف کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کرام نے طویل عرصہ کے اجارہ کی بھی اجازت دی ہے۔ الاسعاف میں ہے:

> **دار لرجل فيها موضع وقف بمقدار بيت واحد وليس فى يد المتولى شيىء من غلة الوقف واراد صاحب الدار استئجاره مدة طويلة قالوا ان كان لذلك الموضع مسلك الى الطريق الاعظم لايجوز له ان يؤجره مدة طويلة لان فيه ابطال الوقف وان لم يكن مسلك اليه جازت اجارته مدة طويلة.** [1]

ایک شخص کے گھر میں ایک کمرہ کے بقدر جگہ وقف ہے، متولی کے پاس وقف کی کوئی آمدنی بھی نہیں ہے، گھر والا اپنا گھر طویل مدت کیلئے اجارہ پر دینا چاہتا ہے تو کیا اس موقوفہ جگہ کو بھی طویل مدت کے لئے اجارہ پر دیا جاسکتا ہے؟ علماء نے فرمایا کہ اگر موقوفہ جگہ کا شارع عام یا بڑی گلی کی طرف کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے طویل مدت کے لئے اجارہ پر نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس میں وقف کے ابطال کا اندیشہ ہے، اور اگر اس جگہ کا شارع عام کی طرف کوئی راستہ نہ نکلتا ہو تو اس صورت میں اسے طویل مدت کے لئے اجارہ پر دیا جاسکتا ہے (کیونکہ

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ(٦٧)

اس کے بغیر اسے کوئی اجارہ پر لے گا نہیں، اس کا الگ راستہ نہیں ہے اور یہ گھر کے تابع ہے)

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

اذا احيتج الى عمارته من اجرته يؤجره الحاكم مدة طويلة بقدر مايعمر به. [1]

اگر وقف کے کرایہ سے اس کی تعمیر کی ضرورت پیش آئے تو حاکم اسے طویل مدت کے لئے کرایہ پر دے سکتا ہے جس سے اتنی آمدنی حاصل ہو جائے کہ وقف کی تعمیر کی جا سکے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وقف کو اتنے طویل عرصہ کے لئے اجارہ پر نہ دیا جائے کہ اس پر قبضہ کا خطرہ پیدا ہو جائے یا مارکیٹ میں کرایہ کے اضافہ کے صورت میں وقف اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے، اس عرصہ کی تحدید جیسا کہ ابھی تحریر کیا ہے کہ فقہاء کرام نے گھروں میں ایک سال اور زرعی زمینوں میں تین سال سے کی ہے، لیکن موضعِ وقف کے عرف اور وقف کی مصلحت کو دیکھتے ہوئے اس میں کمی بیشی بھی کی جا سکتی ہے۔

(۲) اجارہ کے سلسلہ میں واقف کی جائز شرائط کا لحاظ رکھا جائے:

اگر واقف نے اجارہ کے حوالہ سے کچھ شرائط عائد کی ہوں تو ان کی پابندی کرنا متولی کی ذمہ داری ہے، مثلاً واقف نے دوکان وقف کی کہ اس کی آمدنی فقراء میں تقسیم کی جائے اور یہ شرط لگا دی کہ دوکان کسی لوہار کو کرایہ پر نہیں دی جائے گی، اس شرط کی پابندی ضروری ہے متولی اسے لوہار کو کرایہ پر نہیں دے سکتا، اسی طرح اجارہ کی مدت کی واقف نے خود تحدید کر دی کہ ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دی جائے گی تو اس کی اتباع بھی ضروری ہے، کیونکہ واقف کی جائز شرائط بمنزلہ نص شارع ہیں۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

لو شرط الواقف ان لا يؤجر المتولي الوقف ولا شيئا منه ...... أو شرط ان لايؤجره الا ثلاث سنين ثم لايعقد عليه الا بعد انقضاء العقد الاول كان شرطه معتبر او لا يجوز مخالفته. [2]

اگر واقف نے وقف کرتے وقت شرط لگائی کہ متولی وقف کو اجارہ پر نہیں دے گا یا تین سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دے گا اور عقد اول ختم ہوئے بغیر دوسرا عقد نہیں کرے گا تو اس کی یہ شرائط معتبر ہوں گی ان کی خلاف ورزی جائز نہیں ہوگی۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۰۱)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۶۳)

شافعی فقیہ علامہ شربینی خطیبؒ تحریر فرماتے ہیں:

اذا شرط الواقف ان لایؤجر وقفه الا سنة ونحوها فانه یتبع شرطه علی الأصح. (۱)

اگر واقف نے شرط لگائی کہ اس کے وقف کو ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دیا جائے گا تو اصح قول کے مطابق اس شرط کی پابندی کی جائے گی۔

شیخ کبیسیؒ نے مطالب اولی النہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

ویجب العمل بالشرط فی عدم ایجاره ای الوقف او فی قدر مدته. أی الایجار فان شرط أن لایؤجر اکثر من سنة لم تجز الزیادة علیها. (۲)

واقف نے اگر وقف کو اجارہ پر نہ دینے کی شرط لگائی یا اس کی مدت کی تحدید کی تو اس پر عمل کرنا واجب ہے، لہٰذا اگر یہ شرط لگائی کہ ایک سال سے زیادہ کے لئے وقف کو کرایہ پر نہیں دیا جائے گا تو اس سے زیادہ مدت کے لئے کرایہ پر دینا جائز نہیں ہوگا۔

متولی اجارہ کے معاملہ میں واقف کی شرط کی خلاف ورزی کب کرسکتا ہے؟

البتہ اگر وقف کی مصلحت واقف کی عائد کردہ شرط کی خلاف ورزی میں ہو تو ایسی صورت میں متولی وقف حاکم یا قاضی کی اجازت سے اس کی خلاف ورزی بھی کرسکتا ہے، مثال کے طور پر واقف نے شرط عائد کی کہ ایک سال سے زیادہ کے لئے وقف کو کرایہ پر نہ دیا جائے، جبکہ اس جگہ صورتحال یہ ہے کہ ایک سال کے لئے کوئی اسے مناسب کرایہ پر نہیں لے رہا تو متولی کے لئے حاکم یا قاضی کی اجازت سے وقف کو ایک سال سے زیادہ کیلئے کرایہ پر دینا جائز ہے۔ (۳)

اسی طرح اگر وقف کو تعمیر کے لئے جتنی آمدنی کی ضرورت ہے وہ ایک سال کے اجارہ سے حاصل نہ ہوسکے تو بھی خلاف ورزی کی گنجائش ہوگی۔

اسنی المطالب میں ہے:

---

(۱) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۲/۳۴۹)

(۲) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۲/۹۵)

(۳) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۸۷)

افتی ابن الصلاح بأنه اذا شرط ان لایؤجر اکثر من سنة ولا یورد عقد علی عقد فخرب ولم تمکن عمارته الا باجارة سنین یصح ایجاره سنین بعقود متفرقة، لأن المنع یفضی الی تعطیله وهو مخالف لمصلحة الوقف.(۱)

واقف نے شرط لگائی کہ ایک سال سے زیادہ کے لئے وقف کو کرایہ پر نہیں دیا جائے گا اور یکے بعد دگرے عقود نہیں کئے جائیں گے لیکن وقف کی عمارت خراب ہوگئی اور وقف ویران ہوگیا، طویل عرصہ کے لئے اجارہ پر دئے بغیر اس کی تعمیر ممکن نہیں ہے، تو ایسی صورت میں ابن الصلاح نے فتویٰ دیا کہ وقف کو کئی سال کے لئے متفرق عقود کے ساتھ اجارہ پر دیا جاسکتا ہے، کیونکہ واقف کی طرف سے طویل عرصہ کے لئے اجارہ پر دینے کی ممانعت وقف کو معطل کردے گی جو کہ وقف کی مصلحت کے خلاف ہے۔

(۳) اجرتِ مثل سے کم پر اجارہ نہ کیا جائے:

وقف کو اجارہ پر دیتے ہوئے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس کا کرایہ مارکیٹ میں اس جیسے مکان، دوکان یا زمین کے کرایہ سے کم نہ ہو۔ الدرالمختار میں ہے:

ویؤجر بأجر المثل فلایجوز بالأقل ولو هو المستحق الا بنقصان یسیر.(۲)

وقف کو اجرتِ مثل پر اجارہ پر دیا جائے اس سے کم پر دینا جائز نہیں اگرچہ متولی خود ہی موقوف علیہ ہو، ہاں اجرتِ مثل سے اگر کرایہ معمولی کم ہو تو وہ قابلِ نظرانداز ہے۔

ہم آگے جاکر متولی کے ناجائز تصرفات کے ضمن میں ایسے جزئیات نقل کریں گے جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وقف کو عام کرایہ سے کم کرایہ پر دینا خیانت کے زمرہ میں آتا ہے اور اگر واقف بھی اس کا ارتکاب کرے تو قاضی اس سے وقف کا انتظام لے کر کسی دیانتدار شخص کے سپرد کردے گا۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر متولی عام کرایہ سے کم کرایہ پر اجارہ کرتا ہے تو کرایہ دار پر

---

(۱) بحواله: الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۲/۹۷)

(۲) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۰۳)

بہرصورت اجرتِ مثل یعنی مارکیٹ میں رائج کرایہ ہی واجب ہوگا۔ فرماتے ہیں:

ثم اعلم ان المتولی اذ اجر بأقل من اجرة المثل بنقصان فاحش حتی فسدت لاضمان علیه و انما یلزم المستاجر اجرة المثل. [1]

اگر متولی اجرتِ مثل سے کم پر نقصانِ فاحش کے ساتھ اجارہ کرے تو اجارہ فاسد ہوگا، متولی پر اگرچہ ضمان نہیں آئے گا لیکن کرایہ دار کو اجرتِ مثل ہی ادا کرنی ہوگی۔

ہمارے یہاں اوقاف کے کرایہ میں غبنِ فاحش:

ان معروضات سے ہمارے یہاں رائج اوقاف کے کرایہ کا حکم بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ یہ غبنِ فاحش کی بدترین مثال ہے، عام مارکیٹ میں اگر ایک دوکان کا کرایہ پانچ ہزار روپے ہے تو اوقاف کی دوکان آپ کو پانچ سو میں مل جائے گی، یہی صورتحال مساجد کی مملوکہ دوکانوں اور مکانوں کی ہے، یہ طرزِ عمل نہ تو اوقاف اور مساجد کے متولیین کے لئے جائز ہے اور نہ ہی کرایہ پر لینے والوں کے لئے، انہیں قیامت میں ایک نہیں بے شمار لوگوں کو جواب دینا ہوگا۔

ہماری حکومت اور متعلقہ وزارت کی بھی شرعی طور پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بددیانتی کا نوٹس لیتے ہوئے اس میں مداخلت کریں اور اس بدترین خیانت کا سدباب کریں۔

اجارہ پر دینے کے بعد اگر کرایہ میں اضافہ ہو جائے:

البتہ اجارہ پر دیتے وقت اگر طے شدہ کرایہ مارکیٹ میں رائج کرایہ کے مطابق تھا بعد میں مارکیٹ کے کرایہ میں اضافہ ہوگیا تو کیا پہلا اجارہ ختم کر کے نئے کرایہ پر دوسرا عقد کیا جائے گا یا پہلا اجارہ جاری رہے گا؟ اس میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں:

فقہاء حنابلہ و مالکیہ کی آراء:

فقہاء مالکیہ وحنابلہ کے نزدیک تو پہلا اجارہ ہی جاری رہے گا اسے فسخ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اصل اعتبار عقد کے وقت کا ہے کہ عقد کرتے وقت متولی نے اجرتِ مثل، عام کرایہ پر عقد کیا تھا یا نہیں اگر عقد اجرتِ مثل پر کیا گیا تھا تو بعد میں کرایہ میں نمایاں اضافہ کے صورت میں اجارہ کا عقد فسخ نہیں کیا جائے گا۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۳۹/۵)

مالکی فقیہ علامہ خرشیؒ لکھتے ہیں:

الحبس اذا صدرت اجارته بأجرة المثل ثم جاء شخص یزید فیه فان الاجارة لا تنفسخ لتلک الزیادة ...... ویعتبر کون الکراء کراء المثل وقت عقد الاجارة. (۱)

وقف کو اجرتِ مثل پر ہی کرایہ پر دیا گیا بعد میں ایک شخص نے آ کر زیادہ کرایہ پر اجارہ پر لینے کی پیشکش کی تو یہ اجارہ فسخ نہیں ہوگا اس زیادتی کی وجہ سے، اجرتِ مثل کا اعتبار اجارہ کے وقت کا ہوگا کہ اجارہ کرتے وقت کرایہ اجرتِ مثل کے مطابق مقرر کرنا چاہئے۔

حنبلی فقیہ علامہ بہوتیؒ لکھتے ہیں:

ولا تنفسخ الاجارة حیث صحت لو طلب الوقف بزیادة عن الاجرة الاولیٰ وان لم یکن فیها ضرر، لانها عقد لازم من الطرفین وتقدم. (۲)

جب اجارہ منعقد ہوگیا تو طے شدہ کرایہ سے زیادہ کرایہ کی پیشکش سے وہ فسخ نہیں ہوگا، اگرچہ اس میں کوئی نقصان نہ ہو، کیونکہ اجارہ جانبین پر لازم ہوجاتا ہے تو دوسرے فریق کی رضامندی کے بغیر محض زیادہ اجرت کی پیشکش پر پہلا اجارہ فسخ نہیں ہوگا۔

شوافع کا موقف:

شوافع کے یہاں اس سلسلہ میں تین روایتیں ہیں ایک تو یہ کہ ایسی صورت میں پہلا اجارہ باقی رکھا جائے گا، دوسری روایت یہ ہے کہ پہلا اجارہ فسخ کردیا جائے گا، تیسری روایت یہ ہے کہ اگر ایک سال سے کم کے لئے اجارہ کیا ہو تو باقی رکھا جائے گا ورنہ فسخ کردیا جائے گا۔ علامہ نوویؒ نے پہلی روایت کو راجح قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

ولو اجر المتولی بحکم التولیة ثم حدث ذلک (ای زادت الاجرة فی المدة او ظهر طالب بالزیادة) فکذلک الحکم علی الأصح (بان

---

(۱) الخرشی، محمد بن عبد الله بن علی الخرشی المالکی. شرح الخرشی علی مختصر سیدی خلیل، بیروت، دار صادر (۹۸/۷)

(۲) البهوتی، منصور بن یونس بن ادریس البهوتی ۱۰۵۱ھ. کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۴ھ (۲۹۷/۴)

لا یتأثر العقد به) لان العقد جرى بالغبطة فى وقته فأشبه ما اذا باع الولى مال الطفل ثم ارتفعت القيمة بالأسواق أو ظهر طالب بالزيادة. والثانى ينفسخ العقد لانه بان وقوعه بخلاف الغبطة فى المستقبل. والثالث: ان كانت الاجارة سنة فمادونها لم يتأثر العقد وان كانت اكثر فالزيادة مردودة. (۱)

اگر متولی نے وقف اجارہ پر دیا پھر یہ صورتحال پیش آئی کہ اجارہ کی مدت کے اندر اس وقف کا کرایہ مارکیٹ میں بڑھ گیا یا کسی نے زیادہ کرایہ کی پیشکش کردی تو اصح قول کے مطابق اس سے سابقہ عقد متاثر نہیں ہوگا کیونکہ جس وقت یہ عقد کیا گیا تھا وقف کی بہتری کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا گیا تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسے بچے کے سرپرست نے بچے کا مال بیچا پھر مارکیٹ میں اس کی قیمت بڑھ گئی یا کسی نے زیادہ قیمت کی پیشکش کی تو ظاہر ہے اس سے سابقہ عقدِ بیع پر کوئی فرق نہیں پڑتا، دوسرا قول یہ ہے کہ ایسی صورتحال میں عقد فسخ ہوجائے گا کیونکہ مستقبل میں تو یہ ظاہر ہوگیا کہ وقف کی مصلحت کے مطابق یہ عقد نہیں ہوا تھا، تیسرا قول یہ ہے کہ اگر جارہ ایک سال یا اس سے کم کا ہے تو وہ اس کرایہ کے اضافہ سے متاثر نہیں ہوگا، اور اگر اس سے زیادہ عرصہ کے لئے تو وہ متاثر ہوگا۔

احناف کا موقف:

فقہاء احناف رحمہ اللہ کی بھی اس سلسلہ میں دو رائے ہیں:

صاحب اسعافؒ نے تو صراحۃً ذکر کیا ہے کہ اگر اجارہ کا عقد کئے جانے کے بعد مارکیٹ میں کرایہ میں نمایاں اضافہ ہوجائے تو پہلا عقد منسوخ نہیں کیا جائے گا، فرماتے ہیں:

ولو استأجر وقفا ثلاث سنين بأجرة معلومة هى اجر مثلها فلما دخلت السنة الثانية كثرت رغائب الناس فيها فزاد اجر الارض قالو اليس للمتولى نقض الاجارة بنقصان اجر المثل لانه انما يعتبر وقت العقد

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۵۲/۵) مزید دیکھئے: مغنى المحتاج (۳۹۵/۲)

وفی وقته كان المسمى اجر المثل فلايضر التغيير بعد ذلک.(۱)

اگر تین سال کے عرصہ کے لئے وقف کو اجارہ پر دیا اور اس کی جو اجرت طے کی گئی وہ اس وقت کے مطابق اجرتِ مثل تھی، دوسرے سال لوگوں کی رغبت اس وقف میں بڑھ گئی اور زمین کا کرایہ بڑھ گیا تو علماء نے فرمایا کہ اس صورتحال میں متولی پہلا اجارہ ختم نہیں کرے گا، کیونکہ اصل اعتبار عقد کے وقت کا ہے، عقد کرتے وقت طے شدہ کرایہ اجرتِ مثل کے مطابق تھا لہٰذا عقد صحیح ہوگیا، بعد میں اس میں تبدیلی آنا عقد کو متاثر نہیں کرے گا۔

علامہ ابن نجیمؒ، علامہ حصکفیؒ اور دیگر فقہاء حنفیہ کا موقف یہ ہے کہ اجارہ چونکہ شیأً فشیأً منعقد ہوتا ہے اس لئے ایسی صورت میں وقف کی مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے پہلا اجارہ فسخ کردیا جائے گا۔

البحر الرائق میں ہے:

وان كانت الاجارة الأولىٰ بأجرة المثل ثم از داد أجر مثله كان للمتولی أن يفسخ الاجارة ومالم يفسخ كان على المستأجر الأجر المسمىٰ وفی الحاوی: ویفتی بالضمان فی غصب عقار الوقف وغصب منافعه وكذا كل ماهوا نفع للوقف فيما اختلف العلماء فيه حتى نقضت الاجارة عند الزيادة الفاحشة نظراً للوقف وصيانة لحق الله تعالىٰ وابقاء اللخيرات.(۲)

اگر پہلا اجارہ اجرتِ مثل پر تھا پھر اس وقف کی اجرتِ مثل میں اضافہ ہوگیا تو متولی پہلا اجارہ فسخ کردے گا، اور جب تک فسخ نہیں کرتا کرایہ دار پر وہی طے شدہ کرایہ لازم ہوگا، حاوی میں ہے وقف کی زمین کے غصب اور وقف کے منافع کے غصب میں ضمان لازم ہونے کا فتویٰ دیا جاتا ہے، اسی طرح ہر اس معاملہ میں جس میں علماء کا اختلاف ہو ایسی بات پر فتویٰ دیا جائے گا جس میں وقف کا زیادہ فائدہ ہو، یہاں تک کہ وقف کے کرایہ میں اگر نمایاں اضافہ ہوجائے تو پہلا اجارہ ختم کردیا جائے گا وقف کی بھلائی ملحوظ رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے حق کی حفاظت کے پیش نظر اور وقف کے ذریعہ حاصل ہونے والے فوائد کو ہمیشہ

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۶۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۹/۵) مزید دیکھئے: الدر المختار (۴۰۳/۴)

باقی رکھنے کے لئے۔

ردالمحتار میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ فسخ کی روایت اس صورت میں ہے جبکہ اجرت میں اضافہ اضافہ فاحشہ ہو۔ محض معمولی سے اضافہ کی وجہ سے پہلا اجارہ فسخ نہیں کیا جائے گا۔ (اضافہ فاحشہ میں وہی تفصیل ہوگی جو غبن فاحش میں ہے) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اجرت میں اضافہ محض کسی ایک شخص کی طرف سے تعنتاً نہ ہو بلکہ مارکیٹ میں ہی اجرت میں عام ضافہ ہوگیا ہو۔ اور علامہ شامیؒ نے اسی دوسری روایت کو ترجیح دی ہے، بحث کو سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں:

والأولیٰ روایۃ شرح الطحاوی بناء علی أن الاجارۃ تنعقد شیأً فشیأً والوقف یجب له النظر.(۱)

ترجیح:

احقر کی رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ایسی صورتحال میں متولی وقف اور مستاجر کے درمیان ہونے والا اجارہ ایگریمنٹ بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اگر اجارہ ایگریمنٹ میں فریقین نے یہ اختیار رکھا ہوا ہے کہ مدتِ اجارہ کے دوران جب چاہے کوئی بھی فریق نوٹس دے کر اجارہ ختم کرسکتا ہے تو متولی کو بھی حق حاصل ہوگا کہ کرایہ میں نمایاں اضافہ ہونے کی صورت میں نوٹس دے کر اجارہ ختم کردے اور نئے کرایہ پر اسی کرایہ دار یا نئے کرایہ دار سے معاملہ کرلے۔

لیکن اگر اجارہ ایگریمنٹ میں اس سے سکوت کیا گیا ہے یا اس اختیار کی صراحۃً نفی کی گئی ہے جیسے عام طور پر ملٹی نیشنل کمپنی یا مالیاتی ادارے اجارہ پر کوئی جگہ لیتے وقت اجارہ ایگریمنٹ میں صراحۃً یہ شق ڈلواتے ہیں کہ اتنے عرصہ تک مالکِ زمین یا دوکان وغیرہ کو اجارہ فسخ کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں احقر کی رائے یہ ہے کہ مالکیہ، حنابلہ کے متفقہ مذہب اور شوافع واحناف کی اس ایک روایت کے مطابق فتویٰ دینا چاہئے کہ اجارہ فسخ نہیں کیا جائے گا، متعینہ مدت تک اجارہ ایگریمنٹ پورا کیا جائے گا، کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ وقف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی ''**أوفوا بالعقود**'' میں عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ بات لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ وقف کو اگر کرایہ پر لیا جائے گا تو کرایہ میں اضافہ ہونے کی صورت میں اجارہ فسخ کردیا جائے گا تو وقف کو اجارہ پر لینے سے ہچکچائیں گے، کیونکہ اس بے یقینی کی وجہ سے کرایہ دار کو شدید نقصان کا اندیشہ ہے، اور اس کا نتیجہ یہ بھی نکلے گا

---

(۱) رد المحتار ج۴ ص ۴۰۴

کہ اچھے ادارے اور مالی لحاظ سے مستحکم لوگ وقف کو کرایہ پر لینے سے اجتناب کریں گے اور وقف کو بہتر کرایہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

وقتی فائدہ کے بجائے طویل المیعاد فائدہ کو ترجیح دینی چاہیئے:

آج بھی منظّم، وسیع اور مستحکم اداروں میں یہ اصول ہے کہ وقتی فائدہ کو سامنے رکھنے کے بجائے طویل المیعاد فائدہ کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اگرچہ اس میں فائدہ نسبۃً کم ہی کیوں نہ ہو، اسی میں ادارے اپنا فائدہ سمجھتے ہیں، اور تجربہ سے بھی اس اصول کی تائید ہوتی ہے، وقف کے سلسلہ میں بھی ہمیں یہی اصول ملحوظ رکھنا چاہیئے اور یہی انشاءاللہ انفع للوقف ہوگا۔

اجارہ کرتے وقت کرایہ میں تبدیلی کے لئے معیار مقرر کر لینا مناسب ہے:

البتہ اجارہ کا عقد کرتے وقت ہی کرایہ میں کمی بیشی کے امکان کو مدنظر رکھ کر کرایہ میں اضافہ کے لئے کوئی اصول طے کر لیا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے اس میں فریقین نقصان سے بچ سکتے ہیں کہ مثلاً ہر سال کرایہ میں اتنے فیصد اضافہ ہوگا یا اسے کسی منضبط اور متبدل معیار سے وابستہ کر دیا جائے کہ اگر مارکیٹ میں کرایہ میں سالانہ اتنے فیصد اضافہ ہوگا تو وقف کے کرایہ میں اتنے فیصد اضافہ کر دیا جائے گا۔

بہرحال عقد کرتے وقت تو بہت کچھ تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں اور وقف کے لئے تو وہ خاص طور پر اختیار کرنی چاہئیں، لیکن عقد ہونے کے بعد ایگریمنٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے منسوخ کرنا وقف کے لئے کسی بھی طرح بہتر نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے جبکہ یہ خروج عن المذہب کے زمرہ میں بھی نہیں آتا۔

اجارہ کرنے کے بعد مارکیٹ کرایہ میں کمی آ گئی:

متولی نے وقف کو اجارہ پر دیتے وقت تو عام مارکیٹ کے کرایہ کے مطابق کرایہ مقرر کیا تھا لیکن بعد میں مارکیٹ کے کرایہ میں نمایاں کمی ہو گئی اور کرایہ دار اس کے مطابق کمی کا مطالبہ کر رہا ہے تو کیا کرایہ میں کمی کی جائے گی؟ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ کرایہ میں کمی نہیں کی جائے گی، فرماتے ہیں:

فلو رخص اجره بعد العقد لايفسخ العقد للزوم الضرر. (۱)

---

(۱) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ١٠٠٨ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (٤٠٣/٤)

اگر عقد کے بعد اس کی اجرت میں کمی ہوگئی تو عقد اجارہ فسخ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس میں وقف کو نقصان ہوگا۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

لو طلب المستأجر فسخه لايجيبه الناظر للزوم الضرر على الوقف قال في الفتح: وليس له الاقالة الا ان كانت اصلح للوقف. (۱)

اس صورتحال میں اگر کرایہ دار اجارہ فسخ کرنے کا مطالبہ کرے تو متولی اسے مثبت جواب نہیں دے گا کیونکہ اس میں وقف کا نقصان ہے، فتح القدیر میں ہے کہ متولی وقف کے لئے کئے گئے عقد کا اقالہ نہیں کرسکتا الا یہ کہ اس میں وقف کی بہتری ملحوظ ہو۔

احقر کی رائے اس سلسلہ میں بھی وہی ہے کہ اجارہ ایگریمنٹ کو مدنظر رکھنا چاہئے اگر اس میں متأجر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی وقت نوٹس دے کر اجارہ ختم کرسکتا ہے، یا کرایہ میں تبدیلی کے لئے ایگریمنٹ میں کوئی معیار طے کیا گیا تھا تو اسے اپنا یہ حق استعمال کرنے کا حق ہے، ہاں اگر اس سے سکوت اختیار کیا گیا یا صراحۃً اس کی نفی کی گئی تو پھر متأجر کے مطالبہ کے باوجود متولی کرایہ میں کمی نہیں کرے گا۔

۴۔ اجارۂ وقف میں تہمت سے بچا جائے:

اجارہ کرتے وقت متولی کو اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اس عقد کے نتیجہ میں اسے یا اس کے اصول وفروع یعنی ماں باپ اولاد وغیرہ کو کوئی اضافی فائدہ تو حاصل نہیں ہورہا، اگر ایسا کوئی امکان ہو تو متولی کے لئے یہ عقد اجارہ کرنا جائز نہیں ہوگا، اس کی مثال فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ دی ہے کہ متولی اگر خود اجارہ پر لے یا اپنی اولاد یا اپنے والدین یا اپنے غلام کو وقف یا اس کی مملوک جائیداد اجارہ پر دے تو یہ جائز نہیں ہے:

علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

لو اجر الوقف من نفسه او سكنه بأجرة المثل لايجوز و كذا اذا اجره من ابنه او ابيه او عبده او مكاتبه للتهمة ولا نظر معها. (۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۰۳)

(۲) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۶۵)

اگر متولی وقف کو خود کرایہ پر لے یا اجرتِ مثل دے کر اس میں رہائش اختیار کرلے تو یہ جائز نہیں ہے، اسی طرح اپنے بیٹے، باپ، غلام یا مکاتب کو اجرت پر دینا بھی جائز نہیں ہے تہمت کی وجہ سے، اور اس تہمت کے ہوتے ہوئے اس عقد کو وقف کی مصلحت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ہمارے خیال میں اس عبارت کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ کیا اسعاف کی اس عبارت میں ذکر کردہ اطلاق اور ان افراد سے عقد کی ممانعت تمام فقہاء کرام کے نزدیک ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے۔

متولی کا خود یا اپنی اولاد کے ساتھ وقف کا اجارہ کرنا:

اس مسئلہ میں فقہاء کرام کے یہاں عبارات مختلف نوعیت کی ہیں:

عبارات کی پہلی نوعیت:

کچھ عبارات وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متولی وقف کا وقف کو خود اجارہ پر لینا یا اپنی اولاد یا والدین یا اپنے غلاموں کو اجارہ پر دینا مطلقاً جائز نہیں جیسے کہ اوپر ذکر کردہ الاسعاف کی عبارت سے واضح ہے، اس کی دو علتیں بیان کی جاتی ہیں ایک تو تہمت کا اندیشہ جیسا کہ ذکر کردہ عبارت میں مذکور ہے، دوسرے یہ فقہی اصول کہ ''الواحد لایتولی طرفی العقد'' ایک ہی شخص عقد کا ایجاب وقبول دونوں نہیں کرسکتا، اگر متولی خود اجارہ پر لے گا یا اپنی نابالغ اولاد یا اپنے غلاموں کو اجارہ پر دے گا تو ایجاب بھی متولی ہونے کی حیثیت سے خود کرے گا اور قبول بھی خود ذاتی حیثیت میں یا ان لوگوں کے ولی ہونے کی حیثیت سے کرے گا، ایک ہی شخص ایجاب بھی کررہا ہے اور قبول بھی۔ اس علت کی طرف علامہ طرابلسیؒ اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **ولو تقبل المتولی الوقف لنفسه لایجوز لان الواحد لایتولی طرفی العقد الا اذا تقبله من القاضی لنفسه فحینئذ یتم لقیامه باثنین.** [1]
>
> اگر متولی وقف کی طرف سے قبول کرتے ہوئے خود موقوفہ چیز کرایہ پر لے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ ایک شخص عقد کے دونوں اطراف یعنی ایجاب وقبول انجام نہیں دے سکتا، الا یہ کہ قاضی کے جانب سے پیشکش ہو اور وہ پھر قبول کرے تو یہ جائز ہے، کیونکہ اب ایجاب وقبول دولوگوں کی طرف سے ہوگا۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۶۵)

دوسری نوعیت کی عبارات:

دوسری نوعیت کی عبارات وہ ہیں جن میں یہ صراحت ہے کہ متولی خود وقف کی جائیداد اجارہ پر نہیں لے سکتا اور نہ ہی اپنی نابالغ اولاد یا اپنے غلاموں کو اجارہ پر دے سکتا ہے البتہ اپنے والدین یا اپنی بالغ اولاد کو اگر اجارہ پر دے تو اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ناجائز ہے جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قلت: ارایت ان اجرها الواقف من ابنه او من ابيه او من عبده او من مكاتبه؟ قال اما في مذهب أبي حنيفة فان الاجارة لا تجوز من احد من هؤلاء واما في مذهب أبي يوسف فان الاجارة من ابنه وأبيه جائزة واما من عبده او مكاتبه فان الاجارة لاتجوز.[1]

میں نے عرض کیا کہ اگر واقف موقوفہ زمین اپنے بیٹے، باپ، غلام یا مکاتب کو اجارہ پر دیدے تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کے مطابق تو ان میں سے کسی کے ساتھ اجارہ جائز نہیں، امام ابویوسفؒ کے مذہب میں اپنے بیٹے اور باپ سے اجارہ جائز ہے اپنے غلام یا مکاتب سے اجارہ کا عقد نہیں کیا جاسکتا۔

اس عبارت سے امام محمدؒ کا موقف معلوم نہیں ہوتا، اس کی صراحت صاحبِ اسعاف نے کی ہے، فرماتے ہیں:

ولو اجر المتولي الوقف من ابيه أو ابنه أو من عبده أو مكاتبه لايجوز عند أبي حنيفةؒ، ويجوز عندهما فيما سوى عبده و مكاتبه.[2]

اگر متولی اپنے باپ، بیٹے، غلام یا مکاتب کو وقف اجارہ پر دے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے، حضرات صاحبینؒ کے نزدیک اپنے غلام یا مکاتب کے سوا اپنے باپ اور بیٹے کو وقف اجارہ پر دینا جائز ہے۔

اپنے آپ کو اجارہ پر دینے کا حکم یا نابالغ اولاد کو اجارہ پر دینے کا حکم مزید وضاحت کے ساتھ علامہ حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ نے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ١٩٩٩م (١٧٣)

(٢) الطرابلسي، ابراهيم بن موسىٰ بن ابي بكر الطرابلسي. الاسعاف في احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ١٣٢٠ه (٢٩)

فی الدر المختار: ولو اجره لابنه لم یجز خلافا لهما کعبده اتفاقا، وفی الشامیة تحت هذه العبارة: قوله "لابنه" أی الکبیر اذا لصغیر تبع له...... وقوله: "کعبده اتفاقاً" وکذا لو لنفسه. (۱)

الدر المختار میں ہے کہ اگر اپنے بیٹے کو وقف زمین اجارہ پر دے تو امام صاحب کے نزدیک جائز نہیں، حضرات صاحبین اس سے اختلاف کرتے ہیں، اپنے غلام کو اجارہ پر دینا تو بالاتفاق ناجائز ہے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ اس عبارت میں "بیٹے" سے مراد بالغ بیٹا ہے، نابالغ تو خود اس کے تابع ہے، اور اپنے آپ کو کرایہ پر دینے کا حکم وہ ہے جو اپنے غلام کو کرایہ پر دینے کا ہے۔

المحیط البرہانی میں ہے:

اذا اجر القیم دار الوقف من نفسه لایجوز کذا ذکر هلال فی وقفه وکذا اذا اجر من عبده او مکاتبه لایجوز کمالو اجره من نفسه، قیل انما لم تجز اجارة القیم من نفسه علی قیاس الوکیل اذا اجر من نفسه لأن کل واحد منهما یتصرف بتفویض من جهة غیره ...... ولو اجر من ابنه أو أبیه فهو علی الاختلاف فی الوکیل عند أبی حنیفة لایجوز وعندهما یجوز. (۲)

اگر متولی وقف خود کرایہ پر لے تو یہ جائز نہیں امام ہلال نے ایسے ہی ذکر کیا ہے، اسی طرح اپنے غلام یا مکاتب کو کرایہ پر دینا بھی جائز نہیں، کہا گیا ہے کہ متولی کے لئے اپنے آپ کو کرایہ پر دینا جائز نہیں اسے وکیل پر قیاس کیا ہے کہ اس کے لئے بھی خود اجارہ پر لینا جائز نہیں ہے، وجہ مشترک یہ ہے کہ متولی اور وکیل دونوں کسی اور کی طرف سے امور سپرد کرنے پر ہی کام کرتے ہیں، اور اگر متولی اپنے بیٹے یا باپ کو کرایہ پر دے تو اس میں وکیل کی طرح اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک جائز ہے۔

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۵۶)

(۲) ابن مازه البخاری، برهان الدین ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۹/۳۳) و کذا فی التتارخانیه (۵/۷۵۳)

تیسری نوعیت کی عبارات:

تیسری قسم کی عبارات وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ متولی کا وقف کو خود اجارہ پر لینا یا اپنی بالغ یا نابالغ اولاد کو اجارہ پر دینا یا اپنے والدین یا اپنے غلام کو اجارہ پر دینا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے بشرطیکہ اس میں وقف کا واضح فائدہ ہو کہ مثال کے طور پر کرایہ عام رائج کرایہ (اجرتِ مثل) سے زیادہ رکھا جائے، جبکہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک عام رائج کرایہ پر اگر عقد کیا جائے تو وہ بھی درست ہے البتہ اس سے کم میں درست نہیں۔ اس موقف کی بنیاد جامع الفصولین کی درج ذیل عبارت ہے:

المتولی اذا اجر دار الوقف من ابنه البالغ أو ابیه لم یجز عند أبی حنیفةؒ الا بأکثر من اجرة المثل کبیع الوصی لو بمثل قیمته صح عندهما ولو خیر الیتیم صح عند أبی حنیفةؒ وکذا متولی اجر من نفسه لو خیراً صح والا لاومعنی الخیر مرفی بیع الوصی من نفسه وبه یفتی. (۱)

متولی اگر موقوفہ گھر اپنے بالغ بیٹے یا اپنے باپ کو اجارہ پر دے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں، ہاں اگر اجرت اجرتِ مثل سے زیادہ طے کی گئی ہو تو پھر اجازت ہے وصی کی بیع کی طرح، حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک قیمتِ مثل پر بیع جائز ہے، اور امام صاحب کے نزدیک یتیم کے لئے بہتر ہو تو صحیح ہے ورنہ نہیں اور بہتری کے معنی پیچھے گذر چکے ہیں، اسی رائے پر فتویٰ ہے۔

خیریت اور انفعیت کی تفصیل چند صفحات پہلے خود ہی تحریر فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

جاز للوصی ذلک لو خیراً وتفسیره أن یأخذ بخمسة عشر ما یساوی عشرة أو یبیع منه بعشرة مایساوی خمسة عشر و به یفتی. (۲)

وصی کیلئے یتیم کی چیز خود خریدنا جائز ہے بشرطیکہ یہ یتیم کے لئے بہتر ہو اور بہتر ہونے کی تفسیر یہ ہے کہ دس کی چیز پندرہ میں خریدے، یا پندرہ کی چیز دس میں اسے بیچے اور اس پر فتویٰ ہے۔

---

(۱) ابن سماوه، محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوه. جامع الفصولین، کراچی، اسلامی کتب خانه ۱۳۰۲ھ (۲/۲۷)

(۲) ابن سماوه، محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوه. جامع الفصولین، کراچی، اسلامی کتب خانه ۱۳۰۲ھ (۲/۲۰)

علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہا اللہ نے جامع الفصولین کی یہی عبارت نقل کی ہے اور دونوں کا رجحان بھی اسی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ نے تو یہ عبارت نقل کر کے واضح طور پر فرمادیا:

فعلم ان مافی الاسعاف ضعیف. (۱)

جامع الفصولین کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسعاف میں جو تحریر کیا گیا ہے وہ ضعیف ہے۔

المحیط البرہانی میں تحریر ہے:

قیل: ینبغی ان یکون هذا علی قیاس الوصی اذا باع مال الصبی من نفسه ان کان فیه منفعة للوقف یجوز عند أبی حنیفة رحمه الله. ولو اجر من ابنه أو ابیه فهو علی الاختلاف فی الوکیل ...... ومن مشایخنا من قال: هنایجوز وقیاسه علی المضارب اذا اجر من هؤلاء فانه یجوز بلاخلاف وکذا لک الوصی لانهما عاما التصرف. (۲)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ متولی کا مالِ وقف خود کرایہ پر لینے کا حکم وصی کی طرح ہونا چاہئے جب وہ یتیم کا مال خود خریدے، اگر اس میں وقف کا فائدہ ہو تو امام صاحبؒ کے نزدیک جائز ہے، اور اگر اپنے بیٹے یا باپ کو کرایہ پر دے تو اس میں وہی اختلاف ہے جو وکیل میں ہے، اور ہمارے مشائخ میں سے بعض نے کہا کہ متولی کو مضارب پر قیاس کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ جس طرح مضارب کیلئے ان لوگوں کو کرایہ پر دینا بلا اختلاف جائز ہے اسی طرح متولی کے لئے جائز ہے، یہی حکم وصی کا بھی ہے کیونکہ دونوں کو تصرف کی عام اجازت حاصل ہے۔

یہ عبارات واضح ہیں کہ کرایہ عام رائج کرایہ سے زیادہ مقرر کیا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک متولی خود بھی اجارہ پر لے سکتا ہے اور اپنے اصول وفروع کو بھی اجارہ پر دے سکتا ہے جبکہ صاحبینؒ کے نزدیک عام رائج کرایہ پر بھی ان سے معاملہ جائز ہے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۳۵/۵) علامہ شامی کی رائے کے لئے دیکھئے: رد المحتار (۴۵۶/۴)

(۲) ابن مازہ البخاری، برھان الدین ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازہ البخاری ۶۱۲ ۵. المحیط البرھانی، کراچی، ادارۃ القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۳۳/۹) و کذا فی التتارخانیه (۴۲۱/۲)

ترجیح:

احقر کا رجحان اسی تیسری نوعیت کی عبارات میں ذکر کردہ امام صاحبؒ کے موقف کی طرف ہے کہ اگر متولی عام اجرت سے زیادہ اجرت مقرر کر کے خود وقف کو کرایہ پر لے یا اپنے والدین یا اپنی اولاد یا اپنے غلام کو کرایہ پر دے تو اس کی اجازت ہونی چاہئے، کیونکہ جو حضرات منع فرماتے ہیں وہ اس کی ایک علت تہمت بیان کرتے ہیں، جب عام رائج کرایہ سے زیادہ کرایہ مقرر کیا جائے گا تو تہمت کا امکان ہی ختم ہو جائے گا بلکہ یہ عقد وقف کے لئے بھی فائدہ مند ہوگا کہ اسے عام رائج کرایہ سے زیادہ کرایہ مل رہا ہے۔

''الواحد لایتولی طرفی العقد'' سے مستثنیات:

دوسری علت ممانعت کی یہ فقہی اصول تھا، الواحد لایتولی طرفی العقد کہ ایک شخص عقد کے ایجاب و قبول دونوں نہیں کر سکتا اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہ اللہ نے اس اصول کے کچھ مستثنیات بھی ذکر فرمائے ہیں جن میں سے ایک والد کا اپنے نابالغ بچے سے کوئی چیز خریدنا یا اسے بیچنا ہے کہ اگر یہ بچہ کے حق میں بہتر ہے تو جائز ہے حالانکہ یہاں بھی ایک ہی شخص عقد کے دونوں پہلوؤں یعنی ایجاب و قبول کی ذمہ داری لے رہا ہے اسی طرح وصی کا استثناء بھی کیا ہے کہ اگر وصی اپنے زیرولایت نابالغ سے کوئی چیز خریدے یا اسے بیچے تو یہ بھی جائز ہے۔ شیخ وہبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

> اجاز الحنفية ماعداز فر انعقاد البيع بارادة شخص واحد متخذاً صفتين بالنيابة عن البائع وعن المشترى فى حالات نادرة هى شراء الاب أو وصيه أو الجد مال الصغير لنفسه أو بيع مال نفسه من الصغير ...... لكن تعامل الاب مع الصغير لنفسه مقيد بأن يكون السعر بمثل قيمة الشيئى أو بشئى يسير من الغبن المعتاد حدوثه بين الناس عادة ...... وأما وصى الاب فمقيد تعامله مع الصغير عند أبى حنيفة وأبى يوسف بان يكون تصرفه بمال الصغير لنفسه بمثل القيمة أو بما فيه نفع ظاهر (أو خير بين) لليتيم.[1]

---

(۱) الزحیلی، الدکتور وھبۃ الزحیلی. الفقۃ الاسلامی وادلتہ، بیروت، دار الفکر، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۸۴م (۸۸/۴) و کذا فی الدر المختار (۵۲۵/۴)

احناف نے سوائے امام زفرؒ کے کچھ مخصوص و نادر حالات میں ایک شخص کے بائع اور مشتری دونوں کے طرف سے نیابت کرتے ہوئے عقد کرنے کی اجازت دی ہے، وہ صورتیں یہ ہیں کہ باپ یا اس کا وصی یا دادا نابالغ بچے کا مال خود خریدے، یا اسے اپنا مال بیچے، لیکن باپ کے بچے کے ساتھ معاملہ میں یہ قید ہے کہ اس چیز کی بازاری قیمت طے کی ہو یا قیمت میں کچھ معمولی کمی ہو جو کہ عام طور پر لوگوں کے باہمی معاملات میں ہوتی ہو، اور باپ کے وصی کے بچے کے ساتھ معاملہ کرنے میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ سودا بازاری قیمت پر ہو یا ایسی قیمت پر ہو جس میں یتیم کا واضح نفع ہو۔

متولی وقف اس اصول سے مستثنیٰ ہونا چاہئے:

جب اس اصول سے اَبّ اور وصّی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں تو متوّلی کو بھی مستثنیٰ ہونا چاہئے، کیونکہ جو حیثیت اَبّ اور وصّی کی ہے وہ حیثیت متولی وقف کی بھی ہے، ان میں سے ہر ایک کسی کے وکیل کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ امام خصافؒ نے لکھا ہے:

انما قاس أصحابنا كثيراً من مسائل الوقف على الوصايا. (۱)

ہمارے اصحاب نے وقف کے بہت سے مسائل کو وصایا پر قیاس کیا ہے۔

ایک اور جگہ امام لکھتے ہیں:

قلت: فقدر أيتك تقيس كثيراً من الوقوف على الوصايا؟ قال انما اقيس منها على الوصايا مايشبهها وما يقرب منها لانها قد تشبهها فى بعض الحالات. (۲)

میں نے عرض کیا کہ آپ وقف کے بہت سے مسائل کو وصایا پر قیاس کرتے ہیں؟ فرمایا کہ میں وقف کے جو مسائل وصیت سے ملتے جلتے ہیں ان میں میں وصیت پر قیاس کرتا ہوں کیونکہ وقف بعض حالات میں وصیت کے مشابہ ہے۔

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۵۷)

(۲) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۳۷)

خلاصہ یہ ہے کہ احقر کی رائے میں اگر متولی رائج اجرت سے زیادہ کرایہ دے کر وقف کا مکان وغیرہ خود کرایہ پر لے یا اپنی نابالغ اولاد کے لئے کرایہ پر لے یا اپنی بالغ اولاد یا والدین یا غلام کو کرایہ پر دے تو امام صاحبؒ کے مذہب کے مطابق اس کی گنجائش ہونی چاہئے، کیونکہ اس میں نہ تو تہمت کا امکان ہے اور نہ ہی تولیت پر ''الواحد لایتولی طرفی العقد'' والے اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔

اجارہ کے علاوہ دیگر عقود کا حکم:

یہاں یہ بھی وضاحت مناسب ہے کہ ہم نے اجارہ کی مناسبت سے یہاں صرف اجارہ ہی کا حکم تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن متولی کے اپنے لئے یا اوپر ذکر کردہ افراد کے لئے وقف کے ساتھ دیگر عقود مثلاً خرید وفروخت، مضاربت، مزارعۃ وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے اور اس میں بھی عبارات کا یہی اختلاف ہے اور وہاں بھی ہمارے نزدیک راجح امام صاحبؒ کا ہی مذہب ہے کہ اگر واضح طور پر یہ عقود وقف کے لئے بہتر ہوں تو ان کی گنجائش ہوگی ورنہ نہیں۔

واقف یا موقوف علیہم کو اجرت پر دینا:

واقف یا موقوف علیہم کے ساتھ وقف کا اجارہ کرنے میں چونکہ تہمت کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے متولی کے لئے جائز ہے کہ عام رائج کرایہ پر واقف یا موقوف علیہم کو وقف کرایہ پر دیدے۔ تتارخانیہ میں ہے:

واذا كان الوقف على قوم معينين فأجر القيم الوقف من الموقوف عليهم جاز. (۱)

اگر وقف متعین لوگوں پر ہو اور متولی موقوف علیہم میں سے کسی کو اجارہ پر دیدے تو یہ جائز ہے۔

آگے جاکر مزید ارشاد فرماتے ہیں:

ولو اجر من الواقف وكان اخرجه من يده وسلمه الى القيم جاز. (۲)

اور اگر متولی واقف کو اجارہ پر دے جبکہ وہ وقف کو اپنے قبضہ سے نکال کر متولی کے حوالہ کر چکا ہے تو یہ جائز ہے۔

---

(۱) الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوى التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۷۵۴/۵)

(۲) الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوى التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۷۵۹/۵)

مزارعتِ وقف

وقف کی آمدنی کے لئے دوسری صورت جس کا فقہاء کرام رحمہم اللہ نے صراحۃً ذکر فرمایا ہے وہ ہے مزارعۃ، اگر وقف زمین قابلِ کاشت ہے تو متولی کو رائج طریقہ کار کے مطابق اسے مزارعہ پر دینا چاہئے کہ مثلاً کسی شخص سے معاملہ کیا جائے کہ اس میں آپ زراعت کریں جو پیداوار ہوگی وہ آدھی آپ کی ہوگی اور آدھی وقف کی یا اور کوئی تناسب طے کرلیا جائے بشرطیکہ اس کا رواج ہو اور اس میں وقف کا نقصان نہ ہو، یا اسی طرح اگر وقف زمین میں درخت کثرت سے لگے ہوئے ہیں تو ان میں بھی کسی کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کرے جو آمدنی پھل یا لکڑی کی صورت میں حاصل ہوگی وہ مثال کے طور پر آدھی اس کام کرنے والے کی ہوگی اور آدھی آمدنی وقف کی ہوگی، اس طرح عقد کرنے کو مساقاۃ اور معاملہ سے تعبیر کا جاتا ہے۔ امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قال ابوبكر رحمه الله: واذا وقف الرجل ارضاله وقفاً صحيحاً وفيها نخل و شجر هل له ان يدفع الارض مزارعة الى رجل يذرعها ببذره ونفقته على ان ما اخرج الله تعالىٰ من ذلك فله النصف وللمزارع النصف؟ قال: هٰذا جائز في قول أبي يوسفؒ وكذلك ان كان عنده بذر فدفع الارض والبذر الى رجل مزارعة بالنصف؟ قال: هٰذا جائز ان لم يكن فيه محاباة لايتغابن الناس في مثلها ...... قلت: وكذلك ان دفع مافي هذه الارض من نخل وشجر معاملة بالنصف أو بالثلث؟ قال هذا جائز. (۱)

امام ابوبکرؒ نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے کوئی زمین وقف کی جس میں درخت وغیرہ ہیں تو کیا وہ یہ زمین کسی کو مزارعت پر دے سکتا ہے کہ وہ شخص اپنے بیج اور اپنے خرچہ پر اس میں

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۷۸)

زراعت کرے گا جو پیداوار ہوگی وہ آدھی اس آدمی کی ہوگی اور آدھی وقف کی؟ فرمایا: امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق یہ جائز ہے، اسی طرح اگر واقف کے پاس بیج ہوں اور وہ بیج مع زمین کسی کو دیدے کہ جو پیداوار ہوگی وہ آدھی آدھی ہوگی تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس میں عام مزارعت کے عرف سے زیادہ پیداوار اس شخص کو نہ دی جائے جس کے ساتھ مزارعت کا معاملہ کیا جارہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ موقوفہ زمین پر لگے ہوئے درخت اگر کسی کو معاملہ پر دیدئے جائیں کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے جو فائدہ ہوگا وہ آدھا آدھا یا دو تہائی اور ایک تہائی ہوگا تو یہ جائز ہے؟ امام نے فرمایا کہ یہ جائز ہے۔

ایک اور جگہ اس سلسلہ میں اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قلت: وكذلك ان دفع الارض مزارعة او كان فيها نخل فدفعه معاملة؟ قال: انما هو ناظر لاهل الوقف ومحتاط عليهم فما فعله من ذلك ممافيه صلاح لهم وتوفير عليهم فهو جائز و مافعله من ذلك مماهو نقص عليهم وفساد في الوقف لم يجز. [1]

میں نے عرض کیا کہ کیا وقف زمین مزارعت پر دینا یا اس کے درختوں کو معاملہ اور مساقاۃ پر دینا جائز ہے؟ امام نے فرمایا کہ متولی اہلِ وقف کے طرف سے وقف کا نگران ہے اس کے لئے ایسا عقد کرنا جس میں وقف کی مصلحت ہو اور اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جائز ہے اور ایسا عقد کرنا جس میں وقف کا نقصان ہو یا اس کے فساد کا اندیشہ ہو جائز نہیں ہے، (اس اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے متولی وقف زمین مزارعت یا مساقاۃ پر دے سکتا ہے)

اگر متولی مناسب سمجھے تو وقف زمین میں زراعت کے لئے یہ صورت بھی اختیار کرسکتا ہے کہ کسی کو اجرت پر رکھ کر اس سے کھیتی باڑی کروائے اور اسے متعین اجرت دے۔

امام ھلالؒ تحریر فرماتے ہیں:

قلت: أرايت القائم بأمر هٰذه الصدقة اذا كانت قراحا فأجرها من رجل فزرعها بدراهم معلومة الى اجل معلوم؟ قال فهٰذا جائز الى

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۳۶)

ذلک الاجل.[۱]

میں نے عرض کیا کہ اگر وقف چٹیل زمین ہو تو کیا متولی کسی کو دراھمِ متعینہ کے عوض یہ زمین معین مدت کے لئے اجارہ پر دے سکتا ہے کہ وہ اس میں زراعت کرے؟ فرمایا ایک معین مدت تک کے لئے اجارہ پر دینا جائز ہے۔

مضاربت یا شرکت پر مالِ وقف دینا:

اگر وقف نقود کی شکل میں ہے یا وقف کی ملکیت میں نقود ہیں تو انہیں مضاربت یا شرکت میں لگا کر نفع حاصل کیا جاسکتا ہے، البتہ اس کا خیال ضروری ہے کہ ایسے کاروبار میں لگایا جائے جہاں فائدہ کا امکان غالب ہو اور تحریری دستاویزات اور کفالت سمیت ایسی تدابیر اختیار کر لی جائیں جس کے نتیجہ میں مال کے خرد برد ہونے کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ ردالمحتار میں ہے:

وعن الأنصاری وکان من أصحاب زفرؒ فیمن وقف الدراھم او مایکال او مایوزن أیجوز ذلک؟ قال: نعم، قیل و کیف؟ قال یدفع الدراھم مضاربة، ثم یتصدق بھا فی الوجه الذی وقف علیه.[۲]

انصاری جو امام زفرؒ کے اصحاب میں سے تھے ان سے وقف کی اس صورت کے بارے میں پوچھا گیا کہ کوئی شخص دراہم یا مکیلی یا موزونی چیز وقف کر دے تو یہ جائز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ جائز ہے، سوال کیا گیا کہ وقف کا کیا جائے گا؟ فرمایا کہ دراہم کو مضاربت پر دیا جائے گا جو نفع حاصل ہوگا وہ اس مصرف پر خرچ کیا جائے گا، جس کے لئے یہ وقف کیا گیا ہے۔

---

(۱) ھلال الرای، ھلال بن یحییٰ بن مسلم الرای. کتاب احکام الوقف، حیدر آباد دکن، دائرۃ المعارف العثمانیة ۱۳۵۵ھ (۲۱۲)

(۲) الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۴/۴)

مروجہ جدید ذرائع آمدنی اور ان کی اہمیت

وقف کی آمدنی کی صورت پیدا کرنے کے لئے اور اس میں مزید اضافہ کرنے کے لئے مذکورہ بالا ذرائع تو وہ تھے جو قدیم زمانے سے استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی انہیں استعمال کیا جارہا ہے، ان کے مفید ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن آج اقتصادی پیوندکاری (Financial Engenaring) کے نتیجہ میں بے شمار ایسی صورتیں سامنے آگئی ہیں کہ انہیں استعمال کر کے وقف کی آمدنی میں بے انتہاء اضافہ کیا جاسکتا ہے اور وقف کے مقاصد کو بہتر انداز میں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق حاصل کیا جاسکتا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک کمرشل جگہ پر وقف پلاٹ ہے، وقف کے پاس اپنی جو آمدنی ہے اس میں اس پلاٹ پر ایک منزلہ دوکان تعمیر ہوسکتی ہے جسے کرایہ پر دے کر وقف کو ماہانہ پانچ ہزار سے لے کر دس ہزار تک کرایہ مل سکتا ہے، لیکن جدید طریقہائے تمویل کو استعمال کر کے اس سے کئی گنا آمدنی کی صورت بن سکتی ہے کہ اس پلاٹ پر ایک منزلہ دوکان بنانے کے بجائے کمرشل بیس منزلہ پلازہ تعمیر کیا جائے، سوال یہ ہے کہ اس کے لئے رقم کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ یہ کوئی بڑی بات نہیں، اس کے صکوک بھی جاری کئے جاسکتے ہیں، اس میں کسی مالیاتی ادارہ سے شرکتِ متناقصہ کا معاملہ بھی کیا جاسکتا ہے، ان کی تفصیل ہم انشاء اللہ ابھی ذکر کریں گے، سب کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ بالآخر کچھ عرصہ بعد یہ پلازہ وقف ہی کی ملکیت میں آجائے گا اور اس کی آمدنی کے لئے یہ بہترین صورت وجود میں آجائے گی۔

ذیل میں ان صورتوں میں سے کچھ اہم صورتیں ذکر کی جارہی ہیں:

(الف) استصناع:

اگر وقف کے پاس پلاٹ ہو خواہ وہ وقف ہو یا وقف کی ملکیت ہو اور وقف کے پاس اس کی تعمیر کے لئے رقم نہ ہو یا رقم تو ہو لیکن تعمیر کے لئے کافی نہ ہو تو ایسی صورت میں متولی وقف وقف کی تعمیر کے لئے کسی شخص یا کسی مالیاتی ادارہ سے استصناع کا عقد کرسکتا ہے جس کی چیدہ چیدہ تفصیلات درج ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلے اس کی فیزیبلیٹی رپورٹ تیار کی جانی چاہئے جس میں یہ اندازہ لگا جائے کہ استصناع کے تحت اگر وقف پلاٹ پر پلازہ تعمیر کروایا جائے تو اس کی لاگت کیا آئے گی؟ اور پلازہ تعمیر ہونے کے بعد اگر اسے کرایہ پر دیا جائے تو سالانہ کتنا کرایہ حاصل ہوگا؟ کتنے سال کے کرایہ سے استصناع پر آنے والی لاگت پوری کی جاسکتی ہے؟ استصناع کی قیمت ادا کرنے کے بعد یہ پلازہ مزید کتنے عرصہ تک قابل استعمال اور کرایہ پر دینے کے قابل رہے گا؟ وقف کب تک اس کی آمدنی سے فائدہ اٹھا سکے گا؟

(۲) ان تمام امور کا جائزہ لینے کی صورت میں یہ نتائج سامنے آئے کہ وقف زمین پر کمرشل پلازہ تعمیر کروانے پر اندازاً دس کروڑ لاگت آئے گی، ایک سال میں پلازہ تیار ہوجائے گا، اسے اگر کرایہ پر دیدیا جائے تو سالانہ ایک کروڑ کرایہ حاصل ہو سکے گا، اس طرح دس سال میں استصناع کی لاگت کرایہ کی رقم سے ادا ہوسکتی ہے، اور پلازہ کی محتاط عمر تیس سال ہے تو آئندہ بیس سال جو کرایہ حاصل ہوگا وہ اس وقف کی خالص آمدنی ہوگا، جو وقف کے مصارف پر خرچ کیا جاسکے گا۔

(۳) اب کسی مالیاتی ادارہ سے استصناع کا عقد کا جائے گا کہ وہ اس نقشہ کے مطابق اس وقف زمین پر کمرشل پلازہ ایک سال کے اندر تعمیر کرے گا۔

(۴) وقف کے پاس چونکہ فی الحال استصناع میں طے شدہ قیمت کی ادائیگی کے لئے رقم نہیں ہے اس لئے استصناع کرتے وقت یہ بھی طے کیا جائے گا کہ استصناع کی طے شدہ قیمت گیارہ سال میں ادا کی جائے گی، پہلا سال تو تعمیر کا ہے اس میں کچھ نہیں دیا جائے گا، اس کے اگلے سال سے جب وہ پلازہ کرایہ پر دیدیا جائے گا تو ظاہر ہے اس کی سالانہ آمدنی وقف کے پاس آنا شروع ہوجائے گی اس لئے دوسرے سال سے گیارہویں سال تک دس قسطوں میں قیمت کی ادائیگی طے کی جائے گی۔

(۵) یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ صانع/ مالیاتی ادارہ جو یہ پلازہ تعمیر کر رہا ہے اسے اس پلازہ میں لگائی گئی رقم گیارہ سال بعد پوری طرح مل سکے گی اس لئے وہ استصناع کی قیمت طے کرتے وقت اس عرصہ کو بھی پیش نظر رکھے گا اور نقد رقم ادا کر کے جو تعمیر کروائی جاتی تو شاید اس سے دوگنی رقم پر وہ پلازہ تعمیر کرنے پر تیار ہوگا، لیکن وقف کے لئے بہر حال اس میں فائدہ ہے کیونکہ وقف کے پاس تو اتنی رقم ہے نہیں کہ وہ اپنی آمدنی سے یہ تعمیر کروا سکے، آمدنی کے انتظار میں وقف کا مسلسل نقصان ہے اور تعمیراتی مٹیریل کی قیمت میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جائے گا اس لئے آئندہ کے

فوائد کو سامنے رکھتے ہوئے اس دوگنی قیمت یا اس سے زیادہ پر بھی استصناع کر لیا جائے تو یہ وقف کی مصلحت کے خلاف نہ ہوگا۔

(۶) تعمیر مکمل ہونے کے بعد اسے کرایہ پر دیدیا جائے، جو کرایہ ایڈوانس یا ماہانہ حاصل ہو اس میں سے ضروری اخراجات کی رقم نکال کر اسے کسی اسلامی مالیاتی ادارہ میں انوسٹ کر دیا جائے جس پر سال کے آخر تک بہتر منافع حاصل کیا جاسکتا ہے، سال کے اختتام پر حاصل شدہ کرایہ اور اس پر حاصل ہونے والے نفع کی رقم سے صانع / مالیاتی ادارہ کی پہلی قسط ادا کر دی جائے، اس طرح انشاء اللہ گیارہ سال کے عرصہ میں تمام رقم ادا ہو جائے گی اب آئندہ مزید بیس سال تک جو آمدنی ہوگی وہ خالصۃً وقف کی آمدنی ہوگی اسے وقف کے مصرف پر خرچ کیا جائے گا۔

(ب) استصناع BOT کے طریقہ سے:

کسی مالیاتی ادارہ سے استصناع کرتے وقت اگر ضمانات کے حوالہ سے مشکل پیش آئے تو اس سے یہ بھی معاملہ کیا جاسکتا ہے کہ بنانے والا ادارہ وقف زمین پر پلازہ تعمیر کرنے کے بعد اسے وقف کے حوالہ نہ کرے بلکہ اسے خود ہی اپنے انتظام کے تحت کرایہ پر دے اور جو کرایہ حاصل ہوتا رہے اس سے استصناع کی طے شدہ قیمت وصول کرتا رہے اور جب یہ قیمت وصول ہو جائے تو یہ پلازہ وقف کے حوالہ کر دے، اب آئندہ حاصل ہونے والی آمدنی وقف کی ہی ہوگی، اس طرح استصناع کا عقد کرنے کو اقتصادیین BOT کے مخفف سے تعبیر کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے (Built operate than Transfer) تعمیر کرو، انتظام سنبھالو اور جب قیمت وصول ہو جائے تو اصل مالک یعنی مستصنع کے سپرد کردو۔

(ج) اجارہ:

ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وقف پلاٹ پر پلازہ تعمیر کرنے کے لئے متولی وقف زمین طویل مدت کے لئے کسی کو کرایہ پر دیدے، وہ شخص اس پر پلازہ تعمیر کر کے آگے کرایہ پر دیدے، جس شخص کو وقف زمین کرایہ پر دی گئی ہے متولی اس سے وقف زمین کے استعمال کا کرایہ لے اور ہر مہینے یا ہر سال اس تعمیر شدہ پلازہ کا کچھ حصہ بھی اس شخص سے خریدتا رہے، اس طرح ایک متعینہ مدت کے بعد جا کر وہ پلازہ پورا کا پورا وقف خرید چکا ہوگا، اور جس شخص نے وقف کو کرایہ پر لیا تھا اس کا تعلق اس سے ختم ہو جائے گا۔

(د) صکوک:

وقف کی ملکیت میں اگر کوئی پلاٹ ہو اس پر پلازہ تعمیر کرنا ہو تو اس کے لئے شرکۃ الملک کی بنیاد پر صکوک بھی جاری کئے جا سکتے ہیں جس کی بنیادی تفصیلات درج ذیل ہیں:

الف: سب سے پہلے تو فیزیبلیٹی رپورٹ تیار کی جائے گی کہ عمارت پر لاگت کتنی آئے گی؟ اس سے آمدنی کتنی متوقع ہے، صکوک کتنے عرصہ کے لئے جاری کئے جائیں، وغیرہ وغیرہ

ب: متولی وقف وقف کی طرف سے رقم دینے والے لوگوں کے ساتھ مشارکہ ایگریمنٹ سائن کرے گا جس کی رُو سے رقم دینے والے لوگ وقف کے مملوک پلاٹ میں اپنی دی ہوئی رقم کے تناسب سے شریک ہو جائیں گے، اور اس پلاٹ کی قیمت اس مشارکہ میں وقف کی انوسمنٹ ہوگی، شرکاء کو ان کے حصہ کی نمائندگی کے طور پر سٹرفکیٹ دیدیئے جائیں گے جنہیں صکوک کہا جاتا ہے۔

ج: اس پلاٹ پر پلازہ تعمیر کروایا جائے گا۔

د: پلازہ مکمل ہونے کے بعد وقف اور حاملینِ صکوک اپنے حصہ سرمایہ کاری کے تناسب سے اس کے مالک ہوں گے۔

ہ: وقف حاملینِ صکوک کا مشاع حصہ ان سے کرایہ پر حاصل کرے گا، کرایہ باہمی رضامندی سے کچھ بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔

و: وقف پورے پلازہ کو کرایہ پر دیدے گا، جو کرایہ حاصل ہوگا وہ وقف کی ملکیت ہوگا اس میں سے حاملینِ صکوک کو ان کی ملکیت کے استعمال کے عوض طے شدہ کرایہ دیا جائے گا۔

ز: وقف ہر چھ مہینہ بعد یا سال بعد صکوک کا ایک معتدبہ حصہ حاملینِ صکوک سے خریدے گا۔

ک: چونکہ شرکۃ الملک کی بنیاد پر صکوک جاری کئے گئے ہیں اس لئے ہر صک کی پہلے سے کوئی بھی قیمت طے کی جا سکتی ہے، یہ ضروری نہیں ہوگا کہ مارکیٹ میں جو قیمت ہو اس پر خریدا جائے۔

ل: جیسے جیسے وقف حاملینِ صکوک کا حصہ خریدتا جائے گا ایسے ہی انہیں دیا جانے والا کرایہ بھی کم ہوتا جائے گا۔

اس طرح کچھ عرصہ بعد جا کر وقف کی ملکیت میں یہ پورا پلازہ بھی آجائے گا اور آئندہ اس کی پوری آمدنی وقف کی ہی ہوگی۔

یہ واضح رہے کہ یہ صورت اس پلاٹ میں تو ہو سکتی ہے جو وقف کی ملکیت ہو، اگر پلاٹ خود بھی

وقف ہوتو اس میں یہ شرکت والی صورت جاری نہیں ہو سکے گی، کیونکہ پلاٹ میں شرکت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پلاٹ کا حصہ مشاعہ شرکاء کو بیچا جارہا ہے، جبکہ وقف پلاٹ کو بیچا نہیں جاسکتا، نیز صکوک جاری کرنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مارکیٹ میں ان کی خرید وفروخت ہوتی رہے اگر وقف پلاٹ کے صکوک ہیں تو ان صکوک کی خرید وفروخت کا مطلب ان کی پشت پر موجود وقف پلاٹ کی خرید وفروخت ہوگا جو کہ جائز نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ پلاٹ خود وقف نہ ہو بلکہ وقف کی ملکیت ہو اور اس کی خرید وفروخت کی اجازت ہو۔

وقف کی زائد آمدنی کی انوسمنٹ:

وقف کی زائد آمدنی رائج شرعی طریقوں سے انوسٹ بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً اسلامی بنک اگر بہتر نفع دے رہے ہوں تو ان میں یہ زائد رقم رکھوا کر نفع حاصل کیا جاسکتا ہے اسی طرح اسلامی میوچل فنڈ میں بھی رقم رکھوا کر نفع حاصل کیا جاسکتا ہے، وقف کی زائد آمدنی سے اسلامی اصولوں کے مطابق جاری کردہ صکوک بھی خریدے جاسکتے ہیں، شرعی اصولوں کی رعایت رکھتے ہوئے شیئرز مارکیٹ میں بھی رقم رکھوانے کی گنجائش ہے لیکن احقر کی رائے میں اس سے احتراز کرنا چاہئے کیونکہ یہاں نقصان کا امکان بھی بہت زیادہ ہے، فقہاءِ کرامؒ نے وقف کی آمدنی کاروبار میں لگانے کی تو اجازت دی ہے لیکن یہ قید بھی لگائی ہے کہ ایسی جگہ لگائی جائے جہاں نفع کا امکان غالب ہو اور نقصان کا امکان کم سے کم ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ متولی کو وقف کی آمدنی کی صورتیں پیدا کرنے کے لئے یا اس آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے تمام جدید مالیاتی صورتیں بھی اختیار کرنی چاہئیں، موقع محل دیکھتے ہوئے جس صورت کو وقف کے لئے عمومی لحاظ سے وہ بہتر سمجھے اختیار کرسکتا ہے۔

وقف کی آمدنی سے اگر کوئی جائیداد خریدی جائے تو کیا وہ بھی وقف ہوگی؟

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ وقف کی مملوکہ آمدنی سے اگر کوئی جائیداد مکان، پلاٹ یا دوکان کی شکل میں خریدی جائے تو کیا وہ بھی وقف ہوگی؟

بعض حضرات کا تو کہنا ہے کہ خریدی گئی چیز وقف ہوگی، فتاویٰ بزازیہ میں اس قول کی نسبت فقیہ ابواللیث کے طرف کی گئی ہے:

متولی المسجد اشتریٰ بغلة المسجد دار أو حانو تالاجل المسجد ثم با ع ذلک اختلفوا فیه ...... وذکر ابو اللیث فی الاستحسان یصیر وقفاً وهٰذا تصریح بانه المختار.[1]

متولی مسجد نے وقف کی آمدنی سے گھر یا دوکان خریدی مسجد کے لئے پھر اسے بیچ دیا علماء کا اس میں اختلاف ہے، فقیہ ابواللیث نے فرمایا کہ استحسان کے مطابق وہ خریدا گیا گھر اور دوکان بھی وقف ہوں گے، اسے استحسان کہنا اس بات کی تصریح ہے کہ یہ قول مختار ہے۔

لیکن جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک یہ جائیداد وقف نہیں ہوگی بلکہ وقف کی ملکیت ہوگی لہٰذا بوقتِ ضرورت اسے بیچا جاسکتا ہے، اس پر وقف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔ تتارخانیہ میں ہے:

متولی المسجد اذا اشتری بمال المسجد حانوتا او دار اثم باعها جاز اذا کانت له ولایة الشراء، وفی التجنیس: فی الفتاویٰ: قال الامام

---

(۱) الکردوی، الامام محمد بن محمد شهاب المعروف بابن البزاز الکردوی الحنفی ۸۲۷ھ. الفتاوی البزازیه بهامش الهندیة، کوئٹه، مکتبه ماجدیه ۱۹۸۲م (۲۶۲/۶)

حسام الدين: هٰذا هو المختار وفى الخانية هو الصحيح وهٰذه المسئلة بناء عل مسالة اخرى ان متولى المسجد اذا اشترى من غلته دارا او حانوتا فهذه الدار او هذا الحانوت هل يلتحق بالحوانيت الموقوفة على المسجد ومعناه هل يصير وقفاً؟ اختلف المشايخ فيه، قال الصدر الشهيد المختار انه لا يلتحق بالحوانيت الموقوفة على المسجد ولكن يصير مستغلاً للمسجد. (۱)

متولی مسجد نے مسجد کے مال سے دوکان یا گھر خریدا پھر اسے بیچ دیا تو جائز ہے بشرطیکہ اسے خرید وفروخت کا اختیار حاصل ہو، تجنیس میں فتاویٰ کے حوالہ سے نقل کیا ہے امام حسام الدین فرماتے تھے کہ یہی مختار ہے، خانیہ میں ہے کہ یہی صحیح ہے یہ مسئلہ درحقیقت ایک اور مسئلہ پر مبنی ہے کہ متولی مسجد اگر مسجد کی آمدنی سے کوئی گھر یا دوکان خریدے تو کیا یہ بھی وقف ہوں گے؟ اس میں مشائخ کا اختلاف ہے، صدرِ شہید نے فرمایا کہ مختار یہ ہے کہ یہ خریدے گئے گھر اور دوکان مسجد کی موقوفہ دوکانوں کے ساتھ مل کر وقف نہیں ہوں گے بلکہ آمدنی کے حصول کے لئے مسجد کی ملکیت ہوں گے۔

علامہ ابن الہمامؒ فتح القدیر میں تحریر فرماتے ہیں:

اما فما اشتراه المتولى من مستغلات الوقف فانه يجوز بيعه بلاهٰذا الشرط، وهذا لان فى صورته وقفا خلافا والمختار انه لايكون وقفاً فللقيم ان يبيعه متى شاء لمصلحة عرضت. (۲)

متولی وقف کی آمدنی سے جو خریدے اسے بغیر اس شرط کے (کہ وہ ناقابل انتفاع ہو گیا ہو) بیچنا جائز ہے، کیونکہ اس کے وقف ہونے میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ اسے وقف کی پیش آمدہ مصلحت کی خاطر بیچنا جائز ہے۔

محررِ مذہب شافعی علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ١٤١١ھ (٨٦٢/٥) و (٥/٥٦٤)

(۲) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ٨٦١ھ. فتح القدير، كوئٹہ، مكتبه رشيديه (٥/٤٣٧) مزید دیکھئے: الدر المختار (٤/٤١٧) البحر الرائق (٥/٢٠٧)

اما ما اشتراه الناظر للمسجد او وهبه له واهب وقبله الناظر فيجوز بيعه عند الحاجة بلاخلاف لانه ملك حتى اذا كان المشترىٰ للمسجد شقصا كان للشريك الاخذ بالشفعه ولو باع الشريك فللناظر الاخذ بالشفعة عند الغبطة هٰكذا ذكروه.[1]

متولی نے مسجد کے لئے جو چیزیں خریدلی ہیں یا کسی نے مسجد کو ہبہ کی ہیں اور متولی نے مسجد کے لئے قبول کیا ہے ضرورت کے وقت ان تمام چیزوں کو بیچنا بالاتفاق جائز ہے کیونکہ یہ چیزیں مسجد کی ملکیت ہیں، یہاں تک کہ اگر مسجد کے لئے خریدے جانے والی جگہ مشترک جگہ کا ایک حصہ ہو تو شریک کو حق شفعہ بھی ملتا ہے، اور اگر شریک بیچے تو وقف کی بہتری کی صورت میں متولی بھی وقف کے طرف سے حقِ شفعہ کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

ترجیح:

راجح جمہور فقہاء رحمہم اللہ کا موقف معلوم ہوتا ہے کہ وقف کی آمدنی سے خریدی جانے والی چیز وقف نہیں ہونی چاہئے بلکہ وقف کی ملکیت ہونی چاہئے، بیشک اس کا مصرف بھی وہی ہوگا جو وقف کا ہے لیکن وقف کی بہتری کے لئے اس کی فروخت وغیرہ میں وہ احکامات جاری نہیں ہوں گے جو وقف کی بیع میں جاری ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کے وقف ہونے کے لئے بہت سی شرائط ہیں جن کا تفصیلی ذکر ہم دوسرے باب کے تحت کر چکے ہیں وہ یہاں نہیں پائی جارہیں، وقف کی بنیادی شرط ہے کہ واقف کی طرف سے کوئی ایسا قول یا فعل پایا جانا چاہئے جو اس چیز کے قصداً وقف ہونے پر دلالت کرے، بلاقصد و ارادہ کوئی چیز وقف نہیں ہوتی، یہاں تو یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وقف آمدنی سے کوئی چیز خریدنے والا واقف ہی ہو، متولی اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہوسکتا ہے، اگر خریدی گئی چیز کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے وقف کہا جائے تو یہ نہ اصل وقف کا مالک ہے اور نہ ہی اس کی آمدنی کا، غیر مالک کی طرف وقف کی نسبت کیسے کی جاسکتی ہے؟ اور اصل واقف کی طرف نسبت کرتے ہوئے اسے وقف کہا جائے تو یہ بھی مشکل ہے کیونکہ اس کی ملکیت سے تو وقف پہلے ہی نکل چکا ہے، وہ بھی نہ وقف کا مالک رہا اور نہ اس کی

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ١٩٨٥م (٣٥٨/٥)

آمدنی کا مالک ہے، اسی طرح یہ بھی اشکال ہے کہ وہ آمدنی جو وقف سے حاصل ہوئی ہے وہ خود کیوں نہیں وقف ہوئی اس سے خریدی جانے والی چیز کیوں وقف ہوجاتی ہے؟ ان جیسے اور بھی اشکالات ہیں جو وقف کی آمدنی سے خریدی گئی چیز کو وقف قرار دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔ علامہ قاضی خان ؒ تحریر فرماتے ہیں:

المتولی اذا اشتری من غلة المسجد حانوتاً او دار او مستغلاً اخر جاز لان هٰذا من مصالح المسجد فاذا اراد المتولی ان یبیع مااشتری وباع اختلفوا فیه قال بعضهم لایجوز هٰذا البیع لان هٰذا صار من اوقاف المسجد وقال بعضهم یجوز هٰذا البیع وهو الصحیح لان المشتری لم یذکر شیئا من شرائط الوقف فلایکون مااشتری من جملة اوقاف المسجد. (۱)

متولی نے اگر مسجد کی آمدنی سے کوئی دوکان یا گھر یا اور کوئی جگہ آمدنی کے لئے خریدی تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ مسجد کے مصالح میں سے ہے، اگر متولی اس خریدے گئے گھر وغیرہ کو بیچنا چاہے تو اس میں اختلاف ہے، بعض نے فرمایا کہ جائز ہے، یہی صحیح ہے کیونکہ خریدتے وقت وقف کی شرائط میں سے کوئی شرط ذکر نہیں کی گئی تھی، لہٰذا جو چیز خریدی گئی ہے وہ مسجد کے اوقاف میں داخل نہیں ہوگی۔

نیز اگر ان چیزوں کو وقف قرار دیا جائے گا تو اس میں بڑا حرج بھی لازم آئے گا، ان کے عین کو بھی باقی رکھنا ضروری ہوگا، واقف نے جن مستحقین کو منافع وقف دینے کے لئے کہا تھا انہیں منافع دینے کی شکل تو پھر یہی ہوگی کہ وقف کی آمدنی ان میں براہِ راست تقسیم کردی جائے اگر براہِ راست تقسیم نہیں کی جائے گی اور اس سے کوئی چیز خرید لی جائے گی تو وقف ہوجانے کی وجہ سے وہ چیز مستحقین میں تقسیم نہیں کی جاسکے گی، پھر اس کے منافع کا انتظار کیا جائے گا اور وہ تقسیم کئے جاسکیں گے، اس میں واقف کا مقصد بھی فوت ہورہا ہے اور فقراء و مستحقینِ وقف کا بھی حرج لازم آرہا ہے، اس لئے ہمارے نزدیک راجح یہی ہے کہ وقف کی آمدنی سے خریدی جانے والی جائیداد وغیرہ وقف نہیں ہوگی بلکہ وہ وقف کی ملکیت ہوگی اور یہ ہم پہلے باب کے تحت مدلل طریقہ سے ثابت کرچکے ہیں کہ وقف اپنی حقیقت کے لحاظ سے شخصِ قانونی ہے اس میں

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۲ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیة، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲۹۷/۳)

مالک بننے کی صلاحیت موجود ہے، لہٰذا وہ اپنی آمدنی سے خریدی جانے والی چیز کا بھی مالک بن سکتا ہے، اور اس کا بھی وہی مصرف ہوگا جو وقف کا مصرف ہے۔

مدرسہ یا مسجد کو دی جانے والی رقم کا حکم:

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مدرسہ یا مسجد کو عام طور سے جو چندہ دیا جاتا ہے وہ وقف نہیں ہوتا بلکہ مدرسہ یا مسجد کی ملکیت ہوتا ہے الا یہ کہ دینے والے نے اس کے وقف ہونے کی صراحت کردی ہو۔ استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب ایک فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

> جب کوئی شخص اپنی کوئی رقم مسجد یا مدرسہ کے حساب میں جمع کرادے تو وہ رقم اس شخص کی ملکیت سے نکل کر مسجد کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے۔(۱)

اسی طرح امداد الاحکام میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے بھی صراحت کی ہے کہ یہ رقم وقف نہیں ہوگی۔ تحریر فرماتے ہیں:

> مدت سے یہ خلجان چلا آرہا تھا کہ مدارس اور مساجد میں جو رقوم یہ کہہ کر دی جاتی ہیں کہ یہ رقم مسجد یا مدرسہ میں دینی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور یہ کس عقد میں داخل ہے۔ اگر یہ وقف ہے تو وقف کے لئے تابید شرط ہے کہ عین یا اس کا بدل باقی رہے اور یہاں یہ صورت نہیں...... آج مدت بعد یہ اشکال اس طرح رفع ہوا کہ فقہاء نے ہبہ للمسجد کو صحیح مانا ہے...... چونکہ یہ وقف نہیں اس لئے بقاء عین و بدل ضروری نہیں، اور چونکہ ہبہ ہے اس لئے قبض متولی شرط ہے اور بعد قبض متولی ملک معطی زائل ہوجائے گا۔(۲)

---

(۱) دار العلوم، جامعہ دار العلوم کراچی، ماہنامہ البلاغ جلد ۳۳ شمارہ ۳، ربیع الاول ۱۴۱۹ھ

(۲) عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی۔ امداد الاحکام، کراچی، مکتبہ دار العلوم کراچی (۳/۲۲۰)

وقف یا اس کی آمدنی پر زکوٰۃ کا حکم

وقف یا اس کی آمدنی پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں فقہاء کرامؒ کی آراء مختلف ہیں:

فقہاء احناف کا موقف:

فقہاء احنافؒ کے نزدیک وقف یا اس کی آمدنی پر زکوٰۃ نہیں ہے، چاہے وہ کسی فردِ متعین پر وقف ہو یا کسی جہتِ خیر پر مثلاً مساکین، مساجد، مدارس وغیرہ پر وقف ہو۔ کیونکہ زکوٰۃ ایسے مال پر ہوتی ہے جو کسی شخص کی ملکیت میں ہو جبکہ وقف کسی شخص کی ملکیت میں نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا ہے اس لئے اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی نہ واقف پر لازم ہے اور نہ ہی موقوف علیہم پر۔

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

واما الشرائط التی ترجع الی المال فمنها: الملک فلا تجب الزکاة فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملک وهٰذا لان فی الزکاة تملیکاً والتملیک فی غیر المملک لایتصور والاتجب الزکاة فی المال الذی استولیٰ علیه العدو وأحرزوه بدریاهم عندنا لانهم ملکوها بالاحراز عندنا فزال ملک المسلم عنها.[1]

زکوٰۃ کی وہ شرائط جن کا مال سے تعلق ہے ان میں سے ایک شرط ملکیت ہے، لہٰذا وقف جانور اور وقف گھوڑے پر ملک کی شرط نہ پائی جانے کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ میں تملیک شرط ہے اور غیر مملک میں اس کا تصور نہیں ہوسکتا، ورنہ تو اس مال پر بھی زکوٰۃ ہونی چاہئے جس پر دشمن غالب آگئے اور اسے اپنے یہاں لے گئے، کیونکہ دار الحرب میں لے جانے سے ہمارے نزدیک وہ اس کے مالک ہو گئے مسلمان کی ملکیت اس سے زائل ہو گئی۔

---

(۱) الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۸۸/۲)

علامہ کاسانیؒ کی اس عبارت سے ایک اور علت عدمِ وجوبِ زکوٰۃ کی سامنے آئی کہ زکوٰۃ کا مقصد کسی کو مالک بنانا ہے، وقف جب مملوک ہی نہیں ہے تو کسی اور کو اس کا مالک کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ علامہ شامیؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ وقف پر زکوٰۃ واجب نہیں۔[1]

شافعیہ کا موقف:

حضرات شوافعؒ کے نزدیک اگر وقف جہت عامہ پر ہو جیسے مساکین، مساجد وغیرہ تو ایسے وقف پر بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے، اور اگر وقف کسی معین شخص یا افراد پر ہو تو اس میں دو رائے ہیں، ایک رائے کے مطابق اس کے موقوف علیہ پر وقف کی زکوٰۃ نکالنا بھی ضروری ہے جبکہ دوسری رائے میں زکوٰۃ واجب نہیں، شوافع کے یہاں چونکہ راجح یہی ہے کہ وقف پر موقوف علیہم کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی اس لئے ان کا راجح مذہب زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہی ہونا چاہئے کہ وقف پر بہر صورت زکوٰۃ فرض نہیں۔

محررِ مذہب شافعی علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

قال اصحابنا اذا كانت الماشية موقوفة على جهة عامة كالفقراء او المساجد او الغزاة او اليتامى وشبه ذلك فلا زكاة فيها بلاخلاف لانه ليس لها مالك معين وان كانت موقوفة على معين سواء كان واحداً او جماعة فان قلنا بالاصح ان الملك فى رقبة الموقوف لله تعالىٰ فلازكاة بلاخلاف كالوقف على جهة عامة وان قلنا بالضعيف ان الملك فى الرقبة للموقوف عليه ففى وجوبها عليه الوجهان المذكوران فى الكتاب بدليلهما اصحهما لاتجب.[2]

ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ اگر جانور جہتِ عامہ پر وقف ہو جیسے فقراء، مساجد، غازی، یتیم وغیرہ تو ان جانوروں پر بالاتفاق زکوٰۃ نہیں، کیونکہ ان کا کوئی معین شخص مالک نہیں ہے۔ اور اگر یہ کسی معین شخص یا جماعت پر وقف ہوں تو اگر ہم ملکیتِ وقف کے بارے میں اصح قول کو لیں کہ وقف پر اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوتی ہے تو ان جانوروں پر زکوٰۃ نہیں ہونی چاہئے جہتِ

---

(۱) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۵۹/۹)

(۲) یحییٰ بن شرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دار الفکر (۳۴۰/۵)

عامہ پر وقف کی طرح،اور اگر ملکیتِ وقف کے بارے میں ضعیف قول لیا جائے کہ وقف کی ملکیت موقوف علیہم کو حاصل ہوتی ہے تو ان جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہونے میں دو روایتیں ہیں،اصح یہی ہے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

حنابلہ کا موقف:

حنابلہ کے یہاں بھی اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں،ایک کے مطابق مالِ وقف پر زکوٰۃ ہے،اور دوسرے کے مطابق نہیں،ان کے راجح قول کے مطابق زکوٰۃ موقوف علیہم کے ذمہ واجب ہونی چاہئے، الشرح الکبیر میں ہے:

لاتجب الزكاة فى السائمة الموقوفة لان الملك لايثبت فيها فى وجه وفى وجه يثبت ناقصاً لايتمكن من التصرف فيها بانواع التصرفات وذكر شيخنا فى هذا الكتاب المشروح وجهاً اخران الزكاة تجب فيها و ذكره القاضى ونقل منها عن احمد مادل على ذلك لعموم قوله عليه السلام "فى أربعين شاة شاة" و لعموم غيره من النصوص، ولان الملك ينتقل الى الموقوف عليه فى الصحيح من المذهب اشبهت سائر املاكه. [1]

موقوفہ جانوروں میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے،ایک اعتبار سے تو ان میں ملکیت ثابت نہیں اور ایک اعتبار سے ان میں ملکیت ناقص ہے،موقوف علیہ ان میں ہر طرح کا تصرف نہیں کرسکتا، ہمارے شیخ نے ایک دوسری رائے لکھی ہے کہ ان میں زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے،اور قاضی نے اسے ذکر کیا ہے اور امام احمد سے ایسی روایت نقل کی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے،وجہ واجب ہونے کی یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "چالیس بکریوں میں ایک بکری واجب ہے" یہ عام ہے،اس کے علاوہ دیگر نصوص بھی عام ہیں،دوسرے یہ کہ اس کی ملکیت صحیح قول کے مطابق موقوف علیہم کی طرف منتقل ہوگئی ہے اور وہ اس کی دیگر املاک کی طرح ہوگیا۔

---

(۱) ابن قدامه، ابو الفرج عبد الرحمن بن ابى عمر و محمد بن احمد بن قدامه المقدسى. الشرح الكبير مع المغنى، بيروت دار الكتاب العربى ۱۹۷۲م (۲/۴۴۰)

مالکیہ کا موقف:

مالکیہ کے یہاں بھی وقف چونکہ واقف ہی کی ملکیت میں رہتا ہے اس لئے اس پر اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے۔ مالکی فقیہ علامہ دردیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

من وقف عيناً للسلف يأخذها المحتاج ويرد مثلها يجب على الواقف زكاتها لانها على ملكه فتزكى كل عام ولو بانضمامها لماله...... وكذلك من وقف حباليزرع كل عام فى ارض مملوكة او مستأجرة او حوائط ليفرق ثمرها فيزكى الحب والثمران كان فيه نصاب ولو بالضم لحب الواقف وثمره وكذلك وقف الانعام لتفرقة لبنها او صوفها او الحمل عليها او لتفرقة نسلها فان الجميع تزكى على مالك الوقف ان كان فيها نصاب ولو بالانضمام لما له ولا فرق بين كون الموقوف عليهم معينين او غيرهم ويقوم مقام الواقف ناظر الوقف فى جميع ماتقدم الا انه يزكيها على حدتها ان بلغت نصاباً ولا يتأتى الضم لما له لانه ليس مالكا.[1]

جس شخص نے کوئی مثلی چیز وقف کی قرض کے لئے کہ ضرورتمند وہ بطور قرض لے لے اور پھر اس کا مثل کچھ عرصہ بعد واپس کر دے تو واقف پر اس کی زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ یہ موقوفہ چیز اسی کی ملکیت میں باقی ہے، لہٰذا ہر سال اس کی زکوٰۃ دی جائے گی اگر چہ وہ خود بقدر نصاب نہ ہو لیکن اس کے دیگر اموال کے ساتھ مل کر نصاب کو پہنچ جائے۔ اسی طرح جس شخص نے غلہ وقف کیا کہ ہر سال اس کے ذریعہ مملوکہ زمینوں یا کرایہ کی زمینوں میں زراعت کی جائے یا اس نے باغ وقف کیا کہ اس کے پھل تقسیم کر دئے جائیں تو اس پر غلہ اور پھل کی زکوٰۃ واجب ہوگی اگر وہ بقدر نصاب ہوں یا واقف کے دیگر غلہ اور پھل کے ساتھ مل کر نصاب کو پہنچ جائیں، اسی طرح اگر کسی نے جانور وقف کئے کہ ان کا دودھ یا ان کا اون تقسیم کر دیا جائے یا ان پر سواری کی جائے یا ان کی نسل تقسیم کی جائے تو واقف پر ان کی زکوٰۃ واجب

---

(۱) الدردير، ابو البركات احمد بن محمد الدردير. الشرح الصغير، مصر، دار المعارف، طبع فى سنة ۱۳۹۲ھ (۶۵۰/۱)

ہوگی، اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ موقوف علیہم متعین ہوں یا نہ ہوں، متولی ان تمام مسائل میں واقف کا قائم مقام ہوگا البتہ وہ ان تمام چیزوں کی زکوٰۃ علیحدہ دے گا اگر یہ بقدر نصاب ہوں اور اگر یہ بقدر نصاب نہ ہوں تو انہیں اپنے دیگر اموالِ زکوٰۃ کے ساتھ نہیں ملائے گا کیونکہ وہ ان کا مالک نہیں ہے۔

شیخ زحیلی مالکیہ کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وتجب الزكاة على الواقف في ملكه ان بلغ نصابا او نقص عن النصاب وكان عند الواقف مايكمل به النصاب ان تولى المالك القيام به بأن كان النبات تحت يد الواقف يزرعه ويعالجه حتى يثمر ثم يفرقه لان الوقف لايخرج العين عندهم عن الملك. [1]

واقف پر وقف کی زکوٰۃ واجب ہے اگر وقف خود نصاب کے بقدر ہو یا واقف کے دیگر اموال کے ساتھ مل کر نصاب کو پہنچ جائے بشرطیکہ واقف خود ہی وقف کا انتظام سنبھالتا ہو کہ زرعی زمین اس کے پاس ہی ہو وہ اس میں زراعت کرتا ہو اور اس کی نگہبانی کرتا ہو، جب پیداوار تیار ہو جائے تو اسے تقسیم کرتا ہو، کیونکہ مالکیہ کے نزدیک وقف کی ذات واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتی۔

قول راجح:

راجح احناف ہی کا قول معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ہم پہلے باب میں دلائل سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وقف نہ واقف کی ملکیت ہوتا ہے اور نہ موقوف علیہم کی ملکیت، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں چلا جاتا ہے، جب اس پر نہ واقف کی ملکیت ہے اور نہ موقوف علیہم کی تو پھر ان میں سے کسی ایک پر زکوٰۃ کیسے واجب کی جاسکتی ہے؟

نیز جو لوگ ملکیت مانتے ہیں ان کے نزدیک بھی ملکِ ناقص ہی حاصل ہے، واقف یا موقوف علیہم کو ملکیت کے باوجود تمام تصرفات کا حق نہیں ہے جبکہ زکوٰۃ کیلئے ملکِ تام ضروری ہے، اس لئے ہمارے نزدیک وقف یا اس کی مملوکات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہونی چاہئے۔[2]

---

(۱) الزحيلي، الدكتور وهبة الزحيلي. الفقه الاسلامي وادلته، بيروت، دار الفكر، الطبعة الاولىٰ ۱۹۸۴م (۲/۷۴۲)

(۲) دیکھئے: دیوبندی، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، کراچی، دارالاشاعت (۶/۴۹) حضرت لکھتے ہیں: مدرسہ کا چندہ جو بقدر نصاب جمع ہو جاتا ہے اور سال بھر اس پر گذر جاتا ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

وقف کی زرعی پیداوار پر عشر وخراج کا شرعی حکم

مالکیہ واحناف کا موقف:

فقہاء واحناف ؒ ومالکیہ ؒ کے نزدیک وقف زمین کی زرعی پیداوار پر عشر وخراج واجب ہے، خواہ وہ زمین معین افراد پر وقف ہو یا جہتِ عامہ پر وقف ہو۔

اس کی وجہ فقہاء کرام رحمہم اللہ کے کلام سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عشر وخراج کا تعلق زمین کی پیداوار سے ہے نہ کہ زمین کی ملکیت سے، وقف میں اگرچہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی لیکن اس کی پیداوار تو موقوف علیہم کی ملکیت ہوتی ہے اس لئے اس کا عشر وخراج ادا کیا جائے گا۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فلان العشر مؤونة الارض النامية كالخراج فلا يعتبر فيه غنى المالك ولهٰذا لايعتبر فيه اصل الملك عندنا حتى يجب فى الارضى الموقوفة. (۱)

عشر ارض نامیہ پر واجب ہونے والی ذمہ داری ہے خراج کی طرح، اس میں مالک کی مالداری کا اعتبار نہیں ہے اسی وجہ سے اس میں ملکیت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ وقف زمین پر عشر واجب ہے۔

علامہ شامی ؒ لکھتے ہیں:

افاد ان ملك الارض ليس بشرط لوجوب العشر وانما الشرط ملك الخارج لانه يجب فى الخارج لافى الارض فكان ملكه لها

---

(۱) الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود الكاساني المتوفى ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بيروت، دار احياء التراث العربي (۲/۸۴) و (۲/۱۷۳)

وعدمه سواء.(۱)

معلوم ہوا کہ عشر کے وجوب کے لئے زمین کی ملکیت شرط نہیں، پیداوار کی ملکیت ضرور ہے کیونکہ عشر پیداوار میں واجب ہوتا ہے نہ کہ زمین میں،اس لئے زمین کی ملکیت وعدم ملکیت برابر ہے۔

مالکی فقیہ علامہ دردیرؒ لکھتے ہیں:

وکذلک من وقف حبا لیزرع کل عام فی ارض مملوکة أو مستأجرة او حوائط لیفرق ثمرها فیزید الحب والثمر، ان کان فیه نصاب ولوبالضم لحب الواقف و ثمره ...... فان الجمیع تزکی علی ملک الوقف.(۲)

اسی طرح کسی نے غلہ وقف کیا کہ اس کے ذریعہ زراعت کی جائے ارض مملوکہ یامستأجرہ میں، یاباغ وقف کیا کہ اس کا پھل تقسیم کیا جائے،غلہ اور پھل میں اضافہ ہوگیا تو اگر وہ بقدر نصاب ہوں یا اس کے دیگر پھل کے ساتھ مل کر نصاب کو پہنچ جائیں تو ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

وقف کی پیداوار پرعشر واجب ہونے پرعلامہ ابن رشدؒ کا اعتراض:

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف چاہے متعین لوگوں پر ہو یا جہتِ عامہ، جیسے فقراء، مساکین، مسافر،طلبہ دین وغیرہ پر بہرصورت اس کی پیداوار پرعشر واجب ہوگا۔

اس پرعلامہ ابن رشدؒ اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر وقف متعین لوگوں پر ہوتب تو عشر کا واجب ہونا سمجھ میں آتا ہےلیکن اگر وقف جہتِ عامہ پر ہوتو عشر واجب ہونے میں دو اعتراض ہیں:

نمبر۱: ان کی ملکیت وقف پر ناقص ہے۔

نمبر۲: وقف کا مصرف جو لوگ ہیں وہی عشر کا مصرف ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انہی سے عشر لے کر انہیں ہی واپس دیا جارہا ہے۔لکھتے ہیں:

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ (۳۲۶/۴)

(۲) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الصغیر، مصر، دار المعارف، طبع فی سنة ۱۳۹۲ھ (۶۵۰/۱)

المسئلة الاولیٰ: هی زکاة الثمار المحبسة الاصول فان مالکاً والشافعی کانا یوجبان فیها الزکاة وکان مکحول و طاؤس یقولان لازکاة فیها وفرق قوم بین ان تکون محبوسة عل المساکین وبین ان تکون علی قوم باعیانهم ولم یوجبوا فیها الصدقة اذا کانت علی المساکین ولا معنی لمن اوجبها علی المساکین لانه یجتمع فی ذلک شیئان اثنان احدهما انها ملک ناقص والثانیة انها علی قوم غیر معینین من الصنف الذین تصرف الیهم الصدقة لامن الذین تجب علیهم. [۱]

کسی نے درخت وقف کئے اس سے جو پھل حاصل ہوئے امام مالکؒ وشافعیؒ اس کی زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں، مکحولؒ اور طاؤسؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، بعض حضرات نے اس میں فرق کیا ہے کہ وہ مساکین پر وقف ہوں یا کسی معین قوم پر، اگر مساکین پر وقف ہوں تو وہ اس پر زکوٰۃ واجب نہیں کرتے، اور مساکین پر زکوٰۃ واجب کرنے کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی، اس میں دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ ان کی ملکیت ملکیتِ ناقص ہے، دوسرے یہ کہ یہ درخت غیر معین لوگوں پر وقف ہیں یعنی ان لوگوں پر وقف ہیں جن پر صدقہ خرچ کیا جاتا ہے جن پر صدقہ واجب ہوتا ہے ان پر وقف نہیں، لہٰذا جن پر صدقہ صرف کیا جاتا ہے ان پر ہی زکوٰۃ واجب کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اعتراض کا جواب:

علامہ ابن رشدؒ کے یہ اعتراض زیادہ وزنی نہیں کیونکہ عشر کا تعلق مالکِ ارض سے نہیں بلکہ پیداوار سے ہے، واقف کی ملکیت وقف زمین پر ناقص ہوسکتی ہے لیکن پیداوار تو موقوف علیہم کے لئے ہے جنہیں اس پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ اور جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے اس کا جواب بھی واضح ہے اگر واقف نے جہتِ عامہ کو وقف کا مصرف قرار دیا ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو مصارفِ وقف ہوں وہی عشر کا بھی مصرف ہوں، دیکھئے اگر واقف نے مسافرین کے لئے زمین وقف کی تو پیداوار حاصل ہونے کے بعد

---

(۱) ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی الشهیر بابن رشد الحفید ۵۹۵ھ. بدایة المجتهد، مصر، مطبعه علی محمد صبیح (۱/۲۲۴)

وہ پیداوار تو مسافرین کے لئے ہوگی لیکن اس کا عشر اگر نکالا جائے گا تو محض مسافر ہونے کی بناء پر وہ اس کے مستحقین میں نہیں ہوں گے، انہیں عشر میں سے کچھ نہیں ملے گا، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو وقف کا مصرف ہو وہی عشر کا بھی مصرف ہو۔ بہت سے فقہی عبارات سے یہ جواب معلوم ہوتا ہے مثال کے طور پر: علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

واذ ادفعها مزارعة فالخراج او العشر من حصة اهل الوقف لانها اجارة معنىً ولا يسقط العشر بوقف الارض لان الله تعالىٰ عين له وجها فلا يتغير بالوقف الاترى انه يجوز وقفها على غير من جعل الله له العشر ابتداء وصار كما لونذر التصدق بهاتين المأتين ثم حال عليها الحول فانه يلزمه زكاتها ثم يصرف الباقي فيما نذر. (۱)

اگر موقوفہ زمین مزارعت پر دی تو خراج اور عشر اہلِ وقف پر واجب ہوگا کیونکہ مزارعت حکماً اجارہ ہی ہے زمین کے وقف کر دینے سے اس کا عشر ساقط نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عشر کا مصرف متعین فرما دیا ہے وقف سے وہ باطل نہیں ہوگا، دیکھئے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عشر کا مستحق بنایا ہے وقف ابتداءاً ان کے علاوہ اور لوگوں پر بھی ہوسکتا ہے، جیسے کسی نے نذر مانی کہ میں یہ سو درہم صدقہ کروں گا پھر ان پر سال گذر گیا تو ان دراہم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، پھر جو باقی بچے گا وہ راہِ نذر میں خرچ کرنا ضروری ہوگا۔

علامہ رملیؒ فتاویٰ خیریہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وقد صرحوا بان العشر والخراج لايسقطان بوقف الارض لان الشارع عين لهما وجها فلايتغير بالوقف. (۲)

علماء نے صراحت کی ہے کہ عشر اور خراج زمین وقف کرنے سے ساقط نہیں ہوتے کیونکہ عشر و خراج کے مصارف شارع نے متعین فرمائے ہیں وہ وقف سے تبدیل نہیں ہوسکتے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۲۹) مزید دیکھئے: هلال الرای، هلال بن يحيىٰ بن مسلم الرای. كتاب احكام الوقف، حيدر آباد دكن، دائرة المعارف العثمانية ۱۳۵۵ھ (۲۱۳)

(۲) الرملی، خير الدين الرملی. الفتاوى الخيرية بهامش العقود الدريه فی تنقيح الفتاوى الحامديه، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۳۴۶/۱)

المحیط البرہانی میں ذرا مختلف انداز میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اس میں ہے:

ارض الوقف اذا كانت عشرية دفعها مزارعة او معاملة فعشر جميع الخارج في نصيب الدافع هذا على قول أبي حنيفة ...... وعندهما يجب في الخارج ...... وكان ينبغي ان لا يجب العشر في ارض الوقف لان الوقف في الحاصل على الفقراء والعشر للفقراء وانما وجب لان الاخذ يختلف لان حق اخذ العشر للسلطان وله فيه حق المعامله واما الوقف فالقيم هو الذي يتصرف فيه وهو نظير المال المنذور بالتصدق بها اذا حال عليها الحول تجب الزكاة فيها ...... وان كان المصرف في كلا الحقين واحد. (۱)

وقف زمین اگر عشری ہو اور متولی نے اسے مزارعت یا مساقاۃ پر دیا ہوا ہو تو تمام پیداوار کا عشر زمین دینے والے یعنی موقوف علیہم پر ہوگا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، اور صاحبین کے نزدیک پیداوار میں عشر ہوگا، مناسب تو یہ تھا کہ وقف زمین میں عشر واجب نہ ہو کیونکہ وقف بھی بالآخر فقراء کے لئے ہوتا ہے اور عشر بھی فقراء کے لئے ہے، لیکن عشر اس لئے واجب ہوتا ہے کہ عشر لینے کا حق بادشاہ کو ہے اور اسے اس میں تصرف کا اختیار ہے جبکہ وقف میں متولی تصرف کرتا ہے اس کی مثال اس مال کی ہے جس کے صدقہ کی نذر مانی ہو تو جب اس مال پر سال گذر جائے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے حالانکہ نذر اور زکوٰۃ دونوں کا مصرف ایک ہی ہے۔

شوافع وحنابلہ کا موقف:

فقہاء شوافع، حنابلہ کے نزدیک وقف زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہونے میں تفصیل ہے، اگر کسی متعین شخص یا افراد پر وقف ہو تب تو پیداوار پر عشر ہوگا لیکن اگر وقف جہتِ عامہ پر ہو جیسے مساکین، مسافرین، مساجد وغیرہ تو ایسی صورت میں عشر واجب نہیں ہوگا۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) ابن مازه البخاري، برهان الدين ابو المعالي محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاري ٦١٦ ٥. المحيط البرهاني، كراچي، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۴م (۹/۳۷)

ثمار البستان و غلة الارض الموقوفين ان كانت على جهة عامة كالمساجد والقناطر والمدارس والمرابط والفقراء والمجاهدين والغرباء واليتامىٰ والارامل وغير ذلک فلازكاة فيها هذا هو الصحيح المشهور من نصوص الشافعي رضي الله عنه وبه قطع الاصحاب...... وان كانت موقوفة على انسان معين او جماعة معينين او على اولاد زيد مثلاً وجب العشر بلاخلاف لانهم يملكون الثمار والغلة ملكا تاما يتصرفون فيه جميع انواع التصرف. (۱)

موقوفہ باغ کا پھل اور موقوفہ زمین کی پیداوار اگر جہتِ عامہ کے لئے وقف ہوں جیسے مساجد، پُل، مدارس، فوجی چھاؤنیاں، فقراء، مجاہدین، غرباء، یتیم اور بیوہ وغیرہ تو اس پھل اور پیداوار پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی یہی صحیح اور مشہور موقف ہے امام شافعیؒ کا، اور اگر کسی معین انسان یا جماعت پر وقف ہو یا زید کی اولاد پر مثلاً وقف ہو تو عشر واجب ہوگا بالاتفاق، کیونکہ وہ پھل اور پیداوار کے مکمل مالک ہیں ان میں ہر طرح کا تصرف کر سکتے ہیں۔

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وجملة ذلک ان الوقف اذا كان شجرا فأثمرا وارضاً فزرعت وكان الوقف على قوم بأعيانهم فحصل لبعضهم من الثمرة او الحب نصاب ففيه الزكاة ...... ولنا انه استغل من ارضه او شجره نصابا فلزمته زكاته كغير الوقف يحققه ان الوقف الاصل والثمرة طلق والملک فيها تام له التصرف فيها بجميع التصرفات وتورث عنه فتجب فيها الزكاة...... اما المساكين فلا زكاة عليهم فيما يحصل في ايديهم سواء حصل في يدبعضهم نصاب من الحبوب والثمار او لم يحصل ولا زكاة عليهم قبل تفريقها وان بلغت نصبا، لان الوقف على المساكين لايتعين لواحدٍ منهم يجوز حرمانه والدفع الى غيره وانما

---

(۱) يحيىٰ بن شرف النووى. المجموع شرح المهذب، بيروت دار الفكر (۵/۵۷۵) مزید دیکھئے: مغنی المحتاج (۱/۳۸۲)

ثبت الملک فیه بالدفع و القبض لما اعطیه من غلته ملکاً مستأنفا فلم تجب علیه فیه زکاة الخ.[1]

خلاصہ یہ ہے کہ وقف درخت ہو جس میں پھل آ جائیں یا زمین ہو جس میں زراعت کی گئی ہو اور وقف معین لوگوں پر ہو تو اگر انہیں پھل یا زرعی پیداوار میں سے بقدر نصاب مل جائے تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے، ہماری دلیل یہ ہے کہ اس مستحق نے زمین یا درخت سے بقدرِ نصاب کما لیا ہے، لہٰذا اس پر اس کی زکوٰۃ ہونی چاہئے غیر وقف کی طرح، کیونکہ وقف تو اصل زمین یا درخت ہے پھل تو وقف نہیں اور اس میں اس کی ملکیت بھی تام ہے اسے اس میں تصرفات کا حق حاصل ہے نیز اس کے انتقال کے بعد اس کی میراث بھی جاری ہوگی لہٰذا زکوٰۃ بھی آنی چاہئے مساکین وغیرہ جو افراد متعین نہیں ہیں انہیں ان پھلوں اور پیداوار میں سے جو ملے گا وہ اگرچہ بقدرِ نصاب ہو ان پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں، ان پر تقسیم سے پہلے زکوٰۃ نہیں کیونکہ وقف علی المساکین کسی ایک مسکین کے لئے متعین نہیں ہے، ہر ایک میں یہ احتمال ہے کہ اسے محروم کر کے کسی اور کو دیدیا جائے، ان کی ملکیت تو اس وقت ثابت ہوگی، جب ہر ایک کو وہ پھل یا پیداوار دیدیجائے اور وہ اس پر قبضہ کر لیں ملکِ جدید کے طور پر۔

ـ یح:

علامہ نوویؒ اور علامہ ابن قدامہؒ نے متعین افراد پر وقف اور جہتِ عامہ پر وقف میں جو فرق بیان یا ہے کہ اگر وقف متعین افراد پر ہو تو وہ چونکہ اس زرعی پیداوار کے مالک ہوتے ہیں اس لئے ان پر عشر کی یگی لازم ہوگی، اور اگر وقف جہتِ عامہ پر ہو تو چونکہ وہ اس کے مالک نہیں ہیں اس لئے وقف کی اس عی پیداوار پر عشر واجب نہیں ہوگا۔ یہ فرق مخدوش ہے کیونکہ جہتِ عامہ پر وقف کی صورت میں بیشک ا کین فقراء وغیرہ اس وقت تک اس زرعی پیداوار کے مالک نہیں بنتے جب تک انہیں یہ نہ دیدی جائے۔ ن انہیں دینے سے پہلے یہ پیداوار کسی کی ملکیت تو ہوگی مثلاً احناف کے نزدیک وقف کی ملکیت ہوگی، افع کا راجح مذہب بھی یہی ہے، پیداوار حاصل ہوتے ہی جب ملکیت پائی گئی تو مالک پر عشر بھی واجب

---

[1] ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ. المغنی، اض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۲۸/۸)

ہوگا، وہ مالک احناف وشوافع کے نزدیک وقف ہی ہے لہٰذا اس کے ذمہ عشر کی ادائیگی لازم ہوگی، عشر میں تو صرف ملکِ خارج یعنی پیداوار کی ملکیت ہی وجوبِ عشر کے لئے کافی ہے، خواہ مالک مکلّف ہو یا نہ ہو اور شخصِ حقیقی ہو یا نہ ہو۔ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

واما العقل والبلوغ فليسامن شرائط اهلية وجوب العشر حتى يجب فى ارض الصبى والمجنون...... ولهٰذا لومات من عليه العشر والطعام قائم يؤخذمنه بخلاف الزكاة فانها تسقط بموت من هى عليه، وكذا ملك ارض ليس بشرط لوجوب العشر وانما الشرط ملك الخارج فيجب فى الاراضى التى لامالك لها وهى الاراضى الموقوفة ...... ولان العشر يجب فى الخارج لافى الارض فكان ملك الارض وعدمه بمنزلة واحدة ويجب فى الارض المأذون والمكاتب لما قلنا. (۱)

عقل اور بلوغ وجوبِ عشر کی اہلیت کے لئے شرط نہیں، یہاں تک کہ نابالغ اور مجنون کی زمین پر بھی عشر واجب ہوتا ہے، اسی وجہ سے اگر وہ شخص جس پر عشر واجب ہے اس کا انتقال ہوجائے اور غلہ موجود ہو تو عشر لیا جائے گا جبکہ زکوٰۃ نہیں لی جاتی وہ مرنے سے ساقط ہوجاتی ہے، اسی طرح زمین کا مالک ہونا بھی شرط نہیں، شرط تو یہ ہے کہ وہ پیداوار کا مالک ہو لہٰذا ایسی زمینوں پر بھی عشر واجب ہے جن کا کوئی مالک نہیں جیسے موقوفہ زمینیں، کیونکہ عشر پیداوار پر واجب ہوتا ہے زمین پر نہیں، لہٰذا زمین کا مالک ہونا نہ ہونا برابر ہے، یہی وجہ ہے کہ عبد ماذون اور مکاتب کی زمینوں پر بھی عشر واجب ہے۔

حنابلہ کے نزدیک تو وقف راجح قول کے مطابق موقوف علیہم کی ملکیت ہوتا ہے تو وقف کی پیداوار پر موقوف علیہم کی ملکیت ثابت نہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

اس لئے راجح احناف ہی کا مذہب معلوم ہوتا ہے کہ وقف کی پیداوار پر مطلقاً عشر واجب ہے کیونکہ عشر کا تعلق پیداوار سے ہے خواہ وہ کسی کی بھی ملکیت ہو، مکلّف ہو یا غیر مکلّف، شخصِ حقیقی ہو یا شخصِ حکمی۔

---

(۱) الكاسانى، علاء الدين ابوبكر بن مسعود الكاسانى المتوفى ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بيروت، دار احياء التراث العربى (۱۷۳/۲)

وقف میں مزارعۃ کی مختلف صورتیں اور ادائیگی عشر کی ذمہ داری:

وقف زمین میں اگر زراعت کی جائے تو اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) متولی وقف خود ہی یا کسی شخص کو اجرت پر متعین کر کے وقف زمین میں زراعت کرے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ متولی یا مزدور کو محض اجرت ملے گی مکمل پیداوار وقف ہی کی ہوگی، اس لئے اس کے عشر کی ادائیگی وقف پر ہی لازم ہوگی۔[۱]

(۲) متولی وقف کسی شخص کے ساتھ مزارعت (بٹائی) کا معاملہ کرے کہ زمین وقف فراہم کرے اور کاشت کاری مزارع کرے اور جو پیداوار ہو وہ مثال کے طور پر نصف نصف دونوں کی ہو تو یہ بھی جائز ہے، پیداوار وقف اور مزارع میں تقسیم کرنے سے پہلے اس کا عشر نکالا جائے گا، لہٰذا دونوں فریق کے حصہ سے عشر کی ادائیگی ہوگی۔

(۳) متولیِ وقف، وقف زمین کسی کو اجارہ پر دیدے اور اس سے لم سم ایک اجرت طے ہو جائے تو اس صورت میں ظاہر ہے وقف کو تو زرعی پیداوار نہیں ملے گی بلکہ محض کرایہ ملے گا اس لئے جمہور ائمہ ثلاثہ و حضراتِ صاحبین رحمہم اللہ کے مسلک کے مطابق مستأجر پر عشر واجب ہوگا، وقف پر عشر واجب نہیں ہوگا۔

وقف زمین پر سرکاری ٹیکس کی شرعی حیثیت:

عام طور پر ملکی قوانین میں وقف کو ہر طرح کے ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے، نہ اس کی ذات پر کوئی ٹیکس عائد کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی آمدنی پر، لیکن اگر حکومت ملکی ضروریات پوری کرنے کے لئے وقف کی آمدنی پر ٹیکس عائد کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ بھی نہیں، ایسی صورت میں متولی وقف کی ذمہ داری ہوگی کہ یہ بروقت ٹیکس کی ادائیگی کا اہتمام کرے تاکہ وقف کے ضائع ہونے یا ضبط ہونے کا اندیشہ نہ ہو، فقہاء کرامؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ متولی وقف کی آمدنی سے ٹیکس کی ادائیگی پہلے کرے پھر کچھ بچے تو وقف کے مصارف پر خرچ کیا جائے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۳۴/۴)

ودخل فی ذلک دفع المرصد الذی علی الدار فانه مقدم علی الدفع للمستحقین.[1]

اس میں وہ ٹیکس دینا بھی داخل ہے جو موقوفہ گھر پر ہے، اس کی ادائیگی مستحقین کو دینے سے پہلے کی جائے گی۔

وجہ ظاہر ہے کہ ٹیکس تعمیر کی طرح وقف کی بقاء کے لئے ناگزیر ہے، وقف باقی رہے گا تو مستحقین کو کچھ ملے گا، اس لئے جس طرح وقف کی ضروری تعمیر کا خیال رکھا جاتا ہے اور اسے مقدم رکھا جاتا ہے اسی طرح وقف کے ذمہ واجب الاداء ٹیکس اور دوسرے یوٹیلیٹی بل مثلاً گیس، بجلی، پانی وغیرہ کی ادائیگی مستحقین کو دینے سے پہلے کی جائے گی۔

---

(۱) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۷/۴)

بابِ پنجم

وقف کے مصارف

پانچواں باب

وقف کے مصارف

اس باب میں ہم ان عنوانات پر بھی گفتگو کریں گے جو اس باب کے تحت ہم نے خطۃ البحث میں ذکر کئے ہیں اور ان کے علاوہ ان عنوانات پر بھی بحث کریں گے جن کا ذکر ہم نے پہلے باب کی فصلِ ثالث کے تحت کیا ہے۔ اس لئے ہم اس باب کو دو فصلوں پر تقسیم کریں گے، پہلے حصہ میں ان امور پر گفتگو کریں گے جن کا مصرف متعین کرتے وقت لحاظ رکھنا ضروری ہے، اور دوسرے حصہ میں واقف کے ان اختیارات پر گفتگو کریں گے جو شریعت نے اسے واقف ہونے کی حیثیت سے تعیینِ مصرف کے سلسلہ میں عطا کئے ہوئے ہیں۔

فصلِ اول

وہ امور جن کا مصرف متعین کرتے وقت لحاظ رکھنا ضروری ہے

وقف کا مصرف متعین کرتے وقت پہلی شرط جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وقف انتہاءً ایسی جہت اور مصرف پر کیا جائے جو فی نفسہٖ قربۃ اور باعث ثواب ہو۔ یعنی اگر ایک مسلمان اس جہت پر کچھ خرچ کرے تو شریعت کی نگاہ میں اسے صدقہ کا ثواب ملے جیسے فقراء و مساکین کے لئے وقف کیا جائے، مساجد و مدارس پر وقف کیا جائے، بیماروں کے علاج کے لئے وقف کیا جائے، رفاہِ عامہ کے کاموں کے لئے وقف کیا جائے، ان تمام صورتوں میں یہ جہات جہاتِ قربۃ ہیں اور ان پر خرچ کرنا باعثِ ثواب ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔ علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وشرطه شرط سائر التبرعات وان يكون قربة فى ذاته، وفى الشامية: اى بان يكون من حيث النظر الى ذاته و صورته قوبة والمرادان يحكم الشارع بانه لوصدر من مسلم يكون قوبة حملا على انه قصد القربة. (۱)

وقف کے لئے وہ تمام شرائط لاگو ہیں جو کسی بھی تبرع کے لئے ضروری ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا مصرف فی نفسہٖ باعثِ ثواب ہو۔ شامی میں ہے کہ وقف کا مصرف اپنی ذات

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدين الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۱/۴) نیز دیکھئے: الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۱۵)

اور صورت کے اعتبار سے قربت ہو یعنی اگر کسی مسلمان سے وہ عمل صادر ہو تو شریعت اس پر عبادت ہونے اور موجبِ ثواب ہونے کا حکم لگائے۔

قربت سے مراد:

شیخ زرقاء ''قربۃ'' کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

فالقربة هي مايتقرب به الى الله تعالىٰ فتدخل فيها العبادات المفروضة التى توقف لها المساجد كما توقف الاموال للقائمين على الوظائف المتعلقة بها و تدخل فيها ايضاً جميع الاعمال التى حض الشرع عليها وندب اليها كطلب العلم والصدقة على الفقراء واسعاف المرضى وايواء الايتام ووسائل الجهاد. الخ. [1]

قربۃ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے اس میں وہ فرض عبادات بھی داخل ہیں جن کے لئے مسجد قائم کی جاتی ہے اسی طرح مسجد سے متعلق اعمال جو لوگ انجام دیتے ہیں ان پر بھی وقف کیا جاسکتا ہے، اسی طرح قربت میں وہ تمام اعمال داخل ہیں جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے اور ان کی انجام دہی کو پسند کیا ہے جیسے علم طلب کرنا، فقراء پر صدقہ کرنا، مریضوں کی مدد کرنا، یتیموں کو ٹھکانہ دینا، اور جہاد کے وسائل میں خرچ کرنا۔

جہتِ معصیت پر وقف درست نہیں:

لہٰذا اگر جہتِ موقوفہ معصیت ہو یا معصیت تو نہ ہو لیکن وجہِ قربت اور باعثِ ثواب بھی نہ ہو تو محض اس جہت پر وقف کرنا احنافؒ کے نزدیک جائز نہیں، اس اصول کی بنیاد پر فقہاء احنافؒ نے درج ذیل وقف کی صورتوں کو معتبر قرار نہیں دیا:

الف: کوئی شخص ایسے مصرف پر وقف کرے جو شریعت کی نگاہ میں معصیت ہی معصیت ہے جیسے مسلمان نصاریٰ یا یہود کے عبادت خانہ کے لئے وقف کرے یا قمار و شراب خانہ کے لئے وقف کرے یا

---

(۱) الزرقاء، مصطفى احمد الزرقاء. احكام الاوقاف، دمشق (۱/۵۲)

سودی کاروبار کرنے کے لئے کوئی چیز وقف کرے تو ایسا وقف شرعاً معتبر نہیں ہوگا۔ ہندیہ میں ہے:

لایصح وقف المسلم او الذمی علی البیعة والکنیسة او علی فقراء أهل الحرب. (۱)

مسلمان یا ذمی کا یہودیوں یا عیسائیوں کے عبادت خانہ پر وقف کرنا یا اہلِ حرب کے فقراء پر وقف کرنا درست نہیں ہے۔

یہی موقف دیگر ائمہ کا بھی ہے کہ یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

فینظر فی الجهة ان کانت علی المعصیة کعمارة الکنیسة وقنادیلها و حصرها و کتب التوراة والانجیل لم یصح سواء وقفه مسلم او ذمی...... ولو وقف لسلاح قطاع الطریق اولألات سائر المعاصی فباطل قطعاً. (۲)

جہتِ وقف کو دیکھا جائے گا اگر وہ وقف معصیت پر ہو جیسے کنیساء کی تعمیر اور اس کی قندیلوں و چٹائیوں کے لئے وقف کیا جائے اور تورات وانجیل کے لئے تو یہ وقف صحیح نہیں ہوگا، خواہ مسلمان وقف کرے یا ذمی اور اگر ڈاکوؤں کے اسلحہ کے لئے وقف کیا یا گناہ کے اسباب و آلات کے لئے تو یہ وقف بھی بالکل باطل ہوگا۔

حنبلی فقیہ علامہ بہوتیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولا یصح الوقف علی کنائس و بیوت نارو بیع و صوامع و دیورة و مصالحها کقنادیلها و فرشها و وقودها و سدنتها لانه معونة علی المعصیة. (۳)

---

(۱) نظام، الشیخ نظام و جماعة علماء الهند من القرآن الحادی عشر. الفتاویٰ الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۳۵۳/۲)

(۲) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبین و عمدة المفتین، بیروت، مکتب اسلامی ۱۹۸۵م (۳۱۹/۵) مزید ملاحظہ فرمائیے: الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۸۰/۲)

(۳) البهوتی، منصور بن یونس بن ادریس البهوتی ۱۰۵۱ه. کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۴ه (۲۷۵/۴) وکذا فی المغنی (۲۳۴/۸)

عیسائیوں کے گرجا، مجوسیوں کے آتشکدہ اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کے لئے اور ان کے مصالح جیسے ان کی قندیلوں، فرش، آگ جلانے کے انتظام وغیرہ کے لئے وقف کرنا درست نہیں کیونکہ یہ گناہ اور معصیت میں تعاون ہے۔

فقیہ مالکی علامہ دردیرؒ الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں:

وبطل الوقف على معصية كجعل غلته فى ثمن خمر او حشيشة او سلاح لقتال غير جائز ويدخل فيه وقف الذمى على الكنيسة سواء كان لعبادها او لمرمتها. (۱)

معصیت کے کام کے لئے وقف کرنا باطل ہے جیسے کوئی کہے کہ وقف کی آمدنی شراب یا افیون خریدنے کے لئے استعمال کی جائے یا پھر ناجائز لڑائی کے لئے اسلحہ خریدنے پر خرچ کی جائے، اسی طرح اگر ذمی گرجا گھر پر وقف کرے خواہ اس میں عبادت کرنے والوں کے لئے وقف ہو یا اس کی مرمت کے لئے، یہ وقف جائز نہیں۔

شیخ زرقاءؒ لکھتے ہیں:

وتخرج بهذه الشريطة الاعمال والامور التى ينهى عنها الشرع ويعدها منكرات من الامور المحرمة او المكروهة كالميسر ونوادى الفحش والنواح و الغناء و فنون اللهو و اللعب و العبث بأنواعه والوانه فلايجوز الوقف على شيئى من ذلک او على اربابه. (۲)

اس شرط سے وہ تمام اعمال نکل جاتے ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے اور انہیں محرمات یا مکروہات میں شمار کیا ہے جیسے جوا خانہ کے لئے وقف یا فحاشی اور موسیقی کے اڈوں کے لئے وقف یا فنونِ لہو ولعب کے لئے یا فضول اور عبث کاموں کے لئے وقف کرنا، ان تمام صورتوں پر وقف کرنا یا ان کے انجام دینے والوں پر وقف کرنا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) الدردير، ابو البركات احمد بن محمد الدردير. الشرح الكبير بهامش الدسوقى على الشرح الكبير، بيروت دار الفكر (۷۸/۴)

(۲) الزرقاء، مصطفى احمد الزرقاء. احكام الاوقاف، دمشق (۵۲/۱)

فنونِ موسیقی ولطیفہ اور کھیلوں پر وقف کرنے کا شرعی حکم:

ان عبارات سے یہ واضح ہے کہ ہمارے یہاں فنونِ موسیقی ولطیفہ پر وقف کرنے کا جو سلسلہ ہے شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں یہ تعاون علی الاثم کا مصداق ہے۔ اسی طرح مختلف کھیلوں کی ترویج کے لئے اوقاف قائم کئے جاتے ہیں انہیں بھی شرعی نقطہ نظر سے وقف نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کھیل کو مستقل مقصدِ زندگی بنالینا یا پیشہ بنالینا عبث میں داخل ہو کر معصیت کے زمرہ میں آجاتا ہے اور اگر مستقل پیشہ نہ بنایا جائے بلکہ جسمانی اور ذہنی مشق کا ذریعہ قرار دیا جائے تو بیشک یہ معصیت میں تو داخل نہیں ہوگا لیکن قربۃ کے زمرہ میں بہر حال داخل نہیں ہوگا امرِ مباح ہی رہے گا اور ہم ابھی یہ تفصیل سے ذکر کریں گے کہ محض امورِ مباحہ پر بھی وقف کرنا احنافؒ وحنابلہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے، اس لئے ان مقاصد کے لئے اپنی جائیدادیں وقف کرنا قابلِ تامل ہے۔ البتہ اگر ان مقاصد کے لئے کوئی ٹرسٹ قائم کیا جائے تو دیکھا جائے گا کہ ٹرسٹ سے مراد وقف ہی ہے یا ٹرسٹ کا قانونی عام مفہوم مراد ہے، اگر ٹرسٹ مراد وقف ہی ہو تو اس کا تو یہی حکم ہوگا جو وقف کا بیان کیا گیا ہے اور اگر اس کے ٹرسٹ کا عام قانونی مفہوم مراد ہو تو ایسا ٹرسٹ قانوناً منعقد ہو جاتا ہے تاہم اس مقصد کے لئے ٹرسٹ قائم کرنا کوئی باعثِ ثواب کام نہیں ہوگا۔

وقف ابتداءً جہتِ معصیت پر ہوا اور انتہاءً جہتِ قربت پر ہو:

البتہ اگر کسی نے ابتداءً جہتِ معصیت پر وقف کیا اور اس کے بعد دوسرا مصرف ایسا ذکر کیا جو جہتِ قربۃ ہے تو ایسی صورت میں یہ وقف باطل تو نہیں ہوگا لیکن دوسرے مصرف کے لئے ہوگا جو کہ جہتِ قربہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے اپنی جائیداد عیسائیوں کے عبادت خانہ کی تعمیر کے لئے وقف کی اور کہا کہ اگر ان کا عبادت خانہ ویران ہو جائے تو اسے فقراء پر خرچ کیا جائے تو یہاں وقف کا ابتدائی مصرف تو معصیت ہے لیکن انتہائی مصرف فقراء ہیں جو کہ جہتِ قربۃ ہیں، اس لئے اس کا وقف باطل نہیں ہوگا بلکہ ابتداءً ہی فقراء کے لئے سمجھا جائے گا۔ علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

> **فلو وقف علی بیعة مثلاً فاذا خربت یکون للفقراء کان ابتداءً ولو لم یجعل آخره للفقراء کان میراثاً عنه.** (۱)

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۲/۵)

اگر کسی نے عیسائیوں کے گرجا کے لئے وقف کیا کہ اگر یہ گرجا ویران ہوجائے تو پھر اسے فقراء پر خرچ کیا جائے تو یہ وقف ابتداء ہی سے فقراء پر ہی ہوگا۔ اور اگر اس کے آخر میں فقراء کا ذکر نہیں کیا تو یہ وقف صحیح نہیں ہوگا اور وقف کرنے والے کی میراث میں تقسیم ہوگا۔

الاسعاف میں ہے:

ولو وقفها على مصالح بيعة كذا من عمارة و مرمة و اسراج واذا خربت واستغنى عنها تكون الغلة لاسراج بيت المقدس او قال للفقراء و المساكين يجوز الوقف و تكون الغلة للاسراج او للفقراء والمساكين ولاينفق على البيعة منها شيئى. (۱)

اگر کسی نے گرجا کی عمارت، مصالح اور مرمت پر وقف کیا اور کہا کہ جب یہ ویران ہوجائے تو یہ وقف بیت المقدس میں روشنی کے لئے استعمال کیا جائے یا یہ فقراء ومساکین پر خرچ کیا جائے تو یہ وقف درست ہوگا وراس کی آمدنی ابتداء ہی سے بیت المقدس کو روشن کرنے کیلئے یا فقراء ومساکین پر خرچ کی جائے گی، عیسائیوں کے گرجا پر اس کی آمدنی بالکل خرچ نہیں کی جائے گی۔

محض اغنیاء پر وقف کا حکم:

ب: اگر کوئی شخص محض اغنیاء پر وقف کرے تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اغنیاء پر وقف کرنا براہِ راست صدقہ کے حکم میں نہیں ہے اس لئے اسے فی نفسہٖ قربۃ نہیں کہا جاسکتا۔ ردالمحتار میں ہے:

لما فى النهر من المحيط: لو وقف على الاغنياء وحدهم لم يجز لانه ليس بقربة ...... ان الوقف تصدق ابتداء وانتهاء اذ لابد من التصريح بالتصدق على وجه التابيد او مايقوم مقامه. (۲)

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۱۵) مزید دیکھئے: منحة الخالق (۱۸۹/۵) رد المحتار (۳۴۲/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۳۸/۴)

نہر میں محیط کے حوالہ سے ہے کہ اگر کوئی صرف مالداروں پر وقف کرے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ محض مالداروں پر وقف کرنا قربۃ میں داخل نہیں، کیونکہ وقف تو ابتداءً اور انتہاءً صدقہ ہے۔ لہٰذا اس میں ہمیشہ کے لئے صدقہ کی صراحت یا ایسے مصرف کی صراحت ضروری ہے جو لفظ صدقہ کے قائم مقام ہوجائے (جیسے فقراء مساکین وغیرہ)

علامہ بہوتیؒ لکھتے ہیں:

ولا یصح الوقف ایضاً علی طائفة الاغنیاء۔ (۱)

وقف اغنیاء کی جماعت کے لئے جائز نہیں ہے۔

شوافع و مالکیہ کا موقف:

البتہ جن حضرات کے نزدیک جہتِ موقوفہ کے لئے قربۃ ہونا ضروری نہیں بلکہ معصیت نہ ہونا کافی ہے ان کے نزدیک اغنیاء پر وقف درست ہوگا، کیونکہ ان پر کچھ خرچ کرنا معصیت نہیں ہاں فی نفسہ قربت بھی نہیں ہے۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

وان لم یظهر قصد القربة کالوقف علی الاغنیاء فوجهان بناءً علی ان المرعی بالوقف علی الموصوفین جهة القربة ام التملیک فحکی الامام عن المعظم انه القربة. وعن القفال انه قال: التملیک کالوصیة والوقف علی المعین، فان قلنا بالاول لم یصح الوقف علی الاغنیاء والیهود والنصاریٰ والفساق والاصح الجمیع ...... والاشبه بکلام الاکثرین ترجیح کونه تملیکا و تصحیح الوقف علی هؤلاء ...... لکن الاحسن توسط لبعض المتأخرین وهو تصحیح الوقف علی الاغنیاء وابطاله علی الیهود والنصاریٰ وقطاع الطریق و سائر الفسقة لتضمنه الاعانة علی المعصیة. (۲)

---

(۱) البهوتی، منصور بن یونس بن ادریس البهوتی ۱۰۵۱ھ. کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۴ھ (۲۷۴/۴)

(۲) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبین و عمدة المفتین، بیروت، مکتب اسلامی ۱۹۸۵م (۳۲۰/۵) مزید ملاحظہ فرمائیے: الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۸۱/۲)

اگر وقف میں قربۃ کا قصد ظاہر نہ ہو جیسے اغنیاء پر وقف تو اس میں دو رائے اس بنیاد پر ہو سکتی ہیں کہ معین لوگوں پر وقف کرنے کی صورت میں قربۃ کے پہلو کی رعایت رکھی جائے گی یا تملیک کی؟ امام سے ایک روایت یہ ہے کہ قربۃ کے پہلو کی رعایت رکھی جائے گی، قفال سے مروی ہے کہ تملیک کی رعایت رکھی جائے گی جیسے معین لوگوں کے لئے وصیت کرنے کی صورت میں تملیک کا لحاظ رکھا جاتا ہے اگر ہم پہلے قول کو لیں تو اغنیاء، یہود و نصاریٰ اور فساق پر وقف جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہاں قربۃ نہیں پائی جارہی، اکثر شوافع نے تملیک کا لحاظ رکھنے کو ترجیح دی ہے اور ان سب پر وقف کو جائز قرار دیا ہے، لیکن سب سے بہترین بات وہ ہے جو بعض متاخرین کا قولِ متوسط ہے کہ اغنیاء پر وقف تو جائز ہو اور یہود و نصاریٰ ڈاکوؤں اور دیگر فاسق لوگوں پر وقف درست نہ ہو کیونکہ اس میں گناہ میں تعاون لازم آتا ہے۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ حضراتِ شافعیہ کی راجح روایت کے مطابق صرف اغنیاء پر وقف درست ہے کیونکہ یہ اگرچہ جہتِ قربۃ نہیں ہے لیکن جہتِ معصیت بھی نہیں اور ان میں مالک بننے کی صلاحیت بھی ہے۔ علامہ شربینیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں:

وقد علم من كلام المصنف ان الشرط انتفاء المعصية لا وجود ظهور القربة. [1]

مصنف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وقف کے لئے معصیت کا نہ پایا جانا شرط ہے قربۃ کے پہلو کا پایا جانا ضروری نہیں۔

مالکیہ کی عبارات سے بھی یہی موقف معلوم ہوتا ہے۔[2]

ابتداءً اغنیاء پر وقف ہو اور انتہاءً فقراء پر اس کا حکم:

اغنیاء پر وقف کے سلسلہ میں یہ دو رائے اس وقت ہیں جب صرف اغنیاء پر وقف کیا جائے لیکن اگر ابتداءً اغنیاء پر وقف کیا جائے اور انتہاءً فقراء پر وقف ہو تو یہ بالاتفاق سب کے نزدیک جائز ہے۔ کیونکہ جو حضرات جہتِ قربۃ کی شرط لگاتے ہیں وہ انتہاءً ہی لگاتے ہیں کہ وقف کی انتہاء ایسے مصرف اور جہت پر ہو جو فی نفسہٖ قربت ہو، یہ ضروری نہیں ہے کہ ابتداءً بھی اس کا مصرف جہتِ قربت ہو بلکہ ابتداءً

---

(۱) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۸۱/۲)

(۲) دیکھئے: الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشية الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۷۷/۴)

اس کے مصرف کا معصیت نہ ہونا کافی ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

وفی المحیط لایجوز الوقف علی الاغنیاء وحدھم ولو شرط بعدھم للفقراء جاز. [1]

محیط میں ہے تنہا صرف مالداروں پر وقف کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر ان کے بعد فقراء کے لئے وقف کی شرط لگائی ہو تو پھر یہ وقف جائز ہے۔

مسلمان ذمی پر وقف کرسکتا ہے:

یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان ذمی پر وقف کرسکتا ہے بشرطیکہ اس وقف کی جہتِ اخیر جہتِ قربۃ ہو کیونکہ ذمی پر کچھ خرچ کرنا معصیت نہیں بلکہ اس میں بھی صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ویصح الوقف علی اھل الذمة لانھم یملکون ملکاً محترماً ویجوز ان یتصدق علیھم فجاز الوقف علیھم کالمسلمین ویجوز ان یقف المسلم علیه لما روی ان صفیة بنت حیی زوج النبی صلی اللہ علیه وسلم وقفت علی اخٍ لھا یھودی. [2]

ذمیوں پر وقف کرنا جائز ہے کیونکہ وہ کسی بھی چیز کے مالک بن سکتے ہیں، اور ان پر صدقہ کرنا بھی جائز ہے لہٰذا مسلمانوں کی طرح ان پر وقف کیا جاسکتا ہے اور ایک مسلمان بھی ذمی پر وقف کرسکتا ہے۔ کیونکہ مروی ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے یہودی بھائی کے لئے وقف کیا تھا۔

الدر المختار میں ہے:

وجاز علی ذمی لانه قربة حتی لو قال علی ان من اسلم من ولدہ او انتقل الی غیر النصرانیة فلاشیئی له لزم شرطه علی المذھب. [3]

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۰۰/۵)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ـ ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۶/۸)

(۳) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۱/۴) نیز دیکھئے: ابن الھمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۱۷/۵)

ذمی پر وقف کرنا جائز ہے کیونکہ یہ بھی قربۃ ہے حتی کہ اگر واقف نے یہ کہا کہ میری اولاد میں سے جو اسلام لے آیا یا نصرانی مذہب کو چھوڑ کر کسی اور مذہب کی طرف منتقل ہو گیا تو اسے اس وقف سے کچھ نہیں ملے گا تو یہ شرط لازم ہوگی۔

فقہِ مالکی کی الشرح الکبیر میں ہے:

وعلىٰ ذمی وان لم يظهر قربة. وفی شرح الدسوقی: قوله: "وعلىٰ ذمی" ای وصح وقف من مسلم علىٰ من تحت ذمتنا وان لم يكن كتابياً. (۱)

ذمی پر وقف جائز ہے اگرچہ اس میں قربۃ کا پہلو ظاہر نہ ہو یعنی ایک مسلمان ایسے شخص پر وقف کر سکتا ہے جو ہمارے ذمہ میں رہ رہا ہو اگرچہ وہ کتابی نہ ہو۔

پہلی شرط کا خلاصہ:

پہلی شرط کا حاصل یہ ہے کہ وقف کا مصرف انتہاءً ایسی جہت ہونی چاہئے جو باعثِ قربۃ ہو یعنی اس پر خرچ کرنا براہِ راست صدقہ سمجھا جائے۔ لہٰذا اگر وقف جہتِ معصیت پر کیا جائے تو وہ درست نہیں یا انتہاءً جہتِ قربۃ پر نہ ہو تب بھی درست نہیں۔ البتہ اگر انتہاءً جہتِ قربۃ پر ہو لیکن ابتداءً جہتِ معصیت پر ہو تو یہ وقف باطل نہیں ہوگا ابتداء ہی سے اسے جہتِ قربۃ ہی پر خرچ کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ابتداءً جہتِ قربۃ پر نہ ہو بلکہ جہتِ مباحہ پر ہو اور انتہاءً قربۃ پر ہو تو یہ وقف بھی درست ہوگا اور واقف کی تصریح کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

دوسری شرط: احتیاج ملحوظ رکھی جائے:

وقف چونکہ بنیادی طور پر صدقہ ہی کی ایک مخصوص شکل یعنی صدقہ جاریہ ہے اس لئے انتہاءً وقف کا مصرف ایسی جہت ہونی چاہئے جس میں وصفِ احتیاج پایا جائے تاکہ حقیقی صدقہ کا ثواب حاصل ہو سکے۔ ابتداءً تو وقف سے فائدہ اٹھانے کے لئے واقف کسی کو متعین کر سکتا ہے، خواہ وہ اس میں قرابت کو ملحوظ رکھے یا احتیاج کو ملحوظ رکھے یا اور کوئی وجہ انتخاب ہو لیکن وقف کی انتہاء ایسے مصرف پر اور جہت پر ہونی چاہئے جس میں احتیاج کا وصف پایا جائے۔

---

(۱) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشية الدسوقی علی الشرح الكبير، بيروت، دار الفكر (۴/۷۷)

اب احتیاج کا وصف کبھی تو صراحۃً پایا جاتا ہے جیسے کوئی شخص فقراء، مساکین وغیرہ کے لئے وقف کرے اور کبھی احتیاج کا وصف صراحۃً تو نہیں ہوتا لیکن واقف نے جو مصرف ذکر کیا ہے عرف میں اس کی احتیاج معروف ہوتی ہے جیسے کوئی شخص بیواؤں کے لئے وقف کرے تو لفظِ ''بیوہ'' صراحۃً تو احتیاج پر دلالت نہیں کرتا، بیوہ فقیر بھی ہوسکتی ہے، مالدار بھی ہوسکتی ہے، لیکن عرف عام میں عمومی طور پر بیواؤں کی احتیاج معروف ہے کہ ان میں بیشتر حاجت مند ہوتی ہیں۔ اسی طرح یتیموں پر وقف کیا جائے یا مدرسہ کے طلبہ پر وقف کیا جائے تو یہاں بھی لفظِ ''یتیم اور مدارس کے طلبہ'' صراحۃً تو احتیاج پر دلالت نہیں کرتے لیکن عمومی طور پر ان میں سے بیشتر محتاج ہی ہوتے ہیں اس لئے وقف کا انتہائی مصرف بیوہ، یتیم، مدارس کے طلبہ بن سکتے ہیں۔ اسی طرح اپاہج لوگوں کو اگر وقف کا انتہائی مصرف بنایا جائے یا زخمیوں یا مسافروں کو وقف کا مصرف مقرر کیا جائے تو یہ درست ہے کیونکہ ان تمام مصارف میں اگر چہ صراحۃً تو وصفِ احتیاج نہیں پایا جاتا لیکن عرف میں یہ تمام مصارف احتیاج کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

اسی عرف کے استعمال کی وجہ سے فقہاء کرامؒ نے صراحت کی ہے کہ یہ وقف درست ہوجائے گا تاہم اگر اس جہت کے افراد غیر محصور ہوں تو ان جہات کے فقراء صرف اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے، لداروں کو اس وقف سے دینا درست نہیں، لہٰذا اگر طلبہ علم دین کے لئے وقف کیا تو یہ وقف درست وجائے گا لیکن فقیر طلبہ اس سے فائدہ اٹھاسکیں گے مالدار طلبہ اس وقف کا مصرف نہیں ہوں گے، کیونکہ یہ ام مصارف عرف میں اپنے احتیاج کی وجہ سے معروف ہیں اس لئے ان مصارف کا ذکر کرنا گویا کہ قف کی طرف سے یہ صراحت ہے کہ اس کا وقف ان مصارف کے محتاج لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے ہے۔ علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

> والحاصل انه متى ذكر مصرفافيه تنصيص على الفقراء والحاجة فهو صحيح سواء كانوا يحصون اولا يحصون لان المطلوب وجه الله تعالىٰ ومتى ذكر مصرفا يستوى فيه الاغنياء والفقراء فان كانوا يحصون فذلك صحيح لهم باعتبار اعيانهم وان كانوا لايحصون فهو باطل الا ان يكون فى لفظه مايدل على الحاجة استعمالا بين الناس لاباعتبار حقيقة اللفظ كاليتامى فحينئذ ان كانوا يحصون فالفقراء والاغنياء فيه سواء وان كانوالايحصون فالوقف صحيح و تصرف الى فقرائهم دون اغنيائهم لان الاستعمال بمنزلة الحقيقة فى

جواز تصحيح الكلام باعتبار. (۱)

حاصل یہ ہے کہ اگر ایسا مصرف ذکر کیا جائے جس میں فقر اور حاجت کی صراحت ہے تو یہ صحیح ہے خواہ وہ قابلِ شمار ہوں یا نہ ہوں۔ کیونکہ اس میں ابتداء ہی سے اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہے، اور اگر ایسا مصرف ذکر کیا کہ جس میں اغنیاء اور فقراء برابر ہیں تو اگر وہ قابلِ شمار ہوں تو یہ وقف صحیح ہوگا یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے معین لوگوں کے لئے وقف کیا ہے اور اگر وہ قابلِ شمار نہ ہوں تو یہ وقف باطل ہوگا، الا یہ کہ وہ ایسا لفظ مصرف کے لئے استعمال کرے جو لوگوں کے عرف کے مطابق حاجت پر دلالت کرتا ہو جیسے یتیم، اس صورت میں اگر وہ قابلِ شمار ہوں گے تو ان کے فقراء و اغنیاء اس میں برابر ہوں گے اور اگر قابلِ شمار نہ ہوں تو وقف تو صحیح ہوگا لیکن صرف ان میں سے فقراء کو دیا جائے گا اغنیاء کو نہیں۔ کیونکہ استعمال بھی تصحیحِ وقف کے لئے لفظ کے قائم مقام ہوگا۔

علامہ طرابلسیؒ شمس الائمہ کی اس عبارت کا حوالہ دینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

فهٰذا الضابط يقتضي صحة الوقف على الزمنى والعميان و قراء القرآن والفقهاء و اهل الحديث يصرف للفقراء منهم كاليتامى لاشعار الاسماء بالحاجة استعمالا لان العمى والاشتغال بالعلم يقطع الكسب فيغلب فيهم الفقر وهو أصح. (۲)

یہ ضابطہ تقاضہ کرتا ہے کہ اپاہج اور نابیناؤں پر وقف صحیح ہو اسی طرح قراء، فقہاء اور محدثین پر وقف کرنا صحیح ہو اور یہ وقف ان میں سے فقراء پر خرچ کیا جائے یتیموں کی طرح، کیونکہ عرف میں یہ تمام نام حاجت ہی کی علامت سمجھے جاتے ہیں، کیونکہ معذوری اور علم میں مشغولیت کی وجہ سے یہ لوگ کما نہیں سکتے اس لئے ان میں اکثریت فقراء کی ہی ہوتی ہے۔

شمس الائمہؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے وقف کی درج ذیل صورتیں اور احکام معلوم ہوئے:

---

(۱) السرخسي، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسي. المبسوط للسرخسي، بيروت دار المعرفة ۱۹۹۳م (۱۲/۳۴)

(۲) الطرابلسي، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسي. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ه (۱۳) مزید دیکھئے: البحر الرائق (۵/۱۹۹) رد المحتار (۴/۴۵۷)

۱۔ واقف نے ایسا مصرف بیان کیا جس میں فقر اور احتیاج کی صراحت ہے جیسے فقراء، مساکین اور محتاجین پر وقف تو یہ وقف بالکل درست ہے، خواہ یہ فقراء قابلِ احصاء و شمار ہوں یا نہ ہوں۔ (قابلِ احصاء کی تحدید اور تعیین آگے آ رہی ہے)

۲۔ واقف نے ایسے مصرف پر وقف کیا جس میں فقر اور احتیاج کی صراحت تو نہیں ہے لیکن عرف میں وہ اپنے احتیاج کی وجہ سے معروف ہیں جیسے یتیم، بیوہ، مسافر اور مدارس کے طلبہ تو یہ وقف درست ہے۔ پھر اگر وہ محصور ہوں اور ان کا احصاء ممکن ہو جیسے اس محلّہ یا گلی کے یتیموں پر وقف کیا جائے تو وہ خواہ فقیر ہوں یا مالدار اس وقف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ اگر وہ غیر محصور ہوں اور قابلِ شمار نہ ہوں تو ان میں سے صرف فقراء اس وقف سے فائدہ اٹھا سکیں گے مالدار فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جیسے کوئی شخص مطلقاً مدارس کے طلبہ پر وقف کرے یا مطلقاً یتیموں اور بیواؤں پر وقف کرے۔

۴۔ اگر واقف ایسا مصرف بیان کرے جس میں نہ احتیاج کی صراحت ہو اور نہ ہی وہ مصرف اپنی احتیاج کی بناء پر معروف ہو بلکہ اس میں فقیر اور مالدار دونوں طرح کے لوگ ہوں جیسے کوئی شخص فلاں مسجد میں نماز کے لئے آنے والے نمازیوں کے لئے وقف کرے تو اس وقف کے درست ہونے یا نہ ہونے میں تفصیل ہے۔ اگر وہ افراد محصور ہوں تو یہ وقف درست ہوگا اور وہ اس وقف سے فائدہ اٹھا سکیں گے خواہ فقیر ہوں یا مالدار۔

۵۔ اور اگر وہ غیر محصور ہوں تو یہ وقف باطل ہوگا۔

یہ تمام تفصیلات اس وقت ہیں جب کہ وقف کی آمدنی دینے کے لئے واقف یہ مصارف بیان کرے۔

عینِ وقف سے انتفاع کے لئے احتیاج شرط نہیں:

اگر واقف وقف کے عین اور اس کی ذات سے فائدہ اٹھانے کے لئے مصرف مقرر کرے تو اس میں وصفِ احتیاج کا پایا جانا شرط نہیں۔ فقیر و مالدار دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص مجاہدین کے رہنے کے لئے کوئی جگہ وقف کرتا ہے تو اس جگہ فقیر و مالدار دونوں طرح کے مجاہد رہ سکتے ہیں۔ اسی طرح مسافر خانہ وقف کیا، ہسپتال وقف کیا یا قبرستان وقف کیا تو اس سے تمام لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں خواہ وہ محتاج ہوں یا نہ ہوں۔ علامہ سرخسیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وکذلک ان جعلها سکنی للغزاة والمرابطین فی ثغر من الثغور او جعل غلة ارضه للغزاة فی سبیل اللہ تعالیٰ و دفع ذلک الی ولیّ یقوم به فهو جائز و لا سبیل له الی رده لانه قصد التقرب بما صنع، فأما السکنی فلا بأس بان یسکهنا الغنی والفقیر من الغزاة والمرابطین والحاج وکذلک نزول الخان والدفن فی المقبرة، فاما الغلة التی جعلت للغزاة فلا یعجبنی ان یأخذ منها الا محتاج الیها لان الغلة مال یملک والتقرب الی اللہ تعالیٰ بتملیک المال یکون من المحتاج خاصة دون الغنی بخلاف السکنی. وحقیقة المعنی فی الفرق ان الغنی مستغن عن مال الصدقة بمال نفسه وهو لا یستغنی بماله عن الخان لینزل فیه وعن الدفن فی المقبرة فلایمکنه ان یتخذ ذلک فی کل منزل وربما لایجد مایستأجره فلهٰذا یستوی فیه الغنی والفقیر وهو نظیرماء السقایة والحوض والبئر فانه یستوی فیه الغنی والفقیر لهٰذا المعنی وهذا لان الماء لیس بمال قبل الاحراز والناس یتوسعون فیه عادة ولا یخصون به الفقراء دون الاغنیاء بخلاف المتصدق بالمال. (۱)

اسی طرح اگر کسی نے اپنا مکان مجاہدین یا دارالاسلام کی سرحدوں کے محافظوں کے رہنے کے لئے وقف کیا یا اپنی زمین کی پیداوار مجاہدین کے لئے مخصوص کردی اور متولی کے سپرد کردی تو یہ جائز ہے اور وہ اسے واپس نہیں لے سکتا کیونکہ اس نے جو کیا ہے اس سے عبادت کا ارادہ کیا ہے۔ رہائش کے لئے موقوفہ مکان میں مجاہدین، سرحدی محافظ اور حجاج میں سے مالدار اور فقیر دونوں رہ سکتے ہیں۔ یہی حکم مسافر خانہ میں ٹھہرنے اور مقبرہ میں دفن ہونے کا ہے البتہ جو آمدنی مجاہدین کے لئے مخصوص کی ہے فقیر کے علاوہ کسی اور کا وہ آمدنی لینا مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ آمدنی مال ہے جس کا مالک بنایا جاتا ہے اور کسی کو مال کا مالک بنا

---

(۱) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی. المبسوط للسرخسی، بیروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۳۳/۱۲)

کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا اس وقت ہوسکتا ہے جب کسی محتاج کو مالک بنایا جائے نہ کہ مالدار کو۔ بخلاف موقوفہ مکان میں رہائش کے۔ دونوں صورتوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ غنی اپنے پاس موجود مال کی وجہ سے صدقہ کے مال سے مستغنی ہے لیکن اپنے مال کی وجہ سے وہ مسافر خانہ سے یا مقبرہ میں دفن ہونے سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر جگہ نہیں ٹھہر سکتا ہے اور نہ ہر وقت اسے کرایہ کی کوئی جگہ دستیاب ہوسکتی ہے اس لئے رہائش کی ضرورت میں مالدار اور فقیر دونوں برابر ہیں اور اس کی مثال حوض، کنویں اور سبیل کے پانی کی ہے کہ ان میں اس علت کی وجہ سے فقیر اور مالدار دونوں برابر ہیں اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پانی محفوظ کرنے سے پہلے مال نہیں ہے اور عام طور پر لوگ اس میں توسع سے کام لیتے ہیں اور صرف فقیروں کے لئے اسے خاص نہیں کرتے۔ جبکہ جو شخص مال کے ذریعہ صدقہ کرنا چاہتا ہے عام طور پر وہ محتاجوں ہی کو اس کے لئے خاص کرتا ہے۔

کس تعداد کو قابلِ احصاء وشمار کہا جائے گا؟

علامہ ابن نجیمؒ نے الاسعاف کے حوالہ سے اس میں اختلاف نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

وفي الاسعاف روى عن محمد ان مالا يحصى عشرة وعن أبي يوسف مائة وهو الماخوذ عند البعض وقيل: أربعون وقيل: ثمانون، والفتوىٰ على انه مفوض الى رأى الحاكم. [1]

اسعاف میں ہے کہ امام محمدؒ سے مروی ہے کہ غیر محصور تعداد دس کی ہے اور امام ابو یوسفؒ سے سو کی تعداد مروی ہے اور بعض نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ بعض نے چالیس اور بعض نے اَسی کی تعداد بتلائی ہے فتویٰ اس پر ہے کہ یہ حاکم کی رائے کے سپرد ہے وہ خود فیصلہ کرے۔

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے کہ سو تک کی تعداد قابلِ احصاء سمجھی جائے گی اور سو سے زیادہ افراد غیر محصور اور غیر قابلِ شمار سمجھے جائیں گے۔ مادہ نمبر ۱۶۴۶ میں ہے:

أهالي القرية الذين عددهم يزيد عن المائة يعدون قوماً غير محصورين. [2]

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۹۹/۵)

(۲) الاتاسي، الشيخ خالد الاتاسي. شرح المجلة، كوئٹه، مكتبه اسلاميه الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۳ھ (مادہ: ۱۶۴۶)

بستی والے جن کی تعداد سو سے زیادہ ہو وہ غیر محصور نا قابل شمار سمجھے جائیں گے۔

لیکن علامہ ابن نجیمؒ کی عبارت سے ظاہر ہے کہ اس کا مدار عرف پر ہے۔ زمانہ اور جگہ کے عرف کو دیکھتے ہوئے قاضی اور حاکم اس کا فیصلہ اس سے مختلف بھی کر سکتے ہیں۔

تیسری شرط: جس جہت پر وقف کیا جائے وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہو:

وقف کا مصرف متعین کرتے وقت تیسری شرط یہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ وقف انتہاءً ایسے مصرف پر کیا جائے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہو۔ ابتدائی طور پر تو کسی بھی جائز اور مباح جہت کو وقف کا مصرف مقرر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وقف کی انتہاء ایسے مصرف پر ہو جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہو۔ جیسے فقراء، مساکین، قرآن کریم، یا علمِ دین حاصل کرنے والے طلبہ، مسافر، بیمار، مجاہدین اور مساجد وغیرہ یہ تمام وہ مصارف ہیں جن کے ختم ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔

امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ بہترین انداز میں یہ شرط اور اس کی حکمت تحریر فرماتے ہیں:

قلت: ارأیت رجلا قال أرضی هذه صدقة موقوفة علی فلان بن فلان ماکان حیاولم یزد علی هذا وکان هذا فی صحة الواقف؟ قال: لایجوز، قلت: ولم کان هذا هکذالم یجز الوقف علی هذا؟ قال: من قبل انه جعلها وقفا علی رجل خاص لانه اذا مات هذا الرجل الذی وقف الارض علیه صارت میراثا لورثة الواقف، واذا کان الامر علی هذا لم یجز، والوقف هو الذی یکون دائما ابداً لایملکه احد ولا یرجع الی ملک صاحبه ولا الی ورثته، الا تری ان وقوف أصحاب رسول الله صل الله علیه وسلم جاریة ابداً علی وجه الدهر لم تصر میراثا لورثة أحدمنهم ولم یرجع شیئی منها الی ملک الواقف لها لانهم جعلوها جاریة.[1]

میں نے عرض کیا کہ ایک شخص نے کہا کہ میری یہ زمین فلاں ابن فلاں پر جب تک وہ زندہ

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م (۱۸)

ہے وقف ہے۔ اس سے زیادہ کچھ ذکر نہیں کیا تو کیا یہ وقف درست ہوگا؟ امام نے فرمایا کہ یہ وقف جائز نہیں ہے میں نے وجہ دریافت کی تو امام نے جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک خاص شخص پر یہ وقف کیا ہے اگر اس معین شخص کا انتقال ہوجائے تو یہ موقوفہ زمین واقف کے پاس واپس آجائے گی اور اس کی میراث میں تقسیم ہوگی حالانکہ وقف تو ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے اور واقف یا اس کے ورثاء کی ملکیت میں واپس نہیں آتا۔ آپ دیکھئے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کے اوقاف ہمیشہ باقی رہے اور ان کی میراث میں تقسیم نہیں ہوئے اور نہ وقف کرنے والوں کی ملکیت میں واپس آئے وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وقف کو صدقہ جاریہ کے طور پر ہمیشہ باقی رہنے والی جہات پر وقف کیا تھا۔

علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ولا یتم الوقف عند ابی حنیفةؒ و محمدؒ حتی یجعل آخره بجهة لاتنقطع ابداً. (۱)

امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وقف اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک اس کا آخری مصرف ایسی جہت نہ ہو جو کبھی ختم نہ ہوسکے۔

اس شرط کی وجہ بھی صاحبِ ہدایہ نے خود ہی بیان فرمائی ہے:

لهما ان موجب الوقف زوال الملک بدون التملیک وانه یتأبد کالعتق فاذا کانت الجهة یتوهم انقطاعها لایتوفر علیه مقتضاه فلهذا کانت التوقیت مبطلاً له کالتوقیت فی البیع. (۲)

حضرات طرفین فرماتے ہیں کہ وقف کا مقتضیٰ یہ ہے کہ عتق کی طرح موقوفہ چیز سے واقف کی ملکیت زائل ہوجائے اور موقوف علیہم اس کے مالک بھی نہ بنیں اور وقف ہمیشہ باقی رہے لہٰذا اگر جہتِ موقوفہ کے ختم ہونے کا امکان ہو تو وقف کا مقتضیٰ پورا نہیں ہوسکتا اس لئے وقف میں توقیت باطل ہے جیسے کہ بیع کو موقت کرنا بیع کو باطل کردیتا ہے۔

صاحبِ ہدایہ کی اس عبارت سے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف کے مصرف

---

(۱) المرغینانی، برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۲۷/۵)
(۲) حوالہ بالا: مزید دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۹۸/۵)

کے لئے جہتِ غیر منقطعہ ہونا شرط نہیں۔ لیکن جمہور احناف اور خود صاحبِ ہدایہ نے اس کی تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام ائمہ احناف کے نزدیک بشمول امام ابو یوسفؒ وقف کے مصرف کے لئے جہتِ موبدہ یعنی ایسی جہت ہونا شرط ہے جو کبھی ختم نہ ہو۔ البتہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف کے الفاظ میں تابید کی صراحت کا پایا جانا شرط نہیں۔ الفاظِ وقف اور جہتِ موقوفہ میں منافی تابید کسی بات کا نہ پایا جانا کافی ہے۔ جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک الفاظِ وقف میں بھی تابید کی صراحت ضروری ہے یا ایسے مصرف کا ذکر ضروری ہے جو ہمیشہ پایا جائے۔ اس کا ذکر بھی تابید کے قائم مقام ہو جائے گا۔ علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

فظهر بهٰذا ان الخلاف بينهما فى اشتراط ذكر التابيد و عدمه انما هو فى التنصيص عليه أو على مايقوم مقامه كالفقراء و نحوهم و أما التابيد معنىً فشرط اتفاقاً على الصحيح وقد نص عليه محققوا المشايخ. (۱)

اس سے ظاہر ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان تابید کے ذکر و عدمِ ذکر میں اختلاف کا مطلب یہ ہے کہ تابید یا اس پر دلالت کرنے والے کسی مصرف مثلاً فقراء کی صراحت ضروری ہے یا نہیں؟ معنوی طور پر وقف میں تابید کے شرط ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اس پر محققین مشائخ کی صراحت موجود ہے۔

علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

وقيل ان التابيد شرط بالاجماع الا ان عند أبى يوسف لايشترط ذكر التابيد لان لفظة الوقف و الصدقة منبئة عنه لما بينا أنه ازالة الملك بدون التمليك كالعتق ولهٰذا قال فى الكتاب فى بيان قوله و صار بعدها للفقراء و ان لم يسمهم وهٰذا هو الصحيح و عند محمدؒ ذكر التابيد شرط لان هذا صدقة بالمنفعة او بالغلة وذٰلك قد يكون مؤقتا وقد يكون مؤبداً فمطلقه لاينصرف الى التابيد فلابدمن التنصيص. (۲)

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۹/۴)

(۲) المرغيناني، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۲۸/۵) نیز دیکھئے: الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۶۹۷/۵)

تابید تو بالاجماع شرط ہے البتہ امام ابو یوسفؒ تابید کے صراحۃً ذکر کرنے کو شرط قرار نہیں دیتے کیونکہ لفظ صدقہ اور وقف خود ہی اس پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وقف عتق کی طرح موقوفہ چیز سے واقف کی ملکیت زائل کرنے کا نام ہے بغیر کسی اور کو مالک بنائے۔ اسی وجہ سے قدوری میں کہا گیا ہے کہ موقوف علیہم کے ختم ہونے کے بعد وقف فقراء کے لئے ہوگا اگرچہ واقف نے اس کی صراحت نہ کی ہو۔ یہی مذہب صحیح ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک تابید کا ذکر بھی شرط ہے کیونکہ وقف موقوفہ چیز کی منفعت یا آمدنی صدقہ کرنے کا نام ہے اور یہ صدقہ کبھی موقت ہوتا ہے اور کبھی ہمیشہ کے لئے، اگر اس نے تابید کی صراحت نہیں کی تو اس مطلق صدقہ کو تابید پر محمول نہیں کیا جا سکتا اس لئے تابید کی لفظوں میں صراحت ضروری ہے۔

وقف کے صدقہ جاریہ ہونے کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس کا مصرف جہتِ مؤبدہ، دائمہ ہو۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے اپنی اولاد میں سے اشخاص متعین کر کے ان پر وقف کیا کہ مثلاً اس وقف کی آمدنی میری اولاد میں سے خالد، حامد اور فاطمہ کو دی جائے تو بالاتفاق یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ افراد متعینہ تو کبھی نہ کبھی ختم ہو جائیں گے اور انہیں خاص طور پر ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ واقف ان کے علاوہ کسی اور کو وقف سے فائدہ پہنچانا نہیں چاہتا۔ الاسعاف میں ہے:

ولو قال وقفت ارضی هٰذه علی ولد زيد وذكر جماعة بأعيانهم لم يصح عند أبی يوسف ايضاً لان تعيين الموقوف عليه يمنع ارادة غيره.[1]

اگر کسی نے کہا کہ میں نے اپنی زمین زید کی اولاد پر وقف کی اور متعین افراد ذکر کر دیئے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی یہ وقف صحیح نہیں کیونکہ موقوف علیہم کو شخصی طور پر متعین کر دینا اس کی علامت ہے کہ وہ ان کے علاوہ کسی اور کا ارادہ نہیں کر رہا۔

اور اگر واقف ابتداءً ہی جہتِ مؤبدہ غیر منقطعہ پر وقف کرے یا کم از کم انتہاءً ایسی جہت پر وقف کرے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہو تو بالاتفاق یہ وقف درست ہو جائے گا۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۱۷) مزید دیکھئے: رد المحتار (۳۴۹/۴)

مثال کے طور پر فقراء، مساکین، مساجد، مدارس، یتیموں اور بیواؤں کے لئے وقف کیا جائے یا ابتداء میں واقف اپنی اولاد پر وقف کرے اور پھر یہ صراحت کردے کہ میری اولاد کے ختم ہونے کے بعد یہ وقف جہاتِ غیر منقطعہ پر صرف کیا جائے تو بالاتفاق امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک یہ وقف درست ہو جائے گا۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

وفی المحیط: لایجوز الوقف علی الاغنیاء وحدهم ولو شرط بعدهم للفقراء جاز ...... الثانی: موقوفة صدقة علی وجوه البر أو الخیر او لیتامی جاز مؤبداً کالفقراء ...... الخامس: وقف علی المساکین جاز بلاذ کرا لأبد. [1]

صرف اغنیاء پر وقف کرنا جائز نہیں ہے اگر ان کے بعد فقراء کی بھی شرط لگائی تو پھر وقف درست ہے وجوہِ خیر یا یتیموں پر وقف ہوتو وہ جائز ہے فقراء کی طرح اگر مساکین پر وقف کیا تو بغیر تابید کی صراحت کے بھی وقف درست ہے۔

شیخ زرقاءؒ تحریر کرتے ہیں:

ان الواقف اذا وقف علی جهة دائمة کالفقراء او مسجد او مصالح الجهاد او نحو ذلک صح الوقف وتأبد علی ماشرط ...... واذا وقف علی ماینقطع کالاشخاص المعینین لایصح الوقف اتفاقا ...... امالو شرط انصرافه من بعد هؤلاء الی جهة مؤبدة صراحة کقوله: ومن بعدهم الی الفقراء ...... فانه یصح الوقف. [2]

واقف نے اگر جہتِ دائمہ پر وقف کیا جیسے فقراء، مسجد، مصالحِ جہاد وغیرہ تو یہ وقف درست ہوگا اور ہمیشہ اپنی مصارف پر خرچ ہوگا۔ اور اگر وقف ایسی جہت پر کیا جو ختم ہونے والی ہے جیسے معین لوگ تو یہ وقف بالاتفاق درست نہیں۔ ہاں ان کے بعد اگر صراحۃً جہتِ مؤبدہ پر خرچ کرنے کی شرط لگائی جیسے فقراء وغیرہ تو یہ وقف درست ہے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۰۰/۵)

(۲) الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء. احکام الاوقاف، دمشق (۵۵/۱)

دلالۃً تابید بھی کافی ہے:

حضراتِ طرفینؒ کا یہ اتفاق اس صورت میں بھی ہے کہ واقف نے جہتِ منقطعہ پر وقف کیا لیکن وقف کرتے وقت صدقہ کے الفاظ استعمال کئے جیسے کسی نے اپنی اولاد کے لئے وقف کرتے وقت کہا کہ ''میں اس کی آمدنی اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لئے صدقہ کرتا ہوں'' تو اس صورت میں بھی بالاتفاق یہ وقف درست ہو جائے گا۔

کیونکہ اولاد اگرچہ ختم ہو جائے گی لیکن صدقہ کا لفظ عرفاً اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اولاد کے ختم ہونے کے بعد اس کی آمدنی فقراء کو دی جائے۔ صدقہ کے اصل مستحق تو وہی ہیں اس لئے دلالۃً یہاں تابید پائی گئی۔ ردالمحتار میں ہے:

فهٰذا يدل على ان الروايتين عن أبي يوسفؒ فيما اذا ذكر لفظ صدقة مع موقوفة وعيّن الموقوف عليه، اما اذا لم يعينه يجوز بلاخلاف ...... والحاصل انه لا خلاف عندهما في صحة الوقف مع عدم تعيين الموقوف عليه اذا ذكر لفظ التابيد او مافي معناه كالفقراء و كلفظ صدقة موقوفة و كموقوفة لله تعالىٰ و كموقوفة على وجوه البر لانه عبارة عن الصدقة و كذا موقوفة على الجهاد او على اكفان الموتى.(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ سے دو روایتیں اس صورت میں ہیں جب موقوفہ کے ساتھ صدقہ کا لفظ بھی ذکر کیا اور موقوف علیہ بھی معین لوگوں کو بنایا اگر معین لوگ موقوف علیہ نہ ہوں تو بالاتفاق یہ وقف درست ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر موقوف علیہ متعین اشخاص نہ ہوں اور وقف میں لفظ تابید ذکر کیا جائے یا اس کے قائم مقام کوئی اور لفظ جیسے فقراء یا لفظ صدقہ موقوفہ یا موقوفہ للہ تعالیٰ یا وجوہِ خیر کے لئے وقف وغیرہ تو بالاتفاق حضرات صاحبین کے نزدیک وقف درست ہوگا کیونکہ یہ سارے الفاظ صدقہ پر دلالت کرتے ہیں۔

حضراتِ صاحبین رحمہما اللہ کے اختلاف کا ثمرہ اس مثال سے ظاہر ہوگا:

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (٣٤٩/٤)

کسی شخص نے اپنی اولاد پر اور اولاد کی اولاد پر ہمیشہ کے لئے وقف کیا اور اس کے بعد جہتِ موبدہ کا ذکر نہیں کیا تو امام محمدؒ کے نزدیک یہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ اس کے کلام میں تابیدِ وقف پر دلالت کرنے والا کوئی جملہ نہیں ہے۔ اگر اس کی نسل ختم ہوگئی تو یہ وقف بھی ختم ہو جائے گا۔ جبکہ حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ وقف درست ہے کیونکہ اس نے اگرچہ جہتِ مؤبدہ صراحۃً ذکر نہیں کی لیکن اس کی نفی بھی نہیں کی اور عام طور پر لوگ صدقہ جاریہ کے طور پر ہی وقف کرتے ہیں اس لئے عرفاً یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اپنی اولاد کے ختم ہونے کے بعد فقراء ہی پر وقف کرنا چاہتا ہے۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

ولو قال: وقفت أرضي هٰذا على ولدي وولد ولدي ونسلهم ابداً يصح عند أبي يوسف فاذا انقرضوا تكون الغلة للفقراء ولايصح عند محمدؒ لاحتمال الانقطاع...... بخلاف ما اذا لم يعين لجعله اياه وقفا على الفقراء. [1]

اگر کسی نے کہا کہ میں نے اپنی یہ زمین اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد اور ان کی نسل پر ہمیشہ کے لئے وقف کی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ وقف درست ہے جب اس کی نسل ختم ہو جائے گی تو اس وقف کی آمدنی فقراء کو ملے گی۔ امام محمدؒ کے نزدیک یہ وقف درست نہیں کیونکہ مصرف کے منقطع اور ختم ہونے کا احتمال ہے۔ بخلاف اس کے کہ اگر معین افراد کو مصرف نہیں قرار دیا تو وقف بالاتفاق درست ہوگا کیونکہ اس نے یہ وقف فقراء کے لئے کیا ہے۔

ترجیح:

اس مختلف فیہا صورت میں فقہاء کرامؒ نے امام ابو یوسفؒ کے قول ہی کو ترجیح دی ہے کہ وقف کا مصرف انتہاءً غیر منقطعہ ہی ہونا چاہئے اور وقف کے مصرف میں تابید یعنی ہمیشگی کا پایا جانا ضروری ہے البتہ واقف کے کلام میں اس کی صراحت ضروری نہیں صرف اتنا کافی ہے کہ وہ اس کی نفی نہ کرے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۱۷) مزید دیکھئے: رد المحتار (۳۴۹/۴)

واختلف الترجيح مع التصريح في كل منهما بان الفتوىٰ عليه لكن في الفتح ان قول أبي يوسفؒ اوجه عند المحققين.[1]

ترجیح میں اختلاف ہے اور دونوں قولوں کے بارے میں صراحت ہے کہ ان پر فتویٰ ہے لیکن فتح القدیر میں علامہ ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا قول محققین کے نزدیک اَوجہ ہے۔

تابید کی شرط حضراتِ شوافعؒ کے نزدیک بھی ضروری ہے۔ علامہ شیرازیؒ لکھتے ہیں:

ولا يجوز الاعلىٰ سبيل لاينقطع و ذلك من وجهين: احدهما ان يقف على من لاينقرض كالفقراء والمجاهدين وطلبة العلم وما اشبهها والثاني: ان يقف على من ينقرض ثم من بعده على من لاينقرض مثل ان يقف على رجل بعينه ثم على الفقراء او على رجل بعينه ثم على عقبه ثم على الفقراء.[2]

وقف جائز نہیں ہے سوائے ایسے مصرف پر کہ جو کبھی ختم نہ ہو۔ اب اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی جہت پر وقف کرے جو کبھی ختم نہ ہو جیسے فقراء، مجاہدین، طلبہ علم وغیرہ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ابتداءً تو ایسی جہت پر وقف کرے جو ختم ہونے والی ہو لیکن اس کے بعد ختم نہ ہونے والی جہت پر وقف ہو۔ جیسے کوئی شخص کسی معین آدمی کے لئے وقف کرے اور اس کے بعد فقراء کے لئے تو یہ وقف درست ہوگا۔

چوتھی شرط: مصرف معلوم ہو:

جس جہت پر وقف کیا جائے وہ معلوم ہونا ضروری ہے۔ اگر جہتِ مجہولہ پر وقف کیا جائے تو وہ وقف درست نہیں ہوگا۔ جیسے کوئی شخص کہے کہ ''میں کسی کے لئے یہ گھر وقف کرتا ہوں'' تو یہ وقف درست نہیں ہوگا۔ علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰٦ھ (۳۴۹/۴)

(۲) الشيرازي، الامام ابو اسحاق الشيرازي. المهذب، مصر، عيسىٰ البابي (۴۴۲/۱)

ولا يصح على غير معين كرجل وامرأة لان الوقف تمليك للعين او للمنفعة فلا يصح على غير معين كالبيع والاجارة.(۱)

وقف غیر معین پر درست نہیں جیسے کسی آدمی یا کسی عورت پر وقف کیا جائے کیونکہ وقف تو کسی چیز کی ذات یا اس کی منفعت کے مالک بنانے کا نام ہے لہٰذا غیر معین پر درست نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر مصرف معدوم محض ہو جس کے وجود کا امکان نہ ہو تو اس پر وقف کرنا درست نہیں کیونکہ جب اس مصرف کا وجود ہی ممکن نہیں تو اس کا ذکر کرنا اور نہ کرنا برابر ہے گویا کہ وقف کا مصرف متعین ہی نہیں کیا گیا ہے۔ الاشباہ والنظائر میں ہے:

لايشترط لصحة الوقف على شيئى وجود ذلک الشيئى وقته فلو وقف على اولاد زيد ولا ولد له صح وتصرف الغلة الى الفقراء الى ان يوجد له ولد، ويقول الشارح الحموى: قال بعض الفضلاء: أصل المسألة فى العمادية وفيه: وجعل آخره للفقراء ولابدمن هذا القيد لانه مدار الصحة حتى لايكون وقفا على معدوم محض فان الوقف على المعدوم لايجوز كما فى شرح الحداوى.(۲)

وقف کے صحیح ہونے کے لئے اس چیز کا موجود ہونا وقف کے وقت ضروری نہیں لہٰذا اگر زید کی اولاد پر وقف کیا اور زید کی کوئی اولاد نہ ہو تو یہ وقف درست ہے اور وقف کی آمدنی فقراء پر خرچ کی جائے گی جب تک اس کی اولاد نہ ہو۔ شارح حمویؒ لکھتے ہیں بعض فضلاء نے لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اصل میں عمادیہ میں ہے اور اس میں یہ صراحت ہے کہ اس وقف میں یہ بھی مذکور ہونا چاہئے کہ اگر زید کی اولاد نہ ہو تو فقراء پر خرچ کیا جائے۔ یہ قید ضروری ہے کیونکہ اس پر وقف کی صحت کا دارومدار ہے تاکہ معدوم پر وقف نہ ہو کیونکہ معدوم پر وقف جائز نہیں ہے جیسا کہ شرح الحداوی میں ہے۔

یہی بات علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھی ہے۔(۳)

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱. ۶۲۰ه. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۴/۸)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم، الاشباه والنظائر، كراچى، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ه (۱۰۴/۲)

(۳) الرافعى، عبد القادر الرافعى، تقريرات الرافعى ملحق برد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى (۹۶/۴)

البتہ اگر وقف کا ابتدائی مصرف معدوم ہو لیکن آخری مصرف معلوم اور متعین ہو تو یہ وقف درست ہے مثال کے طور پر ایک شخص نے زید کی اولاد کے لئے وقف کیا اور پھر آخری مصرف کے طور پر فقراء کا ذکر کیا۔ وقف کرتے وقت زید کی کوئی اولاد نہیں تھی تو یہ وقف درست ہوگا اور جب تک زید کی کوئی اولاد نہیں ہوگی اس وقت تک اس وقف کی آمدنی فقراء ہی پر خرچ کی جائے گی جب اس کی اولاد ہو جائے گی تو انہیں وقف کی آمدنی دی جائے گی۔ علامہ قاضی خانؒ لکھتے ہیں:

ولو قال أرضي صدقة موقوفة على من يحدث لي من الولد وليس له ولد يصح هٰذا الوقف فاذا ادرک الغلة يقسم على الفقراء فان حدث له ولد بعد القسمة يصرف الغلة التي توجد بعد ذلک الى هٰذا الولد مابقي هٰذا الولد فان لم يبق له ولد صرفت الغلة الى الفقراء ولأن قوله: ”صدقة موقوفة“ وقف على الفقراء و ذكر الولد الحادث للاستثناء.[1]

اگر کسی نے کہا کہ میری یہ زمین میرے آئندہ ہونے والے لڑکے پر بطورِ صدقہ وقف ہے۔ ابھی اس کا کوئی لڑکا نہیں ہے تو یہ وقف صحیح ہے اس کی آمدنی فقراء پر تقسیم کی جائے گی جب اس کا کوئی لڑکا ہوگا تو بعد میں ہونے والی آمدنی اسے ملے گی جب تک وہ زندہ رہے گا اگر زندہ نہ رہے تو پھر فقراء کو آمدنی دی جائے گی۔ کیونکہ اس کا قول ”صدقہ موقوفہ“ یہ ابتداءً ہی فقراء پر وقف ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ لڑکے کا ذکر بطورِ استثناء ہے۔

وقف کی اس صورت کو منقطع الاول کہا جاتا ہے۔ اسی طرح منقطع الاوسط وقف بھی درست ہے کہ اپنی اولاد کے لئے وقف کیا اور ان کے بعد اولاد کی اولاد کے لئے اور پھر آخر میں فقراء کے لئے۔ وقف کرتے وقت اولاد تو موجود ہے لیکن اولاد کی اولاد موجود نہیں تو یہ وقف منقطع الاوسط ہوگا اور یہ بھی صحیح ہوگا۔[2]

---

(۱) الاوز جندی، فخر الدين حسن بن منصور الاوز جندی المتوفی ۵۹۲ھ. الفتاوى الخانية بهامش الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۴۰۲ھ (۳/۳۲۴)

(۲) دیکھئے: الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۰)

مدرسہ بنانے سے پہلے اس کے لئے وقف کرنا:

اسی لئے بیشتر فقہاء کرامؒ نے وقف کی اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ ایک شخص اپنی زمین پر مدرسہ تعمیر کرنا چاہتا ہے وہ اس مدرسہ کے لئے وقف کرتا ہے کہ جو مدرسہ میں اس زمین پر تعمیر کروں گا اس کے لئے میں یہ جائیداد وقف کرتا ہوں اور آخری مصرف کے طور پر فقراء کا ذکر کر دیتا ہے تو اسے بیشتر فقہاء کرامؒ نے جائز قرار دیا ہے۔ جامع الفصولین میں ہے:

استفتی انه هیأ موضعاً لبناء المدرسة وقبل ان یبنی وقف علی هٰذا المدرسة قریً بشرائط وجعل اٰخره للفقراء وحکم قاضی بصحته؟ قیل لایصح هٰذا الوقف لانه وقف قبل وجود الموقوف علیه وقیل یصح وهو الصحیح ...... وتصرف الغلة الی الفقراء فاذا بنی المدرسة یصرف الیها فی المستقبل. [١]

سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے مدرسہ کے لئے جگہ تیار کی اور مدرسہ بنانے سے پہلے اس مجوزہ مدرسہ کے لئے کچھ زمینیں وقف کر دی اور اس کی آخری جہت فقراء کو مقرر کر دیا اور قاضی نے اس کی صحت کا بھی فیصلہ کر دیا تو کیا یہ وقف درست ہوگا؟ بعض نے کہا کہ وقف درست نہیں ہوگا کیونکہ یہ موقوف علیہ کے وجود سے پہلے وقف ہے بعض نے کہا کہ صحیح ہوگا۔ یہی قول صحیح ہے اور جب تک مدرسہ نہیں بنے گا اس کی آمدنی فقراء پر خرچ کی جائے گی مدرسہ تیار ہونے کے بعد آئندہ ان اوقاف کی آمدنی مدرسہ پر خرچ کی جائے گی۔

اسی کو علامہ ابن نجیمؒ نے الاشباہ والنظائر میں [٢] اور علامہ رافعیؒ نے تقریرات الرافعی میں [٣] راجح قرار دیا ہے۔ اگر مصرف ابتداءً غیر مخلوق ہو تو اسے امام خصافؒ نے بھی جائز قرار دیا ہے۔ [٤]

وقف کے صحیح ہونے کے لئے اس کے مصرف میں ان چار شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو وقف درست نہیں ہوگا۔

---

(١) ابن سماوہ، محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوہ. جامع الفصولین، کراچی، اسلامی کتب خانہ ١٤٠٢ھ (١/١٨٧)
(٢) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ١٤١٨ھ (٢/١٠٤)
(٣) دیکھئے: الرافعی، عبد القادر الرافعی، تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (٤/٩٦)
(٤) دیکھئے: الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ١٩٩٩م (٣٦)

دوسری فصل

تعیینِ مصرف کے سلسلہ میں واقف کے اختیارات

مصرف کے حوالہ سے جو بنیادی شرائط ہم نے فصل اول میں بیان کی ہیں ان کی رعایت رکھتے ہوئے واقف اپنے وقف کا مصرف جو بھی متعین کرنا چاہے اسے اس کا اختیار حاصل ہے اور شریعت نے بھی مصرف کے حوالہ سے اس کی تعیین اور شرط کا لحاظ رکھا ہے۔ وہ جس کو اس وقف کا مصرف بنانا چاہتا ہے بنائے اور جسے نہیں بنانا چاہتا نہ بنائے اسے مکمل حق حاصل ہے۔ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوقاف اس کی واضح مثال ہیں۔ کسی نے خود اپنے اوپر اور اپنی اولاد پر وقف کیا کسی نے اپنے رشتہ داروں پر کسی نے فقراء و مساکین پر اور کسی نے اپنی مطلقہ بیٹیوں کو وقف کا مصرف بنایا اور کسی نے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کیا۔ حضراتِ صحابہ کرام کے متعین کردہ مصارف میں یہ تنوع مصرف کی تعیین کے سلسلہ میں واقف کے وسیع اختیارات پر دلالت کرتا ہے۔ علامہ شیرازیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وتصرف الغلة على شرط الواقف من الاثرة والتسوية والتفضيل والتقديم والتاخير والجمع والترتيب وادخال من شاء بصفة واخراجه بصفة لان الصحابة رضى الله عنهم وقفوا و كتبوا شروطهم. (۱)

وقف کی آمدنی کو واقف کی شرط کے مطابق خرچ کیا جائے گا۔ اس نے کسی کو کسی پر ترجیح دی ہو یا سب کو برابر رکھا ہو، یا کسی کو مقدم رکھا ہو یا کسی کو مؤخر رکھا ہو سب کو ایک ساتھ دینے کی شرط لگائی ہو یا ترتیب سے دینے کی صراحت کی ہو کسی خاص وصف سے متصف شخص کو وقف کے مصرف میں داخل کرنے کے لئے کہا ہو یا کسی خاص وصف سے متصف شخص کو وقف سے نکالنے کے لئے کہا ہو ان تمام شرائط پر عمل کیا جائے گا۔ کیونکہ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ

---

۱) الشیرازی، الامام ابو اسحاق الشیرازی. المهذب، مصر، عیسیٰ البابی (۱/۴۴۳)

علیہم اجمعین نے وقف کئے اور اس میں اپنی شرائط بھی لگائی۔ (جو واقف کے لئے شرط عائد کرنے کے جواز پر دال ہیں)

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

وكذلك ان شرط اخراج بعضهم بصفة ورده بصفة مثل أن يقول من تزوج منهم فله ومن فارق فلاشيئى له او عكس ذلك او من حفظ القرآن فله ومن نسيه فلاشيئى له ومن اشتغل بالعلم فله ومن ترك فلا شيئى له او من كان على مذهب كذا فله ومن خرج فلا شيئى له فكل هذا صحيح على ماشرط. (۱)

اسی طرح اگر واقف نے کسی کو خاص صفت کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے نکال دیا یا وقف کے مصرف میں شامل کر دیا تو اسے اس کا اختیار حاصل ہے مثلاً کہا کہ ان میں سے جو نکاح کرلے گا اسے وقف سے ملے گا اور جو جدا ہو جائے گا اسے نہیں ملے گا یا اس کا برعکس کیا یا کہا کہ جو قرآن حفظ کرے گا اسے دیا جائے گا اور جو بھول جائے گا اسے نہیں ملے گا یا جو تحصیلِ علم میں مشغول رہے گا اسے وقف سے دیا جائے گا اور جو اسے ترک کر دے گا اسے نہیں ملے گا یا جو فلاں مذہب سے تعلق رکھے گا اسے اس وقف کی آمدنی دی جائے گی اور جو نہیں رکھے گا اسے اس کی آمدنی نہیں ملے گی تو یہ تمام شرائط معتبر ہوں گی اور واقف کی شرط کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

مصرف کے سلسلہ میں واقف کے احترام کا اندازہ اس مسئلہ سے لگایئے کہ اگر ایک شخص نے ذمیوں پر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ ان میں سے جو بھی اسلام لے آئے گا وہ اس وقف کا مصرف نہیں رہے گا اور وقف کی آمدنی سے محروم ہو جائے گا فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس شرط کو بھی لازم قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

وكذا: ان قال من انتقل الى غير النصرانية خرج اعتبر، نص على ذلك الخصاف ...... فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنى الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷ م (۲۰۵/۸)

والواقف مالک له ان یجعل ماله حیث شاء مالم یکن معصیة وله ان یخص صنفامن الفقراء دون صنف وان کان الوضع فی کلهم قربة.(۱)

اسی طرح اگر واقف نے یہ کہا کہ موقوف علیہم میں سے جو نصرانیت سے کسی اور مذہب کی طرف منتقل ہو جائے وہ اس وقف سے نکل جائے گا تو اس شرط کا اعتبار کیا جائے گا جیسا کہ امام خصاف نے صراحت کی ہے۔ کیونکہ واقف کی شرائط معتبر ہیں جب تک وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں واقف اپنے مال کا مالک ہے اسے اختیار حاصل ہے کہ جہاں چاہے اسے خرچ کرے بشرطیکہ وہ معصیت نہ ہو اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ فقراء کی ایک صنف کو مصرف قرار دے دوسری صنف کو مصرف قرار نہ دے اگرچہ سب کو دینا بھی باعثِ قربت ہے۔

آخری باب میں انشاء اللہ ہم مزید تفصیل سے مصرف کے سلسلہ میں واقف کی شرائط کا جائزہ لیں گے، یہاں تعیینِ مصرف کی کچھ مخصوص صورتوں پر گفتگو کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اپنی ذات کو وقف کا اولین مصرف بنانا:

واقف نے یہ شرط لگائی کہ اپنی زندگی میں اس وقف کی آمدنی میں ہی لوں گا۔ میرے مرنے کے بعد یہ فقراء کو ملے گی یا یہ گھر میں نے مدرسہ کے لئے وقف کیا لیکن اپنی زندگی میں خود اسی میں رہائش اختیار رکھوں گا تو یہ وقف احناف میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک درست ہے البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں اختلاف ہے ان کے نزدیک یہ وقف شرعاً درست نہیں۔ علامہ اندریتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اذا وقف أرضه اوشیئا آخر وشرط الکل لنفسه او شرط البعض لنفسه مادام حیا وبعده للفقراء فالوقف باطل عند محمدؒ وهلال الرأی وقال أبویوسفؒ: الوقف صحیح ومشایخ بلخ أخذوا بقول أبی یوسف و علیه الفتویٰ ترغیبا للناس فی الوقف.(۲)

اگر اپنی زمین یا اور کوئی چیز وقف کی اور یہ شرط لگا دی کہ اس کی پوری یا بعض آمدنی اسے ہی

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۴۱۷)

(۲) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۷۲۱)

ملے گی جب تک وہ زندہ ہے اور اس کے بعد فقراء کو ملے گی تو امام محمدؒ اور امام ہلال الرأیؒ کے نزدیک وقف باطل ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف صحیح ہے۔ مشائخ بلخ نے امام ابو یوسفؒ کا قول اختیار کیا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے لوگوں کو وقف کی ترغیب دینے کے لئے۔

یہ اختلاف بعض حضرات کے نزدیک اس مشہور اصولی اختلاف پر مبنی ہے کہ وقف کے بحکمِ صدقہ ہونے کی وجہ سے امام محمدؒ کے نزدیک اس میں تسلیم شرط ہے اور وقف کی آمدنی اپنے لئے رکھنا تسلیم کے منافی ہے کیونکہ تسلیم الی المتولی کا مقصد یہ ہے کہ واقف کا وقف سے تعلق نہ رہے۔ اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانے کی صورت میں واقف کا وقف سے تعلق ختم نہیں ہوا۔ لہٰذا تسلیم الی المتولی نہیں پایا گیا اور جب تسلیم الی المتولی نہیں پایا گیا تو وقف بھی درست نہیں ہوا۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے نزدیک وقف کے بحکم اعتاق ہونے کی وجہ سے اس میں تسلیم الی المتولی شرط نہیں لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ واقف کا وقف سے کوئی تعلق نہ ہو، اس لئے وہ اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگا سکتا ہے۔ صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

قيل ان الاختلاف بينهما بناء على الاختلاف فى اشتراط القبض والافراز.[1]

بعض حضرات نے کہا کہ حضراتِ صاحبینؒ کا اختلاف درحقیقت وقف میں متولی کے قبضہ اور افراز کے شرط ہونے نہ ہونے پر مبنی ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ اس کے تحت فرماتے ہیں:

أى قبض المتولى فلما شرطه محمدؒ منع اشتراط الغلة لنفسه لأنه حينئذ لاينقطع حقه فيه وماشرط القبض الا لينقطع حقه ولما لم يشرطه ابويوسف لم يمنعه.[2]

یعنی متولی کا قبضہ شرط ہے یا نہیں اسی اختلاف پر یہ مسئلہ بھی مبنی ہے۔ جب امام محمدؒ متولی کے

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۳۷/۵)

(۲) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸٦۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۳۷/۵) و كذا فى: الرافعى، عبد القادر الرافعى، تقريرات الرافعى ملحق برد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى (۸۵/۴)

قبضہ اور تسلیم الی المتولی کو شرط قرار دیتے ہیں تو وہ واقف کے اپنے لئے وقف کی آمدنی رکھنے کی شرط کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اس صورت میں واقف کا حق اس وقف سے ختم نہیں ہوا، تسلیم الی المتولی کی شرط کا مقصد ہی یہی تھا کہ واقف کا وقف سے تعلق ختم ہو جائے۔ اور امام ابو یوسفؒ چونکہ تسلیم کی شرط نہیں لگاتے اس لئے وہ اس شرط کو بھی ناجائز قرار نہیں دیتے۔

اس شرط میں حضراتِ صاحبین کا اختلاف اختلافِ مستقل ہے:

بعض حضرات نے اسے اختلافِ مستقل قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا مسئلۂ تسلیم کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔ اس رائے کو علامہ ابن الہمامؒ اور علامہ ابن عابدینؒ نے اوجہ قرار دیا ہے۔[1]

بہرحال امام ابو یوسفؒ اس وقف کو جائز قرار دیتے ہیں اور امام محمدؒ اس کو جائز قرار نہیں دیتے۔ فریقین کے دلائل صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ نے تفصیل سے بیان کئے ہیں ہم ذیل میں اس کا خلاصہ ذکر کر رہے ہیں۔

امام محمدؒ کا استدلال:

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وقف عقدِ تبرع ہے جس میں شئی موقوف کی منفعت کا اللہ کی رضا کے لئے کسی کو مالک بنایا جاتا ہے۔ اگر واقف وقف کی آمدنی خود لے تو تملیک من نفسہٖ لازم آئے گی کہ اپنے آپ ہی کو اپنی وقف کردہ چیز کی آمدنی کا مالک بنالیا کسی اور کو مالک نہیں بنایا اور تملیک من نفسہٖ کی صورت میں نفسِ تملیک متحقق نہیں ہوتی لہٰذا وقف کا بنیادی عنصر تملیک نہیں پایا گیا اس لئے یہ وقف درست نہیں ہوا اور جو شرط فسادِ وقف کا باعث ہو وہ خود فاسد ہوتی ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس شرط کی مثال تو ایسی ہے جیسے صدقہ منفذہ کہ فقیر کو بطور صدقہ کچھ دیا اور یہ شرط لگادی کہ اس میں سے اتنا میرا ہوگا یا مسجد بنانے کے لئے جگہ وقف کی لیکن یہ شرط لگادی کہ مسجد کے اتنے حصہ کو بطور رہائش استعمال کروں گا تو جس طرح یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں اسی طرح اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانا بھی ناجائز ہوگا۔ علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۳۷/۵) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۴/۴)

وجه قول محمد رحمه الله أن الوقف تبرع على وجه التمليک بالطريق الذى قدمناه فاشتراطه البعض أو الكل لنفسه يبطله لان التمليک من نفسه لايتحقق فصار كالصدقة المنفذة و شرط بعض بقعة المسجد لنفسه.[1]

علامہ زیلعیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وجه قول محمد ان التقرب بازالة الملک واشتراط الغلة او بعضها لنفسه يمنع ذلک فكان باطلاً كالصدقة المنفذة.[2]

امام محمدؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ وقف میں قربت اس سے حاصل ہوتی ہے کہ واقف شئ موقوف سے اپنی ملکیت زائل کرتا ہے۔ جبکہ پوری آمدنی یا بعض آمدنی کی اپنے لئے شرط لگانا زوالِ ملکیت سے مانع ہے اس لئے وقف باطل ہوگا جیسے صدقہ منفذہ۔

امام ابو یوسفؒ کا پہلا استدلال:

امام ابو یوسفؒ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقف کی آمدنی استعمال فرمایا کرتے تھے۔

صاحبِ ہدایہ نے یہ حدیث نقل کی ہے، لکھتے ہیں:

روى أن النبى صلى الله عليه وسلم كان يأكل من صدقته.[3]

لیکن علامہ زیلعیؒ نے اسے غریب قرار دیا ہے البتہ انہوں نے مصنف ابن ابی شیبہ سے ایک روایت ذکر کی ہے جس سے یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے۔ علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

قوله: "روى ان النبى عليه السلام كان ياكل من صدقته" قلت: غريب ايضاً و فى مصنف بن أبى شيبة فى باب "الاحاديث التى اعترض بها

---

(۱) المرغينانى، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۳۸/۵)

(۲) الزيلعى، فخر الدين عثمان بن على الزيلعى ۷۴۳ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۰م (۲۶۸/۴) و كذا فى: السرخسى، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابى سهل السرخسى. المبسوط للسرخسى، بيروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۴۱/۱۲)

(۳) حواله بالا.

على أبي حنيفة" حدثنا ابن عيينة عن ابن طاؤس عن أبيه أخبرني حجر المدري قال: في صدقة النبي عليه السلام ياكل منها أهلها بالمعروف غير المنكر.[۱]

یہ حدیث غریب ہے۔ البتہ مصنف بن ابی شیبہ باب: "الاحادیث التی اعترض بها علی أبی حنیفة" میں حضرت حجر مدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقف میں یہ شرط تھی کہ اس وقف سے اہلِ وقف مناسب انداز میں کھا سکتے ہیں۔

اور ظاہر ہے وقف سے واقف یا اہلِ واقف کا کھانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ وقف کرتے وقت واقف نے اس میں یہ شرط لگائی ہو، بلاشرط تو کسی کے نزدیک واقف کے لئے وقف کی آمدنی استعمال کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے موقوفہ گھر میں خود بھی رہتے تھے۔[۲]

دوسرا استدلال:

دوسری دلیل یہ ہے کہ وقف سے مقصود قربۃ ہے اور قربۃ اس صورت میں بھی حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اپنی ذات پر خرچ کرے۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من كسب الرجل كسب أطيب من عمل يديه وما انفق الرجل على نفسه وأهله وولده وخادمه فهو له صدقة.[۳]

---

(۱) الزيلعي، جمال الدين ابو محمد عبد الله بن يوسف الزيلعي. نصب الراية، بيروت، مؤسسة الرسالة. الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۷م (۳/۴۷۹)

(۲) البيهقي، احمد حسين بن على البيهقي ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۶/۱۶۱)

(۳) القزويني، ابوعبد الله محمد بن يزيد القزويني المتوفى ۲۷۳ھ. سنن ابن ماجه، رياض، شركة الطباعة العربية، الطبعة الثانية ۱۹۸۴م (باب الحث على المكاسب، التجارات) و كذا في نصب الرايه (۳/۴۷۹)

انسان کی اپنے ہاتھ کی کمائی سے پاکیزہ کوئی کمائی نہیں۔ انسان اپنے اوپر، اپنے اہل خانہ اور اولاد پر اور اپنے خادم پر جو خرچ کرتا ہے وہ سب صدقہ ہے۔

لہٰذا وقف کی آمدنی خود استعمال کرنے سے بھی قربۃ کا پہلو حاصل ہو جائے گا۔

تیسرا استدلال:

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسافر خانہ بنائے اور یہ شرط لگائے کہ میں بھی جب یہاں سے گذروں گا تو یہاں ٹھہروں گا یا قبرستان کے لئے زمین وقف کرے اور یہ شرط لگا دے کہ میں بھی یہاں مدفون ہوں گا تو یہ شرط بالاتفاق جائز ہے۔ حالانکہ یہ بھی تو اپنے وقف سے انتفاع کی ایک صورت ہے۔

علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

فصار نظير ما اذا بنى خانا أوسقاية أو جعل أرضه مقبرة و شرط أن ينزله أو يشرب منها أو يدفن فيها. (۱)

اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانا ایسا ہی ہے جیسے مسافر خانہ بنایا یا پانی کی سبیل بنائی یا اپنی زمین کو قبرستان کے لئے وقف کر دیا اور یہ شرط لگا دی کہ میں بھی اس مسافر خانہ میں ٹھہروں گا یا اس سبیل سے پانی پیوں گا یا اس قبرستان میں مدفون ہوں گا۔

امام محمدؒ کے استدلال کا جواب:

امام محمدؒ نے یہ جو فرمایا تھا کہ اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانے کی صورت میں تملیک من نفسہٖ لازم آئے گی کہ اپنی چیز کا اپنے ہی کو مالک بنالیا۔ اس کا جواب امام ابو یوسفؒ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ جب واقف نے وقف کیا تو وقف کرتے ہی وہ موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوگئی پھر واقف نے جب اپنے لئے اس وقف کی آمدنی کی شرط لگائی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی مملوکہ چیز کا اپنے آپ کو مالک بنالیا تو یہاں اپنی چیز کا اپنے ہی کو مالک بنانا لازم نہیں آیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مملوکہ چیز کا واقف نے اپنے آپ کو مالک بنایا ہے، لہٰذا تملیک من نفسہٖ کی خرابی یہاں لازم نہیں آرہی۔

---

(۱) الزيلعي، فخر الدين عثمان بن علي الزيلعي ۷۴۳ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۰م (۲۶۸/۴)

صاحبِ ہدایہؒ فرماتے ہیں:

ولان الوقف ازالة الملك الى الله تعالىٰ على وجه القربة على مابينا فاذا شرط البعض أو الكل لنفسه فقد جعل ماصار مملوكاً لله تعالىٰ لنفسه لا انه يجعل ملك نفسه لنفسه وهٰذا جائز. [1]

وقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی ملکیت زائل کر کے اس چیز کی ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل کردی جائے، جب واقف نے کل یا بعض آمدنی کی شرط اپنے لئے لگائی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی مملوک چیز اپنے لئے کرلی اور یہ جائز ہے یہ بات نہیں ہے کہ اس نے اپنی ہی مملوکہ چیز کا اپنے آپ کو مالک بنالیا۔

احناف کا قولِ راجح:

فقہاءِ احناف کے یہاں اس مسئلہ میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول راجح ہے کہ واقف وقف کرتے وقت اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگا سکتا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ امام خصافؒ فرماتے ہیں:

وقدروى عن النبى صلى الله عليه وسلم انه امر برجل يسوق بدنة وقد أعيا فقال: له اركبها فقال انها بدنة فقال له: اركبها فقال: انها بدنة فقال: اركبها وان كانت بدنة، فقد امر رسول الله صلى الله عله وسلم بالانتفاع بها وهى بدنة فكذلك السبيل فى الوقف و قدروى الواقدى عن ابن أبى سبرة عن أبى بكر بن عبد الرحمن عن عبد الله بن عمران عمر بن الخطاب رضى الله عنه كان ياكل من صدقته بثمغ وقد شرط عبد الله بن عمر بن الخطاب فى وقفه انه لاجناح على عبدالله ولا على أحد من ولاة هٰذه الصدقة من بعده ان ياكل من ثمر صدقته ويؤكِل. [2]

---

(۱) المرغینانی، برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۸/۵)

(۲) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹ء (۱۲۹)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک شخص حرم میں ذبح کرنے کے لئے قربانی کا جانور لے جارہا تھا اور کافی تھک گیا تھا آپ نے اس سے فرمایا کہ اس پر سوار ہوجا۔اس نے عرض کیا کہ یہ حرم کا جانور ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوار ہوجا،اس نے مکرر عرض کیا کہ یہ حرم کا جانور ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوار ہوجا اگرچہ یہ حرم میں ذبح کیا جانے والا جانور ہی کیوں نہ ہو۔اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور سے فائدہ اٹھانے کا حکم دیا حالانکہ یہ حرم کا جانور تھا یہی حکم وقف کا بھی ہونا چاہئے۔

واقدی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنے وقف ثمغ سے کھایا کرتے تھے اور عبداللہ بن عمر نے اپنے وقف میں شرط لگائی تھی کہ عبداللہ یا اس وقف کے کسی اور متولی کے لئے اس وقف کے پھل میں سے خود کھانے اور کسی اور کو کھلانے میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وجاز جعل غلة الوقف او الولاية لنفسه عند الثانی وعليه الفتویٰ.(۱)

وقف کی آمدنی یا اس کی تولیت واقف کے لئے خود رکھنا جائز ہے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک، اسی پر فتویٰ ہے۔

دیگر ائمہ کا موقف:

احناف کے علاوہ دیگر ائمہ ثلاثہ میں سے حضراتِ مالکیہ تو اس کی سختی سے ممانعت فرماتے ہیں۔

علامہ مواقؒ ’’التاج والاکلیل‘‘ میں لکھتے ہیں:

الحبس علی نفس المحبس وحده باطل اتفاقاً وكذلک مع غيره علی المعروف و ظاهر المذهب بطلان كل حبس من حبس علی نفسه وغيره ان لم يحز عنه فان حيز صح علی غيره فقط.(۲)

---

(۱) الحصكفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدين الحصكفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۴/۴)

(۲) المواق، ابو عبد الله محمد بن يوسف بن ابی القاسم الشهير بالمواق ۸۹۷ھ. التاج والاكليل بهامش مواهب الجليل، بيروت، دار الفكر الطبعة الثانية ۱۹۷۸م (۲۵/۲)

واقف کا اپنے اوپر وقف کرنا باطل ہے اسی طرح کسی اور کے ساتھ اپنے اوپر وقف کرنا بھی معروف قول کے مطابق باطل ہے۔ ظاہر مذہب یہ ہے کہ ہر وہ وقف جو واقف نے اپنے اور کسی اور پر کیا ہوا گر اسے اپنی ملکیت سے الگ نہیں کیا تو وہ باطل ہے اور اگر الگ کر دیا گیا تو غیر پر صحیح ہے اپنے اوپر صحیح نہیں۔

حضراتِ شافعیہ کے یہاں اس میں اختلاف ہے، اکثر فقہاءِ شوافع کا رجحان عدمِ جواز کی طرف ہے۔ علامہ نوویؒ المنہاج میں تحریر فرماتے ہیں:

ویصح علی ذمی لامرتد و حربی و نفسہ فی الاصح. (۱)

ذمی پر وقف صحیح ہے۔ مرتد پر، حربی پر اور اپنی ذات پر وقف کرنا اصح قول کے مطابق صحیح نہیں۔

شارح منہاج علامہ شربینی خطیبؒ اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

لتعذر تملیک الانسان ملکہ لنفسہ لانہ حاصل وتحصیل الحاصل محال: والثانی یصح لان استحقاق الشیئی وقفا غیر استحقاقہ ملکا. (۲)

اصح قول یہ ہے کہ اپنے اوپر وقف کرنا صحیح نہیں کیونکہ انسان کا اپنے آپ کو مالک بنانا متعذر ہے کیونکہ یہ پہلے سے حاصل ہے اور تحصیل حاصل محال ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ ایسا وقف صحیح ہے کیونکہ ایک چیز کا وقف ہونے کی حیثیت سے مستحق ہونا اس استحقاق سے مختلف ہے جو ملکیت کی بناء پر حاصل ہوتا ہے۔

حضراتِ حنابلہ کے یہاں کچھ تفصیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر وقف نے واقف کی آمدنی اپنے لئے خاص کر لی تو اس کی اجازت ہے۔ یعنی وقف تو ابتداءً اہی فقراء وغیرہ پر کیا لیکن وقف کرتے وقت یہ صراحت کر دی کہ اپنی زندگی میں اس کی آمدنی میں خود لوں گا تو اس کی اجازت ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ان الواقف اذا اشترط فی الوقف ان ینفق منہ علی نفسہ صح الوقف والشرط، نص علیہ احمد، قال الأثرم: قیل لأبی عبد اللہ یشترط فی

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. المنہاج مع شرحہ مغنی المتحاج بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۸۰/۲)

(۲) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۸۰/۲)

الوقف انی انفق علی نفسی واھلی منه؟ قال: نعم، واحتج قال: سمعت ابن عيينة عن ابن طاؤس عن أبيه عن حجر المدری ان فی صدقة رسول الله صلى الله عليه وسلم ان ياكل منها أهله بالمعروف غير المنكر ...... وبذلک قال ابن أبی ليلی وابن شبرمة وأبويوسف والزبير وابن سريج ...... ولان عمر رضی الله عنه لما وقف قال: ولا بأس علی من وليها ان ياكل منها أو يطعم صديقا غير متمول فيه وكان الوقف فی يده الی ان مات. ولانه اذا وقف وقفا عاما كالمساجد والسقايات والرباطات والمقابر كان له الانتفاع به فكذلک ههنا.(۱)

واقف نے وقف میں یہ شرط لگائی کہ وہ وقف اپنی ذات پر خرچ کرے گا تو یہ وقف اور شرط دونوں صحیح ہے۔ امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔ اثرم کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ سے ایسے وقف کے بارے میں پوچھا گیا انہوں نے فرمایا کہ یہ وقف صحیح ہے اور استدلال اس سے کیا کہ حضرت حجر مدریؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقف میں یہ شرط تھی کہ اس وقف سے آپ کے اہل مناسب انداز میں کھا سکتے ہیں۔ یہی قول ابن ابی لیلیٰ ابن شبرمہ، امام ابو یوسف، زبیر اور ابن سریج رحمہم اللہ کا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب وقف کیا تھا تو اس میں یہ صراحت کی تھی کہ اس کے متولی کے لئے اس وقف سے خود کھانا یا اپنے کسی دوست کو کھلانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے تمول حاصل نہ کیا جائے اور یہ وقف حضرت عمرؓ ہی کی تولیت میں تھا آپ کی وفات تک۔ ایک اور دلیل اپنے وقف سے فائدہ اٹھانے کے جواز پر یہ ہے کہ اوقافِ عامہ جیسے مساجد، سبیلیں، مسافر خانے اور مقابر سے واقف خود بھی بالاتفاق مستفید ہوسکتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دیگر اوقاف میں بھی اس کی اجازت ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات ہی پر وقف کرے اور اپنے بعد فقراء پر وقف کرے۔ اس میں حنابلہ کی دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ وقف درست ہے ابن قدامہؒ نے حنبلی فقیہ ابن عقیل

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۹۱/۸)

کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ قول اصح ہے۔ جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ وقف درست نہیں باطل ہے۔ اسے علامہ ابن قدامہؒ نے اُقیس قرار دیا ہے۔(۱)

ترجیح:

ان اقوال میں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ واقف اپنی ذات پر خرچ کرنے کی شرط کے ساتھ وقف کرسکتا ہے۔ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل اس کی واضح دلیل ہے۔

ہم نے نصب الرایہ کے حوالہ سے پیچھے نقل کیا ہے کہ حضرت حجر مدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں واضح طور پر موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقف کی آمدنی استعمال فرمایا کرتے تھے۔(۲) علامہ ابن قدامہؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف سے بھی اس پر استدلال فرمایا ہے۔ امام خصاف نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت نقل کی ہے:

> **حدثنا ابراهيم بن يحى أن زيد بن ثابت كان ياكل من صدقة الثمرة.(۳)**
>
> ابراہیم بن یحیٰ نے ہم سے بیان کیا کہ زید بن ثابت اپنے وقف باغ کے پھل کھایا کرتے تھے۔

سننِ بیہقی میں حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ اپنے موقوفہ گھر میں رہا کرتے تھے۔ امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

> **قال مالک: و حبس زيد بن ثابت عندى قال: و كان زيد بن ثابت رضى الله عنه يسكن منزلا فى داره التى حبس عند المسجد حتى مات فيه وقد كان عبد الله بن عمر رضى الله عنه فعل ذلک، حبس داره و كان يسكن مسكنا فيها.(۴)**

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۱۹۴/۸)

(۲) الزيلعى، جمال الدين ابو محمد عبد الله بن يوسف الزيلعى. نصب الرايه، بيروت، مؤسسة الرسالة، الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۷م (۴۷۹/۳)

(۳) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۳) لعله من ثمرة الصدقة. خليل

(۴) البيهقى، احمد حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۱/۶)

مالکؒ نے فرمایا کہ زید بن ثابتؓ نے میرے سامنے وقف کیا اور زید بن ثابت اپنی وفات تک اس گھر میں رہا کرتے تھے جو انہوں نے مسجد کے پاس وقف کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، آپ نے گھر وقف فرمایا تھا اور اس میں آپ رہائش بھی رکھا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے:

انه وقف دارا بالمدينة فكان اذا حج مر با لمدينة فنزل داره. [1]

حضرت انسؓ نے مدینہ میں گھر وقف کیا تھا جب آپ حج کے لئے جاتے ہوئے مدینہ منورہ سے گذرتے تو اس گھر میں قیام فرماتے تھے۔

یہ تمام روایات اس موقف پر دلالت کرنے کے لئے واضح ہیں کہ واقف اپنے وقف سے خود استفادہ کرسکتا ہے اور وقف کرتے وقت اس کی شرط بھی لگا سکتا ہے۔ اور اگر وہ اپنی زندگی تک وقف کی آمدنی اپنے لئے خاص کرلے تو اس کی اجازت ہے۔ البتہ آخری جہت فقراء ہونا بہرحال ضروری ہے۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) البیهقی، احمد حسین بن علی البیهقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۶/۱۶۱)

اپنی اولاد پر وقف (وقف علی الأ ولاد)

اپنی اولاد کے لئے وقف کرنا جمہور فقہاء امت کے نزدیک جائز ہے اور اس میں جہاں وقف کا ثواب ہے وہاں صلہ رحمی کا بھی ثواب ہے۔

وقف علی الأ ولاد کا ثبوت نصوص سے:

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوقاف میں واضح طور پر اس کا ثبوت موجود ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں کئی حضراتِ صحابہ کرام کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد پر وقف کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

تصدق ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ بدارہ بمکۃ علی ولدہ فھی الی الیوم و تصدق عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بربعہ عند المروۃ و بالثنیۃ علی ولدہ فھی الی الیوم ...... وتصدق الزبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بدارہ بمکۃ فی الحرامیۃ و دارہ بمصر و اموالہ بالمدینۃ علی ولدہ فذلک الی الیوم و تصدق سعد بن أبی وقاصؓ بدارہ بالمدینۃ وبدارہ بمصر علی ولدہ فذلک الی الیوم...... و عمر بن العاصؓ بالوھط من الطائف ودارہ بمکۃ علی ولدہ فذلک الی الیوم وحکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بدارہ بمکۃ والمدینۃ علی ولدہ فذلک الی الیوم. (۱)

حضرت ابوبکرؓ نے اپنا مکہ کا گھر اپنی اولاد پر وقف کیا وہ آج تک موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے مروہ کے پاس اپنا باغ اپنی اولاد پر وقف کیا وہ بھی آج تک موجود ہے۔ زبیر بن العوامؓ نے

---

۱) البیھقی، احمد حسین بن علی البیھقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنۃ (۶/۱۶۱)

مکہ مکرمہ میں حرامیہ نامی جگہ پر واقع اپنا گھر اور مصر میں موجود اپنا گھر اور مدینہ منورہ میں اپنے اموال اپنی اولاد پر وقف کئے وہ آج تک چلے آرہے ہیں۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے مدینہ منورہ میں اپنا گھر اور مصر میں اپنا گھر اپنی اولاد پر وقف کیا وہ آج تک موجود ہے۔ عمرو بن العاصؓ نے طائف میں واقع اپنا گھر اور مکہ مکرمہ کا گھر اپنی اولاد کے لئے وقف کیا وہ اب تک موجود ہے۔ حکیم بن حزامؓ نے اپنا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا گھر اپنی اولاد پر وقف کیا وہ آج تک چلا آرہا ہے۔

ہشام بن عروہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے وقف کے بارے میں فرماتے ہیں:

جعل الزبير دوره صدقة على بنيه لاتباع ولاتوهب ولاتورث وللمردودة من بناته ان تسكن غير مضرة ولامضربها فاذا استغنت بزوج فليس لها فيها حق لاتباع ولاتورث. (۱)

حضرت زبیرؓ نے اپنا گھر اپنے بیٹوں پر اس طرح وقف کردیا تھا کہ اسے بیچا نہیں جاسکتا، ہبہ نہیں کیا جاسکتا اور اس میں میراث جاری نہیں ہوسکتی نیز اس میں صراحت کردی تھی کہ ان کی بیٹیوں میں سے جو مطلقہ ہوجائے یا اس کے شوہر کا انتقال ہوجائے وہ بھی اس میں رہ سکتی ہے نہ وہ کسی کو نقصان پہنچائے اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچائے۔ جب وہ نکاح کر کے اس گھر سے مستغنی ہوجائے تو پھر اسے اس گھر میں کوئی حق حاصل نہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی اسی نوعیت کا وقف کیا تھا۔ (۲)

امام خصافؒ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت نقل کی ہے:

حبس زيد بن ثابت داره على ولده وولد ولده و على أعقابهم لاتباع ولا توهب ولا تورث. (۳)

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۲)

(۲) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۴)

(۳) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م ا(۱۲)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنا گھر اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد اور ان کی نسل پر وقف کیا تھا کہ اسے نہ بیچا جاسکے نہ ہبہ کیا جاسکے اور نہ اس میں ان کی میراث جاری ہو۔

ابوسعادا لجہنیؒ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے وقف کے بارے میں فرماتے ہیں:

أشهدني عقبة بن عامرؓ على دار تصدق بها حبساً لاتباع ولاتوهب ولاتورث على ولده وولد ولده فاذا انقرضوا فالى اقرب الناس منى حتى يرث الله الارض ومن عليها. (۱)

عقبہ بن عامرؓ نے مجھے اپنے اس گھر کے بارے میں گواہ بنایا تھا جو انہوں نے وقف کیا تھا کہ اسے نہ بیچا جاسکتا ہے، نہ ہبہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس میں میراث جاری ہوگی یہ وقف انہوں نے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد پر کیا تھا اور پھر فرمایا تھا کہ اگر یہ سب نہ رہیں تو مجھ سے جو شخص قرابت میں سب سے زیادہ قریب ہوگا اسے یہ وقف ملے گا قیامت تک کے لئے۔

عقلاً وقف علی الأولاد کی ضرورت:

عقلاً بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ایک شخص کے بچے چھوٹے ہیں اور بیماریوں کی وجہ سے اسے اپنی زندگی کی زیادہ امید نہیں ہے وہ اگر اپنی اولاد پر وقف نہ کرے اور اس کا ترکہ اس کے انتقال کے بعد اس کے بچوں کے حصہ میں آئے تو ان کی ناسمجھی کی وجہ سے اس کا امکان غالب ہے کہ وہ اس کی جائیداد وغیرہ بیچ کر کھا جائیں گے اور پھر دوسروں کے محتاج ہو جائیں گے۔اگر وہ اپنی جائیداد ان پر وقف کردے کہ اس کے منافع اور آمدنی ان میں تقسیم کی جائے تو اس میں ان کا زیادہ فائدہ ہے کیونکہ وقف ہونے کی وجہ سے وہ جائیداد بیچی نہیں جاسکے گی اور ان کے لئے مستقل ذریعہ آمدنی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

اسی طرح اولاد کے نافرمان اور فضول خرچ ہونے کی صورت میں بھی یہ امکان ہوتا ہے کہ میراث میں ملنے والی جائیداد وہ خود بیچ کر پیسے ختم کر ڈالیں یا لوگ ان پر واجب الاداء دیون کے حصول کے لئے ان کی جائیداد بیچ دیں۔اگر باپ اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد ان کے لئے وقف کردے گا تو یہ امکان نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا اور ان کی ضرورت بھی مستقل بنیادوں پر پوری ہوتی رہے گی۔

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۹۹۹م (۱۲)

یہ خطرات وہاں بھی ہو سکتے ہیں جہاں کسی شخص کے انتقال کے بعد اس کے مال و اولاد کے بننے والے اولیاء امانتدار اور دیانتدار نہ ہوں اور امکان ہو کہ اس کے انتقال کے بعد اس کی جائیداد ورثہ کو ملنے کے بجائے ان کی دستبرد کا شکار ہو جائے گی اور ورثا محتاج ہی رہیں گے۔ اس کے تدارک کے لئے اگر وہ اولاد پر وقف کر دے تو اس خطرہ سے حفاظت ہو سکتی ہے۔

انگریزوں کی طرف سے وقف علی الأولاد پر پابندی:

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس تعامل اور امت کے توارث کی وجہ سے اپنی اولاد پر وقف کرنے یا اپنی اولاد کو وقف کی آمدنی دینے میں کسی فقیہ کا اختلاف نہیں رہا۔

برصغیر پر انگریزوں کے غلبہ کے بعد ان کی عدالتوں میں اوقاف کے حوالہ سے جب مقدمات جانے شروع ہوئے تو انہوں نے بہت سے مقدمات میں وقف علی الاولاد کو باطل قرار دیدیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا فیصلہ بمبئی ہائی کورٹ سے ۱۸۷۳ء میں جاری ہوا جس میں وقف علی الاولاد کو باطل قرار دیا گیا۔ اس کے بعد بھی اس طرح کے فیصلے آتے رہے۔ ۱۸۹۴ء میں پریوی کونسل نے اپنا مشہور فیصلہ بمقدمہ ابوالفتح محمد اسحاق بنام رسوموری سنایا جس میں وقف کی اس صورت کو باطل قرار دیدیا گیا کہ کوئی مسلمان اپنی اولاد پر وقف کرے۔[1]

پابندی کی وجہ:

ان فیصلوں کی وجہ علامہ شبلی نعمانی ؒ نے یہ لکھی ہے کہ انگریز وقف کا ترجمہ خیرات سمجھتے تھے اور خیرات کو انگریزی میں چیریٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کے عرف کے مطابق چیریٹی کا محل اپنی اولاد نہیں ہوتی۔ انسان اپنی اولاد کے لئے جو بھی کرتا ہے وہ گویا اپنے لئے کرتا ہے۔ خیرات وہ ہوتی ہے جس سے اپنے اور اپنی اولاد کے علاوہ کسی اور کو فائدہ پہنچے۔ خیرات کا یہ مفہوم چونکہ وقف علی الاولاد پر صادق نہیں آتا تھا اس لئے وہ وقف علی الاولاد کو درست قرار نہیں دیتے تھے۔[2]

---

(۱) شیخ گلاب دین۔ قائداعظم اور وقف علی الاولاد، لاہور آتش فشاں پبلیکیشنز ۱۹۹۰م (۵)

(۲) نعمانی، محمد شبلی نعمانی۔ مقالات شبلی، انڈیا، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۷۳ھ (۸۲/۱)

انگریزوں کی غلط فہمی:

یہ انگریزوں کی غلط فہمی تھی کہ انہوں نے اولاً تو وقف کا ترجمہ خیرات سے کیا اور پھر خیرات کو بھی اپنے قریبی رشتہ داروں کے علاوہ اوروں پر خرچ کرنے سے تعبیر کیا۔ حالانکہ وقف عام خیرات (Charity) نہیں ہے۔ یہ خیرات کی ایک مخصوص شکل ہے جس میں اصل چیز کو باقی رکھ کر اس کے منافع اور فوائد مستحقین کو دئے جاتے ہیں۔

عام خیرات میں تو اصل چیز ہی دی جاتی ہے، پھر مستحقین کی مرضی ہے کہ اسے براہِ راست خرچ کر ڈالیں یا اسے باقی رکھ کر اس کے منافع سے فائدہ اٹھائیں۔

دوسری غلط فہمی انہیں یہ ہوئی کہ انہوں نے خیرات کا مفہوم بہت تنگ سمجھا اور غیروں پر خرچ کرنے ہی کو خیرات قرار دیا اپنی اولاد پر خرچ کرنے کو خیرات نہیں سمجھا۔ حالانکہ شریعتِ اسلامیہ میں جہاں غیر رشتہ داروں پر خرچ کرنا خیرات اور باعثِ ثواب ہے وہاں اپنے قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرنا بھی خیرات میں داخل ہے اور باعثِ ثواب ہے، بلکہ اس میں خیرات کے ثواب کے علاوہ صلہ رحمی کا ثواب بھی ملتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کا واقعہ موجود ہے جس میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے شوہر پر صدقہ کر سکتی ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ اجازت دی بلکہ فرمایا:

لها أجران أجر القرابة وأجر الصدقة. (۱)

انہیں دگنا اجر ملے گا ایک صلہ رحمی کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر۔

صحیح مسلم ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دینار انفقته فی سبیل اللہ و دینار انفقته فی رقبة و دینار تصدقت به علی مسکین و دینار انفقته علی أهلک، أعظمها أجرا الذی انفقته علی أهلک. (۲)

---

(۱) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارة القرآن (کتاب الزکاة رقم الحدیث: ۱۰۰۰)

(۲) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارة القرآن (کتاب الزکاة، رقم الحدیث: ۹۹۵)

ایک دینار وہ ہے جو تم جہاد میں خرچ کرو، ایک دینار وہ ہے جو تم غلام کی آزادی پر خرچ کرو، ایک دینار وہ ہے جو تم صدقہ کرو اور ایک دینار وہ ہے جو تم اپنے اہل پر خرچ کرو، ان میں سے سب سے افضل اور زیادہ اجر اس دینار میں ہے جو تم نے اپنے اہل پر خرچ کیا ہو۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: افضل دينار ينفقه الرجل دينار ينفقه على عياله. (۱)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے افضل دینار جو آدمی خرچ کرتا ہے وہ دینار ہے جو آدمی اپنے عیال پر خرچ کرے۔

اسی طرح حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:

عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: ان المسلم اذا انفق علی اهله نفقة وهو یحتسبها کانت له صدقة. (۲)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک مسلمان جب اپنے اہل پر ثواب کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لئے صدقہ ہوتا ہے۔

قریبی رشتہ داروں پر صدقہ کرنے کی بھی ایسی ہی فضیلت ہے۔ حضرت میمونہ بنت الحارث نے ایک باندی آزاد کی، حضور کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم یہ باندی اپنے ننھیال والوں کو دیدیتی تو اس میں تمہیں زیادہ ثواب ملتا۔ (۳)

یہ تمام احادیث اس پر شاہد ہیں کہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا صدقہ کی ایک بہترین صورت ہے۔ اور وقف کی صورت میں اپنی اولاد پر خرچ کرنے پر تو بے شمار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل

---

(۱) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارة القرآن (کتاب الزکاة، رقم الحدیث: ۹۹۴)

(۲) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارة القرآن (کتاب الزکاة، رقم الحدیث: ۱۰۰۲)

(۳) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارة القرآن (کتاب الزکاة، رقم الحدیث: ۹۹۹)

موجود ہے جیسا کہ ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے، ان تمام نصوص کے ہوتے ہوئے وقف علی الاولاد کو خیرات نہ سمجھنا اسلام کے احکام سے ناواقفیت اور لاعلمی کی بین دلیل ہے۔

انگریزوں کے فیصلہ پر ردعمل:

انگریزوں کی جانب سے جب وقف علی الاولاد پر پابندی کا فیصلہ آیا تو پورے ہندوستان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ۱۸۹۴ء کے پریوی کونسل کے فیصلہ سے تو ایک ہیجان برپا ہوگیا اور مسلمانوں نے سے واضح طور پر اپنے دین میں مداخلت سمجھا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے ردعمل کے طور پر مسلمانوں کی سیاسی تماعتوں نے قراردادیں پاس کیں اور انگریز حکام پر اس معاملہ میں نظر ثانی کے لئے دباؤ ڈالا گیا۔ علامہ شبلی عمانی رحمہ اللہ نے اس پر ایک مفصل رسالہ لکھ کر مفتیانِ ہند کے دستخط کروا کر انگریز حکام کو بھیجا اور مترجمِ ہدایہ سولانا امیر علی صاحب مرحوم جو خود ایک جج تھے انہوں نے بھی اس پر تفصیلی مضمون لکھ کر انگریز حکام کو پیش کیا۔

پابندی کا خاتمہ:

مسلمانوں کے احتجاج اور اشتعال کو دیکھتے ہوئے بالآخر ۱۹۱۳ء میں انگریزوں نے یہ پابندی ایک یکٹ کے ذریعہ ختم کردی اس ایکٹ کو ''جواز وقف علی الاولاد مصدرہ ۱۹۱۳ء ایکٹ'' کا نام دیا گیا۔ اسمبلی سے اس ایکٹ کو منظور کروانے میں قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے جو کوششیں کیں انہیں تاریخ میں سنہری روف سے لکھا گیا۔ آپ ۱۹۱۰ء میں امپیریل لجسلیٹو کونسل (Legislative Council) کے رکن بنے، آپ نے ۱۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو جواز وقف علی الاولاد کا بل اسمبلی میں پیش کیا۔ اسمبلی کی مباحث، گفت و شنید اور کارروائیوں سے گذرنے کے بعد بالآخر ۱۹۱۳ء میں یہ ایکٹ منظور ہوا اور اس کے نافذ ہوتے ہی لریزوں کی طرف سے وقف علی الاولاد پر پابندی ختم ہوگئی۔ (۱)

رثاء کو میراث سے محروم کرنے کے لئے اولاد پر وقف کیا جائے:

اگر اپنی اولاد میں سے کچھ پر اس لئے وقف کیا جارہا ہے کہ واقف کے انتقال کے بعد دیگر ورثاء کو راث میں کچھ نہ ملے یا کم ملے تو ایسی صورت میں بھی کیا یہ وقف درست ہوگا؟ اسی طرح اگر کوئی اپنے لوں پر وقف کردے تاکہ لڑکیاں اس کی میراث سے محروم رہیں تو کیا یہ وقف درست ہوگا؟

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: شیخ گلاب دین۔ قائداعظم اور وقف علی الاولاد، لاہور آتش فشاں پبلیکیشنز ۱۹۹۰م (۵)

ان سوالات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے کیونکہ وقف علی الاولاد کی بیشتر صورتوں میں اس طرح کی فاسد نیتیں اور ناجائز مقاصد پائے جانے کا امکان ہے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اگر کوئی شخص اس نیت سے اپنی بعض اولاد پر وقف کرتا ہے تو یہ نیت بالکل ناجائز ہے اور اسے اس نیت فاسدہ کا گناہ بھی ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ اس کا وقف بھی بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل نہ کر سکے۔

اور بعض فقہاء کرام کے نزدیک ایسا وقف شرعاً معتبر اور منعقد ہی نہیں ہوگا، قاضی کے علم میں اگر آجائے تو اس پر اسے باطل کرنا لازم ہے۔ المعیار المعرب میں ہے:

ان تخصيص بعض البنين بحبس أو غيره من العطايا وافرادهم بها دون بعض مماورد النهى عنه من الشارع نصامن طرق متعددة وروايات متعاضدة ...... وقد شهر من غير واحد من المحققين ابطال حبس أخرجت منه البنات. [1]

اولاد میں سے بعض کو وقف یا اس کے علاوہ کسی اور عطیہ کے ساتھ خاص کرنا اور دوسروں کو محروم کردینا اس پر شارع کی طرف سے نہی وارد ہے جس پر متعدد روایات دلالت کررہی ہیں۔ کئی محققین نے اس وقف کو باطل قرار دیا ہے جس سے لڑکیوں کو محروم کیا گیا ہے۔

شیخ ابوزہرہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

اما اذا كان غرض الواقف حرمانا لبعض ورثته او تطفيفاً لنصيبهم وزيادة نصيب الأخرين فذلک هو الذى نراه اثما لاخيرفيه وشراً لابرمعه لان فيه معارضة لنص القرآن فى توزيعه الميراث ...... فكل وقف يقصد صاحبه منه مضارة الوارث او نقص حقه فى فريضة الله التى فرضها ووصيته الموثقة التى اوصى بها ففعله اثم واذا قام لدى القاضى الدليل على مقصده ووضعت بين يديه الدلائل على غرضه الأثم فعليه ان يبطل وقفه. [2]

---

(۱) الونشريسى، محمد بن يحيىٰ الونشريسى ۹۱۴ھ. المعيار المعرب، بيروت، دار الغرب الاسلامى ۱۹۸۱م (۲۸۲/۷)
(۲) ابو زهرة. محاضرات فى الوقف، جامعة الدول العربية (۲۳۳)

اگر واقف کا ارادہ بعض ورثاء کو میراث سے محروم کرنا ہو یا ان کے حصہ میں کمی کرنا ہو اور دوسروں کے حصہ میں اضافہ کرنا ہو تو ہم اسے گناہ کا کام سمجھتے ہیں جس میں کوئی خیر نہیں اور اسے ایسا شر سمجھتے ہیں جس میں کوئی نیکی نہیں۔ کیونکہ یہ وقف قرآن کریم کی ان آیات کے معارض ہے جن میں میراث کی تقسیم کا ذکر ہے۔ ہر وہ وقف جس کے ذریعہ ورثاء کو نقصان پہنچانے کا ارادہ ہو یا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو حصہ متعین کیا ہو اس میں کمی کرنا مقصود ہو تو یہ گناہ کی بات ہے اور اگر قاضی کے پاس اس کے اس غلط مقصد اور ارادہ پر کوئی دلیل قائم ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ اس وقف کو باطل قرار دیدے۔

لیکن جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ ایسے وقف کو جس کا مقصد کسی کو میراث سے محروم کرنا یا کسی وارث کو اس کے حصہ سے کم دینا ہو اس نیت کی وجہ سے ناپسند تو کرتے ہیں لیکن اگر وقف کی شرائط پوری ہوں تو اسے باطل قرار نہیں دیتے۔ فقہی نقطہ نظر سے وقف منعقد ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ شخص زندگی میں اپنے مال کا مکمل مالک ہے اسے اس میں تصرف کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ لہٰذا اگر وہ اپنی بعض اولاد پر وقف کرے تو اسے اس کا اختیار حاصل ہوگا اور اپنی ملکیت میں تصرف کی وجہ سے یہ وقف نافذ بھی ہوگا۔

حنفی فقیہ علامہ اندریتی رحمہ اللہ فتاویٰ تتارخانیہ میں لکھتے ہیں:

ولو اراد ان يدفع الى البعض (بعض اولاده) ويحرم البعض يجوز من طريق الحكم الا ان العدل والانصاف ان يعطيهم على ماذكرنا سواء كان بعضهم فاجراً أو بعضهم فقيها عالماً تقياً. هٰذا على جواب المتقدمين واما على جواب المتأخرين فلابأس بان يعطى للمتفقهين والمتأدبين من أولاده دون الفسقة وان كانوا سواء يكره التفضيل.[1]

اگر کوئی شخص وقف کے ذریعہ اپنی بعض اولاد کو دینا اور بعض کو محروم کرنا چاہے تو قضاءً یہ جائز ہے۔ البتہ عدل وانصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ سب کو دے اس طریق کے مطابق جو ہم نے بیان کیا ہے۔ چاہے بعض فاجر ہوں یا بعض فقیہ، عالم اور متقی ہوں۔ یہ متقدمین کا فتویٰ تھا،

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۷۴۶/۵)

حضراتِ متاخرین کے نزدیک اگر وہ اپنی اولاد میں سے فقیہ اور متادب کو دے اور فاسق کو نہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر سب برابر ہیں تو پھر ترجیح دینا مکروہ ہے۔

اس عبارت میں قضاءً اور حکماً اضرار والی صورتِ وقف کو جائز قرار دیا گیا ہے البتہ عدل وانصاف کا تقاضہ اسے قرار دیا ہے کہ مساوات رکھی جائے بلاوجہ کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی جائے۔

دوسرے باب کے تحت ہم تفصیل سے اس مسئلہ پر گفتگو کر چکے ہیں کہ اگر مدیون شخص اپنے قرض خواہوں کو نقصان پہنچانے کی نیت سے وقف کرے تو جمہور کے نزدیک یہ وقف منعقد ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر قیاس کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ وقف علی الاولاد کی یہ صورت شرعاً جائز ہو البتہ فسادِ نیت کا گناہ ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امداد الفتاویٰ میں اس کے جواز پر فتویٰ دیا ہے۔[1] فقہ شافعی کے مشہور متن فتح المعین میں ہے:

فرع يقع لكثيرين انهم يقضون أموالهم في صحتهم على ذكور أولادهم قاصدين بذلك حرمان اناثهم وقد تكرر من غير واحد الافتاء ببطلان الوقف حينئذ قال شيخنا الطنبداوي: فيه نظر ظاهر بل الأوجه الصحة.[2]

کئی مرتبہ یہ صورت سامنے آئی کہ لوگ اپنی جائیداد اپنے بیٹوں پر وقف کر دیتے ہیں تاکہ بیٹیوں کو جائیداد سے محروم کیا جا سکے۔ کئی فتاویٰ میں تو اسے باطل قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے شیخ طنبداوی نے فرمایا کہ ان فتاویٰ میں تامل ہے راجح یہ ہے کہ یہ اوقاف صحیح ہیں۔

اس کے شارح علامہ دمیاطی اس کے ذیل میں فرماتے ہیں:

قوله: "فيه نظر ظاهر" وعبارة شيخه و فيه نظر ظاهر بل الاوجه الصحة اما اولا فلانسلم ان قصد الحرمان معصية كيف وقد اتفق ائمتنا كاكثر العلماء على ان تخصيص بعض الاولاد بماله كله اوبعضه هبة أو وقفا أو غيرهما لاحرمة فيه ولو لغير عذر، وهذا

---

(۱) تهانوی، حکيم الامة اشرف على تهانوى. امداد الفتاوىٰ، كراچى، مكتبه دار العلوم (۲۰۳/۲)

(۲) المليبارى، زين الدين بن عبد العزيز المليبارى. فتح المعين بهامش اعانة الطالبين، بيروت، دار احياء التراث العربى (۱۶۶/۳)

صریح ف أن قصد الحرمان لایحرم لانه لازم للتخصیص من غیر عذر وقد صرحوا بحله کما علمت و اما ثانیا فتسلیم حرمته هی معصیة خارجة عن ذات الوقف کشراء العنب بقصد عصره خمرا فکیف یقتضی ابطاله اھ. [1]

ان اوقاف کے صحیح ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ لڑکیوں کو محروم کرنا معصیت نہیں ہے ہمارے تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ اپنی بعض اولاد کو ہبہ یا وقف میں خاص طور پر دینا اس میں کوئی حرمت نہیں ہے اگر چہ یہ تخصیص بغیر کسی عذر کے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ لڑکیوں کو محروم کرنا تخصیص میں داخل ہے اور تخصیص حرام نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر لڑکیوں کو محروم کرنے کو معصیت بھی سمجھا جائے تو یہ معصیت وقف سے خارج ہے اس کی ذات میں داخل نہیں جیسے کوئی شخص شراب بنانے کے لئے انگور خریدے تو انگور کی خریداری کو کوئی باطل نہیں کہتا اسی طرح وقف کو بھی باطل نہیں کہنا چاہئے۔

اس عبارت سے اس وقف کے باطل نہ ہونے کی ایک وجہ سامنے آئی کہ بیشک بعض اولاد کو محروم کرنے کی نیت کرنا معصیت ہے لیکن یہ معصیت وقف کی ذات میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہے اور امر خارج کے اتصال کی وجہ سے کوئی بھی عقد باطل نہیں ہوتا جیسے کوئی شراب بنانے کی نیت سے انگور خریدے۔ اس نیت کی وجہ سے انگور خریدنے کا جو عقد ہے وہ باطل نہیں ہوگا۔

ایک اور شافعی فقیہ علامہ رملی نہایۃ المحتاج میں تحریر کرتے ہیں:

ومما تعم به البلویٰ انه یقف ماله علی ذکور اولاده و اولاد اولاده حال صحته قاصداً بذلک حرمان اناثهم والاوجه الصحة وان نقل عن بعضهم القول ببطلانه. [2]

---

(۱) الدمیاطی، السید البکری ابن السید محمد شطا الدمیاطی. اعانة الطالبین، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۱۶۶/۳)

(۲) الرملی، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدین الرملی. نهایة المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی. (۳۶۶/۵)

ایک مسئلہ عام طور پر پیش آنے لگا ہے کہ لوگ اپنی مذکر اولاد پر وقف کرتے ہیں اپنی صحت میں اور مقصد لڑکیوں کو محروم کرنا ہوتا ہے۔ اوجہ یہ ہے کہ یہ وقف صحیح ہوگا اگرچہ بعض سے بطلان کا قول بھی منقول ہے۔

فقہ مالکی کی اسہل المدارک میں ہے:

ویجوز للشخص الصحیح العاقل الرشید ان یخص بعض أولاده بهبته أوصدقته فان وقع ذلک لبعضهم بان تصدق بماله کله لهم جاز مع الکراهة. [1]

صحت مند، عقل مند اور سمجھ دار شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے ہبہ اور وقف کے لئے اپنی اولاد میں سے کچھ کو خاص کرلے۔ اگر کسی نے اس طرح کرلیا کہ اپنا پورا مال بعض پر وقف کردیا تو یہ کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

ابن عبدالبر القرطبی فقیہ مالکی لکھتے ہیں:

وشرط المحبس فیما حبسه نافذ مثل ان یحبس علی الذکور من ولده دون الاناث منهم او علی الاناث دون الذکور او علی بعضهم دون بعض او علی ان یخرج البنات من حبسه بعد التزویج و ماشاء من هٰذا کله شرطه فیه ماض اذا کان فی صحته ویکره له ان یحرم الاناث ویعطی الذکور فان فعل جاز فعله لأنه ماله یفعل فیه فی صحته ما أحب والأولی به التسویة بین ولده فی العطایا کلها کمایسره ان یکونوا له فی البرسواء. [2]

واقف وقف میں جو شرط لگائے وہ نافذ ہوگی جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں پر وقف کرے بیٹیوں پر نہ کرے یا بیٹیوں پر کرے اور بیٹوں پر نہ کرے یا بعض پر کرے اور بعض پر نہ کرے یا اس شرط پر وقف کرے کہ نکاح کے بعد بیٹیاں اس وقف کے مصرف سے نکل جائیں گی اسی

---

(۱) الکشناوی، ابوبکر بن حن الکشناوی. اسهل المدارک شرح ارشاد السالک، بیروت، دار الفکر (۹۴/۳)
(۲) ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر. کتاب الکافی، ریاض، مکتبة الریاض الحدیثة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۰م (۱۰۱۶/۲)

طرح جو چاہے شرط لگائے وہ نافذ ہوگی اگر یہ اپنی صحت والی زندگی میں لگا رہا ہے۔ اس کے لئے بیٹیوں کو محروم کر کے بیٹوں کو دینا مکروہ ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وقف تو درست ہو جائے گا کیونکہ یہ اس کا مال ہے اپنی صحت میں وہ جو چاہے اس میں کر سکتا ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ وہ سب میں برابری کرے دینے میں۔ جیسا کہ اسے یہ اچھا لگتا ہے کہ اطاعت، فرماں برداری میں سب ہی اس کے ساتھ برابر کا سلوک کریں۔

مشہور مالکی فقیہ علامہ دسوقی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں مالکیہ کے پانچ اقوال نقل کئے ہیں اور ترجیح اسی کو ی ہے کہ کراہت کے ساتھ یہ وقف منعقد ہو جائے گا۔(۱)

حنابلہ کے یہاں بھی یہی حکم ملتا ہے۔ حنبلی فقیہ علامہ بہوتیؒ لکھتے ہیں:

فان الانسان قديقف على غيره تودداً او على أولاده خشية بيعه بعد موته واتلاف ثمنه او خشية ان يحجر عليه فيباع فى دينه أو رياء ونحوه وهو وقف لازم لاثواب فيه. (۲)

''انسان کبھی کسی پر محبت میں وقف کرتا ہے یا اپنی اولاد پر وقف کرتا ہے اس خوف سے کہ وہ اس کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد بیچ دیں گے اور اس کی قیمت ضائع کر دیں گے یا اس خوف سے وقف کرتا ہے کہ اس پر پابندی لگا دی جائے گی اور اس کا مال دائنین کے دیون کی ادائیگی کے لئے بیچ دیا جائے گا۔ ان تمام صورتوں میں وقف لازم ہوگا البتہ اسے ثواب نہیں ملے گا۔''

بعینہ یہی بات علامہ تقی الدین محمد بن احمد الفتوحی الحنبلی نے منتہی الارادات میں بھی لکھی ہے۔(۳)

ان عبارات سے واضح ہے کہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کرام اس پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بعض لاد پر دوسروں کو محروم کرنے کی نیت سے وقف کرے تو یہ وقف اس غلط نیت کے باوجود منعقد ہو جائے گا۔

---

۱) دیکھئے: الدسوقی، شمس الدين محمد عرفه الدسوقی. حاشية الدسوقی على الشرح الكبير، بيروت، دار الفكر (۷۹/۴)

۲) البهوتی، منصور بن يونس بن ادريس البهوتی ۱۰۵۱ھ. شرح منتهى الارادات، بيروت، دار الفكر (۴۹۰/۲)

۳) دیکھئے: ابن النجار، تقی الدين محمد بن احمد الفتوحی الشهير بابن النجار. منتهى الارادات، بيروت، مؤسسة رسالة، الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۹م (۳۳۰/۳)

اور شرعاً معتبر سمجھا جائے گا۔ یہی حکم اس صورت کا بھی ہوگا کہ اپنی اولاد کے علاوہ دیگر رشتہ داروں پر وقف کیا جائے یا اجانب پر وقف کیا جائے اور نیت اولاد کو محروم کرنے کی ہو تو نیتِ فاسدہ کا گناہ ہوگا لیکن وقف معتبر اور لازم ہوگا۔

مرض الوفات میں وقف علی الاولاد:

کوئی شخص اگر اپنی ایسی بیماری میں اولاد پر وقف کرے جس میں اس کا انتقال ہو جائے تو یہ وقف شرعاً درست نہیں ہوگا کیونکہ مرض الوفات میں وقف کا حکم وصیت کا ہوتا ہے اور وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں اس لئے وقف بھی درست نہیں ہوگا۔ علامہ اندریتیؒ فتاویٰ خانیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

مريض قال وقفت هٰذه الضيعة على ولدى وولد ولدى ابدا ماتناسلوا و مات قالوا: ماكان من حصة الوارث لايجوز فيه الوقف وماكان من حصة غير الوارث جاز الوقف من الثلث فى قول أبى حنيفة و أبى يوسف وزفر والحسن رحمهم الله لان وقف المريض وصية فلاتجوز للوارث وتجوز فيما كان لغير الوارث.[1]

ایک مریض نے کہا کہ میں نے اپنی یہ زمین اپنی اولاد اور ان کی نسل پر وقف کی اور یہ کہہ کر مر گیا تو علماء نے لکھا ہے کہ اس میں جو وارث کا حصہ ہوگا اس کے بقدر تو وقف درست نہیں ہوگا اور جو غیر وارث کا حصہ ہوگا اس میں تہائی مال کی حد تک وقف جائز ہوگا امام ابوحنیفہؒ امام ابو یوسفؒ امام زفرؒ اور امام حسنؒ کے نزدیک، کیونکہ مریض کا وقف وصیت کے حکم میں ہوتا ہے جو وارث کے لئے جائز نہیں، غیر وارث کے لئے (تہائی مال کی حد تک) جائز ہے۔

یہی تفصیل علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے تنقیح الحامدیہ میں بھی لکھی ہے۔[2]

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولى ١٤١١ه (٥/٧٧٤)

(۲) دیکھئے: الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. العقود الدريه فى تنقيح الفتاوى الحامديه، كوئٹه، مكتبه رشيديه (١/١١٢)

رشتہ داروں پر وقف:

جس طرح اپنی اولاد پر وقف کیا جا سکتا ہے اسی طرح اپنے دیگر رشتہ داروں پر وقف کرنا بھی جائز ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقف کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم جعل سبع حيطان بالمدينة صدقة على بني عبد المطلب و بني هاشم. (۱)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے سات باغ بنی عبد المطلب اور بنی ہاشم کے لئے وقف فرما دیئے تھے۔

ظاہر ہے کہ بنو عبد المطلب اور بنی ہاشم سے آپ کا قرابت ہی کا تعلق تھا۔

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اوقاف بھی اس پر شاہد ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وقف جو اس باب میں سب سے بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ وقف فقراء مساکین کے علاوہ اپنے رشتہ داروں کے لئے بھی مخصوص کر دیا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے:

فجعلها عمر رضى الله تعالىٰ عنه صدقة لا تباع ولا توهب ولا تورث تصدق بها على الفقراء ولذوى القربى وفى سبيل الله وفى الرقاب. (۲)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ باغ وقف فرما دیا کہ اسے نہ بیچا جا سکتا ہے، نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں میراث جاری ہوگی۔ اس کی آمدنی فقراء، رشتہ داروں، جہاد اور غلاموں کی آزادی پر خرچ کی جائے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اپنا باغ وقف کرنے کا ارادہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ظاہر فرمایا تو آپ نے انہیں مشورہ دیا کہ اسے اپنے قریبی رشتہ داروں کے لئے وقف کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ سنن بیہقی کی روایت میں ہے:

---

(۱) البيهقى، احمد حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۰/۲)

(۲) البيهقى، احمد حسين بن على البيهقى ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۱۵۹/۲)

انی اری ان تجعلها فی الأقربین قال ابو طلحة: افعل یارسول الله فقسمها أبو طلحة فی أقاربه وبنی عمه. (۱)

حضور نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ اسے تم اپنے رشتہ داروں کے لئے مخصوص کردو۔ حضرت ابوطلحہ نے کہا کہ یارسول اللہ میں ایسا ہی کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے یہ باغ اپنے رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسیم کردیا۔

اور ہم جیسا کہ وقف علی الاولاد کے ذیل میں لکھ چکے ہیں کہ رشتہ داروں پر وقف کرنے میں جہاں صدقہ کا ثواب ہے وہاں صلہ رحمی کا ثواب بھی ملتا ہے۔

رشتہ داروں سے کون مراد ہوگا؟

واقف نے اگر رشتہ داروں پر وقف کیا تو کون کون اس میں داخل ہوگا؟ اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ باپ اور ماں کی طرف سے اس کے آباء واجداد میں سے جو سب سے پہلے اسلام لایا ہے اس سے لے کر اس تک جتنے لوگوں کا اس سے ان کی نسبت سے قرابت کا تعلق ہو وہ سب اس میں داخل ہوں گے۔

یعنی ددھیال اور ننھیال دونوں طرف کے رشتہ دار اس میں داخل ہوں گے، اور آباء واجداد میں سے جو غیر مسلم ہو اس کی نسل کا اس سے قرابت کا تعلق نہیں ہوگا اور وہ اور اس کی اولاد اس کے رشتہ داروں میں داخل نہیں ہوں گے۔ الاسعاف میں ہے:

والقرابة والارحام والأنساب کل من یناسبه الی أقصی اب له فی الاسلام من قبل أبیه والی أقصی اب له فی الاسلام من قبل امه فکل من کان من هؤلاء فهو قرابته. (۲)

قرابت، ارحام اور انساب سے مراد ہر وہ رشتہ دار ہے جو اس کی طرف منسوب ہو بعید ترین باپ کے واسطے سے جو سب سے پہلے اسلام لایا ہو واقف کے باپ کی طرف سے۔ اسی طرح واقف کی ماں کی طرف سے جو اس کی طرف بعید ترین باپ کے واسطہ سے منسوب ہو جو سب سے پہلے اسلام لایا ہو۔

---

(۱) البیهقی، احمد حسین بن علی البیهقی ۳۸۴ھ۔ ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۵/۶)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۱۰۸)

پھر حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک تو جتنے بھی رشتہ دار ہوں گے خواہ وہ محارم ہوں یا غیر محارم نریب کے ہوں یا دور کے وہ سب بیک وقت اس وقف کے مستحق ہوں گے۔ جبکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ للہ علیہ کے نزدیک رشتہ دار کا مصداق تو وہ سب ہوں گے لیکن وقف کے مستحق بیک وقت سب نہیں ہوں گے بلکہ اس میں محرمیۃ اور الاقرب فالأقرب کا اصول ملحوظ رکھا جائے گا۔ چنانچہ اگر اس کے حقیقی بھائی بھی وں اور باپ شریک بھائی بھی تو حضراتِ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک سب اس وقف کے مستحق ہوں گے بکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حقیقی بھائی پہلے حقدار ہوں گے ان کے نہ ہونے کی صورت میں باپ شریک عائیوں کو وقف کی آمدنی ملے گی۔ علامہ شامیؒ نے امام صاحب کے قول کو ترجیح دی ہے، فرماتے ہیں:

قال (صاحب الاسعاف): ويدخل فيه المحارم وغيرهم من اولاد الاناث وان بعدوا عندهما، وعند أبى حنيفةؒ تعتبر المحرمية والأقرب فالأقرب للاستحقاق، قلت: وقول الامام هو الصحيح كما فى القهستانى وغيره و عليه المتون فى كتاب الوصايا. (1)

صاحبِ اسعاف نے فرمایا کہ رشتہ داروں میں محارم اور غیر محارم اور بیٹیوں کی اولاد بھی داخل ہوگی اگرچہ یہ سب دور کے رشتہ دار کیوں نہ ہوں۔ یہ حضراتِ صاحبینؒ کا موقف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محرمیۃ اور الاقرب فالاقرب کا اصول اس وقف سے استحقاق کے لئے ملحوظ رکھا جائے گا۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں امام صاحب کا قول صحیح ہے جیسا کہ قہستانی اور مختلف متون میں منقول ہے۔

البتہ واقف کے والدین اور اولاد اس وقف میں داخل نہیں ہوں گے کیونکہ انہیں عرف میں رشتہ دار نہیں سمجھا جاتا۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

فكل من كان هؤلاء فهو قرابته ماخلا أبويه وولده لصلبه فانهم لايسمون قرابة فيكون ولد ولده وأجداده وجداته داخلين فى القرابة. (2)

---

(1) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ ۴/۴۷۳) مزید دیکھئے: (۶/۶۸۶)

(2) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۱ھ (۱۰۸)

واقف کے والدین اور اس کی صلبی اولاد رشتہ داروں میں داخل نہیں کیونکہ انہیں عرف میں رشتہ دار نہیں کہا جاتا۔ ہاں پوتے اور واقف کے دادا اور دادیاں رشتہ داروں میں داخل ہوں گے۔

پڑوسیوں پر وقف:

اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کے لئے وقف کرے تو اس کا مصداق وہ پڑوسی ہوگا جس کی دیوار اس کی دیوار سے ملتی ہے۔ جن جن گھروں کی دیوار اس کے گھر کی دیوار سے ملتی ہوگی ان تمام گھروں کے رہنے والے چھوٹے بڑے افراد میں ان کی تعداد کے اعتبار سے وقف کی آمدنی مساوی تقسیم کی جائے گی۔

علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

لو قال: أرضي هٰذه صدقة موقوفة لله عزوجل ابدا على فقراء جيراني ومن بعدهم على المساكين صح الوقف وتكون الغلة على قول أبي حنيفة للفقير الملاصقة داره لداره الساكن هو فيها لتخصيصه الجار بالملاصق فيما لو أوصى لجيرانه بثلث ماله والوقف مثلها وبه قال زفر، و تكون لجميع السكان في الدور الملاصقة له، الاحرار و العبيد والذكور والاناث والمسلمون واهل الذمة فيها سواء، و بعد الابواب و قربها سواء ولايعطى القيم بعضا دون بعض بل يقسمها على عدد رؤسهم. (1)

اگر کسی نے کہا کہ میری یہ زمین میرے فقیر پڑوسیوں پر وقف ہے اور ان کے بعد مساکین پر وقف ہے تو یہ وقف درست ہوگا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس وقف کی آمدنی اس فقیر کو دی جائے گی جس کی دیوار اس واقف کے گھر کی دیوار سے ملتی ہو جس میں یہ رہائش پذیر ہو۔ کیونکہ جار سے مراد جارِ ملاصق ہے اس صورت میں جب کوئی اپنے ثلثِ مال کی وصیت اپنے جار کے لئے کرے، امام زفرؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ واقف کے گھر سے متصل گھروں کے تمام رہنے والوں کو اس وقف کی آمدنی دی جائے گی۔ آزاد ہوں یا غلام، مرد

---

(۱) الطرابلسی، ابراھیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبہ ھندیہ ۱۳۲۰ھ (۱۳۳) مزید دیکھئے: الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۹۹۹م (۱۵۳)

ہوں یا عورت، مسلمان اور اہل ذمہ بھی اس وقف میں برابر کے شریک ہوں گے۔ دروازہ کے دور ہونے یا قریب ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ متولی یہ نہیں کرے گا کہ کسی کو دے اور کسی کو نہ دے بلکہ ان کی تعداد کے مطابق ان میں وقف کی آمدنی برابر تقسیم کرے گا۔

حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے یہاں جار کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ ان کے نزدیک واقف جس محلّہ میں ہتا ہے اس محلّہ کی مسجد میں جتنے لوگ اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں وہ سب اس کے پڑوسی ہیں ان سب کو ں وقف کی آمدنی دی جائے گی۔ علامہ حصکفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وقال من يسكن في محلته ويجمعهم مسجد المحلة وهو استحسان. [1]

جو شخص بھی اس کے محلّہ میں رہتا ہے اور وہ ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں وہ اس کا جار ہے، یہی استحسان ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ترجیح دی ہے اور مایا ہے کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جہاں قیاس کو استحسان پر ترجیح حاصل ہے۔ [2]

لحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ١٠٠٨ه. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم کمپنی الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ه (٦٨٢/٦)

لشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ه (٦٨

وقف کے مصارف میں تغییر وتبدیل

واقف نے وقف کرتے وقت وقف کا مصرف متعین کر دیا تو عام حالات میں اب اس مصرف
بدلنے کا اختیار اسے حاصل نہیں مثلاً اس نے یتیم بچوں کے لئے وقف کیا کچھ عرصہ بعد وہ چاہتا ہے کہ ا
کے ساتھ بیواؤں کو بھی شامل کر دے تو وہ یہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب اس نے وقف کر دیا تو اب اس کا تعل
وقف سے براہِ راست باقی نہیں رہا لہٰذا اسے تبدیل وتغییر کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ علامہ قاضی خان رحمہ ا
تحریر فرماتے ہیں:

رجل وقف ضيعة في صحته على الفقراء وأخرجها من يده الى المتولي ثم قال لوصيه عند الموت: أعط من غلة تلك الضيعة لفلان كذا ولفلان كذا و قال لوصيه: افعل مارأيت من الصواب فجعله لأولئك باطل لأنها صارت حقا للفقراء أولا فلا يملك ابطال حقهم الا اذا كان شرط الواقف أن يصرف غلتها الى من شاء. (۱)

ایک شخص اپنی صحت والی زندگی میں اپنی زمین فقراء کے لئے وقف کی اور اسے اپنے قبضہ سے نکال کر متولی کے حوالہ کر دیا پھر مرتے وقت وہ اپنے وصی سے کہتا ہے کہ اس موقوفہ زمین کی آمدنی سے فلاں کو اتنا دینا اور فلاں کو اتنا یا اپنے وصی سے کہتا ہے کہ تم اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر لینا تو مرتے وقت دوسرے لوگوں کے لئے وقف کی یہ آمدنی دینے کا حکم دینا باطل ہے کیونکہ وقف کرنے سے یہ زمین فقراء کا حق بن گئی ہے لہٰذا اب وہ ان کا حق باطل نہیں کر سکتا البتہ اگر وقف کرتے وقت واقف نے اپنے لئے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ جیسے چاہے گا اس وقف کی آمدنی دے گا تو اسے پھر اختیار حاصل ہوگا۔

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۵ھ. الفتاوی الخانية بهامش ال
كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۴۰۲ھ (۲۹۶/۳)

یہی حکم علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے۔[۱] علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ الشیخ قاسم کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

وفی فتاویٰ الشیخ قاسم: وماکان من شرط معتبر فی الوقف فلیس للواقف تغییرہ ولاتخصیصہ بعد تقررہ ولا سیما بعد الحکم. اہ فقد ثبت ان الرجوع عن الشروط لایصح.[۲]

فتاویٰ شیخ قاسم میں ہے کہ وقف میں جو شرط ابتداءً الگائی گئی ہو واقف کو اس میں تبدیلی اور تخصیص کا اختیار حاصل نہیں ہے خاص طور پر جب قاضی بھی اس کا فیصلہ کردے۔ معلوم ہوا کہ واقف کے لئے اپنی شرط سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت جب مصرف متعین کیا اس وقت اپنے لئے یہ اختیار رکھ لیا تھا کہ میں جب چاہوں مصرف تبدیل کرسکتا ہوں تو اسے اس کا اختیار حاصل ہوگا جیسا کہ خانیہ کی ذکرکردہ عبارت میں اس کی صراحت ہے۔ علامہ طرابلسی تحریر کرتے ہیں:

لو اشترط فی وقفہ أن یزید فی وظیفتہ من یری زیادتہ وأن ینقص من وظیفتہ من یری نقصانہ من أھل الوقف وأن یدخل معھم من یری ادخالہ وأن یخرج منھم من یری اخراجہ جاز.[۳]

اگر اپنے وقف میں یہ شرط لگائی تھی کہ وہ موقوف علیہم میں جسے چاہے بڑھا سکتا ہے اور جسے چاہے کم کرسکتا ہے اور جسے چاہے ان کے ساتھ داخل کرسکتا ہے اور جسے چاہے نکال سکتا ہے تو اس کی یہ شرط جائز ہے اور اسے اختیار حاصل ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت اپنے لئے مصرف میں تبدیلی کا اختیار نہیں رکھا تھا تو اسے وقف کا مصرف تبدیل کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

---

(۱) دیکھئے: الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۹/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۵۹/۴)

(۳) الطرابلسی، ابراھیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبہ ھندیہ ۱۳۲۰ھ (۳۴)

جس وقف کا مصرف معلوم نہ ہو اس کا حکم:

ایک جائیداد کا وقف ہونا تو معروف ہے لیکن اس کے مصارف میں اشتباہ ہو گیا کہ اس کی آمدنی کہاں کہاں خرچ کی جائے اور کتنی کی جائے؟ وقف کی کوئی دستاویز بھی دستیاب نہیں۔ ایسی صورت میں فقہاء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ متولی اپنے سے پہلے متولیین کا عمل دیکھے کہ وہ اس وقف کی آمدنی کہاں خرچ کیا کرتے تھے۔ جہاں وہ خرچ کیا کرتے تھے وہاں یہ بھی خرچ کرے کیونکہ غالب گمان یہی ہے کہ پرانے متولی واقف کی ہدایت کے مطابق ہی اسے خرچ کیا کرتے ہوں گے۔ اس لئے جب تک ان کے عمل کے خلاف کوئی واضح دلیل نہ مل جائے اس وقت تک ان کے مطابق ہی یہ متولی عمل کرے گا۔

ردالمحتار میں ذخیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

قال: سئل شيخ الاسلام عن وقف مشهور اشتبهت مصارفه وقدر مايصرف الى مستحقيه قال: ينظر الى المعهود من حاله فيما سبق من الزمان من ان قوامه كيف يعملون فيه والى من يصرفونه، فيبنى على ذلك لان الظاهر انهم كانوا يفعلون ذلك على موافقة شرط الواقف وهو المظنون بحال المسلمين فيعمل على ذلك.(۱)

شیخ الاسلام سے ایک مشہور وقف کے بارے میں پوچھا گیا جس کے مصارف مشتبہ ہو گئے ہیں اور مستحقین کو کتنا کتنا دینا ہے وہ بھی مشتبہ ہے؟ فرمایا کہ ماضی میں اس کے احوال کو دیکھا جائے گا کہ اس کے متولی اس میں کیا تصرف کیا کرتے تھے اور کسے اس کی آمدنی دیا کرتے تھے۔ نیا متولی اسی پر بناء کرے گا۔ کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ سابقہ متولی واقف کی شرائط کے مطابق ہی عمل کرتے ہوں گے مسلمانوں سے یہی گمان کرنا چاہئے۔ لہٰذا اس کے مطابق عمل ہوگا۔

اور اگر پرانے متولیین کا عمل بھی واضح نہ ہو تو پھر جو شخص بھی اپنے استحقاق کا دعویٰ کرے گا اس سے بینہ لے کر اسے وقف کے مصرف میں شامل کر دیا جائے گا۔(۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (۴/۴۱۲)

(۲) حوالہ بالا

وقف کے اخراجات مصرف سے مقدم ہوں گے:

واقف نے ایک بہت بڑی عمارت وقف کی کہ اس کی آمدنی فلاں فلاں پر خرچ کی جائے تو ظاہر ہے اس عمارت کے ذریعہ آمدنی کی صورتیں پیدا کرنے کے لئے کچھ اخراجات بھی ہوں گے مثلاً اس کی تعمیر و مرمت کے اخراجات، متولی کی تنخواہ، وقف کی ضرورت کے لئے متولی نے جو ملازم رکھے ہیں ان کی تنخواہ، اس عمارت پر واجب الاداء مختلف یوٹیلٹی بل، حکومت کے ٹیکس وغیرہ۔ اس وقف کی آمدنی سے پہلے یہ تمام اخراجات نکالے جائیں گے پھر بقیہ آمدنی اس کے متعین مصارف پر خرچ کی جائے گی۔ کیونکہ اصل تو اس وقف کا بقاء ہے جو ان چیزوں اور اخراجات پر موقوف ہے۔ اگر وقف ہی نہیں رہے گا تو واقف کے طے کردہ مصارف کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔ علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

ذكر محمدؒ في الاصل في شيئى من رسم الصكوك فاشترط أن يرفع الوالي من غلته كل عام مايحتاج اليه لأداء العشر والخراج والبذر وأرزاق الولاة عليها والعملة وأجور الحراس والحصادين والدراسين لان حصول منفعتها في كل وقف لايتحقق الا بدفع هٰذه المؤن من رأس الغلة.(۱)

امام محمدؒ نے مبسوط میں وقف کی دستاویزات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس میں یہ شرط رکھی جائے گی کہ متولی ہر سال اس کی آمدنی میں سے اتنا پس انداز کر کے رکھے گا جس کی عشر و خراج کی ادائیگی، بیج کی خریداری، اس کے منتظمین وعملہ کی تنخواہ کی ادائیگی اور چوکیداروں کی اجرت اور کھیتی کاٹنے والوں اور گاہنے والوں کی اجرت کی ادائیگی کے لئے ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس وقف کی منفعت ہمیشہ حاصل کرنا ان اخراجات کی ادائیگی کے بغیر ممکن نہیں۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

وفي النوازل سئل ابوبكر عن رجل وقف دارا على مسجد على أن مافضل من عمارته فهو للفقراء فاجتمعت الغلة والمسجد لايحتاج

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/ ۴۱۷) نیز دیکھئے: ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ـ ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۸/ ۲۳۸)

الی العمارة هل تصرف الی الفقراء؟ قال: لاتصرف الی الفقراء وان اجتمعت غلة كثيرة لأنه يجوز أن يحدث للمسجد حدث والدار بحال لاتغل، قال الفقيه: سئل أبو جعفر عن هٰذه المسألة فاجاب هٰكذا ولكن الاختيار عندى انه اذا علم انه قد اجتمع من الغلة مقدار مالو احتاج المسجد والدار الى العمارة أمكن العمارة منها صرف الزيادة على الفقراء على ماشرط الواقف.[1]

امام ابوبکرؒ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے مسجد کے لئے گھر وقف کیا کہ مسجد کی تعمیر سے جو آمدنی بچے وہ فقراء پر خرچ کی جائے۔ اس وقف کی آمدنی جمع ہوگئی مسجد کو تعمیر کی ضرورت نہیں ہے تو کیا یہ آمدنی فقراء کو دی جاسکتی ہے؟ فرمایا کہ اگرچہ کافی آمدنی جمع ہوجائے فقراء کو نہیں دیا جائے گا کیونکہ ممکن ہے مسجد کی کوئی ضرورت پیش آجائے اور گھر اس قابل نہ رہے کہ اسے کرایہ پر دیا جاسکے اس لئے یہ آمدنی مسجد کے لئے جمع کر کے رکھی جائے گی۔ امام ابوجعفرؒ سے بھی یہ مسئلہ پوچھا گیا انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اگر اتنی آمدنی جمع ہوجائے کہ یہ گمان غالب ہو کہ اگر مسجد اور اس موقوفہ گھر کو تعمیر کی ضرورت پیش آئے گی تو اس سے ہوسکے گی تو زائد آمدنی واقف کی شرط کے مطابق فقراء پر تقسیم کردینی چاہئے۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ مصارف پر خرچ کرنے سے پہلے نہ یہ کہ اخراجات منہا کئے جائیں گے بلکہ مستقبل کی ضروریات کے لئے اضافی رقم محفوظ بھی رکھی جائے گی۔

وقف کے اخراجات کی تفصیل اور ان میں ترتیب کیا ہوگی اس پر مفصل گفتگو ہم اگلے باب میں متولی کی ذمہ داریوں اور اختیارات کے ضمن میں کریں گے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم، الاشباه والنظائر، كراچى، ادارة القرآن، ١٤١٨ھ (١٢٩/٢)

وقف اگر قابلِ انتفاع نہ رہے تو اس کا مصرف

پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وقف کے قابل انتفاع نہ ہونے کی صورت کیا ہوگی؟ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

وقف کے قابلِ انتفاع نہ رہنے کی ممکنہ صورتیں:

۱۔ واقف نے فقراء و مساکین پر گھر وقف کیا کسی وجہ سے وہ علاقہ ویران ہوگیا اور وہاں لوگوں نے رہائش اختیار کرنا چھوڑ دی اب اس وقف کو کرایہ پر لینے کے لئے بھی کوئی تیار نہیں ہے تو اب کہا جاسکتا ہے کہ یہ وقف قابلِ انتفاع نہیں رہا۔

۲۔ وقف زمین بنجر ہوگئی اس پر کاشت کرنا ممکن نہیں رہا۔

۳۔ موقوفہ جائیداد کے اخراجات اس کے منافع سے بڑھ جائیں۔

۴۔ موقوفہ عمارت کمزور اور کچھ حصہ منہدم ہوجانے کی وجہ سے قابلِ استعمال نہ رہے اور وقف کی ملکیت میں آمدنی بھی نہ ہو کہ جس سے تعمیر کی جاسکے۔ اسی طرح کوئی شخص ایڈوانس کرایہ دینے کو بھی تیار نہ ہو کہ اس کرایہ سے تعمیر کرلی جائے اور پھر جب تک یہ رقم پوری نہ ہو وہ بغیر کرایہ کے اس میں رہتا رہے۔

مسجد کے علاوہ دیگر غیر منتفع اوقاف کا حکم:

ایسی صورت حال میں اگر وقف مسجد کے علاوہ اور کوئی جگہ ہو تو بالاتفاق حاکم یا اس کے مجاز نمائندہ کی اجازت سے اسے بیچ دیا جائے گا اور حاصل ہونے والی قیمت سے دوسری مناسب جگہ خرید کر وقف کردی جائے گی۔ اسے فقہاء کرام استبدال سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

فی فتاویٰ قاضی خان... لأن الوقف يقبل الانتقال من أرض الى أرض

فـان أرض الوقف اذا غصبها غاصب وأجرى عليها الماء حتى صارت بحراً لاتصلح للزراعة يضمن قيمتها ويشترى بها أرضا اخرى فتكون وقفا مكانها و كذا أرض الوقف اذا قل نزلها بحيث لاتحتمل الزراعة ولا تفضل غلتها عن مؤنتها ويكون صلاح الأرض فى الاستبدال بأرض اخرى...... والحاصل ان الاستبدال اما عن شرطه الاستبدال وهو مسئلة الكتاب اولا عن شرط فان كان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف عليهم به فينبغى ان لايختلف فيه كالصورتين المذكورتين لقاضى خان.[1]

فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ استبدال کی اجازت اس لئے ہے کہ وقف ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، مثلاً اگر وقف زمین پر کسی غاصب نے قبضہ کرلیا اور اس پر اتنا پانی بھر دیا کہ وہ سمندر کی طرح بن گئی اب اس میں زراعت نہیں ہوسکتی تو وہ اس کی قیمت کا ضامن ہوگا جس سے دوسری زمین خرید کر اس کی جگہ وقف کی جائے گی اسی طرح اگر وقف زمین کی آمدنی اتنی کم ہوگئی کہ اس کے ذریعہ اس میں زراعت بھی نہیں ہوسکتی اور نہ اس کے اخراجات سے کچھ بچتا ہو اور زمین کی بہتری اس میں ہو کہ اسے بیچ کر دوسری جگہ خریدی جائے اور اسے وقف کیا جائے تو اس صورت میں بھی استبدال جائز ہے۔ حاصل یہ ہے کہ استبدال یا تو واقف کی شرط کی وجہ سے ہوگا یا اس کی شرط کے بغیر اگر اس کی شرط کے ساتھ ہو تو اس کا حکم وہ ہے جو ہدایہ میں مذکور ہے اور اگر اس کی شرط کے بغیر استبدال کیا جارہا ہے اس وجہ سے کہ موقوف علیہم کو اس وقف سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو مناسب یہ ہے کہ یہ بلا اختلاف جائز ہو جیسا کہ خانیہ میں ذکر کردہ دونوں صورتوں میں بلا اختلاف استبدال جائز ہے۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

والثانى أن لايشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸٦١ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۹)

لاینتفع بہ بالکلیة بأن لایحصل منه شیئی اصلاً او لایفی بمؤنته فھو أیضا جائز علی الاصح اذا کان باذن القاضی ورأیه المصلحة فیه.(۱)

استبدال کی دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے استبدال کی شرط نہیں لگائی تھی خواہ اس سے سکوت کیا ہو یا عدمِ استبدال کی شرط لگائی ہو لیکن موقوفہ زمین قابل انتفاع نہ رہی، اس سے کوئی آمدنی حاصل نہیں ہو رہی یا اس کے اخراجات پورے نہیں ہو پا رہے۔ تو اس صورت میں اصح قول کے مطابق استبدال جائز ہے بشرطیکہ قاضی کی اجازت ہو اور قاضی اس میں وقف کی مصلحت سمجھے۔

ان حالات میں استبدال کے لئے یعنی یہ وقف بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری جگہ خرید کر وقف کرنے کے لئے فقہاء کرامؒ نے بہت سی شرائط عائد کی ہیں۔ وہ ہم انشاء اللہ آخری باب میں تفصیل سے ذکر کریں گے۔

دیگر فقہی مذاہب:

دیگر فقہی مذاہب میں بھی اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

وجملة ذلک ان الوقف اذا خرب وتعطلت منافعه کدار انھدمت أو أرض خربت وعادت مواتاً ولم تمکن عمارتھا ...... جازبیع بعضه لتعمربه بقیته وان لم یمکن الانتفاع بشئی منه بیع جمیعه...... لاجماعھم علی جواز بیع الفرس الحبیس یعنی الموقوفة علی الغزو اذا کبرت فلم تصلح للغزو وامکن الانتفاع بھا فی شئی آخر مثل أن تدور فی الرحی أو یحمل علیھا تراب أو تکون الرغبة فی نتاجھا أو حصانا یتخذ للطراق فانه یجوز بیعھا ویشتری بثمنھا مایصلح للغزو، نص علیه أحمد.(۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۴/۴)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ. ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۲۰/۸)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر وقف ویران ہو جائے یا اس کے منافع معطل ہو جائیں جیسے کوئی گھر ہو وہ گر جائے یا زمین ہو اور وہ ویران ہو جائے اور اس کی آبادی ممکن نہ ہو تو اس وقف کے بعض حصے کو بیچا جا سکتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ بقیہ کی تعمیر کی جا سکے اور اگر اس سے انتفاع ممکن نہ ہو کسی بھی طرح تو پورے وقف کو بھی بیچا جا سکتا ہے کیونکہ علماء کا اجماع ہے کہ جہاد کے لئے وقف گھوڑے کو بیچنا جائز ہے اگر وہ بوڑھا ہو جائے جہاد کے قابل نہ رہے اور اسے کسی اور مقصد میں استعمال کرنا ممکن ہو جیسے چکی گھمانے کے لئے استعمال کیا جائے یا مٹی لادنے کے لئے استعمال ہو سکے یا توالد و تناسل کے لئے استعمال ہو سکے تو ایسے گھوڑے کو بیچنا جائز ہے اس کی قیمت سے ایسا گھوڑا خریدا جائے گا جس کے ذریعہ جہاد کیا جا سکے۔ امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے یہاں منقولہ وقف کو تو قابلِ انتفاع نہ رہنے کی صورت میں بیچا جا سکتا ہے اور اس کی رقم سے اس جنس کی دوسری چیز خرید کر وقف کی جا سکتی ہے لیکن غیر منقولہ موقوفہ جائیداد کو ایسی صورت حال میں بیچنے کے بارے میں ان کی دو روایتیں ہیں ایک کے مطابق اجازت نہیں جبکہ دوسری روایت کے مطابق اسے بیچ کر اس کی جگہ دوسرا وقف خریدنے کی اجازت ہے۔

علامہ دردیرؒ الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں:

یعنی أن من وقف شیئا من الأنعام علی فقراء أو معینین لینتفع بألبانها وأصوافها وأوبارها فنسلها کأصلها فی التحبیس فما فضل من ذکور نسلها عن النزو وما کبر منها أو من نسلها من الاناث فانه یباع و یعوض بدله اناث صغار تحصیلا لغرض الواقف. (۱)

کسی شخص نے جانور فقراء کے لئے وقف کئے کہ ان کے دودھ، اون اور بالوں سے وہ فائدہ اٹھا سکیں تو ان جانوروں کی نسل بھی اصل جانوروں کے حکم میں ہو کر وقف ہوگی۔ ان کی نسل میں سے جو نر جانور زائد ہوں یا یہ موقوفہ جانور بوڑھے ہو گئے ہوں یا ان کی نسل میں سے جو مادہ جانور بوڑھے ہو گئے ہوں تو انہیں بیچا جا سکتا ہے ان کی جگہ چھوٹے مادہ جانور خریدے جائیں گے تاکہ واقف کا مقصد حاصل ہو سکے۔

---

(۱) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الکبیر بهامش الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۹۱/۴)

علامہ دسوقیؒ تحریر فرماتے ہیں:

أشار بذلک لقول مالک فی المدونة: ولایباع العقار الحبس ولو خرب وبقاء احباس السلف دائرة دلیل علی منع ذلک ورد المصنف بالمبالغة علی روایة ابی الفرج عن مالک ان رأی الامام بیع ذلک لمصلحة جاز و یجعل ثمنه فی مثله وهو مذهب أبی حنیفة أیضا. [1]

امام مالکؒ نے مدونہ میں فرمایا کہ وقف زمین کو بیچا نہیں جاسکتا اگرچہ وہ ویران کیوں نہ ہو جائے۔ اسلاف کے اوقاف کا باقی رہنا اس کی بیع کی ممانعت کی دلیل ہے جبکہ ابوالفرج کی امام مالکؒ سے روایت ہے کہ اگر امام اس کی بیع کو مناسب سمجھے اور اس میں وقف کی مصلحت سمجھے تو اسے بیچنا جائز ہے اور اس کی قیمت سے اسی جیسی زمین یا چیز خرید کر وقف کردی جائے گی۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب بھی ہے۔

مسجد اگر قابلِ انتفاع نہ رہے:

مسجد کے قابلِ انتفاع نہ رہنے کی بھی وہی صورتیں ہیں جو ہم نے ابتداء میں بیان کی ہیں، مسجد کے بارے میں فقہاء احناف کا اختلاف ہے کہ اگر وہ قابلِ انتفاع نہ رہے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

امام محمدؒ سے اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں:

ایک روایت یہ ہے کہ مسجد ویران ہونے کے بعد وقف نہیں رہے گی۔ واقف کی ملکیت میں لوٹ آئے گی اور اگر واقف نہ ہو تو اس کے ورثہ کو ملے گی اور اگر ان کا بھی علم نہ ہو تو اس کا حکم لقطہ کا ہوگا۔

جبکہ دوسری روایت یہ ہے کہ مسجد واقف کی ملکیت کی طرف نہیں لوٹے گی بلکہ قاضی اس کی جگہ کو بیچ کر کوئی اور جگہ خرید کر وقف کردے گا۔ علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں۔

ولو خرب ماحوله واستغنی عنه ...... عاد الی الملک أی ملک البانی أو ورثته عند محمدؒ. [2]

اگر مسجد کا آس پاس ویران ہوگیا اور مسجد کی ضرورت نہ رہے تو وہ بانی کی ملکیت میں واپس آجائے گی اور اگر بانی نہ ہو تو اس کے ورثہ کی ملکیت میں آجائے گی۔ یہ امام محمدؒ کا مذہب ہے۔

---

(۱) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۹۱/۴)

(۲) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۸/۴)

علامہ شامیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

قال في الذخيرة: و في المنتقى قال هشام: سمعت محمداً يقول: الوقف اذا صار بحيث لاينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشتري بثمنه غيره وليس ذلك الا للقاضي اه. وأما عود الوقف بعد خرابه الى ملك الواقف أو ورثته فقد قدمنا ضعفه. (۱)

ہشام سے مروی ہے کہ میں نے امام محمدؒ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر وقف قابلِ انتفاع نہ رہے مساکین کے لئے تو قاضی اسے بیچ سکتا ہے اور اس کی قیمت سے کوئی اور جگہ خرید کر وقف کردے گا۔ قاضی کے علاوہ کسی اور کو اختیار نہیں ہے۔ وقف کا واقف کی ملکیت میں ویران ہوجانے کے بعد لوٹ آنا یا اس کے ورثہ کی ملکیت میں لوٹ آنا ضعیف ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

حضرت امام ابو یوسفؒ سے بھی دو روایتیں ہیں:

۱۔ اس مسجد کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے گا بیچنا یا کسی اور جگہ منتقل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ شامی میں ہے:

عند الامام والثاني فلايعود ميراثا ولايجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر. (۲)

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ویران ہونے کے بعد واقف کی ملکیت میں یہ مسجد واپس نہیں آئے گی۔ اسے یا اس کے مال کو دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اسے فروخت کرکے اس کی قیمت یا تو قریب ترین مساجد میں صرف کی جائے گی یا دوسری مسجد تعمیر کی جائے گی۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

ولو خرب المسجد و ماحوله و تفرق الناس عنه لايعود الى ملك الواقف عند أبي يوسف فيباع نقضه باذن القاضي ويصرف ثمنه الى بعض المساجد ويعود الى ملكه أو الى ورثته عند محمد و ذكر

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۷۶/۴)

(۲) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۸/۴)

بعضهم ان قول أبی حنيفة كقول أبی يوسف و بعضهم ذكره كقول محمد. (۱)

اگر مسجد اور اس کے پاس کی آبادی ویران ہوجائے اور لوگ وہاں سے چلے جائیں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ مسجد واقف کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گی بلکہ اس کا ملبہ قاضی کی اجازت سے بیچا جائے گا اور اس کی قیمت دوسری مسجد میں خرچ کی جائے گی۔ امام محمدؒ کے نزدیک واقف یا اس کے ورثہ کی ملکیت میں واپس آجائے گی۔ امام صاحب کا قول بعض حضرات نے امام ابو یوسفؒ کے موافق اور بعض نے امام محمدؒ کے موافق ذکر کیا ہے۔

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سے بھی دونوں طرح کی روایتیں منقول ہیں۔ فتاویٰ مہدیہ میں ہے:

لو خرب ماحول المسجد أو خرب نفسه واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الامام والثانی أبدا الی قيام الساعة و به يفتى كما فی الحاوی القدسی وعاد الی الملک أی ملک البانی أو ورثته عند محمد و مثله فی الخلاف المذكور حشيش المسجد و حصره مع الاستغناء عنهما. (۲)

اگر مسجد کے آس پاس کا علاقہ ویران ہوجائے یا مسجد ویران ہوجائے اور اس کی ضرورت نہ رہے تو امام صاحبؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے اس پر فتویٰ ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک بانی یا اس کے ورثہ کی ملکیت میں واپس آجاتی ہے یہی اختلاف مسجد کی گھاس اور چٹائی وغیرہ میں بھی ہے جب ان سے استغناء ہوجائے۔

وجہِ اختلاف:

دونوں حضرات کا اختلاف درحقیقت وقف کی حقیقت کے اختلاف پر مبنی ہے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۴۳)

(۲) الفتاوى المهدية (۵۹۸/۴)

حضرت امام محمدؒ کے نزدیک وقف کی حقیقت:

حضرت امام محمدؒ کے نزدیک وقف کی حقیقت یہ ہے کہ واقف اپنی مملوکہ اشیاء میں سے کسی شئی سے مخصوص جہت یعنی تقرب الی اللہ کی خاطر اپنی ملکیت ختم کرتا ہے لہٰذا اگر کسی وقت وہ مخصوص جہت ختم ہو جائے تو وہ شئی موقوفہ اس جہت کے ختم ہونے کی وجہ سے واقف کی ملکیت میں لوٹ آئے گی۔

حضرت امام محمدؒ کے نزدیک وقف کی اس حقیقت کا مقیس علیہ دو مسئلے ہیں:ا۔ہدی محصر ۲۔کفن میت۔

(ا) ہدی محصر کی تفصیل یہ ہے کہ محصر کو حکم ہے کہ وہ ذبح کے لئے حرم میں ہدی بھیج دے اب ہدی بھیجنے کے بعد اگر حصار ختم ہو جائے اور محصر کو حج مل جائے تو اس وقت وہ ہدی دوبارہ محصر کے قبضے میں آجائے گی اور اس کو اپنی ہدی کے بارے میں مکمل اختیار ہوتا ہے کہ چاہے خود ذبح کرے یا کسی اور سے کرائے وکیل کو انکار کی گنجائش نہیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ کفنِ میت کا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی میت کو کفن پہنائے اس کے بعد کوئی درندہ میت پر حملہ آور ہو کر میت کو کھا جائے تو کفن، پہنانے والے کی ملکیت میں واپس آجاتا ہے۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف کی حقیقت:

حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف اعتاق کی مانند ہے یعنی جس طرح اعتاق کے بعد معتق غلام کا دوبارہ مالک نہیں بن سکتا اسی طرح وقف کر دینے کے بعد واقف شئی موقوفہ کا مالک نہیں بن سکتا، کیونکہ جب واقف نے اللہ تعالیٰ کے لئے کسی شئی سے اپنی ملکیت ختم کر دی تو وہ چیز اب خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لئے ہو گئی اب وہ کسی صورت واقف کی ملکیت میں نہیں لوٹ سکتی جیسا کہ عام انسانوں کی ملکیت میں بھی یہی اصول ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو اپنی مملوکہ اشیاء میں سے کچھ دیدے تو بغیر کسی سبب کے اس کی ملکیت ختم نہیں ہوتی۔

حضرت امام محمدؒ کے دلائل کا جواب:

المبسوط للسرخسی میں حضرت امام محمدؒ کی دلیل کے جواب میں حضرت امام ابو یوسفؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ واقف نے جس مقصد اور قربت کے پیش نظر مسجد وقف کی تھی بستی کے اجڑنے کے باعث واقف کا مقصد فوت نہیں ہوا کیونکہ شرعی اعتبار سے مسجد کسی ایک محلے یا بستی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام دنیا کے

مسلمانوں کے لئے عام ہے لہٰذا مسجد والی بستی کے ویران ہونے سے اس مسجد کا مقصد فوت نہ ہوگا کیونکہ مسلمان مسافروں اور رہ گذروں کا یہاں سے گزرنا ممکن ہے لہٰذا وہ گذرتے وقت یہاں نماز پڑھ لیں گے۔

اور صاحب بدائع فرماتے ہیں کہ اگر مسجد گرنے کی وجہ سے ویران ہوئی ہے تو دوبارہ تعمیرِ مسجد کا امکان ہے، عین ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں وہاں کے مسلمانوں کے پاس مال جمع ہو اور وہ اس سے مسجد دوبارہ تعمیر کرلیں اور مزید یہ بھی فرمایا ہے کہ جہتِ قربت کا حصول یقینی ہے اور یقینی بات محض مقصود کے حاصل نہ ہونے کے احتمال کی وجہ سے باطل نہ ہوگی۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کی جانب سے حضرت امام محمدؒ کے دونوں مقیس علیہ مسئلوں کا یہ جواب دیا گیا ہے۔

(۱) ہدی محصر والے مسئلے کا جواب یہ ہے کہ ہدی محصر ذبح سے پہلے محصر کی ملکیت سے نکلی ہی نہیں کیونکہ محصر نے اس شخص کو محض حرم میں لے جاکر ذبح کا وکیل بنایا تھا مالک نہیں جبکہ شئی موقوفہ امام محمدؒ کے نزدیک بھی واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے لہٰذا شئی موقوفہ کو ہدی محصر پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

(۲) کفن میت والے مسئلے کا جواب یہ ہے کہ میت کو کفن پہنانے سے پہنانے والے کی ملکیت ختم نہیں ہوئی کیونکہ میت میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں بلکہ اس نے میت کی ضرورت سترِ عورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی ملکیت برقرار رکھتے ہوئے میت کے لئے اس کپڑے سے انتفاع کو مباح کیا ہے لہٰذا بوقتِ استغناء پہنانے والے کو دوبارہ واپس مل جائے گا گویا میت کو کفن پہنانا عاریت کی طرح ہے اور عاریت میں ملکیت ختم نہیں ہوتی جبکہ شئی موقوفہ سے واقف کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے۔

مبسوط للسرخسی اور بعض دوسری کتب فقہ میں اس اختلاف کا مبنیٰ ابتداءِ مسجد کے اختلاف کو قرار دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مسجد شرعی بننے کے لئے اس مسجد میں نماز ادا کرنا شرط نہیں لہٰذا اگر کسی وقت اس میں نماز پڑھنا چھوڑ دیں تو اس کی مسجد ہونے کی حیثیت ختم نہ ہوگی جبکہ حضرت امام محمدؒ کے نزدیک مسجد شرعی بننے کے لئے اس جگہ نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے لہٰذا جب لوگ اس جگہ کے ویران ہونے کی بناء پر نماز پڑھنا بالکل ترک کردیں تو مسجد ہونے کی حیثیت ختم ہوجائے گی۔

حاصل یہ کہ حضرت امام ابو یوسفؒ نے ابتداءً مسجد میں اس جگہ کے مسجد شرعی بننے کے لئے جس طرح نماز کی ادائیگی کو شرط قرار نہیں دیا اسی طرح آخر میں نماز کے ختم ہونے سے مسجد ختم نہیں ہوگی، جبکہ امام

محمدؒ نے مسجد بننے کے لئے نماز پڑھنے کو شرط قرار دیا ہے لہٰذا آخر میں جب نماز پڑھنا ختم ہو جائے تو مسجد کی حیثیت بھی ختم ہو جائے گی۔ شمس الائمہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فان خرب ماحول المسجد و استغنى الناس عن الصلاة فيه فعلى قول أبى يوسف رحمه الله تعالىٰ لايعود الى ملك البانى ولكنه مسجد كما كان وعند محمد رحمه الله تعالىٰ يعود الى ملك البانى أوالى ملك وارثه ان كان ميتا لانه جعل هذا الجزء من ملكه مصروفاً الى قربة بعينها فاذا انقطع ذلك عاد الى ملكه كالمحصر اذا بعث بالهدى ثم زال الاحصار فادرك الحج كان له ان يصنع بهديه ماشاء. قال: ولو اشترى حصر المسجد أو حشيشه فوقع الاستغناء عنه كان له أن يصنع به ماشاء وابويوسفؒ يقول: اذا تم زوال العين عن ملكه و صار خالصاً لله تعالىٰ فلايعود الى ملكه بحال كمالو اعتق عبده، و هٰذا لان القربة التى قصدها لم تنعدم بخراب ماحولها فان الناس فى المساجد شرعاً سواء فيصلى فى هذا الموضع المسافرون ومارة الطريق وهكذا يقول فى الحصير والحشيش انه لايعود الى ملكه ولكن يصرف الى مسجد آخرمن ذلك المسجد وهدى الاحصار لم يزل عن ملكه قبل الذبح.

واستدل أبويوسفؒ بالكعبة فان فى زمان الفترة قد كان حول الكعبة عبدة الاصنام ثم لم يخرج موضع الكعبة به من ان يكون موضع الطاعة والقربة خالصاً لله تعالىٰ. فكذالك سائر هذه المساجد فى الحقيقة انما ينى هذا على مابينا فان أبايوسف رحمه الله تعالىٰ لايشترط فى الابتداء اقامة الصلوٰة فيه بالجماعة ليصير مسجدا فكذا لك فى الانتهاء اذا ترك الناس الصلوٰة فيه لايخرج من ان يكون مسجداو محمد يشترط فى الابتداء اقامة الصلوٰة فيه بالجماعة ليصير مسجدا فكذا لك فى الانتهاء اذا ترك الناس الصلوٰة فيه بالجماعة يخرج من ان يكون مسجداً.

وحكى ان محمدا مر بمزبلة فقال: هذا مسجد أبي يوسف يريد به أنه لما لم يقل بعوده الى ملك الباني يصير مزبلةً عند تطاول المدة، ومرّ أبويوسف باصطبل فقال: هذا مسجد محمد يعني انه لما قال بعوده ملكا فربما يجعله المالك اصطبلا بعد ان كان مسجدا فكل واحدمنهما استبعد مذهب صاحبه بما اشار اليه.[1]

فتح القدیر میں ہے:

(قوله عن محمد يعود الى ملك الواقف) ان حيا (والى ورثته) ان كان ميتا وان لم يعرف بانيه ولاورثته كان لهم بيعه والاستعانة بثمنه في بناء مسجد آخر، وجه قوله انه عينه لقربة وقد انقطعت فينقطع هو أيضاً (فصار كحصير المسجد و حشيشه اذا استغنى عنه) وقنديله اذا خرب المسجد يعود الى ملك متخذه وكمالو كفن ميتا فافترسه سبع عادا لكفن الى ملك مالكه و كهدى الاحصار اذا زال الاحصار فأدرك الحج كان له أن يصنع بهديه ماشاء واستدل أبويوسف وجمهور العلماء بالكعبة فان الاجماع على عدم خروج موضعها عن المسجدية والقربة الا أن لقائل ان يقول القربة التي عينت له هو الطواف من أهل الافاق ولم ينقطع من الدنيار أساً فقد كان لمثل قيس بن ساعدة أمثال.[2]

حضراتِ صاحبین کے اس اختلاف کے حوالہ سے ایک لطیفہ مشہور ہے کہ امام محمدؒ ایک کچرا خانہ کے پاس سے گذرے تو کہا کہ یہ ابو یوسف کی مسجد ہے، اشارہ اس طرف تھا کہ اگر ویران ہونے کے بعد مسجد بانی کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گی تو اس کا یہ حشر ہوگا۔ اور امام ابو یوسفؒ ایک اصطبل کے پاس گذرے تو فرمایا کہ یہ محمد کی مسجد ہے، کیونکہ اگر ویران ہونے کے بعد مسجد کی مسجدیت ختم ہوجائے اور وہ بانی کے پاس

---

(۱) السرخسي، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسي. المبسوط للسرخسي، بيروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۴۲/۱۲)

(۲) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندری المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۴۶/۵)

واپس آجائے تو وہ اسے جس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہے کرسکتا ہے، اسے اصطبل بھی بنا سکتا ہے۔ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

وما انهدم من بناء الوقف والته صرفه الحاكم فى عمارة الوقف ان احتاج اليه وان استغنى عنه امسكه الى وقت الحاجة الى عمارته فيصرفه فيها ولايجوزان يصرفه الى مستحقى الوقف لان حقهم فى المنفعة والغلة لافى العين بل هى حق الله تعالىٰ على الخلوص ولو جعل داره مسجد افخرب جوار المسجد او استغنى عنه لايعود الى ملكه وجه قول محمد انه ازال ملكه بوجه مخصوص وهو التقرب الى الله تعالىٰ بمكان يصلى فيه الناس فاذا استغنى عنه فقد فات غرضه عنه فيعود الى ملكه كمالو كفن ميتاثم اكله سبع وبقى الكفن يعود الى ملكه كذا هذا ولابى يوسف انه لما جعله مسجدا فقد حرره وجعله خالصاً لله تعالىٰ على الاطلاق فصح ذلك فلايحتمل العود الى ملكه كالاعتاق بخلاف تكفين الميت لانه ماحرر الكفن وانما دفع حاجة الميت به وهو ستر عورته وقد استغنى عنه فيعود ملكا له وقوله: ازال ملكه بوجه وقع الاستغناء عنه قلنا، ممنوع فان المجتازين يصلون فيه وكذا احتمال عود العمارة قائمة وجهة القربة قد صحت بيقين فلاتبطل باحتمال عدم حصول المقصود.[1]

مسجد کے سلسلہ میں مفتیٰ بہ قول:

مسجد کے سلسلہ میں حضرات فقہاء کرامؒ نے امام ابویوسفؒ کے پہلے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ ویران ہونے کے باوجود مسجد کو منتقل کرنا یا اسے بیچنا جائز نہیں ہے وہ جگہ مسجد ہی رہے گی۔ کیونکہ اگرچہ وہ فی الحال ویران ہوگئی ہے لیکن مستقبل میں یہاں دوبارہ آبادی ہوسکتی ہے اور راہ گذرنے والوں کے نماز پڑھنے کا

---

(۱) الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۲۲۱/۶)

امکان تو بہر حال موجود ہے اور اگر مسجد گر بھی گئی ہے اور فی الحال تعمیر نہیں ہوسکتی تو مستقبل میں اس کی تعمیر کا امکان رد نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

أن الفتوی علی أن المسجد لایعود میراثاً ولایجوز نقله و نقل ماله الی مسجد آخر...... علمت أن المفتی به قول أبی یوسف انه لایجوز نقله و نقل ماله الی مسجد آخر کما مرعن الحاوی. (۱)

فتویٰ اس پر ہے کہ مسجد میراث نہیں بنتی، اسے اور اس کے اموال کو دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں مفتیٰ بہ قول امام ابو یوسفؒ کا ہے کہ اس کا انتقال جائز نہیں ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

لایعود میراثا ولایجوز نقله ونقل ماله الی مسجد اخر سواء کانوا یصلون فیه أولا وهو الفتوی. حاوی القدسی. واکثر المشائخ علیه مجتبی. وهو الأوجه. فتح. (۲)

مسجد میراث نہیں بنتی، اسے اور اس کے اموال کو دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں خواہ لوگ اس میں نماز پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں، اس پر فتویٰ ہے، جیسا کہ حاوی القدسی میں ہے، مجتبیٰ میں ہے کہ اکثر مشائخ اسی پر ہیں، فتح القدیر میں ہے کہ یہ قول اوجہ ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وقال أبویوسف: هو مسجد ابدا الی قیام الساعة لایعود میراثا ولایجوز نقله و نقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیه أولا وهو الفتویٰ کذا فی الحاوی القدسی وفی المجتبی و أکثر المشایخ علی قول أبی یوسف و رجح فی فتح القدیر قول أبی یوسفؒ بأنه الأوجه. (۳)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۹/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۸/۴)

(۳) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۵۱/۵)

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ مسجد ویران ہونے کے باوجود قیامت تک مسجد ہی رہے گی وہ واقف یا بانی کی میراث نہیں بنے گی، اسے اور اس کے اموال کو دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں، خواہ اس میں نماز پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں، حاوی القدسی میں ہے کہ اس پر فتویٰ ہے، مجتبیٰ میں ہے اکثر مشائخ کا عمل امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے، فتح القدیر میں امام ابو یوسفؒ کے قول کو یہ کہہ کر ترجیح دی گئی ہے کہ یہ اوجہ ہے۔

فتح المعین میں ہے:

خرب ماحول المسجد و استغنی عنه یبقی مسجداً عند أبی یوسفؒ واعلم ان المفتی به قول أبی یوسف. [1]

مسجد کے آس پاس کا علاقہ ویران ہوگیا اور مسجد کی ضرورت نہ رہی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ مسجد ہی رہے گی، معلوم ہونا چاہئے کہ فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہی ہے۔

حضراتِ شوافعؒ کے یہاں بھی مسجد کے سلسلہ میں اسی کے مطابق فتویٰ ہے۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

لو انهدم المسجد أو خربت المحلة حوله و تفرق الناس عنها فتعطل المسجد لم یعد ملکاً بحال ولایجوز بیعه لامکان عوده کما کان ولانه فی الحال یمکن الصلاة فیه. [2]

اگر مسجد منہدم ہوجائے یا محلّہ ویران ہوجائے اور لوگ وہاں سے چلے جائیں جس کی وجہ سے مسجد ویران ہوگئی ہو تو وہ کسی بھی حالت میں واقف یا بانی کی ملکیت میں نہیں آئے گی اور اسے بیچنا بھی جائز نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے یہ مسجد پہلی حالت پر واپس آجائے اور دوسری بات یہ ہے کہ فی الحال وہاں نماز پڑھنا ممکن بھی ہے۔

فقیہ شافعی علامہ شربینیؒ لکھتے ہیں:

ولو انهدم المسجد و تعذرت اعادته أو تعطل بخراب البلد مثلاً لم یعد ملکا ولم یبع بحال کالعبد اذا عتق ثم زمن...... لامکان الصلاة فیه ولامکان عوده. [3]

---

(۱) ابو سعود، السید محمد ابوسعود المصری. فتح المعین علی شرح الکنز لملامسکین، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی ۱۴۰۳ھ (۵۱۹/۳)

(۲) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبین و عمدة المفتین، بیروت، مکتب اسلامی ۱۹۸۵ء (۳۵۷/۵)

(۳) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۳۹۲/۲)

اگر مسجد منہدم ہو جائے اور اسے دوبارہ تعمیر کرنا ممکن نہ ہو یا شہر کے ویران ہونے کی وجہ سے وہ معطل ہو جائے تو وہ واقف کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گی اور اسے بیچا نہیں جا سکتا جیسے غلام آزاد ہونے کے بعد اپاہج ہو جائے۔

مالکیہ کی دو روایتیں ہیں راجح روایت ان کی یہی ہے کہ ویران ہونے کے باوجود مسجد کو بیچا نہیں جائے گا۔[1]

حنابلہ کا راجح قول امام ابو یوسفؒ کی روایتِ ثانیہ کے مطابق ہے کہ مسجد کو بیچ کر اس کی رقم دوسری مسجد میں لگائی جائے گی۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ مسجد اگر ویران ہو جائے اور قابلِ انتفاع نہ رہے تو راجح قول یہی ہے کہ وہ مسجد ہی رہے گی اسے بیچ کر کہیں اور اس کی مسجدیت منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔

ملبۂ وقف کا مصرف

ملبۂ وقف سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں تعمیر وقف میں دخل ہو جیسے ثابت یا ٹوٹی ہوئی اینٹیں، دروازے، کھڑکیاں، سریہ، گارڈر وغیرہ۔ ملبۂ وقف کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں:

مسجد کے علاوہ عام اوقاف کا ملبہ:

۱۔ مسجد کے علاوہ عام اوقاف کا ملبہ ہو کہ وہ وقف قدیم ہونے کی وجہ سے منہدم ہو گیا ہو یا اس وقف کی تعمیر جدید ہوئی ہو اور پرانی تعمیر ملبہ کی شکل اختیار کر گئی ہو تو سب سے پہلے یہ کوشش کی جائے گی کہ اسے وقف کی تعمیر میں استعمال کر لیا جائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے محفوظ رکھا جائے گا کہ آئندہ وقف کو اس کی ضرورت پیش آئے تو اس میں استعمال کر لیا جائے اور اگر بعینہٖ محفوظ رکھنا بھی ممکن نہ ہو، ضایع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو پھر اسے بیچ کر اس کی رقم وقف ہی کے مصالح میں استعمال کی جائے گی۔ علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) دیکھئے: الدسوقی، شمس الدین محمد عرفہ الدسوقی. حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۹۱/۴)

(۲) ابن قدامہ، موفق الدین ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی ۱۵۴۱. ۶۲۰ه. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۷م (۲۲۰/۸)

وصرف الحاكم أو المتولى نقضه أو ثمنه ان تعذر اعادة عينه الى عمارته ان احتاج والاحفظه ليحتاج الا اذا خاف ضياعه فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج.(۱)

وقف کے مبلہ کو اگر بعینہٖ وقف میں استعمال کرنا ممکن نہ ہو تو حاکم یا متولی اس ملبہ کو وقف کی تعمیر میں استعمال کرے گا ورنہ اسے محفوظ رکھے گا، اور اگر اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس ملبہ کو بیچ دے گا اور حاصل ہونے والی قیمت محفوظ رکھے گا تاکہ وقف کو ضرورت پڑنے پر وہ وقف میں استعمال کی جاسکے۔

مسجد کا ملبہ:

۲۔ مسجد کا ملبہ ہو کہ مسجد منہدم ہو جانے کی وجہ سے ملبہ کی شکل بن گئی ہو یا مسجد کی تعمیر جدید کی وجہ سے پرانی تعمیر ملبہ کی شکل اختیار کر گئی ہو تو اس ملبہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا وہی اختلاف معروف ہے جو نفسِ مسجد اور اصلِ مسجد کے بارے میں تھا دونوں سے دو دو روایتیں ہیں، فقہاء احناف رحمہم اللہ نے اس میں امام ابو یوسفؒ کی دوسری روایت پر فتویٰ دیا ہے کہ ایسی صورت میں اس ملبہ کو اس کی تعمیر میں استعمال کرنا یا آئندہ کے لئے محفوظ رکھنا ممکن ہو تو یہی کیا جائے گا ورنہ اگر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے بیچ کر اس کی قیمت اس مسجد میں صرف کی جائے گی اور اگر اس مسجد میں صرف کرنا اس کے انہدام یا ویران ہو جانے کی وجہ سے ممکن نہ ہو تو قریب ترین کسی مسجد میں صرف کر دی جائے گی۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

والذى ينبغى متابعة المشايخ المذكورين فى جواز النقل بلافرق بين مسجد أو حوض كما افتى به الامام أبو شجاع والامام الحلوانى وكفى بهما قدوة لاسيما فى زماننا فان المسجد أو غيره من رباط أو حوض اذا لم ينقل يأخذ انقاضه اللصوص المتغلبون كما هو مشاهد وكذلك أوقافها يأكلها النظار أو غيرهم ويلزم من عدم النقل خراب المسجد الاخر المحتاج الى النقل اليه. وقد وقعت حادثة سئلت

---

(۱) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۷۶/۴)

عنها في أمير أراد أن ينقل بعض أحجار مسجد خراب في سفح قاسيون بدمشق ليبلط بها صحن الجامع الأموي فأفتيت بعدم الجواز متابعة للشرنبلالي ثم بلغني أن بعض المتغلبين أخذ تلك الأحجار لنفسه فندمت على ما أفتيت به، ثم رأيت في الذخيرة قال وفي فتاویٰ النسفي: سئل شيخ الاسلام عن أهل قرية رحلوا وتداعى مسجد الى الخرب وبعض المتغلبة يستولون على خشبه وينقلونه الى دورهم هل لواحد لأهل المحلة أن يبيع الخشب بأمر القاضي ويمسك الثمن ليصرفه الى بعض المساجد أو الى هذا المسجد؟ قال: نعم.[1]

ملبہ کو منتقل کرنے کے حوالہ سے ان مشائخ کے قول کا اتباع مناسب ہے جو ملبہ کو منتقل کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور مسجد اور حوض وغیرہ میں فرق نہیں کرتے جیسا کہ امام ابوشجاع اور امام حلوانی نے فتویٰ دیا ہے، ان کی اقتداء کافی ہے، خاص طور پر ہمارے زمانہ میں اگر مسجد اور دیگر اوقاف کا ملبہ منتقل نہیں کیا جائے گا تو ڈاکو اس پر قبضہ کرلیں گے جیسا کہ اس کا مشاہدہ ہے، اسی طرح ان مساجد اور اوقاف سے متعلق دیگر اوقاف کو ان کے متولی ہی یا اور کوئی لوگ استعمال کر کے ختم کر دیں گے، اس ملبہ کے کسی اور مسجد کی طرف منتقل نہ کرنے سے اس دوسری مسجد کی بھی ویرانی لازم آئے گی جسے اس ملبہ کی ضرورت تھی، میرے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ مجھ سے پوچھا گیا کہ قاسیون دمشق کی ایک مسجد ویران ہوگئی ہے امیر اس کے پتھر جامع اُموی دمشق منتقل کرنا چاہتا ہے تا کہ اس کے صحن کی تعمیر ہو سکے، میں نے امام شرنبلالی کی اتباع میں ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا، پھر مجھے معلوم ہوا کہ بعض قبضہ کرنے والوں نے یہ پتھر خود قبضہ کر کے لے لئے، مجھے اپنے فتویٰ پر بڑی ندامت ہوئی۔ (اگر جامع اموی میں منتقل کرنے کی اجازت دیدی جاتی تو یہ نوبت نہ آتی)

ذخیرہ میں فتاویٰ نسفی کے حوالہ سے ہے کہ شیخ الاسلام سے ایک بستی کے بارے میں پوچھا گیا کہ لوگ اس بستی سے چلے گئے ہیں اور مسجد ویران ہونے لگی ہے اور بعض قبضہ کرنے والے

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۰/۴)

مسجد کی لکڑیوں پر قبضہ کر کے اسے اپنے گھروں میں منتقل کر رہے ہیں، کیا کسی محلّہ والے کے لئے جائز ہے کہ وہ قاضی کی اجازت سے اس مسجد کی لکڑیاں بیچ دے اور پھر اس کی قیمت کو محفوظ رکھے تا کہ اسے اسی مسجد یا کسی اور مسجد میں خرچ کر دے؟ شیخ الاسلام نے فرمایا: ہاں اس کے لئے جائز ہے۔

شوافع کا بھی یہی موقف ہے، روضۃ الطالبین میں ہے:

ثم المسجد المعطل فی الموضع الخراب ان لم یخف من أهل الفساد نقضه لم ینقض وان خیف نقض وحفظ وان رأی الحاکم أن یعمر بنقضه مسجداً آخر جاز وماکان أقرب الیه فهو أولیٰ.[1]

ویران جگہ پر جو مسجد معطل ہوگئی ہے اگر اس کے ملبہ پر اہل فساد کی طرف سے خطرہ نہ ہوتو اسے توڑا نہ جائے اور اگر خطرہ ہوتو اسے توڑ کر محفوظ رکھا جائے اور اگر حاکم اس ملبہ سے کسی دوسری مسجد کی تعمیر کروانا چاہے تو یہ جائز ہے، جو مسجد اس ویران مسجد کے قریب ہو اس میں صرف کرنا اولیٰ ہے۔

حضراتِ حنابلہ کے یہاں اصل مسجد کو بیچنا جائز ہے ایسی صورت حال میں تو ملبۂ مسجد کو بطریق اولیٰ بیچنا جائز ہوگا۔ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

قال احمدؒ فی روایة أبی داؤدؒ: اذا کان فی المسجد خشبتان لهما قیمة جاز بیعهما وصرف ثمنهما علیه.[2]

ابوداؤد کی روایت کے مطابق امام احمدؒ نے فرمایا کہ اگر مسجد میں دو لکڑیاں پڑی ہوں جن کی کوئی قیمت ہوتو انہیں بیچنا جائز ہے اور ان کی قیمت مسجد ہی پر خرچ کی جائے گی۔

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبین و عمدة المفتین، بیروت، مکتب اسلامی ۱۹۸۵ م (۳۵۸/۵)

(۲) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ـ ۶۲۰ه. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷ م (۲۲۱/۸)

آلاتِ وقف جوخود بھی وقف ہوں نا قابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں ان کا مصرف

آلاتِ وقف سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں وقف کی تعمیر میں دخل نہیں ہے جیسے مسجد کی چٹائیاں، قالین، لائٹیں، پنکھے، فانوس اور دیگر متعلقہ ساز وسامان، اگر یہ چیزیں مسجد پر وقف ہوں اور پھر ان کی ضرورت نہ رہے کہ مسجد ہی ویران یا منہدم ہوجائے یا مسجد تو باقی رہے لیکن یہ چیزیں قابلِ انتفاع نہ رہیں پرانی اور شکستہ ہوجائیں یا مسجد کی ضرورت سے زائد ہوں تو ایسی صورت میں ان کا مصرف کیا ہوگا؟

حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا اس میں بھی وہ اختلاف ہے جو اصل مسجد اور ملبۂ مسجد کے بارے میں تھا دونوں سے دو دو روایتیں ہیں، امام محمدؒ کی ایک روایت کے مطابق یہ واقف کی ملکیت میں واپس آجائیں گے اور دوسری روایت جو ہشام سے مروی ہے کہ انہیں بیچ کر ان کی رقم مسجد کی دیگر ضروریات میں خرچ کی جائے گی۔

جبکہ حضرت امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ انہیں ایسے ہی چھوڑ دیا جائے گا اور دوسری روایت کے مطابق انہیں بیچ کر ان کی رقم اسی مسجد میں خرچ کی جائے گی اور اگر مسجد کو ضرورت نہ ہو تو قریب ترین مسجد میں صرف کی جائے گی۔علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

رجل بسط من ماله حصيراً للمسجد فخرب المسجد ووقع الاستغناء عنه فان ذلک يكون له ان كان حياولورثته ان كان ميتاوان بلى ذلک كان له أن يبيع و يشترى بثمنه حصيراً آخر وكذا لواشترى حشيشا أو قنديلاً للمسجد فوقع الاستغناء عنه كان ذلک له ان كان حياولورثته ان كان ميتا. وعند أبى يوسف يباع ذلک و يصرف ثمنه الى حوائج المسجد فان استغنى عنه هٰذا المسجد يحول الى مسجد آخر. (۱)

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۵۲/۵)

ایک شخص نے اپنے مال سے چٹائی خرید کر مسجد میں دی، مسجد ویران ہوگئی اور اس چٹائی کی ضرورت نہ رہی تو یہ چٹائی دینے والے کی ہوگی اگر وہ زندہ ہو ورنہ اس کے ورثہ کی ہوگی، اور اگر وہ پرانی ہوجائے تو اسے بیچ کر اس کی قیمت سے نئی چٹائی خرید لے، یہی حکم اس صورت میں ہے جب کسی نے مسجد کے لئے گھانس یا قندیل خریدا اور پھر ان کی ضرورت نہ رہی تو یہ دینے والے کے ہی ہوں گے۔

امام ابویوسفؒ کے نزدیک مذکورہ صورتوں میں انہیں بیچا جائے گا اور ان کی قیمت مسجد کی ضروریات میں خرچ کی جائے گی، اگر اس مسجد کو ضرورت نہ ہو تو دوسری مسجد میں منتقل کردیا جائے گا۔

شامی میں ہے:

ومثله فی الخلاف المذکور حشیش المسجد و حصره مع الاستغناء عنهما ...... یرجع الی مالکه عند محمدؒ و عند أبی یوسفؒ ینقل الی مسجد آخر. (۱)

یہی اختلاف مسجد کی گھانس اور چٹائی میں بھی ہے جب ان کی ضرورت نہ رہے، امام محمدؒ کے نزدیک مالک کے پاس واپس آجائیں گی اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک دوسری مسجد میں منتقل کردیا جائے گا۔

علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

وفی الخلاصة قال محمدؒ فی الفرس اذا جعله حبیسا فی سبیل الله و صار بحیث لا یستطاع أن یرکب: یباع و یصرف ثمنه الی صاحبه أو ورثته کما فی المسجد وان لم یعلم صاحبه یشتری بثمنه فرس آخر یغزی علیه ولا حاجة الی الحاکم، ولو جعل جنازة وملاة و مغتسلا وقفا فی محلة و مات أهلها کلهم لایرد الی الورثة بل یحمل الی مکان آخر، فان صح هٰذا عن محمد فهورواية فی الحصر والبواری انها لاتعود الی الورثة ...... وروی هشام عن محمد انه قال: اذا صار

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۸/۴)

الوقف بحيث لاينتفع به المساكين فللقاضي أن يبيعه ويشترى بثمنه غيره و على هذا فينبغى ان لايفتى على قوله برجوعه الى ملك الواقف وورثته بمجرد تعطله و خرابه. (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ امام محمدؒ نے فرمایا کہ اگر گھوڑا جہاد کے لئے وقف کیا گیا لیکن اب وہ سواری کے قابل نہیں رہا تو اسے بیچا جا سکتا ہے اس کی رقم واقف کو یا اس کے ورثہ کو دیدی جائے گی جیسے مسجد کا حکم ہے، اور اگر واقف معلوم نہ ہو تو اس کی قیمت سے دوسرا گھوڑا خریدا جائے گا جس پر اس کی جگہ جہاد کیا جائے گا اور حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں، اور اگر کسی محلّہ میں جنازہ کی چارپائی یا غسل دینے کا تختہ وقف کیا گیا پھر پورے اہل محلّہ مر گئے تو یہ چارپائی اور تختہ، دینے والے کے ورثاء کو نہیں ملیں گے بلکہ انہیں کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا، اگر امام کی یہ روایت صحیح ہو تو مسجد کی چٹائی وغیرہ میں بھی ان کی ایک روایت ہوگی، ہشام نے امام محمدؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر وقف مساکین کے لئے قابلِ انتفاع نہ رہے تو قاضی کے لئے اسے بیچنا اور اس کی جگہ دوسرا خریدنا جائز ہے، اسی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے امام محمدؒ کی اس روایت پر فتویٰ نہیں دینا چاہئے جس میں یہ ذکر ہے کہ وقف ویران ہونے کے بعد واقف کی ملکیت میں لوٹ آتا ہے۔

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۴۶/۵)

احناف کا مفتیٰ بہ قول

جمہور متاخرین احناف کی رائے:

متاخرینِ احناف نے نفسِ مسجد کے سلسلہ میں تو امام ابو یوسفؒ کی پہلی روایت پر فتویٰ دیا تھا جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ مسجد اپنی جگہ باقی رہے گی اسے بیچنا یا کہیں اور منتقل کرنا جائز نہیں جبکہ ملبۂ مسجد کے سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ کی دوسری روایت پر فتویٰ دیا تھا کہ اسے محفوظ رکھا جائے یا بیچ کر اس کی رقم اسی مسجد یا کسی اور قریب ترین مسجد میں خرچ کی جائے، لیکن آلاتِ مسجد کے سلسلہ میں بیشتر فقہاء احناف نے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ آلاتِ مسجد اگر قابلِ انتفاع نہ رہیں تو وہ واقف کی ملکیت میں واپس آجائیں گے۔ فتاویٰ خانیہ میں یہ صورتِ مسئلہ ذکر کرنے کے بعد صراحت کی ہے:

والفتویٰ علی قول محمد. (۱)

فتویٰ امام محمدؒ کے قول پر ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

وبہ علم أن الفتویٰ علی قول محمدؒ فی آلات المسجد و علی قول أبی یوسفؒ فی تأبید المسجد. (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آلاتِ مسجد کے سلسلہ میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ ہے اور تأبیدِ مسجد کے بارے میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہے۔

فتاویٰ خیریہ میں منقول ہے:

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۲ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیة، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲۹۳/۳)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۵۲/۵)

وأما حكم المسجد بعد خرابه و تفرق المصلين عنه فقد اختلف الصاحبان فيه والفتوىٰ على قول محمدؒ في آلات المسجد كالقناديل والحصير والبواري.[۱]

مسجد اگر ویران ہوجائے اور اس کے نمازی بکھر جائیں تو اس میں صاحبین کا اختلاف ہے آلاتِ مسجد جیسے قندیل، چٹائی وغیرہ میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان حضرات کے حوالہ سے آلاتِ مسجد کے سلسلہ میں امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی صراحت کی ہے کہ یہ چیزیں واقف کی ملکیت میں واپس آجانی چاہئیں۔[۲]

امداد الفتاویٰ[۳]، امداد الاحکام[۴] اور احسن الفتاویٰ[۵] میں بھی امام محمدؒ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا گیا ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ کی رائے:

دوسری طرف صاحبِ فتح القدیر علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے امام محمدؒ کے قول کے مطابق فتویٰ دینے کی سختی سے تردید کی ہے، ان کے نزدیک ملبۂ وقف کی طرح آلاتِ وقف میں بھی حضرت امام ابو یوسفؒ کی دوسری روایت پر فتویٰ دینا چاہئے کہ اگر ان آلات کی ضرورت نہ رہے تو انہیں بیچ کر ان کی رقم مسجد میں صرف کی جائے اور اگر مسجد کو ضرورت نہ ہو تو دوسری قریب ترین مسجد میں صرف کی جائے۔ لکھتے ہیں:

فالأوجه انه بعد تحقق سبب سقوط الملك فيه لايعود كالمعتق لايعود اذا زال الى مالك من أهل الدنيا الا بسبب يوجب تجدد الملك فما لم يتحقق لم يعد ...... وروى هشام عن محمد انه قال:

---

(۱) الرملي، خير الدين الرملي. الفتاوىٰ الخيرية بهامش العقود الدريه في تنقيح الفتاوىٰ الحامديه، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۵۶/۱)

(۲) دیکھئے: الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۵۹/۴)

(۳) دیکھئے: تهانوي، حكيم الامة اشرف على تهانوي. امداد الفتاوىٰ، كراچي، مكتبه دارالعلوم (۷۱۷/۲)

(۴) دیکھئے: عثماني، مولانا ظفر احمد عثماني. امداد الاحكام، كراچي، مكتبه دارالعلوم كراچي (۲۳۲/۳)

(۵) لدهيانوي. مفتي اعظم مفتي رشيد احمد لدهيانوي. احسن الفتاوىٰ، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، طبع نهم ۱۴۲۰ھ (۴۲۵/۶)

اذا صار الوقف بحيث لاينتفع به المساكين فللقاضى أن يبيعه ويشترى بثمنه غيره و على هذا فينبغى أن لايفتى على قوله برجوعه الى ملك الواقف وورثته بمجرد تعطله وخرابه بل اذا صار بحيث لاينتفع به يشترى بثمنه وقف آخر يستغل ولو كانت غلته دون غلة الأول. (۱)

اُوجہ یہ ہے کہ ملکیت کے سبب کے ساقط ہونے کے بعد ملکیت نہیں لوٹنی چاہئے جیسے معتق میں رقیت نہیں لوٹتی ہاں اگر ملکیت کا کوئی نیا سبب پایا جائے تو ملکیت آجائے گی ورنہ نہیں، ہشام نے امام محمدؒ سے روایت کی ہے کہ اگر وقف مساکین کے لئے قابلِ انتفاع نہ رہے تو قاضی کے لئے اسے بیچنا اور اس کی قیمت سے دوسرا وقف خریدنا جائز ہے، اس روایت کا تقاضہ یہ ہے کہ امام محمدؒ کے اس قول پر فتویٰ نہ دیا جائے کہ وقف معطل ہونے کے بعد واقف کی ملکیت میں لوٹ آتا ہے بلکہ ہشام کی روایت پر فتویٰ دینا چاہئے کہ جب وہ قابلِ انتفاع نہ رہے تو اس کی قیمت سے اس کی جگہ کوئی اور وقف خرید لیا جائے اگر چہ اس کی آمدنی پہلے وقف سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

ترجیح:

ہمیں راجح علامہ ابن الہمامؒ کا موقف ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اصلِ مسجد اور ملبۂ مسجد کے سلسلہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے کہ وہ نا قابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں واقف کی ملکیت میں واپس نہیں آتے اسی طرح آلاتِ مسجد، دریاں، قالین، پنکھے، الماریاں اور دیگر ساز و سامان کے بارے میں بھی امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کرنا چاہئے اور ان کے نا قابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں انہیں بیچ کر رقم مسجد کی ضروریات میں استعمال کی جائے اور اگر یہ مسجد باقی نہ رہے تو دوسری قریب ترین مسجد میں یہ رقم صرف کی جائے، آلاتِ مسجد اور ملبۂ مسجد میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس موقف کی وجوہِ ترجیح درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنے میں جہتِ واقف کی بھی رعایت ہے، کیونکہ آلاتِ

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸٦۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۴٦/۵)

مسجد کے وقف سے واقف کا مقصود یہ ہے کہ اس کی وقف شدہ چیز اہل مسجد اور نمازیوں کے استعمال میں رہے تاکہ اسے ثواب ملتا رہے، لہٰذا جب تک وہ چیز خود قابل استعمال ہے لیکن مسجد کو اس کی ضرورت نہیں اور مسجد کو اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے ضرورت کی چیز خرید کر مسجد میں رکھ دی جائے تو واقف کو ثواب ملتا رہے گا۔

اور اگر مسجد کو کسی اور ایسی چیز کی ضرورت نہ ہو جس میں شئ موقوفہ کو صرف کیا جائے تو پھر قریب کی مسجد میں جہاں ضرورت ہو اس کو منتقل کرنے سے بھی واقف کا مقصد پورا ہو سکتا ہے، بخلاف عود الی ملک الواقف کے کہ اس میں غرضِ واقف کا ابطال ہے۔

۲۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل انفع للوقف بھی ہے کیونکہ اس کی قیمت سے اسی مسجد کی کوئی ضرورت پوری کی جائے گی یا اسے قریب کی مسجد میں منتقل کیا جائے گا جو بھی صورت ہو اس میں اسی وقف یا اسی کے ہم جنس وقف کا فائدہ ہے۔

۳۔ ہمارے عرف میں مسجد کو ایک دفعہ چیز دیدینے کے بعد واپس نہیں لی جاتی بلکہ اگر کسی واقف کو کہا جائے کہ مسجد کو تمہاری چیز کی ضرورت نہیں رہی لہٰذا تم اپنی چیز واپس لے لو تو بعید نہیں کہ وہ لڑنے کے لئے تیار ہو جائے یا کم از کم ناراضگی کا اظہار کرے، نیز اس زمانہ میں امام محمدؒ کے قول پر عمل کرنے میں دشواری ہے کہ اب یہ عرف کے بھی خلاف ہے اور واقف کی نیت کے بھی خلاف ہے اور واقف کی نیت کا لحاظ رکھنا اور عرف کی رعایت کرنا واضح سببِ ترجیح ہے۔

۴۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل سے امام محمدؒ کے قول کی بھی مخالفت نہ ہوگی، کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایسی فاضل اشیاء اور آلات کے فروخت کرنے کی تقریباً واقفین اور معطین کی جانب سے دلالۃً اجازت ہوتی ہے کیونکہ عام طور سے لوگ مسجد کی ایسی فاضل اشیاء وآلات کی نیلامی پر اعتراض نہیں کرتے۔

۵۔ پانچویں وجہ ترجیح یہ ہے کہ علامہ ابن الہمامؒ کی رائے کے مطابق امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دینے کی صورت میں امام محمدؒ کی دوسری روایت جو ہشام سے مروی ہے اس پر بھی عمل ہو جائے گا، امام محمدؒ کی بالکلیہ مخالفت لازم نہیں آئے گی۔

دیگر ائمہ کا مذہب:

۶۔ چھٹی وجہ ترجیح یہ ہے کہ بقیہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مذہب بھی امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق ہے۔ محرر مذہب شافعی علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

حصر المسجد اذا بليت ونحاتة أخشابه اذا نخرت وأستار الكعبة اذا لم يبق فيها منفعة ولاجمال فى جواز بيعها وجهان أصحهما: تباع لئلاتضيع وتضيق المكان بلا فائدة والثانى لاتباع بل تترك بحالها ابداً. وعلى الأول قالوا: يصرف ثمنها فى مصالح المسجد.[1]

مسجد کی چٹائیاں اگر پرانی ہوجائیں اور اس کی لکڑیاں کھوکھلی ہوجائیں یا کعبہ کے پردہ میں کوئی منفعت اور جمال نہ رہے تو ان چیزوں کی بیع میں دو رائے ہیں، اصح یہ ہے کہ انہیں بیچ دیا جائے گا تاکہ یہ ضایع نہ ہوں اور بلاوجہ جگہ تنگ نہ ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ انہیں بیچا نہیں جائے گا بلکہ اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے گا۔ پہلی روایت جو اصح ہے اس کے مطابق فقہاء کرام نے فرمایا کہ ان کی قیمت مسجد کے مصالح ہی میں خرچ کی جائے۔

علامہ نوویؒ نے ان آلات کو بیچ کر اس کی رقم مسجد کے مصالح میں خرچ کرنے کو اصح قرار دیا ہے۔ مالکی فقیہ علامہ ونشریسی تحریر فرماتے ہیں:

أن الحصر البالية التى كانت فى المسجد وأزيلت وجعل الناس فيه حصرا جددا لاتباع تلك الحصر البالية وتبقى مرفوعة حتى يفتقر لها المسجد فيما بعد. هٰذا وجه الفقه، وان نقلت لمسجد آخردون بيع مع غناء هٰذا المسجد الذى كانت فيه لغيره من المساجد من شدة الحاجة فيجوز على قول افتى به بعض من تقدمنا ممن يقتدى به علماً وعملاً.[2]

---

(۱) النووى، يحيىٰ بن شرف النووى. روضة الطالبين وعمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۵۷/۵)

(۲) الونشريسى، محمد بن يحيىٰ الونشريسى ۹۱۴ھ. المعيار المعرب، بيروت، دار الغرب الاسلامى ۱۹۸۱م (۱۴۶/۷)

مسجد کی پرانی چٹائیاں جو مسجد سے اٹھالی گئیں اوران کی جگہ لوگوں نے مسجد میں نئی چٹائیاں بچھادیں انہیں بیچا نہیں جائے گا بلکہ انہیں مسجد کی آئندہ ضروریات کے لئے اٹھا کر رکھا جائے گا۔ یہ فقہ کا تقاضہ ہے، اور اگر یہ مسجد ان سے مستغنی ہو اور دوسری مسجد کو ان کی بہت ضرورت ہو تو اگر بیچے بغیر انہیں دوسری مسجد میں دیدیا جائے تو ہمارے بہت سے فقہاء کے مطابق جن کی اقتداء کی جاتی ہے اس کی اجازت ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

اذا كان الفدان الذى حبس لامنفعة فيه فانه يجوز أن يباع و يشترى بثمنه فدان آخر يحبس و تصرف غلته فى المصرف الذى حبس عليه الأول على ماافتى به كثير من العلماء. (۱)

اگر کوئی بڑا مکان یا محل وقف کیا گیا لیکن اب اس کی کوئی منفعت باقی نہیں رہی تو اسے بیچنا جائز ہے اوراس کی قیمت سے دوسرا مکان خریدا جائے گا جو اس کی جگہ وقف ہوگا اوراس کی آمدنی پہلے وقف ہی کے مصارف میں خرچ کی جائے گی۔ اکثر علماء نے اس پر فتویٰ دیا ہے۔

ان دونوں عبارتوں کے مجموعہ سے واضح ہے کہ آلاتِ مسجد کو اولاً تو بعینہٖ اسی مسجد میں استعمال کیا جائے گا ورنہ قریب ترین مسجد میں اوراگر بیچنے کی ضرورت پیش آئے تو بیچا بھی جاسکتا ہے۔

حنابلہ کے یہاں تو عینِ وقف کو بوقتِ ضرورت بیچا جاسکتا ہے، آلاتِ مسجد کو تو بطریق اولیٰ بیچنا جائز ہے۔ (۲)

خلاصہ یہ ہے کہ تمام وجوہِ ترجیح دلالت کررہی ہیں کہ آلاتِ وقف جو خود بھی وقف ہوں اگر قابلِ انتفاع نہ رہیں تو انہیں بیچا جاسکتا ہے اوران کی رقم اسی وقف میں استعمال کی جائے اور اگر وقف کو ضرورت نہ ہو تو قریب ترین، ہم جنس وقف میں صرف کی جاسکتی ہے۔

بعض متاخرین نے امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ کیوں دیا؟

اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ علام ابن الہمامؒ کے علاوہ دیگر متاخرین احناف نے آلات

---

(۱) الونشريسي، محمد بن يحيىٰ الونشريسي ۹۱۴ھ. المعيار المعرب، بيروت، دار الغرب الاسلامى ۱۹۸۱م (۲۰۰/۷)

(۲) دیکھئے: ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ھ. ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۲۴/۸)

کے سلسلہ میں امام محمدؒ کے قول پر اور ملبہ وقف کے سلسلہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ کیوں دیا؟ دونوں میں فرق کرنے کی وجہ کیا تھی؟

اس سلسلہ میں کوئی حتمی بات کہنا تو مشکل ہے البتہ دو وجہ ذہن میں آ رہی ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان حضراتِ متاخرین کے دور میں ان آلات کے وقف کا یا مسجد کی ملکیت میں دینے کا معمول نہ ہو بلکہ ان کی اباحت کا عرف ہو اور اباحت کی صورت میں چیز دینے والے کی ملکیت سے نکلتی نہیں اس لئے اس پر فتویٰ دیا گیا کہ نا قابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں وہ دینے والے کو واپس مل جائے گی۔ لیکن اس پر سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اباحت ہی ہے تو نا قابلِ انتفاع نہ ہونے کی صورت میں بھی دینے والے کو واپس لینے کا حق ہونا چاہئے اور اس کے انتقال کی صورت میں اس کی میراث بھی جاری ہونی چاہئے۔ حالانکہ فقہاء کرام نے اس سے صراحۃً منع فرمایا ہے۔[1]

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان حضرات کے زمانہ میں یہ عرف ہو کہ آلات اگر وقف کر دیئے جائیں یا وقف کی ملکیت میں دیدیئے جائیں تو نا قابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں دینے والا اسے واپس لے لے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ یہ چیزیں پرانی ہو جائیں گی اور قابلِ انتفاع نہیں رہیں گی اس لئے نا قابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں واپس لے لینے کا عرف ہو، اس کی تائید خانیہ کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

> رجل وضع حبابا فی المسجد أو علق قندیلا کان له أن یرجع لان ذلک لایترک فی المسجد دائما.[2]
>
> ایک شخص نے مسجد میں پائیدان رکھا یا قندیل لٹکایا تو اس کے لئے واپس لینا جائز ہے کیونکہ یہ چیزیں ہمیشہ کے لئے مسجد میں نہیں رکھی جاتیں۔

یہ دونوں باتیں احتمال کے درجہ ہی میں ہیں، کوئی حتمی بات کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

---

(۱) دیکھئے: ابن مازه البخاری، برهان الدین ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۳۳/۹)

(۲) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۲ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیة، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲۹۳/۳)

آلاتِ وقف جو وقف کے مملوک ہوں
ناقابلِ انتفاع ہونے کی صورت میں ان کا مصرف

وقف کے ایسے آلات جو خود وقف نہیں ہیں بلکہ وقف کی ملکیت ہیں جیسے کسی نے مسجد میں دریاں، قالین، پنکھے وغیرہ بطور عطیہ دیئے یا مسجد کے چندہ یا مسجد کی آمدنی سے یہ چیزیں خریدی گئیں تو یہ وقف نہیں ہوں گی بلکہ وقف کی ملکیت ہوں گی۔

اگر یہ چیزیں قابلِ انتفاع نہ رہیں یا وقف کو ان کی ضرورت نہ رہے تو انہیں بیچنا بالاتفاق جائز ہے۔ بیچ کر ان کی رقم مسجد کے مصارف میں صرف کی جائے گی اور اگر مسجد کو فی الحال اور مستقبل میں بھی ضرورت نہ ہو تو قریب ترین مسجد میں خرچ کی جائے گی۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فتح القدیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

واعلم أن عدم جواز بيعه الا اذا تعذر الانتفاع به انما هو فيما اذا ورد عليه وقف الواقف أما اذا اشتراه المتولى من مستغلات الوقف فانه يجوز بيعه بلاهٰذا الشرط لأن فى صير ورته وقفا خلافا والمختار انه لايكون وقفا فللقيم أن يبيعه متى شاء لمصلحة عرضت. اه[1]

وقف سے انتفاع اگر متعذر ہو جائے تو اس کی بیع کا ناجائز ہونا اسی وقت ہے جب اسے واقف نے وقف کیا ہو۔ متولی وقف کی آمدنی سے جو چیزیں خریدتا ہے انہیں اس شرط کے بغیر کہ وہ قابلِ انتفاع نہ رہیں بیچنا جائز ہے، کیونکہ ان کے وقف ہونے میں اختلاف ہے۔ راجح یہ ہے کہ وہ وقف نہیں ہوتیں، متولی کے لئے کسی مصلحتِ وقف کے پیش نظر انہیں بیچنا جائز ہے۔

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۷۷/۴)

علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

جميع ماذكرناه في حصر المسجد و نظائرها هو فيها اذا كانت موقوفة على المسجد أما مااشتراه الناظر للمسجد أو وهبه له واهب و قبله الناظر فيجوز بيعه عند الحاجة بلاخلاف لانه ملك. [1]

مسجد کی چٹائیاں وغیرہ کے بارے میں ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے یہ اسی وقت ہے جبکہ یہ مسجد پر وقف ہوں، اگر انہیں متولی نے خریدا ہو مسجد کے لئے یا کسی نے مسجد کے لئے انہیں بطور ہبہ دیا ہو تو اسے بیچنا بالاتفاق جائز ہے کیونکہ یہ مسجد کی ملکیت ہیں، وقف نہیں۔
شافعی فقیہ شربینی الخطیب نے بھی یہی صراحت کی ہے۔

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبین و عمدة المفتین، بیروت، مکتب اسلامی ۱۹۸۵ م (۳۵۸/۵)

بابِ ششم

تولیتِ وقف

چھٹا باب

تولیتِ وقف

وقف کی نگرانی اور تولیت کی ضرورت واہمیت:

ہم پہلے باب کے تحت اس پر تفصیلی کلام کر چکے ہیں کہ وقف ایک شخص قانونی ہے اور جو چیز وقف کی جائے وہ واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور موقوف علیہ کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی۔ لہٰذا وقف کردہ چیز کی حفاظت اور نگرانی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو وقف کی گئی چیز کی حفاظت کرے، دیکھ بھال کرے، اسے مزید بڑھانے کی کوشش کرے، اس کی آمدنی کے لئے مناسب صورتیں اختیار کرے، اور واقف کی ہدایت کے مطابق اس کی آمدنی مقررہ مصارف پر خرچ کرنے کا اہتمام کرے، نیز حقوق اور واجبات میں اس کی پیروی بھی کرے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اوقاف کی نگرانی کا اہتمام فرماتے تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے وقف کی خود نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ اور آپ نے اپنے وقف کی جو دستاویز اپنے دورِ خلافت میں لکھوائی اس میں جہاں اس کے مصارف بیان فرمائے وہاں اس کی ولایت اور نگرانی کا بھی بطور خاص ذکر فرمایا۔ عبداللہ بن عمر بن ربیعہ فرماتے ہیں:

> شهدت كتاب عمر حين وقف وقفه أنه في يده فاذا توفي فهو الى حفصة بنت عمر، فلم يزل عمر يلي وقفه الى ان توفي، فلقد رأيته هو بنفسه يقسم ثمرة ثمغ في السنة التي توفي فيها، ثم صار الى حفصة.[1]

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلمية ۱۹۹۹م (۱۰)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب وقف کیا اور اس کی دستاویز لکھوائی اس وقت میں حاضر تھا۔ اس میں آپ نے لکھوایا تھا کہ یہ وقف میری نگرانی میں رہے گا اور میرے انتقال کے بعد اس کی نگرانی حفصہ بنت عمر کریں گی، چنانچہ حضرت عمرؓ اپنی وفات تک خود اس کی نگرانی فرماتے رہے، میں نے خود دیکھا کہ وہ اپنی وفات کے سال اپنے موقوفہ باغ ثمغ کے پھل اپنے ہاتھوں سے تقسیم فرما رہے تھے، آپ کے انتقال کے بعد اس موقوفہ باغ کی تولیت ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف منتقل ہوگئی۔

اس عبارت سے وقف کی نگرانی اور تولیت کی اہمیت واضح ہے۔ اس لئے ہم ذیل میں وقف کی تولیت پر تفصیل سے کلام کریں گے، تولیت کی اقسام، متولی کی شرائط، اس کی ذمہ داریاں اور اس کے اختیارات، ان تمام امور پر گفتگو کی جائے گی۔

تولیتِ وقف کی اقسام:

تولیتِ وقف کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ تولیت اصلیہ ۲۔ تولیت فرعیہ

تولیتِ اصلیہ:

تولیتِ اصلیہ سے مراد وہ ولایت ہے جو کسی شخص کو براہِ راست اصالۃً شریعت کی طرف سے حاصل ہو، کسی اور کے متولی بنانے سے وہ ولایت حاصل نہ ہوئی ہو، جیسے خود واقف کو وقف پر ولایت حاصل ہوتی ہے۔ درج ذیل افراد کو ولایتِ اصلیہ حاصل ہے:

۱۔ واقف:

وہ افراد جنہیں ولایت اصلیہ حاصل ہے ان میں سب سے اہم شخص واقف ہے، احناف کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق واقف وقف کرتے وقت اپنے لئے تولیت کی شرط لگائے یا نہ لگائے بہر صورت اسے حقِ تولیت ملتا ہے۔

امام خصافؒ تحریر فرماتے ہیں:

قلت: أريت رجلا اذا وقف وقفاً لم يجعل ولايته الى أحد؟ قال ولايته

الیه، یتولی ذلک هو بنفسه، ویولیه فی حیاته وبعد وفاته من رأی.[1]
میں نے عرض کیا کہ ایک شخص نے وقف کیا اور کسی کو اس کا متولی مقرر نہیں کیا تو کیا حکم ہے؟
امام نے فرمایا اس کی ولایت اسی واقف ہی کو حاصل ہوگی وہ خود اس کی تولیت سنبھالے گا،
اور اپنی زندگی میں اور وفات کے بعد جسے متولی مقرر کرنا چاہے مقرر کر سکتا ہے۔

اسی طرح علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

لو وقف رجل أرضا ولم یشترط الولایة لنفسه ولا لغیره ذکر هلال والناطفی أن الولایة تکون للواقف.[2]
اگر زمین وقف کی اور اپنے لئے یا کسی اور کے لئے ولایت کی شرط نہ لگائی تو امام ہلالؒ اور امام ناطفیؒ نے ذکر کیا ہے کہ ایسی صورت میں ولایت واقف ہی کو حاصل ہوگی۔

امام ابو یوسفؒ کا یہی موقف ہے[3] جبکہ امام محمدؒ سے دو قول منقول ہیں، ایک قول یہ مروی ہے کہ اگر واقف نے اپنے لئے ولایت کی شرط لگائی تو اسے ولایت حاصل ہوگی اور اگر شرط نہ لگائی ہو تو اسے ولایت حاصل نہیں ہوگی۔

صاحب عنایہؒ تحریر فرماتے ہیں:

وذکر هلال فی وقفه: وقال أقوام: ان شرط الواقف الولایة لنفسه کانت له وان لم یشترط لم تکن له الولایة. وهذا بظاهره لایستقیم علی قول أبی یوسفؒ لأن له الولایة شرط أو سکت ...... وقالوا الأشبه أن یکون هذا قول محمد...... والدلیل علی ذالک ماذکره محمد فی السیر اذا وقف ضیعة وأخرجها الی القیم لاتکون له الولایة بعد ذلک الا أن یشترط الولایة لنفسه.[4]

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیة ۱۹۹۹م (۱۷)
(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۴۹) نیز دیکھئے: الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۴۴۱)
(۳) دیکھئے: البابرتی، محمد بن محمود البابرتی. العنایة بهامش فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۴۴۱)
(۴) حواله بالا.

امام ھلالؒ نے وقف سے متعلق اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اگر واقف اپنے لئے ولایت کی شرط لگائے تو اسے ولایت حاصل ہوگی ورنہ نہیں، صاحب عنایہؒ فرماتے ہیں کہ یہ امام ابو یوسفؒ کے مذہب کے مطابق تو نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک واقف ہی کو ولایت حاصل ہوتی ہے، شرط لگائے یا خاموش رہے، علماء نے فرمایا ہے کہ راجح یہ ہے کہ یہ امام محمدؒ کا قول ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ امام محمدؒ نے سیر میں ذکر فرمایا ہے کہ اگر وقف کرنے کے بعد واقف موقوفہ زمین متولی کے حوالہ کردے تو اسے اب ولایت حاصل نہیں رہے گی الا یہ کہ وہ وقف کرتے وقت اپنے لئے ولایت کی شرط لگالے۔

امام محمدؒ کا دوسرا قول یہ ہے کہ واقف وقف کرتے وقت اپنے لئے ولایت کی شرط لگائے تو بھی اسے ولایت حاصل نہیں ہوگی۔[۱]

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مابین یہ اختلاف درحقیقت اس اصولی اختلاف پر مبنی ہے کہ وقف اعتاق کے مشابہ ہے یا صدقہ کے مشابہ، امام ابو یوسفؒ اسے اعتاق کے مشابہ قرار دیتے ہیں اس لئے وہ وقف میں تسلیم الی المتولی کو شرط قرار نہیں دیتے اور واقف کو حق تولیت دیتے ہیں، جبکہ امام محمدؒ وقف کو صدقہ کے مشابہ قرار دیتے ہیں اس لئے وہ اس میں تسلیم الی المتولی کو بھی شرط قرار دیتے ہیں اور واقف کو حق تولیت نہیں دیتے۔ دونوں فریق کے دلائل پر ہم آخری باب میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، لیکن یہاں اتنی بات ذکر کرنا مناسب ہے کہ اس سلسلے میں راجح اور مفتیٰ بہ قول امام ابو یوسف کا ہے۔ امام حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وجاز جعل غلة الوقف أو الولاية لنفسه عند الثاني وعليه الفتوى.[۲]

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک واقف اپنے لئے وقف کی آمدنی اور ولایت کی شرط لگا سکتا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

فقہاء شافعیہ میں سے امام غزالیؒ بھی واقف کے لئے ولایت اصلیہ کے قائل ہیں، فرماتے ہیں:

وتولية امر الوقف الى من شرط له الواقف فان سكت فهو اليه ايضاً لانه لم يصرفه عن نفسه.[۳]

---

(۱) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۳۷۸/۵)

(۲) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۱/۴)

(۳) الغزالي، ابو حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالي ۵۰۵ھ. الوجيز، بيروت، دار المعرفة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۹ھ (۲۴۸/۱)

وقف کی تولیت اس شخص کو حاصل ہوگی جس کے لئے واقف نے تولیت کی شرط لگائی ہو اور اگر واقف خاموش رہا کسی کو متولی مقرر نہیں کیا تو ایسی صورت میں تولیت واقف ہی کو حاصل ہوگی کیونکہ اس نے تولیت اپنے سے کسی اور کی طرف منتقل نہیں کی۔

صاحب ہدایہؒ نے عقلی طور پر بھی اسے راجح قرار دیا ہے کہ واقف کو ولایت اصلیہ حاصل ہونی چاہئے اس کی دو وجہ بیان کی ہیں، پہلی وجہ تو یہ بیان کی کہ متولی وقف کو ولایت واقف کی طرف سے ہی حاصل ہوتی ہے اگر واقف کو ولایت اصلیہ حاصل نہیں تو متولی کو ولایت اس سے کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس وقف سے سب سے قریبی تعلق واقف ہی کو حاصل ہے، لہٰذا ولایت کا سب سے زیادہ حقدار بھی وہی ہوگا، اس لئے اگر اس نے تولیت کے بارے میں سکوت اختیار کیا تو ولایت اصلیہ کے بموجب واقف ہی اس کا متولی ہوگا۔[۱]

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بھی لکھتے ہیں:

حق تولية أمر الوقف فی الأصل للواقف. [۲]

وقف کی تولیت کا حق اصل میں واقف ہی کو ہے۔

مذکورہ بالا تمام عبارات کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ وقف کی ولایت اصلیہ سب سے پہلے واقف ہی کو حاصل ہوتی ہے، اگر واقف اپنے لئے ولایت کی شرط لگالے تو ایسی صورت میں تو جمہور احناف، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اسے ولایت حاصل ہوجاتی ہے، اور اگر شرط نہ لگائے تو فقہاء احناف کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق اور شوافع میں سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے موافق اس صورت میں بھی واقف ہی کو ولایت حاصل ہوگی۔

۲۔ قاضی (حاکم مسلمین):

دوسری شخصیت جسے ولایتِ اصلیہ حاصل ہے حاکمِ مسلمین ہے، حاکم مسلمین کو اپنی ولایت عامہ کی وجہ سے وقف پر بھی ولایت حاصل ہوتی ہے لیکن اسے حاصل ہونے والی ولایت اصلیہ واقف کی

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۴۲/۵)

(۲) النووی، يحيىٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامی ۱۹۸۵م (۳۴۶/۵)

ولایت اصلیہ سے خاص ہے اور یہ چند مخصوص صورتحال میں حاصل ہوتی ہے۔ ذیل میں ہم ان صورتوں کی تفصیل عرض کررہے ہیں لیکن یہاں ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اصولاً تو واقف کے بعد ولایتِ اصلیہ حاکمِ مسلمین کو اپنی ولایتِ عامہ کی وجہ سے حاصل ہے، البتہ حاکم، قاضی کے فرائض میں امورِ واقف کو بھی داخل کردے تو ایسی صورت میں قاضی کو ولایتِ وقف حاصل ہوگی ورنہ نہیں، لہٰذا اگر کسی جگہ حاکم نے امورِ وقف قاضی کے فرائض میں شامل نہیں کئے بلکہ کسی اور عہدہ دار یا کسی اور محکمہ کے تحت اسے دیدیا ہے تو پھر وقف کی تولیت قاضی کو حاصل نہیں ہوگی، بلکہ اس شخص یا ادارہ کو حاصل ہوگی جسے حاکم مسلمین کی طرف سے امورِ اوقاف سپرد کئے گئے ہیں، اس بات کی تائید علامہ ابن سماوہ کی درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

لو كان الوصى أو المتولى من جهة الحاكم فالأوثق أن يكتب فى الصكوك والسجلات "وهو الوصى من جهة حاكم له ولاية نصب الوصى والتولية" لأنه لو اقتصر على قوله: "وهو الوصى من جهة الحاكم" ربما يكون من حاكم ليس له ولاية نصب الوصى، فان القاضى لايملك نصب الوصى والمتولى الا اذا كان ذكر التصرف فى الاوقاف والأيتام منصوصاً عليه فى منشوره.[1]

یہی تفصیل علامہ ابن نجیمؒ نے بھی لکھی ہے۔[2]

اگر ہم پاکستان میں اوقاف کے انتظام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حکومت کی طرف سے اوقاف کے انتظام وانصرام سے متعلق امور قاضی کے بجائے ایک خاص محکمہ یعنی محکمہ اوقاف کو حاصل ہیں، ہاں اگر اس محکمہ میں کوئی بے قاعدگی عدالت کے علم میں لائی جاتی ہے تو دیگر محاکم کی طرح عدالت اس کے خلاف اقدام کرسکتی ہے لیکن براہِ راست اوقاف کے امور اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے اس کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا گیا ہے، لہٰذا اوقاف میں جہاں قاضی کا ذکر آرہا ہے اس سے مراد وہ شخص یا ادارہ ہوگا جس کے سپرد حکومت کی طرف سے اوقاف کے معاملات کئے گئے ہوں گے، ہمارے زمانہ اور ہمارے علاقہ میں اس کا مصداق محکمہ اوقاف ہوگا۔ واللہ سبحانہ اعلم

---

(۱) ابن سماوه، محمود بن اسماعيل الشهير بابن قاضى سماوه. جامع الفصولين، كراچى، اسلامى كتب خانه ۱۴۰۲ھ (۱۵/۲)

(۲) دیکھئے: ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۳/۵)

وہ صورتیں جن میں حاکم کو ولایتِ وقف حاصل ہوتی ہے:

(۱) اگر واقف کا انتقال ہوجائے اور اس نے کسی کو وقف کا متولی مقرر نہیں کیا اور کسی کو اپنا وصی بھی نہیں بنایا، نیز موقوف علیہم بھی غیر محصور ہیں تو ایسی صورت میں حاکم یا قاضی یا مجاز فرد یا ادارہ کو ولایت عامہ کے تحت وقف کی بھی ولایت حاصل ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں اس لئے وہ اپنی جگہ کسی کو وقف کا متولی مقرر کرے گا۔ علامہ طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

فان مات (الواقف) ولم يجعل ولايته الى أحد جعل القاضى له قيما.[1]

اگر واقف کا انتقال ہوجائے اور اس نے وقف کا کسی کو متولی بھی نہیں بنایا تو اب حاکمِ مسلمین وقف کا متولی مقرر کرے گا۔

(۲) واقف کے مقرر کردہ متولی کا انتقال ہوگیا اور اس نے کسی کو وقف کا متولی مقرر نہیں کیا تو ایسی صورت میں بھی ولایت حاکمِ مسلمین یا مجاز فرد یا ادارہ کو حاصل ہوگی اور وہ پھر کسی اور کو وقف کا متولی مقرر کرے گا۔ علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

اذا مات المتولى المشروط له بعدا لواقف فان القاضى ينصب غيره.[2]

جب واقف کا مقرر کردہ متولی واقف کے انتقال کے بعد مرجائے تو قاضی کسی اور کو متولی مقرر کرے گا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ وقف کا جو بھی متولی ہے خواہ وہ واقف ہو یا غیر واقف اس کی خیانت ثابت ہوجائے تو ایسی صورت میں بھی حاکم یا مجاز فرد یا ادارہ کو ولایت حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ اسے معزول کرکے کسی اور کو متولی مقرر کردے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

ان للقاضى عزل المتولى الخائن غير الواقف بالاولىٰ.[3]

جب قاضی واقف خائن کو معزول کرسکتا ہے تو متولی خائن کو بطریق اولی معزول کرسکتا ہے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۵۰)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۵۱)

(۳) الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۸۰)

(۴)　متولی وقف اپنا استعفیٰ پیش کر دے تو ایسی صورت میں بھی انہیں ولایت وقف حاصل ہو جاتی ہے وہ کسی کو وقف کا متولی مقرر کر سکتے ہیں۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

اذا عزل نفسه عند القاضي فانه ينصب غيره. [1]

اگر متولی قاضی کے پاس اپنے آپ کو معزول کر دے تو قاضی کسی اور کو مقرر کر دے گا۔

(۵)　اسی طرح واقف نے جہتِ عامہ جیسے مسجد، ہسپتال، مسافر خانہ وغیرہ کے لئے وقف کیا اور پھر اس کا انتقال ہو گیا تو ان تمام جہتوں کی ولایت قاضی یا حاکم کی طرف سے مجاز فرد یا ادارہ کو حاصل ہو جاتی ہے۔ علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

والذي يقتضي كلام معظم الاصحاب الفتوىٰ به ان يقال ان كان الوقف على جهة عامة فالتولية للحاكم كما الوقف على مسجد اورباط. [2]

اکثر اصحاب کے کلام کا تقاضہ یہ ہے کہ فتویٰ اس بات پر ہونا چاہئے کہ اگر وقف جہت عامہ پر ہے تو اس کی تولیت حاکم/ قاضی کو حاصل ہونی چاہئے جیسے مسجد یا رباط پر وقف۔

علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

واما الوقف على المساكين والمساجد ونحوها او على من لايمكن حصرهم واستيعابهم فالنظر فيه الى الحاكم لانه ليس له مالك متعين ينظر فيه، وله ان يستنيب فيه لان الحاكم لايمكنه تولى النظر بنفسه. [3]

مساجد، مساکین یا ایسے لوگوں پر وقف جن کا استیعاب ممکن نہیں ان میں تولیت حاکم/ قاضی کو حاصل ہوگی، کیونکہ ان اوقاف کا کوئی متعین مالک نہیں ہے، ہاں پھر قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی کو تولیت میں اپنا نائب بنا دے کیونکہ حاکم یا قاضی کے لئے بذات خود نگرانی کرنا ممکن نہیں۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۵۳)

(۲) النووی، يحيىٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامی ۱۹۸۵م (۵/۳۴۷)

(۳) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ـ ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۸/۲۳۷)

یہ کچھ صورتیں ہیں جہاں حاکم المسلمین اور پھر اس کی نیابت میں قاضی یا مجاز فرد یا ادارہ کو وقف پر ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے، ان کے علاوہ اور بھی تصرفات ہیں جو حاکم یا اس کا مجاز نمائندہ وقف میں کرسکتا ہے لیکن وہ اپنی ولایت عامہ کی وجہ سے کرتا ہے، ولایت علی الوقف کی وجہ سے نہیں کرتا۔

کیا موقوف علیہم کو بھی ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے؟

اس سلسلے میں فقہاء حنابلہ و مالکیہ کے یہاں تو ایسی عبارتیں ملتی ہیں جو صراحۃً دلالت کرتی ہیں کہ موقوف علیہ کو بھی بعض صورتوں میں ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے۔ مشہور حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

> **فان لم يجعله لاحد او جعله لانسان فمات نظر فيه الموقوف عليه لانه ملكه ونفعه له فكان نظره اليه كملكه المطلق.** (۱)
>
> اگر واقف نے کسی کو متولی مقرر نہیں کیا یا کسی کو مقرر کیا تھا اس کا انتقال ہوگیا تو اس میں تولیت کا حق موقوف علیہ کو ملے گا، کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہے اور اس کا نفع بھی اسی کی طرف راجع ہے، لہٰذا تولیت بھی اسی کو حاصل ہوگی، جیسے اپنی مملوکہ چیز کی نگرانی کا حق حاصل ہے۔
>
> اس طرح کی عبارت الکافی میں بھی ہے۔ (۲)

معروف مالکی فقیہ علامہ حطاب کی عبارت سے بھی واضح ہے کہ بعض صورتوں میں موقوف علیہ کو بھی ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> **قلت: قوله: "فان غفل المحبس عن ذلک كان النظر فيه للحاكم" هٰذا. والله اعلم. اذا لم يكن المحبس عليه معينا مالكا امر نفسه، واما ان كان مالكا امر نفسه ولم يول المحبس على حبسه احدا فهو الذى يحوز ويتولاه، يدل على ذلک غالب عبارات اهل المذهب فى كتاب الحبس وكتاب الصدقة وكتاب الهبة من المدونة الخ.** (۳)

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۷/۸)

(۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ ـ ۶۲۰ھ. الكافى، بيروت، المكتب الاسلامى، الطبعة الثالثة ۱۴۰۲ھ (۴۶۳/۲)

(۳) الحطاب، ابو عبد الله محمد بن عبد الرحمن الحطاب، مواهب الجليل، بيروت، دار الفكر ۱۳۹۸ھ (۳۷/۶)

''اگر واقف نے کسی کو متولی نہیں بنایا تو تولیت کا حق حاکم کو حاصل ہوگا'' یہ بات واللہ اعلم اس وقت ہے جبکہ موقوف علیہ معین اور اپنے امور کا مالک نہ ہو، اگر وہ اپنے امور کا مالک ہے اور معین ہے نیز واقف نے کسی اور کو متولی بھی نہیں بنایا ہے تو ایسی صورت میں وہ موقوف علیہ وقف کا متولی ہوگا اس پر اہل مذہب کی کافی عبارتیں دلالت کرتی ہیں۔

حضرات شوافعؒ کے یہاں بھی فی الجملہ بعض روایتوں کے مطابق موقوف علیہ کو ولایت اصلیہ حاصل ہونے کا تصور ملتا ہے۔ اگر کسی شخص نے وقف کیا اور تولیت کے بارے میں خاموش رہا تو تولیت کسے حاصل ہوگی؟ اس سلسلے میں حضرات شوافع کے یہاں تین روایتیں ہیں ان میں سے ایک روایت کے مطابق تولیت موقوف علیہم کو حاصل ہوگی۔ علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

وان وقف ولم يشرط التوليه: لاحد فثلثة طرق، احدها هل النظر للواقف ام للموقوف عليه ام للحاكم؟ فيه ثلثة أوجه والطريق الثانى بنى على الخلاف فى ملك الرقبة...... وقيل للموقوف عليه ان كان معيناً لان الغلة والمنفعة له، وان قلنا: الملك للموقوف عليه فالتولية له. (۱)

فقہاء احناف کے یہاں صریح عبارت تو نہیں ملی جس میں یہ صراحت ہو کہ موقوف علیہم کو ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے، ان کے یہاں ولایت اصلیہ یا تو واقف کو حاصل ہوتی ہے یا قاضی کو، البتہ بعض عبارات سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مخصوص صورت میں احناف بھی موقوف علیہم کو ولایت اصلیہ دیتے ہیں، وہ صورت یہ ہے کہ وقف متعین اور محصور لوگوں پر ہو اور واقف یا متولی کے انتقال کے بعد وہ خود کسی کو وقف کا متولی مقرر کر دیں اور وہ شخص جسے متولی بنایا جا رہا ہے اس کا اہل بھی ہو تو یہ تولیت درست ہے۔

علامہ طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف تولية الموقوف عليهم قيماً اذا مات قيمهم فانها صحيحة وان لم يستطلعوا رأى القاضى اذا كانوا يحصون وكان القيم من اهل الصلاح. (۲)

---

(۱) النووى، يحيىٰ بن شرف النووى. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵ م (۳۷/۶)

(۲) الطرابلسى، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۵۳)

بخلاف اس صورت کے کہ وقف کا قیم انتقال کر گیا اور موقوف علیہم نے اس کی جگہ کسی اور کو متولی مقرر کر دیا تو یہ صحیح ہے اگر چہ وہ قاضی کو مطلع نہ کریں، بشرطیکہ موقوف علیہم محصور ہوں اور قیم اہل صلاح میں سے ہو۔

علامہ ابن نجیمؒ تاتارخانیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

وفی التتارخانیة: الوقف اذا کان علی ارباب معلومین یحصی عددهم اذا نصبوا متولیاً بدون استطلاع رأی القاضی یصح اذا کانوا من اهل الصلاح ...... ثم اتفق المشائخ المتأخرون واستاذونا ان الافضل ان ینصبوا متولیاً ولایعلموا القاضی فی زماننا لما عرف من طمع القضاة فی اموال الاوقاف. [1]

تاتارخانیہ میں ہے کہ وقف اگر متعین لوگوں پر ہے جنہیں شمار کرنا ممکن ہے، یہ اگر قاضی کو اطلاع دئے بغیر کسی کو متولی مقرر کر لیں تو یہ جائز ہے بشرطیکہ یہ لوگ اہل صلاح میں سے ہوں، مشائخ متاخرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس زمانے میں افضل یہ ہے کہ لوگ خود ہی متولی مقرر کر لیں، قاضی کو اطلاع نہ دیں کیونکہ قاضی اموال وقف کو ہضم کرنے کے لئے نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

یہی فتویٰ علامہ شامیؒ نے بھی دیا ہے۔[2] موقوف علیہم کا کسی اور کو متولی بنانا اسی وقت ہی درست ہوسکتا ہے جب انہیں خود ولایت اصلیہ حاصل ہو اگر انہیں ولایت اصلیہ حاصل نہ ہو تو وہ کسی اور کو متولی کیسے مقرر کریں گے۔ اس لئے احناف کی ان عبارات سے معلوم ہوا کہ ذکر کردہ مخصوص صورت میں موقوف علیہم کو بھی ان کے نزدیک ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مالکیہ وحنابلہ کے یہاں تو بعض صورتوں میں موقوف علیہم کو ولایت اصلیہ حاصل ہونے کی صراحت موجود ہے، شوافع کے یہاں مخصوص صورت میں ایک روایت کے مطابق موقوف علیہم کو ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے، جبکہ احناف کے یہاں بعض صورتوں میں مفتیٰ بہ قول کے مطابق موقوف علیہم کو ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۵۱/۵)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۲۲/۴)

تولیتِ فرعیہ

تولیتِ فرعیہ سے مراد وہ ولایت ہے جو اصالۃً حاصل نہ ہو بلکہ کسی کے سپرد کرنے سے وہ ولایت حاصل ہو۔

تولیتِ فرعیہ حاصل ہونے کی صورتیں کئی ہوسکتی ہیں:

(ا) الولایۃ بالشرط:

الولایۃ بالشرط کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو ولایتِ اصلیہ یا فرعیہ حاصل ہے وہ کسی کو وقف کی ولایت دینے کی صراحت کردے۔ ولایت بالشرط کی بھی کئی صورتیں ہیں:

(الف) ولایت بالشرط من جانب الواقف:

واقف کو ولایت اصلیہ حاصل ہے، وہ اپنی حیات ہی میں کسی کو وقف کا متولی بنادے تو یہ تولیت درست ہوگی اور متولی کو واقف کی اس شرط کی وجہ سے تولیتِ فرعیہ حاصل ہوجائے گی۔ شیخ کبیسیؒ لکھتے ہیں:

اجمع کافۃ الفقهاء علی حق الواقف فی اشتراط الولایۃ للغیر. (۱)

تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ واقف کو کسی اور کو متولی بنانے کی شرط لگانے کا حق حاصل ہے۔

لیکن اگر واقف نے کسی کو اپنی زندگی میں وقف کا متولی بنایا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک واقف کے انتقال سے متولی معزول ہوجائے گا، کیونکہ وہ متولی واقف کا وکیل ہے اور وکیل موکل کی موت سے معزول ہوجاتا ہے، اس لئے اگر واقف یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص میرے انتقال کے بعد بھی وقف کا متولی رہے تو اسے متولی بناتے وقت یہ الفاظ کہنے چاہئیں کہ "میں اسے اپنی زندگی اور انتقال کے بعد بھی اس وقف کا متولی بناتا

---

(۱) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعۃ الاسلامیۃ، بغداد (۱۴۸/۲)

ہوں'' اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ واقف کی زندگی میں یہ متولی اس کے وکیل کی حیثیت سے کام کرے گا اور واقف کے انتقال کے بعد وہ بطورِ وصی وقف کا متولی رہے گا۔ علامہ طرابلسیؒ الاسعاف میں تحریر فرماتے ہیں:

ولو جعل الولاية لرجل ثم مات بطلت ولايته عنده (أبي يوسفؒ) بناء على الوكالة، الا ان يجعلها له في حياته وبعد مماته لانه يصير وصيه بعد موته. (۱)

اور اگر واقف نے ولایت کسی شخص کے لئے خاص کر دی اور پھر واقف کا انتقال ہوگیا تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک ولایت باطل ہوجائے گی وکالت کی وجہ سے، الا یہ کہ واقف اسے اپنی زندگی اور مرنے کے بعد متولی مقرر کرے تو ایسی صورت میں واقف کے انتقال سے متولی کی ولایت باطل نہیں ہوگی، مرنے کے بعد اسے بطور وصی ولایت حاصل رہے گی۔

واقف کی طرف سے ولایۃ بالشرط حاصل ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ واقف کسی کو متولی تو مقرر نہ کرے لیکن مرتے وقت کسی کو عمومی طور پر اپنا وصی مقرر کر دے تو اس وصی کو واقف کے انتقال کے بعد واقف کے وقف کی بھی ولایت حاصل ہوگی۔ تتارخانیہ میں ہے:

ولولم يشترط الواقف الولاية لأحد حتى حضره الموت فقال لرجل انت وصيي ولم يزد على ذلك فهو وصي في ماله وولده وفيما كان في يده من الوقف. (۲)

اگر واقف نے کسی کو متولی مقرر نہیں کیا اور مرتے وقت کسی سے کہا کہ تم میرے وصی ہو تو یہ شخص اس کے مال، اولاد اور اس کے پاس موجود وقف کے سلسلہ میں بھی وصی ہوگا۔

تولیت کے حوالہ سے اگر واقف متولی میں خاص اوصاف یا اپنے سے قرابت کی شرط لگائے تو اس کی پابندی بھی ضروری ہے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۴۹)

(۲) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۷۵۰/۵)

(ب) ولایۃ بالشرط من جانب الموقوف علیہم:

ولایۃ بالشرط حاصل ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ جن صورتوں میں موقوف علیہم کو ولایت اصلیہ حاصل ہوتی ہے ان میں وہ کسی کو وقف کا متولی مقرر کردیں اس طرح بھی ولایتِ فرعیہ حاصل ہوجاتی ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف ما اذا كان وقف على أرباب معلومين فان لهم أن ينصبوا متوليا من اهل الصلاح.[1]

اگر وقف معلوم اور متعین لوگوں پر ہے تو ان کے لئے کسی اہل شخص کو متولی مقرر کرنا جائز ہے۔

(ج) ولایۃ بالشرط من جانب القاضی:

جن صورتوں میں حاکم یا قاضی کو ولایتِ اصلیہ حاصل ہوتی ہے ان صورتوں میں قاضی بھی کسی کو وقف کا متولی بنا سکتا ہے، قاضی کی جانب سے تولیت کی شرط اور صراحت کی وجہ سے اس شخص کو ولایتِ فرعیہ حاصل ہوجائے گی۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

واما الوقف على المساكين والمساجد ونحوها أو على من لايمكن حصرهم واستيعابهم فالنظر فيه الى الحاكم لانه ليس له مالك متعين ينظر فيه، وله ان يستنيب فيه لان الحاكم لايمكنه تولى النظر بنفسه.[2]

مساجد، مساکین یا ایسے لوگوں پر وقف جن کا استیعاب ممکن نہیں ان میں تولیت حاکم/ قاضی کو حاصل ہوگی، کیونکہ ان اوقاف کا کوئی متعین مالک نہیں ہے جو ان کی نگرانی کرے، ہاں پھر قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی کو تولیت میں اپنا نائب مقرر کردے، کیونکہ حاکم یا قاضی کے لئے بذاتِ خود نگرانی کرنا ممکن نہیں۔

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/ ۴۵۰)

(۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۸/ ۲۳۷) وكذا فى البحر (۵/ ۲۵۱)

واقف کے اہل خانہ تولیت کے زیادہ حقدار ہیں:

البتہ قاضی کے لئے افضل یہ ہے کہ واقف کے اہل خانہ میں سے اگر کوئی تولیت کا اہل ہو تو اسی کو متولی مقرر کرے، اسے اجانب پر ترجیح دے، اس کی وجہ علامہ ابن نجیمؒ نے ایک تو یہ لکھی کہ واقف کا اہل بیت اس کے وقف کا دوسری کی نسبت خیال زیادہ رکھے گا اور دوسرے واقف کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس وقف کی نسبت اسی کی طرف ہوتی رہے۔ اس کے اہل خانہ میں سے کسی کو متولی مقرر کرنے میں یہ خواہش زیادہ پوری ہوگی کیونکہ لوگ متولی کو دیکھ کر یہ جان لیں گے کہ یہ وقف فلاں کا ہے، لیکن اگر اس کے اہل خانہ میں کوئی تولیت کا اہل نہ ہو تو ایسی صورت میں قاضی اجانب میں سے بھی کسی کو متولی مقرر کر سکتا ہے۔[1]

(د) الولایۃ بالشرط من جانب المتولی:

چوتھی صورت ولایۃ بالشرط کے حاصل ہونے کی یہ ہے کہ واقف نے کسی کو متولی مقرر کیا اور پھر واقف کا انتقال ہوگیا، متولی نے اپنے انتقال سے پہلے کسی اور کے لئے ولایت کی وصیت کردی تو یہ وصیت درست ہوگی اور جس شخص کے لئے وصیت کی گئی ہے وہ متولی من الواقف کے انتقال کے بعد وقف کا متولی ہوگا۔ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> **اذا مات المتولی المشروط له بعد الواقف فان القاضی ینصب غیره وشرط فی المجتبی ان لایکون المتولی أوصی به الی رجل عند موته فان کان أوصی لاینصب القاضی.**[2]
>
> متولی جس کے لئے واقف نے ولایت کی شرط لگائی تھی اس کا واقف کے بعد انتقال ہوگیا تو قاضی کسی اور کو متولی مقرر کرے گا، مجتبیٰ میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس متولی نے مرتے وقت کسی کے لئے تولیت کی وصیت نہ کی ہو، ورنہ اگر اس نے وصیت کی ہو تو وہی شخص متولی بنے گا، قاضی کسی اور کو مقرر نہیں کرے گا۔

اس صورت میں بھی متولی کی وصیت اور شرط کی وجہ سے اس موصیٰ لہ کو ولایت حاصل ہو رہی ہے۔ ان چار صورتوں کے علاوہ ولایۃ بالشرط کی مزید اور کوئی صورت باوجود تلاش کے احقر کو نہیں مل سکی۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/ ۲۵۱) وکذا فی الاسعاف (۵۰)
(۲) حوالہ بالا، مزید دیکھئے: رد المحتار (۴/ ۴۲۳)

(۲) الولایۃ بالتوکیل:

ولایتِ فرعیہ حاصل ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس شخص کو ولایت اصلیہ حاصل ہے، یا ولایت بالشرط حاصل ہے، وہ وقف کے جملہ یا بعض امور کی انجام دہی کے لئے کسی کو وکیل بنادے تو جو اختیار اور تصرفات موکل کو حاصل ہوں گے وہ وکیل کو بھی حاصل ہو جائیں گے۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وللناظر ان یوکل بمن یقوم بما کان الیه من أمر الوقف ویجعل له من جعله شیئًا، وله ان یعزله ویستبدل به اولایستبدل، ولو جن انعزل وکیله. (۱)

ناظرِ وقف کے لئے جائز ہے کہ جو امورِ وقف اس کے ذمہ ہیں ان کی انجام دہی کے لئے کسی کو وکیل مقرر کردے اور اپنے وظیفہ میں سے اس کے لئے کچھ مقرر کردے، وکیل کو معزول کرنا بھی ناظر کے لئے جائز ہے اور اسے تبدیل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے اور اگر ناظر مجنون ہو گیا تو اس کا وکیل خود ہی معزول ہو جائے گا۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

ان الخصاف صرح بأن للقیم أن یوکل وکیلا یقوم مقامه وله ان یجعل له من معلومه شیئا وکذا فی الاسعاف. (۲)

امام خصاف نے صراحت کی ہے کہ ناظرِ وقف کے لئے جائز ہے کہ وہ وقف کے امور کی انجام دہی کے لئے کسی کو وکیل مقرر کردے اور اپنے وظیفہ میں سے اس کے لئے کچھ مقرر کردے، اسی طرح اسعاف میں بھی اس کی صراحت ہے۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ ولایۃ بالتوکیل کی صورت میں اصل متولی کا حق ختم نہیں ہوگا، بلکہ اسے بھی وقف میں تمام تصرفات کا اختیار حاصل رہے گا۔

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۵۱/۵)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۳۰/۵، ۲۴۵)

(۳) الولایۃ بالتفویض:

ولایۃ فرعیہ حاصل ہونے کی تیسری شکل تفویضِ ولایت ہے۔ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو وقف کی ولایت حاصل ہے وہ اپنی جگہ کسی اور کو مستقلاً متولی مقرر کر کے اپنے تمام اختیارات نئے متولی کے سپرد کر دے، جن لوگوں کو ولایتِ اصلیہ حاصل ہوتی ہے جیسے واقف اور بعض مخصوص صورتوں میں حاکم اور اس کے مجاز نمائندے اور موقوف علیہم، انہیں تو بالاتفاق تفویضِ ولایت کا حق حاصل ہے، کہ یہ اپنی جگہ کسی اور کو مستقلاً وقف کا متولی مقرر کر کے وقف کے تمام امور اس کے سپرد کر دیں۔ علامہ کبیسیؒ لکھتے ہیں:

ولقد اتفق العلماء على حق من تثبت له الولاية الاصلية على الوقف سواء كان واقفا أو موقوفا عليه أو القاضى فى تفويض هذه الولاية لمن يراه. (۱)

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جسے وقف پر ولایتِ اصلیہ حاصل ہے جیسے واقف، موقوف علیہم اور قاضی اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ولایت جسے مناسب سمجھے اس کے سپرد کر دے۔

جسے ولایت بالشرط حاصل ہے اس کی تفویض سے ولایت کب حاصل ہوگی؟ اور کب نہیں؟ اس میں کچھ تفصیل ہے:

۱۔ واقف نے کسی کو وقف کا متولی مقرر کرتے وقت یہ صراحت کر دی تھی کہ متولی کو کسی اور کو ولایت تفویض کرنے کا حق بھی حاصل ہے تو ایسی صورت میں متولی کو ہر حالت میں تفویض کا حق حاصل ہوگا، وہ اپنی صحت والی زندگی میں بھی ولایتِ وقف کسی اور کے سپرد کر سکتا ہے اور مرض الوفات میں بھی سپرد کر سکتا ہے۔ شیخ محمد قدری پاشا قانون العدل والانصاف میں لکھتے ہیں:

اذا فوض الواقف أمر الوقف للمتولى تفويضا عاما بأن ولاه واقامه مقام نفسه وجعل له ان يسنده ويوصى به الى من شاء ففى هذه الصورة يجوز له التفويض واقامة غيره مقامه استقلالا فى حال صحته وفى حال المرض المتصل بموته ولايحتاج المفوض له الى تقرير شرعى من القاضى. (۲)

---

(۱) الكبيسى، محمد عبيد الكبيسى. احكام الوقف فى الشريعة الاسلامية، بغداد (۲/۱۵۴)

(۲) باشا، محمد قدرى باشا. قانون العدل والانصاف، مصر، مكتبة الاهرام ۱۹۲۸م (۷۷) مزید دیکھئے: رد المحتار (۴/۴۲۵)

اگر واقف نے وقف کے امور متولی کے سپرد تفویضِ عام کے ساتھ کئے کہ اسے متولی بنایا اور اپنے قائم مقام بنایا اور اسے یہ اختیار دیا کہ جس کے لئے چاہے تولیت کی وصیت کرے اور جسے چاہے تولیت تفویض کرے تو ایسی صورت میں متولی کے لئے اپنی صحت یا مرض الوفات میں تولیت کسی اور کے سپرد کرنا اور اسے اپنا قائم مقام بنانا مستقل طور پر جائز ہے اور تولیت جس کے سپرد کی گئی ہو قاضی کی جانب سے اس کی تقرری بھی ضروری نہیں وہ محض تفویضِ ولایت سے متولی بن جائے گا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واقف نے متولی کو صراحۃً تفویض کا اختیار نہ دیا ہو بلکہ اس سے سکوت اختیار کیا ہو تو ایسی صورت میں متولی اپنی صحت کی حالت میں تو ولایتِ وقف کسی اور کے سپرد نہیں کرسکتا، البتہ مرض الوفات میں کسی کے سپرد کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ شیخ قدری لکھتے ہیں:

وان لم یکن التفویض للقیم عاما صح تفویضه لعینه فی مرض موته کما یصح للوصی ان یوصی الی غیره ولا یصح تفویضه فی صحته بغیر تقریر من القاضی. (۱)

اگر واقف نے متولی کو تفویضِ عام نہ دی ہو تو متولی مرض الوفات میں تو تفویض کرسکتا ہے جیسا کہ وصی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی اور کو وصی مقرر کردے، صحت میں تفویض درست نہیں ہوگی، جب تک قاضی کی جانب سے مفوض لہ کو مقرر نہ کیا جائے۔

حالتِ صحت اور حالتِ مرض الوفات میں وجہ فرق کیا ہے کہ اول الذکر میں تفویض معتبر نہیں اور مرض الوفات میں تفویض درست ہے؟

اسے علامہ طرسوسیؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وقف میں دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک واقف دوسرے وہ چیز جو وقف کی گئی ہے، متولی کی حیثیت کیا ہے اس کے بھی دو پہلو ہیں اگر ہم اس لحاظ سے دیکھیں کہ اسے واقف نے مقرر کیا ہے اور اسے جو ولایت بھی حاصل ہوئی ہے وہ واقف کی طرف سے حاصل ہوئی ہے تو اسے واقف کا وکیل ہونا چاہئے اور وکیل کے لئے کسی اور کو وکیل بنانا موکل کی صریح اجازت کے بغیر جائز نہیں، اس پہلو کا تقاضہ تو یہ ہے کہ متولی کے لئے تفویضِ ولایت جائز نہ

---

(۱) باشا، محمد قدری باشا. قانون العدل والانصاف، مصر، مکتبة الاهرام ۱۹۲۸م (۷۷) مزید دیکھئے: الاشباه والنظائر (۱۲۶/۲) منحة الخالق (۲۵۳/۵)

ہو، نہ حالتِ صحت میں اور نہ مرض الوفات میں، اور اگر ہم اس لحاظ سے دیکھیں کہ واقف نے اسے موقوفہ چیز کی حفاظت ونگرانی کے لئے مقرر کیا ہے جو کہ واقف کے مرنے کے بعد بھی باقی رہے گی تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ متولی کی حیثیت وصی کی ہو اور وصی کے لئے حالتِ صحت میں اور انتقال کے وقت کسی اور کو وصی مقرر کرنا جائز ہے۔ لہٰذا متولی کے لئے بھی صحت اور حالتِ مرض الوفات میں تولیت کسی اور کے سپرد کرنا جائز ہو، ہم نے متولی میں دونوں پہلوؤں کی رعایت رکھی وکالت کے پہلو کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا کہ متولی حالتِ صحت میں واقف کی صریح اجازت کے بغیر تولیت کسی اور کے سپرد نہیں کرسکتا، اور وصایۃ کے پہلو کو دیکھتے ہوئے ہم نے کہا کہ حالتِ مرض الوفات میں متولی تولیت کسی اور کے سپرد کرسکتا ہے۔(۱)

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ واقف نے متولی کو مقرر کرتے وقت صراحت کردی تھی کہ وہ تولیت کسی اور کے سپرد نہیں کرے گا تو ایسی صورت میں متولی کو تفویض ولایت کا حق حاصل نہیں ہوگا، نہ صحت میں اور نہ مرض الوفات میں، کیونکہ واقف کی جائز شرائط کی پابندی بہرصورت ضروری ہے۔(۲)

فراغ عن الولایۃ کے بارے میں ضروری وضاحت:

یہاں یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ بعض حضرات نے متولی بالشرط کی طرف سے تفویضِ ولایت کی ان صورتوں کے علاوہ ایک اور چوتھی صورت بھی ذکر کی ہے "فراغ عن الولایۃ" یہ درست نہیں، فراغ تفویض سے مختلف ہے۔ فراغ کا مطلب یہ ہے کہ متولی حالتِ صحت میں قاضی کے پاس جاکر اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حق میں تولیت سے دستبردار کردے، فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ محض اس دستبرداری سے وہ دوسرا شخص متولی نہیں بنے گا، بلکہ اس کی تولیت کے لئے قاضی کی جانب سے تقرری ضروری ہوگی، اگر قاضی منزول لہ (جس کے حق میں متولی دستبردار ہوا ہے) کو متولی مقرر نہ کرے تو وہ وقف کا متولی نہیں بنے گا، پہلا متولی ہی اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الطرسوسی، ابراهيم بن على الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶ء (۱۳۵) وكذا في تقريرات الرافعی (۹۴/۴)

(۲) ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفیٰ الآفندی ۹۸۲ھ. عمدة الناظر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، لائبریری جامعه دارالعلوم کراچی (۲۱/۲)

الفراغ مع التقرير من القاضي عزل لاتفويض ...... أما لو كان عند القاضي كان عزلا لنفسه و تقرير القاضي للغيره نصب جديد وهي مسألة الفراغ بعينها، وبهذا يتجه عدم سقوط حق الفارغ قبل تقرير القاضي. (۱)

متولی کا اپنے عہدہ سے فارغ ہوجانا اور پھر قاضی کا کسی اور کو مقرر کردینا عزل ہے تفویض نہیں...... اگر فراغ قاضی کے پاس ہو تو یہ اپنے آپ کو معزول کرنا ہے اور قاضی کا اس کی جگہ دوسرے کو مقرر کرنا نصبِ جدید ہے اور یہی حکم مسألۃ الفراغ کا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جب تک قاضی منزول لہ کو مقرر نہیں کردیتا سابقہ متولی اپنے عہدہ سے معزول نہیں ہوگا۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ فراغ عن العہدۃ تفویض کی قبیل سے نہیں ہے، اس لئے اسے متولی بالشرط کی جانب سے تفویض کی چوتھی صورت قرار دینا درست نہیں ہے۔

(۴) المصادقۃ علی النظر:

ولایتِ فرعیہ حاصل ہونے کی چوتھی صورت یہ ہے کہ متولی وقف یہ اقرار کرے کہ اس وقف کی تولیت میرے بجائے فلاں کو حاصل ہے، یہ اقرار شرعاً معتبر ہے اور جس شخص کے حق میں اقرار کیا گیا ہے وہ وقف کا متولی بن جائے گا اور اقرار کرنے والے کی تولیت ختم ہوجائے گی۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فلو أقر المشروط له الريع أو النظر أنه يستحقه فلان دونه صح. (۲)

واقف نے جس شخص کے لئے وقف کی آمدنی خاص کی ہے یا جسے وقف کا متولی مقرر کیا ہے وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ وقف کی آمدنی یا تولیت کا میرے بجائے فلاں شخص مستحق ہے تو یہ اقرار درست ہے۔

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۲۹)

(۲) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۴۲)

اسی طرح اگر متولی یہ اقرار کرے کہ میں تنہا اس وقف کا متولی نہیں ہوں بلکہ فلاں شخص کو بھی متولی مقرر کیا تھا تو یہ بھی درست ہے اور اس اقرار کی وجہ سے وہ شخص جس کے لئے اقرار کیا گیا ہے، متولی کے ساتھ تولیت میں شریک ہو جائے گا۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فلو اقر الناظر ان فلانا یستحق معه نصف النظر مثلایؤاخذ باقراره ویشارکه فلان فی وظیفته ما داما حیین. (۱)

اگر ناظر یہ اقرار کرے کہ فلاں شخص بھی اس کے ساتھ تولیت کا مستحق ہے تو یہ اقرار معتبر ہوگا اور مقرلہ (جس کے لئے اقرار کیا گیا ہے) ناظرِ وقف کے ساتھ تولیت میں شریک ہو جائے گا۔

البتہ احناف کے علاوہ دیگر ائمہ اس اقرار کا اس حد تک تو اعتبار کرتے ہیں کہ اقرار کرنے والا اپنے اقرار کی وجہ سے وقف کا متولی نہیں رہے گا لیکن اس اقرار کی وجہ سے مقرلہ کو تولیت حاصل نہیں ہوگی، واقف یا قاضی کو اختیار ہوگا کہ کسی اور کو وقف کا متولی مقرر کر دیں۔ (۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۴۲/۴)

(۲) دیکھئے: الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعة الاسلامیة، بغداد (۱۲۰/۲)

متولی کی شرائط

متولی وقف میں درج ذیل شرائط پائی جانی ضروری ہیں:

ا۔ عقل:

متولی کا عاقل ہونا ضروری ہے، مجنون وقف کا متولی نہیں بن سکتا، اس شرط پر تو تمام فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

ویشترط للصحة بلوغه و عقله. [۱]

تولیت کے صحیح ہونے کے لئے متولی کا بالغ اور عاقل ہونا ضروری ہے۔

شیخ کبیسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

العقل: وهذا شرط أجمع عليه الفقهاء لصحة التولية. لذا فلا تصح تولية المجنون لأنه فاقد العقل عديم التمييز فاسد التدبير فهو ليس باهل لأى عقد أو تصرف لعدم اعتبار عبارته. [۲]

عقل، تولیت کے صحیح ہونے کے لئے اس کے شرط ہونے پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ اس لئے مجنون کو متولی بنانا درست نہیں کیونکہ اس میں عقل اور تمییز نہیں ہے اور وہ فاسد التدبیر بھی ہے، اس کی چونکہ کوئی بات معتبر نہیں اس لئے وہ کسی بھی عقد اور تصرف کا اہل بھی نہیں ہے۔

عاقل متولی اگر مجنون ہو جائے تو معزول ہو جائے گا:

جس طرح مجنون کو متولی نہیں بنایا جا سکتا اسی طرح اگر متولی مجنون ہو جائے اور اس کا جنون، جنون مطبق یعنی طویل ہو تو وہ خود بخود ولایت سے معزول ہو جائے گا۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۶/۵)

(۲) الكبيسى، محمد عبيد الكبيسى. احكام الوقف فى الشريعة الاسلامية، بغداد (۱۶۱/۲)

علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

وینعزل الناظر بالجنون المطبق اذا دام سنة نص علیه الخصاف لا ان دام اقل من ذلک ولو عاد الیه عقله وبرأ من علته عاد الیه النظر. [1]

اگر متولی مجنون ہوجائے اور اس کا جنون، جنون مطبق ہو یعنی ایک سال تک رہے تو وہ معزول ہوجائے گا، اور اگر ایک سال سے کم رہے تو وہ معزول نہیں ہوگا، اور اگر اس کی عقل لوٹ آئے اور وہ جنون کی بیماری سے صحیح ہوجائے تو اس کی تولیت لوٹ آئے گی۔

واضح رہے کہ تولیت واپس مل جانے والی بات اس متولی کے لئے ہے جسے واقف نے مقرر کیا ہو، اگر اس کا جنون صحیح ہوجائے تو اس کی تولیت لوٹ آتی ہے بخلاف اس متولی کے جسے قاضی نے مقرر کیا ہو یا موقوف علیہم نے، جنون سے وہ معزول ہوجاتا ہے لیکن افاقہ کے بعد اس کی تولیت واپس نہیں آتی۔ [2]

۲۔ بلوغ:

متولی کے لئے دوسری شرط اکثر فقہاء کرام کے نزدیک بالغ ہونا ہے، نابالغ کو وقف کا متولی مقرر کرنا درست نہیں۔ الاسعاف میں ہے:

فلو اوصیٰ الی صبی تبطل فی القیاس مطلقا وفی الاستحسان هی باطلة مادام صغیرا فاذا کبر تکون الولایة له. [3]

اگر متولی نے کسی نابالغ کے لئے تولیت کی وصیت کی تو قیاس کے مطابق یہ وصیت مطلقاً باطل ہے۔ جبکہ استحسان کی رو سے جب تک یہ نابالغ ہے یہ وصیت باطل ہے بالغ ہونے کے بعد اس وصیت پر عمل کیا جائے گا اور اسے وقف کی تولیت حاصل ہوجائے گی۔

البتہ جامع احکام الصغار کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نابالغ بچہ اتنا سمجھدار ہو کہ وقف کی نگرانی اور حفاظت کرسکتا ہو تو اسے مقرر کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۵۱/۵)

(۲) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۰/۴)

(۳) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۵۲)

علامہ استروشنی لکھتے ہیں:

وفی فتاوی رشید الدین رحمه الله: القاضی اذا فوض التولية الی صبی یجوز اذا کان أهلا للحفظ ویکون له ولاية التصرف. (۱)

فتاویٰ رشید الدین میں ہے کہ اگر قاضی تولیت وقف نابالغ کے سپرد کردے تو جائز ہے بشرطیکہ اس میں وقف کی حفاظت کی اہلیت ہو، ایسی صورت میں بچے کو وقف میں تصرفات کی ولایت حاصل ہو جائے گی۔

قول راجح:

اس سلسلے میں راجح بات وہ ہے جو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے منحۃ الخالق اور تنقیح الحامدیہ میں ان دونوں عبارتوں میں تطبیق دیتے ہوئے فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

ویؤخذ منه التوفیق بحمل مافی الاسعاف علی ما اذا لم کن اهلا للحفظ بأن کان صغیراً لا یعقل. (۲)

اس میں یوں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ اسعاف کی عبارت کو اس صورت پر محمول کریں کہ وہ بچہ وقف کی حفاظت کی اہلیت نہ رکھتا ہو، صبی غیر عاقل ہو۔

صبی عاقل اگر حفاظتِ وقف کی اہلیت رکھتا ہو تو اس کی تولیت درست ہے:

اس سے یہ واضح ہے کہ اگر بچہ عقل مند ہو اور وقف کی نگرانی اور حفاظت کی اہلیت رکھتا ہو تو اسے وقف کا متولی بنایا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر وہ ناسمجھ ہو اور حفاظتِ وقف کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اسے متولی بنانا بالاتفاق درست نہیں۔

۳۔ عدالت:

تیسری شرط متولی کے لئے یہ ہے کہ وہ عادل ہو فاسق نہ ہو، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک تو یہ

---

(۱) ابن سماوه، محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوه. جامع الفصولین، کراچی، اسلامی کتب خانه ۱۴۰۲ھ (۲۶/۲)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۶/۵) وکذا فی تنقیح الفتاوی الحامدیة (۲۰۴/۲)

شرطِ صحت ہے یعنی اگر متولی میں عدالت نہ ہو تو اسے متولی مقرر کرنا درست ہی نہیں ہوگا اور وہ متولی بنے گا ہی نہیں۔ علامہ بہوتی مشہور حنبلی فقیہ تحریر فرماتے ہیں:

فان كان النظر لغير الموقوف عليه بأن وقف على الفقراء او ولى الحاكم ناظرا من غيرهم او كان النظر لبعضهم اى الموقوف عليهم وكانت ولايته من حاكم بان كان وقف على الفقراء وولى الحاكم منهم ناظرا عليه او من ناظر اصلى فلابد من شرط العدالة فيه لانها ولاية على مال فاشترط لها العدالة كالو لاية على مال اليتيم فان لم يكن الا جنبى المولى من حاكم او ناظر اصلى عدلا لم تصح ولايته لفوات شرطها. (۱)

اگر وقف کی ولایت موقوف علیہم کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہے کہ مثلاً فقراء پر وقف ہو یا حاکم نے موقوف علیہم کے علاوہ کسی اور کو متولی مقرر کر دیا ہو یا ولایت تو موقوف علیہم کو حاصل ہو لیکن انہیں قاضی نے متولی مقرر کیا ہو یا اصل متولی نے کسی اور کو متولی بنا دیا ہو تو ان تمام صورتوں میں متولی میں عدالت شرط ہے، کیونکہ یہ ولایت علی مال ہے جس میں عدالت شرط ہے جیسے کہ یتیم کے مال پر ولایت، اور اگر یہ اجنبی متولی جسے قاضی نے مقرر کیا ہو یا اصل متولی عادل نہ ہو تو اس کی تولیت درست نہیں کیونکہ اس میں ولایت کی شرط نہیں پائی جا رہی۔

البتہ حنابلہ کے یہاں اس سے دو صورتوں کا استثناء ہے کہ اگر واقف نے متولی مقرر کیا ہے یا موقوف علیہم کو ولایت حاصل ہے تو ان صورتوں میں فاسق بھی متولی بن سکتا ہے۔ (۲)

شافعی فقیہ علامہ رملیؒ تحریر فرماتے ہیں:

(وشرط الناظر العدالة) الباطنة مطلقاً كما رجحه الأ ذرعى ...... فينعزل بالفسق المحقق ...... وسواء فى الناظر أكان هو الواقف ام غيره. (۳)

---

(۱) البهوتى، منصور بن يونس بن ادريس البهوتى ۱۰۵۱ھ. كشاف القناع عن متن الاقناع، مكة المكرمة، مطبعة الحكومة، الطبعة الاولىٰ ۱۳۹۴ھ (۲۹۹/۴)

(۲) حواله بالا.

(۳) الرملى، محمد بن ابى العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدين الرملى. نهاية المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربى (۳۹۶/۵) مزید دیکھئے: روضة الطالبين (۳۴۷/۵)

ناظرِ وقف کے لئے عدالتِ باطنہ مطلقاً شرط ہے جیسے کہ اسے اذرعیؒ نے ترجیح دی۔ ہے لہٰذا وہ ایسے کام کی وجہ سے خود بخود معزول ہوجائے گا جس کا فسق ہونا یقینی ہو، خواہ یہ متولی خود واقف ہو یا اس کے علاوہ اور کوئی ہو۔

احناف و مالکیہ کے نزدیک عدالت شرط اولویت ہے:

احنافؒ کے نزدیک عدالت شرطِ صحت نہیں بلکہ شرط اولویت ہے کہ متولی کو عادل ہونا چاہئے لیکن اگر متولی عادل نہ ہو تو وہ خود بخود معزول نہیں ہوگا اور اس کی تولیت منعقد ہوجائے گی۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

وفي الاسعاف لايولى الا امين قادر بنفسه أو بنائبه لأن الولاية مقيدة بشرط النظر وليس من النظر تولية الخائن لأنه يخل بالمقصود والظاهر انها شرائط الاولوية لا شرائط الصحة وان الناظر اذا فسق استحق العزل ولا ينعزل، لأن القضاء اشرف من التولية و يحتاط فيه أكثر من التولية، والعدالة فيه شرط الاولوية حتى يصح تقليد الفاسق واذا فسق القاضي لاينعزل على الصحيح المفتى به فكذا الناظر. (۱)

اسعاف میں ہے کہ ایسے شخص کو متولی بنایا جائے جو امانت دار ہو اور وقف کے امور خود یا اپنے نائب کے ذریعے انجام دینے پر قادر ہو، کیونکہ ولایت مقید بالنظر ہے اور خائن کو متولی بنانے میں وقف کا کوئی خیال نہیں ہے، کیونکہ یہ خیانت تولیت کے اصل مقصود ہی میں خلل کا باعث ہے۔ الخ۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: بظاہر یہ شرطِ اولویت ہے شرطِ صحت نہیں اور اگر متولی وقف فاسق ہوگیا تو وہ عزل کا مستحق ہوجائے گا لیکن خود معزول نہیں ہوگا، کیونکہ تولیتِ وقف قضاء سے اشرف نہیں ہے اور قضاء میں احتیاط بھی زیادہ کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود قضاء میں عدالت شرطِ اولیت ہے یہاں تک کہ فاسق کو قاضی بنانا صحیح ہے اور مفتی بہ قول کے مطابق قاضی فسق کی وجہ سے خود بخود معزول بھی نہیں ہوتا، یہی حکم ناظر وقف کا بھی ہونا چاہئے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۲۶) وكذا في الاسعاف (۴۹)

یہی بات علامہ شامیؒ نے بھی لکھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر قاضی کسی فاسق کو وقف کا متولی مقرر کردے گا تو وہ گناہگار بھی ہوگا۔[۱]

بہر حال احناف کی عبارات سے واضح ہے کہ عدالت ان کے نزدیک شرط اولویت ہے نہ کہ شرطِ صحت، مالکیہ کی عبارت میں ہمیں تلاشِ بسیار کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ملی لیکن بعض عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کا موقف بھی احناف کے قریب ہے۔

امام حطابؒ مالکی فقیہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ان الناظر على الحبس اذا كان سيىء النظر غير مأمون فان القاضي يعزله الا أن يكون المحبس عليه مالكا أمر نفسه ويرضى به ويستمر.[۲]

وقف کا متولی اگر تولیت کے اعتبار سے برا ہو اور غیر مامون ہو تو قاضی اسے معزول کردے گا، الا یہ کہ جن لوگوں پر یہ وقف کیا گیا ہے وہ معلوم ہوں اور اپنے امور کے مالک ہوں تو قاضی غیر مامون متولی کو معزول نہیں کرسکتا اگر یہ لوگ اس پر راضی ہیں اور اسی کو بطورِ متولی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

اس عبارت میں ایک تو غیر مامون اور غیر عادل متولی کے عزل کے لئے قاضی کو اختیار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فسق سے متولی خود بخود معزول نہیں ہوگا۔ اگر مالکیہ کے نزدیک عدالت شرط صحت ہوتی تو فسق کی وجہ سے متولی کو خود بخود معزول ہوجانا چاہئے تھا کیونکہ اس میں اہلیت نہیں رہی، دوسرے اگر موقوف علیہم متعین ہوں اور وہ اس غیر مامون متولی کو برقرار رکھنا چاہیں تو انہیں اس کا اختیار بھی ہے، معلوم ہوا کہ عدالت ان کے نزدیک شرطِ اولویت ہے ورنہ اگر یہ شرطِ صحت ہوتی تو فسق کے بعد متولی خود بخود معزول ہوجاتا اسے برقرار رکھنے کا اختیار موقوف علیہم کے پاس نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا تفصیل کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی و امام احمد رحمہما اللہ عدالت کو شرطِ صحت قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہ و امام مالک رحمہما اللہ اسے شرطِ اولویت قرار دیتے ہیں، ان میں سے کونسا موقف راجح ہے اس پر گفتگو سے پہلے ہم عدالت کے مفہوم پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ متولی کی عدالت سے کیا مراد ہے؟ اس کے بعد ہم ترجیح کے حوالہ سے گفتگو کریں گے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۰/۴)

(۲) الحطاب، ابو عبد الله محمد بن عبد الرحمن الحطاب، مواهب الجليل، بيروت، دار الفكر ۱۳۹۸ھ (۳۷/۶)

عدالت کا مطلب:

عادل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علی الاعلان گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے، صغائر پر اصرار نہ کرے مجموعی طور پر اس میں صلاح کا پہلو غالب ہو اور سلامتِ طبع پائی جاتی ہو۔ فقیہ النفس علامہ قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اتفقوا على ان الاعلان بكبيرة يمنع الشهادة وفى الصغائر ان كان معلنا نوع فسق مستشنع يسميه الناس بذالك فاسقا مطلقا لاتقبل شهادته، وان لم يكن كذلك ينظر ان كان صلاحه اكثر من فساده و صوابه اغلب من الخطاو يكون سليم القلب يكون عدلا تقبل شهادته لان غير المعصوم لايخلو عن قليل ذنب فيعتبر فيه الغالب. (۱)

علماء کا اتفاق ہے کہ کبیرہ کا علی الاعلان ارتکاب کرنا شہادت سے مانع ہے، اور صغائر میں اگر وہ کسی ایسے صغیرہ کا علی الاعلان ارتکاب کرتا ہو جسے لوگ شنیع سمجھتے ہوں اور اسے فاسق قرار دیتے ہوں تو اس کی شہادت بھی قبول نہیں، اگر یہ دونوں باتیں اس میں نہ ہوں تو دیکھا جائے گا کہ اس کی صلاح فساد پر اور صواب خطاء پر غالب ہو اور وہ سلیم القلب ہو تو اسے عادل قرار دیا جائے گا اور اس کی گواہی قبول ہوگی، کیونکہ غیر معصوم تھوڑے بہت گناہ سے خالی نہیں ہوتا اس لئے اس میں غالب کا اعتبار ہے۔

فقہ شافعی کی مشہور کتاب فتح المعین میں عدالت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

والعدالة تتحقق باجتناب كل كبيرة من انواع الكبائر ...... واجتناب اصرار على صغيرة او صغائر بان لاتغلب طاعاته صغائره. (۲)

عدالت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ کبائر سے اجتناب کیا جائے اور صغائر پر اصرار نہ کیا جائے کہ اس کے صغائر اس کی طاعات پر غالب آجائیں۔

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۲ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۴۶۰/۲)

(۲) الملیبار، زین الدین بن عبد العزیز الملیبار. فتح المعین بهامش اعانة الطالبین، بیروت، دار احیاء التراث العربی (۲۸۰/۴)

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں میں عدالت کا جو مفہوم ذکر کیا گیا ہے یہی مفہوم تقریباً اکثر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے مختلف تعبیرات کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ اس مفہوم کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جو شخص کسی بھی کبیرہ کا مرتکب ہو یا کسی بھی صغیرہ پر اصرار کرتا ہو اس میں عدالت کا تحقق نہیں ہوگا اور اسے وقف کا متولی یا تو بنایا نہیں جا سکتا یا بنانا بہتر نہیں ہے۔

علامہ رافعیؒ کے نزدیک عدالتِ متولی کا مفہوم:

لیکن علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمحتار پر اپنی تقریرات میں متولی کی عدالت کا مطلب یہ لکھا ہے کہ متولی متہم نہ ہو اور وقف کے مال میں اس کی خیانت کا خوف نہ ہو، علامہ لکھتے ہیں:

وشرط فی الاصل ان یکون الفاسق متهما مخوفا علیه فی المال اه قال فی المجتبیٰ لانه قد یفسق فی الافعال ویکون امینا فی المال. (۱)

اصل میں یہ شرط ہے کہ فاسق متولی وہ ہے جو کہ متہم ہو اس سے وقف کے مال پر اندیشہ ہو، مجتبیٰ میں اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ کبھی کوئی شخص افعال کے اعتبار سے تو فاسق ہوتا ہے لیکن مالی معاملات میں امین ہوتا ہے۔

علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ متولی کے عادل ہونے کے لئے یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ وہ مالی معاملات میں امانتدار ہو، اس کے بارے میں وقف کے مال ضائع کرنے یا اس میں خیانت کرنے کا اندیشہ نہ ہو، چنانچہ اگر ایک شخص میں بہت سے افعالِ فسقیہ پائے جاتے ہوں لیکن وہ امانتدار ہو تو اسے وقف کا متولی بنایا جا سکتا ہے۔

ترجیح:

جہاں تک عدالت کے شرطِ صحت یا شرطِ اولویت ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں فقہاء احناف و مالکیہ کا مذہب راجح معلوم ہوتا ہے کہ متولی کے لئے عدالت شرطِ اولویت ہے، کیونکہ قاضی کے لئے مفتیٰ بہ قول کے مطابق عدالت شرط نہیں ہے تو متولی جس کی ذمہ داریاں قاضی سے کم ہیں اس کے لئے عدالت بطریق اولیٰ شرط نہیں ہونی چاہئے۔

---

(۱) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۸۴/۴)

دوسری بات یہ ہے کہ اگر عدالت کو شرطِ صحت قرار دیں تو اس کا تقاضہ یہ ہوگا کہ اگر ابتداءً متولی عادل تھا لیکن کسی کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے اس کی عدالت ختم ہوگئی تو متولی شرطِ ولایت نہ پائے جانے کی وجہ سے خود بخود معزول ہوجائے گا۔ ایسی صورت میں فوری طور پر وقف کی نگرانی کون کرے گا؟ اگر یہ سابقہ متولی ہی کرے گا تو فسق کے بعد اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی، نیا متولی اتنی جلدی فوری طور پر مقرر کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا اور عدالت تو کسی بھی وقت ساقط ہوسکتی ہے، اگر اسے شرطِ صحت قرار دیا جائے تو وقف کے انتظام وانصرام میں خلل آنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں احناف و مالکیہ کا موقف راجح ہے کہ عادل شخص ہی کو متولی مقرر کرنا چاہئے اور اگر ابتداءً کسی فاسق کو متولی مقرر کیا جائے تو یہ باعثِ گناہ بھی ہے، اسی طرح اثناء تولیت اگر متولی کی عدالت ختم ہوجائے تو اسے معزول کرنا بھی قاضی کی ذمہ داری ہے لیکن ان تمام امور کے باوجود عدالت متولی کے لئے شرطِ صحت نہیں ہے کہ غیر عادل متولی کی تولیت منعقد ہی نہ ہو اور اثناءِ تولیت اگر عدالت ساقط ہوجائے تو وہ خود بخود معزول ہوجائے، اس میں بڑے مفاسد کا اندیشہ ہے۔

متولی میں عدالت کا کونسا مفہوم معتبر ہے:

یہ سوال رہ جاتا ہے کہ متولی میں عدالت کا وہ عمومی مفہوم معتبر ہے جو اکثر فقہاء کرامؒ نے ذکر کیا ہے یا وہ خاص مفہوم معتبر ہے جسے علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں احقر کی رائے یہ ہے کہ متولی میں عدالت کے عمومی مفہوم کے بجائے عدالت کا وہ خاص مفہوم شرطِ اولویت ہونا چاہئے جسے علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ امانتدار ہو اور وقف کے مال کے سلسلہ میں اس سے خیانت یا ضیاع کا اندیشہ نہ ہو، اس رائے کی وجہ ترجیح درج ذیل ہے:

فقہاء کرام کی بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن عہدوں اور ذمہ داریوں کے لئے عدالت کی شرط لگائی گئی ہے ان میں عدالت کی تفسیر کرتے ہوئے اس عہدہ اور ذمہ داری اور اس کے اصل مقصد کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، مثال کے طور پر مقدمات میں گواہی دینے کے لئے بھی گواہ کا عادل ہونا شرط ہے، اور اس شرط کا مقصد جھوٹ اور غلط بیانی کے امکان کو کم سے کم کرنا ہے، لہٰذا اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے علامہ قاضی خانؒ نے امام ابو یوسفؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

وعن أبي يوسفؒ ان كان الفاسق وجيها ذامروءة جازت شهادته لأن

مثله لایکذب. (۱)

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر فاسق ذی وجاہت اور ذی مروت ہو تو اس کی گواہی قبول کرنا درست ہے، کیونکہ اس جیسا وجیہ اور بامروت شخص جھوٹ نہیں بول سکتا۔

دیکھئے اس جزئیہ میں گواہی میں عدالت کی شرط کے مقصد کو ملحوظ رکھا گیا اور امام نے فرمایا کہ اس فاسق میں چونکہ کذب کا امکان نہیں ہے اس لئے اس کی گواہی قبول کی جا سکتی ہے۔ اس اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم متولی میں بھی عدالت کی شرط کے اصل مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے عدالت کی تشریح کریں، متولی وقف میں یہ شرط خیانت سے احتراز کرنے کے لئے لگائی گئی ہے۔ لہٰذا اگر متولی میں خیانت کا اندیشہ نہ ہو تو اس کے دیگر افعال فسقیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اور دیگر انتظامی خوبیوں کو سامنے رکھ کر اسے وقف کا متولی بنایا جا سکتا ہے اور وقف کا فائدہ بھی اسی میں ہے۔ شیخ ابوزہرہ محاضرات میں لکھتے ہیں:

فان رجلا قد جمع بين هدى الدين والعلم باحوال الدنيا نادر فى عصرنا يحتاج البحث عنه الى مثل مصباح ديو جنس الذى كان يبحث به عن الرجل، ان الرجال عندنا ثلاثة: رجل جائر قد انغمز فى الموبقات واحاطت به الخطيئات و اوغل فى الاثام، ورجل قد هذب الدين قلبه وقد تأدب بادابه وسلك مسلكه ولكنه غير اريب فى شؤن الدنيا غير خبير فى معاملات الناس، قد يغش فى البيعات ويخدع فى التصرفات و مثل هذا لايستطيع ان يدير ماله الخاص على الوجه الامثل فكيف يدير مال الوقف على سنن قويم و طريق مستقيم وان مثل هذا لايخشى على الوقف من ذمته ولكن يخشى عليه من آرائه فى ادارة الاوقاف و تصريفاته فيها، ورجل ثالث امين فى المال وعدل فى كل مايتعلق به لايمديده الى مال غيره ويرعى الامانة حق رعايتها، ولكنه يرتكب بعض مانهى عنه الدين ويقع فى بعض ماحظره عليه الشرع الحنيف وهو عليم بشؤن الدنيا خبير باحوال الحياة

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۲۹۵ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲/۴۶۰)

يعرف كيف يدير الاموال، ومثل هذا قد يكون من حظ بعض الاوقاف ان يكون في ادارتها، يستفيد من امانته المالية وحسن ادارته ولايضره ماقد يقع فيه مما حظره الدين ومنعه الشرع الحكيم، فلا مانع من ان يكون هذا مولى من قبل القاضي او الواقف على الاوقاف الخ. (۱)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عام طور پر تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں کچھ تو وہ ہیں جو گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں ان کے دن رات گناہوں میں بسر ہو رہے ہیں، ایسے لوگوں کو وقف کی تولیت ہرگز نہیں دی جاسکتی، کچھ لوگ وہ ہیں جو نہایت دین دار ہیں لیکن دنیا کے معاملات سے بے خبر ہیں، لین دین میں دھوکہ کھاتے ہیں یہ لوگ اپنے مال کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے تو وقف کے اموال کی حفاظت اور اس کا استعمال کیسے کریں گے؟ ان کی دیانت میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن وقف کی نگرانی اور اس کے تصرفات کے سلسلے میں ان پر اعتماد کرنا مشکل ہے۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو مالی لحاظ سے دیانتدار ہیں کسی کی مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن وہ بعض معاصی اور مناہی میں بھی مبتلا ہیں، یہ لوگ وقف کا انتظام و انصرام بھی بہتر انداز میں چلا سکتے ہیں، شیخ فرماتے ہیں کہ ہماری رائے میں وقف کی تولیت کے لئے اسی تیسرے درجہ کے آدمی کا انتخاب ہونا چاہئے جو امانتدار ہونے کے ساتھ ساتھ وقف کے انتظام و انصرام کی بہتر صلاحیت بھی رکھتا ہے اگر چہ وہ بعض معاصی میں بھی مبتلا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ فقہاء کرام نے عدالت کی جو عام تعریف کی ہے اس کی روشنی میں ایسا عادل متولی تلاش کرنا جو کہ کبائر سے اجتناب کرتا ہو صغائر پر اصرار نہ کرتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وقف کے انتظام و انصرام کی بھی اس میں صلاحیت ہونا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اس لئے تولیت وقف کے باب میں عدالت کا وہ مفہوم لینا بہتر ہے جو علامہ رافعیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ متولی امانتدار ہو اس سے وقف میں خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ متولی کے لئے عدالت کی شرط شرطِ اولویت ہے اور عدالت کا وہ مفہوم معتبر ہے جو علامہ رافعی رحمہ اللہ نے بیان کیا، لہٰذا ایسے شخص کو متولی وقف بنایا جاسکتا ہے جو افعال فسقیہ میں مبتلا ہو لیکن امانتدار ہو، اور وقف کے انتظام و انصرام کی اس میں بہترین صلاحیت ہو۔

---

(۱) ابوزهرة. محاضرات في الوقف، جامعة الدول العربية (۳۷۴)

۴۔ انتظامی صلاحیت (کفایہ)

چوتھی شرط متولی کے لئے یہ ہے کہ اس میں وقف کے انتظام و انصرام کی صلاحیت ہو، وہ وقف کو برقرار رکھنے کے انتظامات کر سکے اس کی آمدنی کی بہترین صورتیں اختیار کر سکے، آمدنی کا حساب کتاب رکھ سکے اور واقف کی بیان کردہ شرائط کی روشنی میں اس آمدنی کو واقف کے متعین کردہ مصرف میں خرچ کرنے کی اس میں بہترین صلاحیت موجود ہو، جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک تو یہ شرط شرطِ صحت ہے، لہٰذا اگر متولی میں انتظامی صلاحیت نہ ہو تو اس کی تولیت منعقد ہی نہیں ہوگی اور شرطِ صحت نہ پائے جانے کی وجہ سے اس کے تصرفات معتبر نہیں ہوں گے۔ شیخ محمد شربینی الخطیب فقیہ شافعی تحریر فرماتے ہیں:

وشرطه ايضا الكفاية وفسرها فى الذخائر بقوة الشخص وقدرته على التصرف فى ماهو ناظر عليه، فان اختلف احدهما (العدالة والكفاية) نزع الحاكم الوقف منه وان كان المشروط له النظر الواقف.[1]

متولی کے لئے کفایہ بھی شرط ہے اس کی تفسیر ذخائر میں یہ کی گئی ہے کہ جس چیز کا اسے متولی مقرر کیا گیا ہے اس میں تصرف کی اسے قدرت اور قوت حاصل ہے، اگر عدالت یا کفایت میں سے کوئی شرط مفقود ہوگی تو حاکم وقف اس کو لے لے گا اگرچہ وہ خود واقف ہی کیوں نہ ہو۔

حنبلی فقیہ علامہ مرداوی تصحیح الفروع میں لکھتے ہیں:

اعلم انه يشترط فى الناظر الاسلام والتكليف والكفاية فى التصرف والخبرة به والقوة عليه.[2]

متولی کے لئے اسلام، مکلّف ہونا اور وقف میں تصرف کی قدرت، اس کا تجربہ اور اس کی قوت ہونا ضروری ہے۔

احناف کے نزدیک متولی میں انتظامی صلاحیت ہونا یہ شرط اولویت ہے یعنی بہتر ہے کہ متولی میں وقف کے امور کی انجام دہی کی صلاحیت موجود ہو، اگر یہ صلاحیت متولی میں نہ ہو اور پھر بھی اسے وقف کا متولی مقرر کر دیا جائے تو بہر حال اس کی تولیت منعقد ہو جائے گی۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) الشربينى، الشيخ محمد الشربينى. مغنى المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربى (۳۹۳/۲)

(۲) المرداوى، ابو الحسن على بن سليمان المرداوى ۸۸۵ھ. تصحيح الفروع بهامش كتاب الفروع، بيروت، عالم الكتب، الطبعة الرابعة ۱۹۸۵م (۵۹۴/۴)

لا یولی الا امین قادر بنفسه أو بنائبه لان الولایة مقیدة بشرط النظر ولیس من النظر تولیة الخائن لانه یخل بالمقصود و کذا تولیة العاجز لان المقصود لایحصل به. [1]

متولی ایسے شخص کو بنایا جائے جو امانتدار ہو اور وقف کے امور خود یا اپنے نائب کے ذریعہ انجام دینے پر قادر ہو، کیونکہ وقف پر ولایت میں شرطِ نظر ملحوظ ہے اور خائن کو متولی بنانا نظر اور شفقت کے خلاف ہے۔ اسی طرح عاجز شخص کو متولی بنانا بھی نظر اور شفقت کے خلاف ہے کیونکہ اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

علامہ ابن نجیمؒ یہ عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

والظاهر انها شرائط الاولویة لاشرائط الصحة. [2]

ظاہر یہ ہے کہ یہ شرائط (عدالت و کفایۃ) شرائطِ اولویت ہیں نہ کہ شرائطِ صحت۔

علامہ ابن عابدینؒ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ [3]

۵۔ اسلام:

پانچویں اور آخری شرط متولی کے لئے اسلام ہے، مسلمانوں کے اوقاف کا کسی غیر مسلم کو متولی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

جمہور فقہاء شوافع و حنابلہ اس شرط کے قائل ہیں۔ [4] جمہور احناف کے نزدیک متولی کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے اسعاف کے حوالہ سے اس کی صراحت کی ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۴۹)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۶/۵)

(۳) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۰/۴)

(۴) دیکھئے: المرداوی، ابو الحسن علی بن سلیمان المرداوی ۸۸۵ھ. تصحیح الفروع بهامش کتاب الفروع، بیروت، عالم الکتب، الطبعة الرابعة ۱۹۸۵ء (۵۹۴/۴)

ولا تشترط الحرية والاسلام للصحة. [1]

تولیت کی صحت کے لئے اسلام اور حریت شرط نہیں ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی وضاحت کی ہے۔[2] اور اس سلسلہ میں احناف کا اصل ماخذ اسعاف کی درج ذیل عبارت ہے:

ولو أوصىٰ الى صبى تبطل فى القياس مطلقا وفى الاستحسان هى باطلة مادام صغيرا فاذا كبر تكون الولاية له، وحكم من لم يخلق من ولده و نسله فى الولاية كحكم الصغير قياسا واستحسانا ولو كان ولده عبدا يجوز قياسا واستحسانا لاهليته فى ذاته بدليل ان تصرفه الموقوف لحق المولىٰ ينفذ عليه بعد العتق لزوال المانع بخلاف الصبى، والذمى فى الحكم كالعبد، فلو اخرجهما القاضى ثم اعتق العبد وأسلم الذمى لاتعود الولاية اليهما. [3]

لیکن علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ انقرویہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں کے اوقاف کے متولی کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے، لکھتے ہیں:

فى منهوات الانقروية: هٰذا يدل على ان تولية الذمى على المسلمين حرام لاينبغى اتباع شرط الواقف فيها. [4]

انقرویۃ میں ہے کہ اسعاف کی اس عبارت سے تو ذمی کی تولیت کا صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے، مناسب یہ ہے کہ یہ ذمی کے وقف کے ساتھ خاص ہو، ذمی کو مسلمانوں پر تولیت دینا حرام ہے، اس سلسلہ میں واقف کی شرط کا اتباع بھی نہیں کرنا چاہئے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۲۶/۵)

(۲) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۱/۴)

(۳) الطرابلسى، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۵۲)

(۴) الرافعى، عبد القادر الرافعى. تقريرات الرافعى ملحق برد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى (۸۴/۴)

ترجیح:

راجح جمہور اور علامہ رافعیؒ کا موقف ہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کو مسلمانوں کے اوقاف کا متولی مقرر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مسلمانوں کے اوقاف تو ہمیشہ جہاتِ خیر ہی پر وقف ہوتے ہیں اور اس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے کہ مساجد تعمیر کی جائیں، اسی طرح مسلمان فقراء کی معاشی حالت بہتر ہو۔ ظاہر ہے اگر کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کے اوقاف کا متولی مقرر کردیا جائے تو اسے ان مذکورہ بالا مصارف و امور سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، جبکہ اس سے تو اس کے خلاف کا اندیشہ ہے، اس لئے غیر مسلم کو مسلمانوں کے اوقاف کا متولی مقرر کرنا مصلحت کے عین خلاف معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ متولی میں پانچ بنیادی شرائط پائی جانی چاہئیں:

۱۔ عقل　۲۔ بلوغ　۳۔ عدالت　۴۔ انتظامی صلاحیت　۵۔ اسلام

ان میں سے شروع کی دو شرطیں اور آخری شرط تو شرطِ صحت ہیں کہ ان کے بغیر کوئی متولی بن ہی نہیں سکتا، جبکہ عدالت اور انتظامی صلاحیت کی شرط شرطِ اولویت ہیں کہ ان کا خیال رکھنا بہتر ہے۔

متولی کی ذمہ داریاں اوراس کے اختیارات وتصرفات

متولی کی ذمہ داریاں اوراس کے اختیارات کیا کیا ہیں؟ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور حقیقت میں اس کا احاطہ بھی ممکن نہیں کیونکہ موقع محل اور وقت کی مناسبت سے اس کی ذمہ داریوں اور اختیارات میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے اور کمی بھی آسکتی ہے۔

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس موقع پر عام طور پر اس کی ذمہ داریوں اور اختیارات کے لئے بنیادی اصول بیان کردیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں مختلف حالات اور مواقع میں متولی کے فرائض، ذمہ داریوں اور اختیارات کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ علامہ برہان الدین طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ویتحری فی تصرفاته النظر للوقف والغبطة لأن الولایة مقیدة به.[١]

متولی اپنے تصرفات میں وقف کی بہتری اور فلاح کو پیش نظر رکھے کیونکہ ولایت اس شرط کے ساتھ مقید ہے۔

علامہ شامیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں:

انما یحل للمتولی الاذن فیما یزید الوقف به خیراً.[٢]

متولی کے لئے ایسی چیز کی اجازت دینا جائز ہے جس سے وقف میں مزید بہتری آئے۔

علامہ ابن نجیمؒ جامع انداز میں متولی کی ذمہ داریوں واختیارات کے سلسلہ میں اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأما بیان ماعلیه من العمل فحاصل ماذکره الخصاف أن مایجعله

---

(١) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ١٣٢٠ھ (٥٦)

(٢) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ١٤٠٦ھ (٤/٤٥٤)

الواقف للمتولی لیس له حد معین، انما هو علی ماتعارفه الناس من الجعل عند عقدة الوقف لیقوم بمصالحه من عمارة واستغلال و بیع غلات و صرف ماجتمع عنده فیما شرطه الواقف ولایکلف من العمل بنفسه الامثل مایفعله أمثاله ولا ینبغی له أن یقصر عنه.[1]

متولی کے ذمہ کیا کیا کام ہیں؟ امام خصافؒ نے جو ذکر کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ متولی کے اختیار کی کوئی خاص تحدید نہیں ہے، یہ عرف پر مبنی ہے کہ عام طور پر واقف متولی مقرر کرتے وقت جو ذمہ داریاں متولی کے سپرد کرتے ہیں وہ سب متولی کے فرائض میں داخل ہوں گی، مثلاً اس کی تعمیر، اس کی آمدنی کی صورتیں اختیار کرنا، اس کے محصولات کو فروخت کرنا اور جو آمدنی جمع ہے اسے واقف کے بیان کردہ مصارف پر خرچ کرنا یہ سب اس کی ذمہ داریاں ہیں اور متولی اسی قدر کاموں کا مکلّف ہے جتنا اس جیسے دیگر متولی کرتے ہیں اس میں کوتاہی کرنا مناسب نہیں ہے۔

ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کرامؒ نے متولی کی کچھ بنیادی ذمہ داریوں اور اختیارات کی تفصیلات تحریر کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ کچھ امور ایسے ہیں جن کا انجام دینا متولی کے لئے ضروری ہے اور یہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہیں اور کچھ امور ایسے ہیں جنہیں انجام دینا اس کے لئے جائز اور مباح ہے، وقف کی بہتری کو سامنے رکھتے ہوئے اسے فیصلہ کرنے کا اختیار ہے، اور کچھ امور ایسے ہیں جنہیں انجام دینا اس کے لئے جائز ہی نہیں ہے، ذیل میں ہم ترتیب وار تینوں طرح کے امور کی تفصیلات لکھ رہے ہیں لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ محض بطور مثال لکھے جا رہے ہیں ان میں انحصار سمجھنا غلط فہمی ہوگا، البتہ ذکر کردہ مثالوں کی روشنی میں ان صورتوں کا حکم معلوم کیا جا سکتا ہے جو جدید ہیں اور فقہاء کرامؒ نے ان سے تعرض بھی نہیں کیا۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/ ۲۴۳) مزید دیکھئے: احکام الاوقاف للخصاف (۲۹۶)

وہ امور جنہیں انجام دینا متولی کے لئے ضروری ہے

ا۔ تعمیرِ وقف:

متولی کی سب سے پہلی ذمہ داری وقف کی تعمیر ہے، اس پر تقریباً تمام فقہاء کرامؒ کا اتفاق ہے۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

أول مایفعله القیم فی غلة الوقف البداء ة بعمارته وأجرة القوام وان لم یشرطها الواقف نصالشرطه ایاها دلالة لأن قصده منه وصول الثواب الیه دائما ولا یمکن ذلک الابها. [1]

وقف کی آمدنی سے سب سے پہلا کام اس کی تعمیر اور اس کے ملازمین کی اجرت کی ادائیگی ہے، اگرچہ واقف نے صراحۃً اس کی شرط نہ لگائی ہو، کیونکہ دلالۃً یہ شرط موجود ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ واقف کا مقصود یہ ہے کہ اسے ہمیشہ وقف کا ثواب ملتا ہے اور یہ تعمیر وغیرہ کے بغیر ممکن نہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والحاصل مماتقرر وتحرر أنه یبدأ بالتعمیر الضروری حتی لو استغرق جمیع الغلة صرفت کلها الیه ولا یعطی لأحد ولو اماما أو مؤذناً. [2]

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۵۶) و کذا فی البحر الرائق (۲۳۴/۵)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۷۰/۴)

جو کچھ لکھا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے وقف کی ضروری تعمیر کی جائے گی یہاں تک کہ اگر پوری آمدنی اسی میں صرف ہو جائے تو کر دی جائے گی اور کسی کو کچھ نہ دیا جائے گا خواہ وہ امام ہو یا مؤذن۔

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

لایخفی انه لو احتیج قطع الکل للعمارة الضروریة قدمت علی جمیع الجهات اذ لیس من النظر خراب المسجد لأجل الامام والمؤذن. [1]

اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ اگر ضروری تعمیر کی وجہ سے دیگر تمام جہات کو وقف کی آمدنی نہ دینی پڑے تو تعمیر ہی کو مقدم رکھا جائے گا امام اور موذن کی وجہ سے مسجد کو ویران کر دینا کوئی عقلمندی نہیں۔

حتی کہ اگر واقف وقف کرتے وقت یہ صراحت بھی کر دے کہ وقف کی تعمیر کو دیگر ضروریات پر مقدم نہ رکھا جائے تو بھی اس کی بات اور شرط کا اعتبار ہرگز نہیں کیا جائے گا اور تعمیر وقف کو بقیہ تمام امور پر مقدم ہی رکھا جائے گا۔ التاج والاکلیل میں ہے:

لو شرط الواقف مایجوز أن یبدأ من غلتها بمنافع أهله ویترک اصلاحماینخرم منه بطل شرطه. [2]

اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ وقف کی آمدنی سے موقوف علیہم کو فائدہ پہنچایا جائے اور وقف کی عمارت کا جو حصہ گر جائے اس کی مرمت نہ کی جائے تو یہ شرط باطل ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو شرط استواء العمارة بالمستحقین لم یعتبر شرطه وانما تقدم علیهم. [3]

اگر واقف نے عمارت کو مستحقین کے ساتھ برابر رکھنے کی شرط لگائی تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، تعمیر کو مستحقین پر مقدم رکھا جائے گا۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۸/۴)

(۲) التاج والاکلیل بحواله احکام الوقف للکبیسی (۱۸۹/۲)

(۳) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباه والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۱۲۱/۲)

وقف کی تعمیر کو سب پر مقدم رکھنے کی وجہ علامہ ابن الہمامؒ یہ بیان فرماتے ہیں:

لأن الغرض لكل واقف وصول الثواب مؤبداً و ذلك بصرف الغلة مؤبداً ولا يمكن ذلك بلا عمارة فكانت العمارة مشروطة اقتضاءً[1]

ہر واقف کا ارادہ یہی ہوتا ہے کہ اسے ہمیشہ وقف کا ثواب ملتا رہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ وقف کی آمدنی ہمیشہ وقف کے مصرف پر خرچ کی جاتی رہے اور یہ تعمیر کے بغیر ممکن نہیں اس لئے تعمیر کی شرط اقتضاءً واقف کی طرف سے مانی جائے گی۔

تعمیر سے کیا مراد ہے؟

یہاں یہ واضح کرنا مناسب ہے کہ تعمیر جو متولی کی پہلی ذمہ داری ہے اس سے مراد یہ ہے کہ واقف کی وقف کردہ چیز کو باقی رکھنا اور اس نے جس حالت میں وہ چیز وقف کی تھی اسے اس حالت میں برقرار رکھنا اور اس کے لئے ضروری تدابیر بروئے کار لانا۔

مثال کے طور پر اگر گھر وقف کیا تو متولی کی ذمہ داری ہے کہ اس کی ضروری تعمیر ومرمت کا خیال رکھے تاکہ یہ گھر ہمیشہ باقی رہ سکے اور واقف کے لئے صدقہ جاریہ رہے، نیز اس گھر پر جو حکومتی ٹیکس وغیرہ واجب الاداء ہیں ان کی ادائیگی بھی تعمیر وقف میں داخل ہے۔

اسی طرح اگر زرعی زمین وقف کی تو اسے قابل کاشت بنانا اور اس میں پیداواری صلاحیت برقرار رکھنے کی کوشش کرنا یہ بھی تعمیر وقف ہی کی صورت ہے اور متولی کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

البتہ موقوفہ چیز میں مزید بہتری لانا اور واقف نے جس حالت میں وقف کیا تھا اس میں مزید اضافہ کرنا یہ متولی کی ذمہ داری نہیں ہے، وقف کی آمدن اور مصارف کو دیکھتے ہوئے اسے مناسب حال فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

انما يستحق العمارة عليه بقدر مايبقى الموقوف على الصفة التي وقفه وان خرب يبنى على ذلك الوصف ...... لأن الصرف الى العمارة ضرورة ابقاء الوقف ولا ضرورة في الزيادة.[2]

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸٦۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۴) وكذا فى المبسوط للسرخسى (۱۲/۳۲)

(۲) المرغيناني، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۵) مزید دیکھئے: الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰٦ھ (۴/۳٦٦)

وقف کی اس قدر تعمیر ضروری ہے کہ وقف اس حالت پر برقرار رہے جس پر اسے واقف نے وقف کیا تھا، اگر اسے کچھ نقصان پہنچ جائے تو اسی قدر تعمیر کی جائے گی، کیونکہ تعمیر پر خرچ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ وقف باقی رہ سکے اور زائد تعمیر میں یہ ضرورت نہیں پائی جارہی اس لئے وہ ضروری نہیں ہوگی۔

وقف کے تعمیری اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں گے؟

وقف کی تعمیر پر ہونے والے اخراجات متولی کہاں سے پورے کرے گا؟ وقف کی مختلف صورتوں میں ان اخراجات کی مدات مختلف ہیں ہم یہاں اس کی اہم صورتیں ذکر کر رہے ہیں:

۱۔ اگر واقف نے وقف کی تعمیر کے لئے خود کوئی رقم مختص کی ہو تو وقف کی تعمیر مختص رقم سے کی جائے گی۔ علامہ رملیؒ لکھتے ہیں:

فی الروض وشرحه نفقة الموقوف ومؤنة تجهيزه وعمارته من حيث شرطت شرطها الواقف من ماله أو من مال الوقف. (۱)

روض اور اس کی شرح میں ہے کہ موقوف کے اخراجات اور اس کی تعمیر کا خرچہ اس جگہ سے پورا کیا جائے گا جس کی واقف نے صراحت کی ہو خواہ اپنے مال سے یا وقف کے مال سے۔

علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

ونفقه الوقف من حيث شرط الواقف لأنه لما اتبع شرطه فی تسبيله وجب اتباع شرطه فی نفقته. (۲)

وقف پر وہاں سے خرچ کیا جائے گا جہاں سے خرچ کرنے کی واقف نے ہدایت کی ہو، کیونکہ وقف کرنے میں جب واقف کی ہدایات پر عمل کیا جاتا ہے تو اخراجات کے سلسلہ میں بھی اس کی ہدایات پر عمل کیا جائے گا۔

---

(۱) الرملی، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدين الرملی. نهاية المحتاج، بيروت، دار احياء التراث العربی (۳۹۷/۵)

(۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنی، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۸/۸)

۲۔ واقف نے تو تعمیر کے لئے کوئی رقم مختص نہیں کی اور اس سلسلہ میں کسی خاص مد کی صراحت بھی نہیں کی لیکن وقف کی نوعیت یہ ہے کہ اس کی ذرائع آمدنی ہیں، مثال کے طور پر گھر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ اسے کرایہ پر دیا جائے اور حاصل ہونے والا کرایہ فقراء میں تقسیم کیا جائے یا زرعی زمین اس صراحت کے ساتھ وقف کی کہ اسے کاشت کیا جائے اور حاصل ہونے والی پیداوار فقراء میں تقسیم کی جائے تو ان تمام صورتوں میں وقف کی تعمیر وقف کی آمدنی سے ہوگی، حاصل ہونے والی آمدن سے پہلے وقف کی ضروری تعمیر کی جائے گی پھر اگر کچھ باقی بچے گا تو وہ مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا۔

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

فان لم يمكن فمن غلته لأن الوقف اقتضى تحبيس اصله و تسبيل نفعه ولا يحصل ذلك الا بالانفاق عليه فكان ذلك من ضرورته. (۱)

اگر واقف نے اخراجات کے سلسلہ میں کوئی مد متعین نہ کی ہو تو وقف کی آمدنی سے اس کی تعمیر کی جائے گی، کیونکہ وقف کا تقاضہ ہے کہ اصل چیز باقی رہے اور اس کے منافع خرچ ہوتے رہیں اور یہ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ اصل وقف پر اس کی آمدنی خرچ کی جاتی رہے۔

اور وقف کی اس نوعیت میں اگر واقف نے وقف کرتے وقت یہ صراحت کر دی تھی کہ وقف کی تعمیر کو دیگر مصارف پر مقدم رکھا جائے تو ایسی صورت میں نہ یہ کہ وقف کی آمدنی سے سب سے پہلے اس کی ضروری تعمیر کی جائے گی بلکہ آئندہ پیش آنے والی ممکنہ تعمیری ضروریات کے لئے بھی اس حاصل ہونے والی آمدنی سے بقدرِ ضرورت محفوظ رکھا جائے گا۔ الأشباہ والنظائر میں ہے:

ان الواقف اذا شرط تقديم العمارة ثم الفاضل منها للمستحقين كماهو الواقع فى أوقاف القاهرة فانه وجب على الناظر امساك قدر مايحتاج اليه للعمارة فى المستقبل وان كان الأن لايحتاج الموقوف الى العمارة على القول المختار للفقيه و على هذا فيفرق بين اشتراط تقديم العمارة فى كل سنة والسكوت عنه فانه مع السكوت تقدم

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ، المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۸/۸) و كذا فى نهاية المحتاج (۳۹۷/۵)

العمارة عند الحاجة اليها ولا يدخر لها عند عدم الحاجة اليها و مع الاشتراط تقدم عند الحاجة و يدخر لها عند عدمها ثم يفرق الباقي. (۱)

اگر واقف نے وقف کی تعمیر کو مقدم رکھنے کی شرط لگائی اور جو اس سے بچے اسے مستحقین میں خرچ کرنے کی ہدایت کی تو متولی کے لئے ضروری ہے کہ وقف کی مستقبل کی تعمیری ضرورت کے لئے بھی آمدنی بچا کر رکھے اگرچہ فی الحال وقف کی تعمیر کی ضرورت نہ ہو، فقیہ ابو اللیث کا قول مختار یہی ہے، اس سے وقف کی تعمیر کو مقدم کرنے کی شرط لگانے اور اس سے خاموش رہنے میں فرق معلوم ہو گیا کہ اگر واقف نے اس شرط سے سکوت اختیار کیا تو بوقت ضرورت وقف کی تعمیر کی جائے گی لیکن آئندہ کی ضرورت کے لئے کچھ بچا کر نہیں رکھا جائے گا اور اگر تقدیم کی شرط لگائی تو تعمیر کو ضرورت کے وقت مقدم تو رکھا ہی جائے گا آئندہ کے لئے بھی اس آمدنی میں سے بقدر ضرورت بچا کر رکھا جائے گا، پھر جو بچے گا اسے مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا۔

اس عبارت سے یہ واضح ہے کہ واقف نے وقف کرتے وقت اگر واقف کی آمدنی سب سے پہلے اس کی تعمیر پر خرچ کرنے کی صراحت نہیں کی تھی تو بھی اس کی آمدنی سے سب سے پہلے اس کی تعمیر اور ضروری مرمت کا انتظام کیا جائے گا اور اگر وقف کرتے وقت تعمیر کو مقدم رکھنے کی صراحت کر دی تھی تو ایسی صورت میں صرف یہ کہ تعمیر کو مقدم رکھا جائے گا بلکہ آئندہ کی ممکنہ ضروریات کے لئے بھی اس آمدنی میں سے بقدر ضرورت پس انداز رکھا جائے گا اس کے بعد اگر کچھ بچے گا تو وہ دیگر مستحقین میں تقسیم کیا جائے گا۔

۳۔ وقف کی تیسری نوعیت یہ ہے کہ واقف نے کچھ مخصوص لوگوں کو اس وقف کے عین اور اس کی ذات سے انتفاع کا حق دیا ہو جیسا کہ گھر وقف کیا اور موقوف علیہم کو اس میں رہنے کا حق دیا یا دوکان وقف کی اور موقوف علیہم کو اس میں کاروبار کرنے کا حق دیا تو ایسے وقف میں اگر تعمیر کی ضرورت پیش آئے گی تو جو لوگ اس میں رہ رہے ہیں اور اس سے براہ راست فائدہ حاصل کر رہے ہیں انہی پر تعمیری اخراجات بھی لازم ہوں گے، اور اگر وہ یہ اخراجات ادا نہ کریں تو متولی وقف ان سے یہ اوقاف خالی کرائے گا اور انہیں یا کسی اور کو کرایہ پر دے گا جو کرایہ حاصل ہو گا اس سے اس کی تعمیر کروائی جائے گی، تعمیر مکمل ہونے کے بعد یہ موقوف علیہم کو دوبارہ انتفاع کے لئے دیئے جائیں گے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم، الاشباه والنظائر، كراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/۱۳۰)

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ولو كان الموقوف دارا فعمارته على من له السكنى ولو متعددا منْ ماله لامن غلته اذ الغرم بالغنم ولم يزد في الاصح يعني انما تجب العمارة عليه بقدرة الصفة التي وقفها الواقف ولو أبى من له السكنى أو عجز لفقره عمر الحاكم أي اجرها الحاكم منه أو من غيره وعمرها بأجرتها. [1]

اگر موقوف چیز گھر پر ہوتو اس کی تعمیر اس پر ہوگی جو اس میں رہائش پذیر ہو اگر چہ وہ کئی ہوں وقف کی آمدن سے تعمیر نہیں کی جائے گی کیونکہ جو فائدہ حاصل کر رہا ہے اخراجات بھی اسے برداشت کرنے چاہئیں۔ البتہ یہ تعمیر اس قدر ہوگی کہ واقف نے جس حالت میں یہ گھر وقف کیا تھا اس حالت پر وہ برقرار رہے اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا، اور اگر رہائش پذیر شخص تعمیر سے انکار کرے یا فقر کی وجہ سے عاجز آجائے تو حاکم یہ گھر اسے یا کسی اور کو کرایہ پر دے گا اور جو کرایہ حاصل ہوگا اس سے اس کی تعمیر کی جائے گی۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ جہتِ عامہ اور عام لوگوں کے مفاد کے لئے کوئی چیز وقف کی گئی ہے جیسے مسجد، مسافر خانہ، کنواں، پانی کی سبیل وغیرہ، اگر ان اوقاف میں ضروری تعمیر کی حاجت ہو تو سب سے پہلے تو ان اوقاف کی ملکیت میں موجود آمدنی سے ان کی تعمیر کی جائے گی، جیسے مسجد وغیرہ میں لوگ چندہ دیتے ہیں یا مسجد کے مصارف پورے کرنے کے لئے لوگ مستقل جائیدادیں وقف کر دیتے ہیں ان جائیداد کی آمدنی اور چندہ سے حاصل ہونے والی رقم مسجد کی ملکیت ہے اس سے مسجد کی تعمیر کی جائے گی۔

اور اگر ان رفاہی اوقاف کی آمدنی نہ ہو تو ان میں سے جن اوقاف کو کرایہ پر دینا شرعاً جائز ہے اور کرایہ پر دینا ممکن بھی ہے جیسے مسافر خانہ، ہسپتال وغیرہ تو انہیں کرایہ پر دیدیا جائے گا اور جو کرایہ حاصل ہوگا اس سے ان کی ضروری تعمیر کر کے دوبارہ کارآمد اور قابل انتفاع بنایا جائے گا اور پھر کرایہ داری کا معاملہ ختم کر کے عام لوگوں کو ان سے انتفاع کی اجازت دی جائے گی۔

---

[1] الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ /۳۷۳)

علامہ اندریتیؒ لکھتے ہیں:

وفی النوادر: اذا بنی خانا واحتاج الی المرمة روی عن محمد أن یعزل منها ناحیة بیتاً او بیتین فیؤاجر و ینفق من غلتها علیها وروی عن محمد روایة اخری انه یؤذن للناس بالنزول فیه سنة ویؤاجر سنة أخری ویرم من اجرته مااسترم منها. (۱)

نوادر میں ہے کہ اگر کسی شخص نے مسافر خانہ بنایا اور اسے مرمت کی ضرورت پیش آ گئی تو امام محمدؒ سے یہ مروی ہے کہ اس کے ایک یا دو کمروں کو الگ کیا جائے اور انہیں کرایہ پر دیدیا جائے حاصل ہونے والے کرایہ سے اس کی مرمت کی جائے، ایک دوسری روایت میں امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک سال لوگوں کو اس میں مفت رہنے کی اجازت دی جائے اور ایک سال اسے کرایہ پر دیا جائے، حاصل ہونے والے کرایہ سے اس کی مرمت کرائی جائے۔

البتہ جن اوقاف کو کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا جیسے مسجد وغیرہ تو ان کی تعمیر کے لئے یہ صورت اختیار نہیں کی جاسکتی۔تاتارخانیہ ہی میں ہے:

اذا اراد انسان أن یتخذ تحت المسجد حوانیت غلة لمرمة المسجد أو فوقه لیس له ذلک. (۲)

اگر کوئی شخص مسجد کے نیچے یا اوپر دو کانیں بنانا چاہے کہ اس کی آمدنی سے مسجد کی تعمیر و مرمت کی جائے تو یہ جائز نہیں ہے۔

اگر رفاہی اوقاف کو اجارہ پر دے کر بھی آمدنی کا حصول ممکن نہ ہو تو ان کی تعمیر کے لئے تیسرا اقدام یہ کیا جائے گا کہ متولی قاضی کی اجازت سے ان کے لئے قرض لے گا اور قرض کی ذریعہ ان کی تعمیر کروائے گا اور جب ان کی ذاتی آمدنی کچھ جمع ہو جائے گی تو قرض کی ادائیگی کردی جائے گی۔

الدرالمختار میں ہے:

لاتجوز الاستدانة علی الوقف الا اذا احتیج الیها لمصلحة الوقف

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۷۶۷ و ۷۵۲)

(۲) حواله بالا (۵/۸۴۳)

کتعمير و شراء بذر فيجوز بشرطين الاول: اذن القاضى فلو ببعد منه يستدين بنفسه، الثانى: أن لاتيسر اجارة العين والصرف من أجرتها. (۱)

وقف کے لئے قرض لینا جائز نہیں الا یہ کہ وقف کی مصلحت مثلاً تعمیر یا زرعی زمین کے لئے بیج خریدنے کی ضرورت پیش آجائے تو یہ قرض لینا جائز ہے دو شرطوں کے ساتھ، پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی سے اجازت لی جائے، البتہ اگر قاضی دور ہو تو متولی خود بھی لے سکتا ہے، دوسری شرط یہ ہے کہ اس موقوفہ چیز کو کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرنا اور اس سے اس کی تعمیر کرانا ممکن نہ ہو۔

یہ قرض ذاتی طور پر بھی کسی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور دیگر اوقاف جن کے پاس زائد آمدنی ہو ان سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ (۲)

اور اگر قرض کا حصول بھی ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ بیت المال سے ان اوقاف کی ضروری تعمیر کرے کیونکہ بیت المال بھی عام مسلمانوں کے مفاد کے لئے ہے اور ان اوقاف کی بقاء میں بھی عام لوگوں کا فائدہ ہے۔ المہذب میں ہے:

وان لم يكن له (اى الوقف) غلة فعلى القولين ان قلنا انه لله تعالىٰ كانت نفقته فى بيت المال كا الحر المعسر الذى لاكسب له وان قلنا للموقوف عليه كانت نفقته عليه. (۳)

اگر وقف کی آمدنی نہ ہو تو پھر دو قول ہیں: اگر ہم یہ کہیں کہ وقف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے تو اس کا خرچہ بیت المال پر ہونا چاہئے جیسے تنگدست آزاد آدمی جس کے پاس کوئی کمائی کا ذریعہ نہ ہو اس کا خرچہ بیت المال پر ہوتا ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ وقف موقوف علیہم کی ملکیت ہے تو اس کا خرچہ ان پر ہونا چاہئے۔

اور یہ بات پہلے ثابت کی جا چکی ہے کہ راجح قول کے مطابق وقف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہوتا ہے لہٰذا اس کی آمدنی نہ ہونے کی صورت میں اس کی تعمیر کا خرچہ بیت المال کو برداشت کرنا چاہئے، اور اگر بیت المال

---

(۱) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۹)

(۲) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۸۸۰)

(۳) الشيرازى، الامام ابو اسحاق الشيرازى. المهذب، مصر، عيسىٰ البابى (۱/۴۴۵)

کے ذریعہ حکومت ان رفاہی اوقاف کی ضروری تعمیر نہ کرے اور ان کے ویران ہونے اور معطل ہونے کا اندیشہ ہو تو احقر کی رائے میں ایسی صورت میں دیگر رفاہی اوقاف جن کے پاس ضرورت سے زائد آمدنی ہو ان کی آمدنی سے ان اوقاف کی ضروری تعمیر کروائی جائے گی تا کہ یہ آباد رہیں اور لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ اس موقف کی تائید درج ذیل جزئیات سے ہوتی ہے:

علامہ ابن قدامہؒ المغنی میں تحریر فرماتے ہیں:

وما فضل من حصر المسجد و زيته ولم يحتج اليه جاز أن يجعل في مسجد آخر أو يتصدق من ذلک علی فقراء جیرانه وغيرهم وكذالک ان فضل من قصبه أو شيء من نقضه قال احمد: في مسجد بني فبقي من خشبه أو قصبه أو شيء من نقضه فقال: يعان في مسجد اخر، وقال المروزي: سألت ابا عبد الله عن بواري المسجد اذا فضل منه الشيئی أو الخشبة قال: يتصدق به وأرى انه قد احتج بكسوة البيت اذا تخرقت تصدق بها. وقال في موضع اخر: قد كان شيبة يتصدق بخلقان الكعبة الخ. (۱)

مسجد کی چٹائی اور تیل میں سے جو بچ جائے اور اس کی ضرورت نہ رہے تو اسے دوسری مسجد میں صرف کرنا یا مسجد کے پڑوس میں موجود فقراء پر صدقہ کرنا جائز ہے یہی حکم مسجد کے بانس اور ملبہ کا بھی ہے، امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ ایک مسجد کی تعمیر کی گئی کچھ لکڑی اور ملبہ بچ گیا اس کا کیا کیا جائے؟ امام نے فرمایا کہ اسے دوسری مسجد میں خرچ کر دیا جائے، مروزی کہتے ہیں میں نے ابوعبداللہ سے مسجد کی فاضل چٹائی اور فاضل لکڑی کے بارے میں پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ اسے صدقہ کیا جائے میرا خیال ہے کہ انہوں نے کعبہ کے غلاف سے استدلال کیا کہ جب وہ پرانا ہو جاتا ہے تو اسے صدقہ کر دیا جاتا ہے شیبہ کعبہ کے پرانے غلاف صدقہ کر دیا کرتے تھے۔

---

(۱) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسي ۵۴۱. ۶۲۰ھ. المغني، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۸/۲۲۵)

فتاویٰ تتارخانیہ میں ہے:

والصحيح من مذهب أبى يوسف فى فصل الحصير انه لايعود الى ملك صاحبه بخراب المسجد بل يحول الى مسجد اخر أو يبيعه قيم المسجد للمسجد.[1]

امام ابو یوسفؒ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ مسجد کے ویران ہونے سے اس کی چٹائی دینے والے کی ملکیت میں نہیں لوٹتی بلکہ اسے یا تو دوسری مسجد میں دیدیا جائے یا اسے بیچ کر اس کی رقم مسجد میں ہی خرچ کی جائے۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت ایک مسجد کی مملوکہ اشیاء دوسری مسجد میں منتقل کی جاسکتی ہیں لہٰذا اگر ایک وقف کے پاس زائد آمدنی ہو اور دوسرے کے تعطل کا اندیشہ ہو اور اس کی تعمیر کی کوئی صورت نہ ہو تو ایسی صورت میں پہلے وقف کی آمدنی سے دوسرے وقف کی تعمیر کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

فتاویٰ تتارخانیہ ہی میں ہے:

اوقاف على قنطرة فيبس الوادى وصار الماء الى شعبة أخرى من الأرض من تلك المحلة واحتيج الى عمارة القنطرة للوادى الجديد فهل يجوز صرف القنطرة الأولىٰ الى الثانية؟ ان كانت القنطرة الثانية للعامة وليس هناك قنطرة أخرى للعامة أقرب الى القنطرة الأولى جاز لما ذكرنا قبل هذا.[2]

ایک پل کے کچھ اوقاف ہیں وادی میں پانی خشک ہوگیا اور اسی محلّہ میں دوسری وادی کی طرف پانی چلا گیا جہاں پل کی تعمیر کی ضرورت ہے تو کیا پہلے پل اور اس کے اوقاف کو دوسری وادی میں پل بنانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ اگر دوسرا پل بھی عام لوگوں کے لئے ہے اور پہلے کے مزید قریب اور کوئی پل نہیں ہے تو پہلے پل اور اس کے اوقاف کو نئے پل بنانے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

علامہ اندریتیؒ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۸۴۷/۵)

(۲) حواله بالا (۸۷۷/۵)

رباط كثرت دوابه و عظمت مؤنتها هل للقيم أن يبيع شيئا منها وينفق ثمنها فی علفها أو مرمة الرباط؟ فهذا علی وجهين: ان بلغ سن البعض الی حدلا يصلح لما ربطت له فله ذلک وما لا فلا ولكن يمسک فی هذا الرباط مقدار مايحتاج اليه ويربط مازاد علی ذلک فی ادنی الرباط الی هذا الرباط.[1]

ایک رباط میں جانور کافی جمع ہوگئے اوران کا خرچہ بھی کافی بڑھ گیا ہے کیا متولی کے لئے ان میں سے کچھ بیچنا جائز ہے کہ وہ بیچ کر قیمت ان کے چارہ وغیرہ میں یا رباط کی مرمت میں خرچ کرے؟ اس کی دوصورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ اگر بعض جانور اس عمر کو پہنچ گئے کہ ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جس کے لئے وہ اس رباط میں دیئے گئے ہیں تو متولی یہ اقدام کرسکتا ہے ورنہ نہیں، لیکن رباط میں اتنے جانور باقی رکھے جتنے کی یہاں ضرورت ہے اور اضافی جانور اس رباط کے قریب ترین رباط میں دیدئے جائیں۔

المعیار المعرب میں علامہ ابن رشد کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

وما كان من المساجد لايفضل من غلات أحباسها الا يسير، فلا يجوز أن يوخذ منه شئی لبنيان الجامع مخافة أن تقل الغلة فيما يستقبل فلا تقوم بما يحتاج اليه، وما كان منها يفضل من غلات أحباسها كثير حتی يؤمن احتياج المسجد اليها أو الی بعضها فيما يستقبل فجائز أن يبنی ما انهدم من الجامع بها اذا لم يكن فی غلة أحباسه مابنی به ماانهدم منه الا علی ما اجازه من تقدم من العلماء فی مثل هذا المعنی، والواجب أن يقدم بنيانه ورمه علی أجرة أئمته وخدمته، الا أن لايوجد من يؤم فيه ويخدمه بغير أجر، فيكون ذلک سبباً لتضييع الجامع و تعطيله، والله الموفق بفضله.[2]

---

(۱) الاندريتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندريتی. الفتاوی التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۸۷۰/۵)

(۲) المعيار المعرب (۱۳۶/۷)

جن مساجد کی آمدنی میں سے معمولی بچت ہوتی ہے، جامع کی تعمیر کے لئے ان مساجد کی آمدنی استعمال نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ احتمال ہے کہ آئندہ ان مساجد کی آمدنی کم ہو اور ان کی ضروریات پوری نہ ہوسکے، البتہ ایسی مساجد جن کی کافی آمدنی بچ جاتی ہو اور مستقبل میں ان مساجد کو اس زائد آمدنی کی ضرورت پڑنے کا احتمال نہ ہو تو ان مساجد کی زائد آمدنی سے جامع مسجد کا منہدم حصہ تعمیر کیا جاسکتا ہے اگر جامع میں اس کی تعمیر کے لئے آمدنی نہ ہو، اور جامع کی تعمیر ومرمت کو امام اور خدام کی تنخواہ پر مقدم کرنا ضروری ہے، الا یہ کہ بغیر اجرت لئے کوئی امامت کرنے اور خدمت کرنے پر تیار نہ ہو اور جامع مسجد کے ضائع ومعطل ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر تعمیر کے ساتھ امام اور خدام پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔

ان جزئیات سے گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایک رفاہی وقف کے پاس ضرورت سے زائد آمدنی ہو اور دوسرے وقف کی تعمیر کی کوئی صورت نہ ہو اور اس کے معطل اور ویران ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں پہلے وقف کی زائد آمدنی دوسرے وقف کی تعمیر میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

البتہ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ رفاہی اوقاف جن کے تعطل کا اندیشہ ہو ان کی تعمیر کے لئے ان کے ہم جنس اوقاف کی زائد آمدنی استعمال کرنی چاہئے مثلاً مسجد کی تعمیر میں دوسری مسجد کی زائد آمدنی استعمال کی جائے مسافر خانہ کی آمدنی استعمال نہ کی جائے، اسی طرح مسافر خانہ کی ضروری تعمیر کے لئے دوسرے مسافر خانہ کی زائد آمدنی استعمال کی جائے مسجد کی آمدنی استعمال نہ کی جائے تا کہ چندہ دینے والوں کا چندہ قریب ترین مقاصد ہی میں خرچ ہو۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وعن الثاني ينقل الى مسجد اخر باذن القاضي ومثله في الخلاف المذكور حشيش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما وكذا الرباط والبئر اذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الى أقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض.

في الشامية: وظاهره انه لايجوز صرف وقف مسجد خرب الى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لأقرب مجانس لها. (۱)

---

(۱) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۲ھ (۳۵۹/۴)

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فاضل اشیاء دوسری مسجد میں منتقل کردی جائیں گے قاضی کی اجازت سے، یہی اختلاف مسجد میں بچھائے جانے والی گھاس اور مسجد کی چٹائیوں میں ہے جب ان کی ضرورت نہ رہے، اسی طرح مسافر خانہ، کنواں وغیرہ جب ان سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکے تو مسجد، مسافر خانہ، کنویں اور حوض کے وقف کو قریب ترین مسجد، مسافر خانہ، کنویں اور حوض پر خرچ کیا جائے گا۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ مسجد کے وقف کو حوض پر خرچ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اس کا برعکس بھی جائز نہیں، شرح الملتقی میں ہے کہ قریب ترین ہم جنس پر خرچ کیا جائے گا۔

۲۔ تنفیذِ شرائط واقف:

متولی کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ واقف نے وقف کرتے وقت وقف کے ذرائع آمدنی، مصارف، مستحقین وغیرہ کے حوالہ سے جو شرائط عائد کی ہیں ان پر عمل کرے اور ان کی تنفیذ کو یقینی بنائے۔

ہم آخری باب میں تفصیل سے واقف کی عائد کردہ شرائط کا جائزہ لیں گے، یہاں اتنا ذکر کرنا کافی ہے کہ واقف کی ایسی شرائط جو مقتضائے وقف کے خلاف نہ ہوں، شریعت کے خلاف نہ ہوں، وقف اور موقوف علیہم کی مصلحت کے خلاف بھی نہ ہوں اور وقف سے فائدہ حاصل کرنے میں خلل کا باعث بھی نہ ہوں ان پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے، قاضی ان کے خلاف اگر فیصلہ کرے تو وہ بھی نافذ نہیں ہوگا۔[1]

انہی شرائط کے بارے میں فقہاء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ شرط الواقف کنص الشارع[2] متولی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان شرائط کی تعمیل کو یقینی بنائے۔

علامہ برہان الدین طرابلسیؒ الاسعاف میں لکھتے ہیں:

لو شرط الواقف ان لایؤجر المتولی الوقف ولا شیئاً منه أو ان لایدفعه مزارعة أو ان لایعامل علی مافیه من الأشجار أو شرط أن لایؤجر الا ثلاث سنین ثم لایعقد علیه الا بعد انقضاء العقد الأول کان شرطه معتبراً ولا یجوز مخالفته.[3]

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۴۶/۵)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباه والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ه (۱۰۶/۲)

(۳) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ه (۶۳)

اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ متولی وقف کو اجارہ پر نہیں دے گا یا اسے مزارعت پر نہیں دے گا یا وقف زمین میں لگے ہوئے درخت میں مساقاۃ نہیں کرے گا یا یہ شرط لگائی کہ تین سال سے زیادہ وقف کو کرایہ پر نہیں دے گا، پہلے عقد ختم ہونے کے بعد دوسرا عقد کرے گا تو اس کی یہ شرائط معتبر ہیں اور متولی کے لئے ان کی مخالفت جائز نہیں۔

علامہ ونشریسیؒ لکھتے ہیں:

لابد للمتولی النظر فی الحبس من مراعاة قصد المحبس واتباع شرطه ان کان جائزاً فما خصه المحبس بنوع لایصرف فی غیر ذلک النوع. [1]

متولی کے لئے واقف کے قصد اور غرض کی رعایت رکھنا ضروری ہے، اس کی شرائط کی اتباع بھی ضروری ہے، بشرطیکہ وہ شرائط جائز ہوں اگر واقف نے وقف کو کسی خاص نوع کے ساتھ خاص کیا ہو تو متولی کسی اور نوع میں اسے صرف نہیں کرسکتا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے تنقیح الحامدیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر متولی واقف کی شرائط کی رعایت نہ کرے تو وہ معزولی کا مستحق ہو جاتا ہے، فرماتے ہیں:

اذا لم یراع (المتولی) شرط الواقف فانه ینعزل بعزل القاضی. [2]

اگر متولی واقف کی شرائط کی رعایت نہ رکھے تو وہ قاضی کے معزول کرنے سے معزول ہو جائے گا۔

اسی طرح واقف کے متعین کردہ مستحقین تک وقف کی آمدنی پہنچانا بھی تعمیل شرطِ واقف میں داخل ہے اور متولی کی ذمہ داری ہے۔

۳۔ مقدمات میں وقف کی طرف سے پیروی کرنا:

ہم شروع میں اس پر تفصیلی کلام کر چکے ہیں کہ وقف شخصِ قانونی ہے وہ مقدمات میں مدعی بھی بن سکتا ہے اور مدعیٰ علیہ بھی، البتہ مقدمات میں وقف کی پیروی کرنا متولی کی ذمہ داری ہے اگر وقف کے حقوق

---

(۱) الونشریسی، محمد بن یحییٰ الونشریسی ۹۱۴ھ. المعیار المعرب، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۹۸۱م (۱۳۵/۷)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۳۰/۱)

کسی کے ذمہ ہوں تو متولی عدالت کے ذریعہ ان کا مطالبہ کرے گا اور اگر وقف پر کسی حقوق ہوں تو متولی اس کی ادائیگی کا انتظام کرے گا۔ علامہ کبیسیؒ منتہی الارادات کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ففي منتهى الارادات: وظيفته حفظ وقف و عمارته و ايجاره و زرعه و مخاصمة فيه. [1]

وقف کی حفاظت، اس کی تعمیر، اسے کرایہ یا مزارعت پر دینا اور مقدمات میں اس کی پیروی کرنا متولی کی ذمہ داری ہے۔

امام خصافؒ تحریر فرماتے ہیں:

يجعل القاضي للوقف قيماً ويجعله خصماً لمن حضر منهم في أن يثبت قرابته من الواقف. [2]

قاضی وقف کے متولی مقرر کرے گا اور جو لوگ واقف سے قرابت کا دعویٰ کر رہے ہیں وقف کی آمدنی حاصل کرنے کے لئے وہ اسی متولی کو خصم بنائیں گے اور عدالت میں اسے مدعی علیہ بناتے ہوئے اپنی قرابت ثابت کریں گے۔

وقف کے ذمہ اگر دیون واجب ہوں تو انہیں ادا کرنا بھی متولی کی ذمہ داری ہے اسی طرح اگر حکومت کی طرف سے وقف پر کوئی ٹیکس عائد ہو تو بروقت اس کی ادائیگی کرنا متولی کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

ذكر محمدؒ في الأصل في شيء من رسم الصكوك: فأشترط أن يرفع الوالي من غلته كل عام مايحتاج اليه لأداء العشر والخراج والبذر وأرزق الولاة عليها والعملة وأجور الحراس والحصادين والدراسين لأن حصول منفعتها في كل وقف لايتحقق الا بدفع هذه المؤون من رأس الغلة، قال شمس الأئمة و ذلك وان كان يستحق بلاشرط عندنا لكن لايؤمن جهل بعض القضاة فيذهب رأيه الى قسمة جميع الغلة فاذا شرط ذلك في صكه يقع الامن بالشرط. [3]

---

(۱) الكبيسي، محمد عبيد الكبيسي. احكام الوقف في الشريعة الاسلامية، بغداد (۲/۱۹۷)

(۲) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۵۱)

(۳) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندري المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹہ، مكتبہ رشيديہ (۵/۴۳۴)

ان مقدمات اور دیون کی ادائیگی اور وصولی پر اگر کوئی خرچہ آئے گا تو متولی مال وقف سے وہ خرچہ کرسکتا ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

للقیم صرف شئی من مال الوقف الی کتبة الفتویٰ ومحاضر الدعویٰ لاستخلاص الوقف. (۱)

متولی کے لئے وقف کا مال فتویٰ لکھوانے اور وقف کو چھڑانے کے لئے مقدمہ کی تیاری پر خرچ کرنا جائز ہے۔

علامہ شامی منحۃ الخالق میں لکھتے ہیں:

لو استولیٰ علیه ظالم ولم یمکنه دفعه عنه الابصرف ماله فصرف لایضمن کما یعلم من مسئلة الوصی اذا طمع السلطان فی مال الیتیم ولم یمکن دفعه عنه الا بدفع شیئی من ماله. (۲)

اگر وقف پر کسی ظالم نے قبضہ کرلیا اور بغیر مال خرچ کئے اسے ظالم سے چھڑانا ممکن نہ ہو تو متولی اس مقصد کے لئے وقف کا مال خرچ کرسکتا ہے وہ ضامن نہیں ہوگا، یہ بات وصی کے مسئلہ سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر بادشاہ یتیم کے مال پر قبضہ کرنا چاہتا ہو اور اسے مال خرچ کئے بغیر بچانا ممکن نہ ہو تو وصی یتیم کا مال اس مقصد کے لئے خرچ کرسکتا ہے۔

۴۔ وقف کے غلط استعمال کو روکنا:

متولی کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وقف کے غلط استعمال کو روکے، اگر کوئی شخص وقف کو نقصان پہنچا رہا ہے اور متولی کے علم میں ہے تو اس غلط کام کو روکنا اس کی ذمہ داری ہے وہ اگر نہیں روکتا تو یہ اپنے منصب سے خیانت کے مترادف ہوگا اور اس کی وجہ سے اسے معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔ البحر الرائق میں ہے:

باع المتولی ورق أشجار التوت جاز لأنه بمنزلة الغلة فلو أراد المشتری قطع قوائم الشجر یمنع لأنها لیست بمبیعة ولو امتنع المتولی من منع المشتری عن قطع القوائم کان ذلک خیانة منه

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۴۰)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۴۰)

فاستفيد منه انه اذا لم يمنع من يتلف شيئا للوقف كان خائنا و يعزل. [۱]

متولی اگر موقوفہ شہتوت کے درخت کے پتے بیچے تو جائز ہے کیونکہ یہ پتے وقف کی آمدنی ہیں عین وقف نہیں البتہ اگر خریدار درخت کاٹنے کی کوشش کرے تو اسے منع کیا جائے گا کیونکہ پتے بیچے گئے ہیں درخت نہیں بیچا گیا اگر متولی خریدار کو درخت کاٹنے سے منع نہیں کرتا تو یہ اس کے طرف سے خیانت ہوگی، اس سے یہ اصول معلوم ہوا ہے کہ اگر متولی اس شخص کو نہ روکے جو وقف کی کوئی چیز تلف کرنا چاہے تو یہ خیانت ہوگی اور اسے معزول کیا جائے گا۔

۵۔وقف کی دیکھ بھال کرنا:

وقف اور اس کی مملوکات کی دیکھ بھال، حفاظت اور اس کی آمدنی کی صحیح نگرانی یہ بھی متولی کی بنیادی ذمہ داری ہے اگر متولی اس میں کوتاہی کرے گا تو بھی اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

في الجواهر: القيم اذا لم يراع الوقف يعزله القاضي. [۲]

قیم اگر وقف کی دیکھ بھال نہ کرے تو قاضی اسے معزول کرسکتا ہے۔

علامہ رافعیؒ لکھتے ہیں:

في خزانة الأكمل: الولاية في الوقف للواقف الا أن يكون خائناً فينزعه القاضي من يده و كذا لو اتهمه في عمارته أو حفظ غلته. [۳]

خزانۃ الأکمل میں ہے: وقف کی ولایت واقف کو حاصل ہے الا یہ کہ وہ خائن ہو تو قاضی اس سے وقف لے لے گا، اسی طرح اگر قاضی اسے تعمیر یا وقف کی آمدنی کے سلسلہ میں متہم سمجھے۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۴/۵)

(۲) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۰/۴)

(۳) الرافعي، عبد القادر الرافعي. تقريرات الرافعي ملحق برد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني (۸۴/۴)

جب واقف کو معزول کیا جاسکتا ہے تو متولی کو تو بطریق اولیٰ معزول کیا جاسکے گا۔ فقہاء کرامؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر وقف کی کوئی لکڑی پڑی ہے متولی نے اس کی حفاظت کا اہتمام نہیں کیا اور وہ ضائع ہوگئی تو متولی اس کی قیمت کا ضامن ہے۔(۱)

علامہ حمویؒ اسی سلسلہ میں دو اہم مسئلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فی الصیر فیة سئل عن قیم مسجد و مؤذنه لم ینفض بسط المسجد حتی أكلتها الأرضة هل یضمن؟ قال ان كان له أجرة نعم و الافلا. قلت: و علی قیاسه خازن كتب الوقف لو لم ینفضها حتی أكلتها الأرضة یضمن ان كان له أجرة و الافلا. (۲)

صیر فیہ میں ہے کہ ایک مسجد کے متولی اور اس کے موذن کے بارے میں پوچھا گیا کہ انہوں نے مسجد کی چٹائی نہیں جھاڑی یہاں تک کہ اسے دیمک کھا گئی تو کیا وہ ضامن ہوں گے؟ فرمایا کہ اگر وہ اجرت لیتے ہوں تو ضامن ہوں گے، علامہ حمویؒ فرماتے ہیں کہ اسی پر موقوفہ کتب کے خازن اور نگران کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس نے کتابیں نہیں جھاڑیں اور انہیں دیمک لگ گئی، اگر اجرت لیتا ہو تو ضمان آئے گا ورنہ نہیں۔

اجرت لینے یا نہ لینے پر ضمان وعدم ضمان کا ترتب تو ہوسکتا ہے لیکن اس کے خیانت ہونے میں تو کوئی کلام نہیں اس لئے ان صورتوں میں متولی کو معزول کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم

یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ ہر چیز کی دیکھ بھال اس کے مناسب حال ضروری ہے، وقف اگر مکان، دوکان یا کسی عمارت کی شکل میں ہے تو اس کی تعمیر اور مرمت کا خیال کرنا اور اس میں موجودہ سامان کی حفاظت کا اہتمام کرنا اس میں موجود لوہے کی چیز کی زنگ سے حفاظت کرنا اور لکڑی کی چیزوں کی دیمک سے حفاظت کرنا اور اس دوکان یا مکان کو ناجائز قابضین سے بچانا یہ اس کی دیکھ بھال میں داخل ہے۔

وقف تالاب، حوض یا کنویں کی شکل میں ہے تو اس کی صفائی، وقتاً فوقتاً اس میں جمع ہونے والی مٹی کو نکالنا، اس کے کناروں کی مضبوطی کا خیال رکھنا اور اس کی پائپ لائنوں کی نگرانی رکھنا ان کی مرمت کرانا یہ اس کی دیکھ بھال ہے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/۱۲۴) و کذا فی البحر الرائق (۵/۲۳۹)

(۲) غمز عیون البصائر بھامش الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/۱۲۴) مزید دیکھئے: رد المحتار (۴/۴۳۹)

اگر کسی نے گاڑی وقف کی تو اس گاڑی کی ٹوٹ پھوٹ کا خیال رکھنا اس کے آئل اور دیگر ضروریات کو بروقت پورا کرنا یہ اس کی دیکھ بھال میں داخل ہے۔

نقد رقم کسی نے وقف کی تو اس کی حفاظت کا اہتمام کرنا اسے ایسی تجارت میں لگانا جس میں نفع کا گمان غالب ہو یہ اس کی دیکھ بھال ہے۔

غرضیکہ ہر چیز کی دیکھ بھال اس کے مناسب حال اور عرف کے مطابق کرنا متولی کی ذمہ داری ہے۔

۶۔ وقف کی مناسب آمدنی کا انتظام کرنا:

اگر وقف کی نوعیت ایسی ہے کہ واقف نے اس کی آمدنی مستحقین میں تقسیم کرنے کی ہدایت کی ہے تو اس وقف کی آمدنی کے لئے مناسب انتظام کرنا یہ بھی متولی کی ذمہ داری ہے مثلاً اگر گھر یا دوکان وقف کی اور یہ ہدایت کی کہ ان کی آمدنی فلاں فلاں مستحقین کو دی جائے تو اس وقف کے متولی کی ذمہ داری ہے کہ اس وقف کی آمدنی کے لئے مناسب صورتیں اختیار کرے، مثلاً اس گھر یا دوکان کو کرایہ پر دے تاکہ کرایہ کی شکل میں آمدنی حاصل ہو سکے یا اگر وقف زرعی زمین ہے تو اسے مزارعہ پر دے تاکہ آمدنی کا انتظام ہو۔ منتہی الارادات میں ہے:

وظيفته حفظ وقف و عمارته وايجاره و زرعه ومخاصمة فيه.[1]

متولی کی ذمہ داری وقف کی حفاظت کرنا، تعمیر کرنا اسے اجارہ اور مزارعہ پر دینا اور اس کی طرف سے مقدمات میں پیروی کرنا ہے۔

اسی طرح اگر وقف نقد کی شکل میں ہے تو ظاہر ہے اس نقد رقم کو فقراء میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عینِ وقف کو باقی رکھنا ضروری ہے ہاں اس نقد رقم سے حاصل ہونے والی آمدنی کو فقراء میں یا واقف کے متعین کردہ مصرف میں خرچ کیا جائے گا، اس کے لئے ضروری ہے کہ متولی اس نقد موقوفہ رقم کو کسی ایسے کاروبار میں لگائے جس میں نفع کا غالب گمان ہو۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الكبيسي، محمد عبيد الكبيسي. احكام الوقف فى الشريعة الاسلامية، بغداد (۲/۱۹۷) بحواله منتهى الارادات (۲/۱۲)

وعن الأنصاری و کان من اصحاب زفرؒ فیمن وقف الدراهم أو مایکال أو یوزن أیجوز ذلک؟ قال: نعم، قیل و کیف؟ قال یدفع الدراهم مضاربة ثم یتصدق بها فی الوجه الذی وقف علیه وما یکال أو یوزن یباع ویدفع ثمنه لمضاربة أو بضاعة ...... وکذا یفعل فی وقف الدراهم والدنانیر وما خرج من الربح یتصدق به فی جهة الوقف. (۱)

انصاری جو کہ امام زفرؒ کے شاگرد ہیں ان سے پوچھا گیا کہ کیا دراہم اور مکیلی وموزونی چیز کا وقف کرنا جائز ہے؟ فرمایا ہاں، پوچھا گیا کہ اس وقف کا کیا کیا جائے گا؟ فرمایا کہ دراہم مضاربت پر دیدیے جائیں گے جو نفع حاصل ہوگا وہ واقف کی بیان کردہ جہات پر خرچ کیا جائے گا، مکیلی وموزونی چیزوں کو بیچا جائے گا اور ان کی قیمت مضاربت پر دیدی جائے گی اس طرح جو نفع حاصل ہوگا وہ واقف کی متعین کردہ جہت پر صرف کیا جائے گا۔

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ اگر وقف مکیلی یا موزونی چیز کی شکل میں ہے جیسے کسی نے گندم وقف کردی یا چاول وقف کردیا تو متولی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انہیں بیچ کر نقد کی شکل میں لائے اور پھر اس نقد رقم کو مضاربت یا کسی اور کاروبار میں لگا کر آمدنی کی صورت ممکن بنائے۔

ہم نے چوتھے باب میں وقف کی ذرائع آمدنی کی جو قدیم وجدید صورتیں تفصیل سے بیان کی ہیں انہیں موقع محل کی مناسبت سے اختیار کرنا بھی متولی کی ذمہ داری ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ /۳۶۴)

وہ امور جنہیں انجام دینا متولی کے لئے جائز نہیں

اس سلسلہ میں واضح اصول تو یہی ہے کہ ایسے کام جن میں وقف کا واضح نقصان ہو وہ متولی کے لئے جائز نہیں ہیں، یہاں بطور مثال چند کام ذکر کئے جا رہے ہیں جن کے بارے میں فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ وہ متولی کے لئے جائز نہیں ہیں۔

۱۔ ایسا عقد کرنا جو وقف کے لئے مضر ہو:

متولی وقف کے لئے کوئی ایسا عقد نہیں کر سکتا جس میں واضح طور پر وقف کا نقصان نظر آ رہا ہو۔ اس کی مثال فقہاء کرامؒ نے یہ دی ہے کہ وقف کو رقم کی ضرورت تھی متولی نے کسی سے مثلاً سو روپے قرض لئے اور پھر قرض دینے والے سے ایک روپے کی چیز دس روپے میں خریدی تو یہ جائز نہیں کیونکہ ایک روپے کی چیز دس روپے میں خریدنا غبن فاحش کے ساتھ خریدنا ہے جو کہ متولی کے لئے جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر متولی سو روپے کی چیز ایک سو دس میں ادھار خریدے اور پھر یہ چیز سو روپے میں بیچ کر رقم وقف کی ضرورت میں استعمال کرے تو اس کی گنجائش ہے۔

دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ دوسری صورت میں متولی اگرچہ دس روپے زائد دے رہا ہے لیکن اس کے عوض اسے ادھار کی سہولت (تاجیل) حاصل ہو رہی ہے اس لئے وقف کے فائدے کے لئے اسے گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن پہلی صورت میں متولی ایک روپے کی چیز دس روپے میں خرید رہا ہے اور اسے کچھ تاجیل کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہو رہا کیونکہ قرض کی تاجیل ممکن نہیں، قرض دینے والا جب چاہے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے اس لئے پہلی صورت جائز نہیں اور دوسری جائز ہے۔[1]

---

(۱) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۴۱۸ھ (۱۲۴/۲) مزید ملاحظہ فرمایئے: الاعظمی، خلیل احمد الاعظمی، تسکین الارواح والضمائر شرح الاشباہ والنظائر کتاب الوقف، مخطوطہ، لائبریری جامعہ دارالعلوم کراچی (۹۴)

۲۔ موقوفہ چیز عاریت پر دینا:

واقف نے اگر گھر یا دوکان وغیرہ اس طرح وقف کی کہ اس کی آمدنی فلاں فلاں مصارف پر خرچ کی جائے تو متولی کے لئے یہ موقوفہ گھر یا دوکان کسی کو بلا اجرت عاریت پر دینا جائز نہیں۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ليس للقيم أن يسكن فيها احداً بغير اجر. (۱)

متولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ موقوفہ مکان وغیرہ میں کسی کو بغیر اجرت لئے رکھے۔

۳۔ اجرت مثل سے کم پر وقف کو کرایہ پر دینا:

موقوفہ مکان یا دوکان کا جو مارکیٹ میں کرایہ ہے اس سے غیر معمولی کم کرایہ پر دینا متولی کے لئے جائز نہیں ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

ولا تجوز اجارته لأجنبي الا بأجرة المثل لأن مانقص يكون اضرارا بالفقراء كذا في المحيط. (۲)

کسی شخص کو اجرت مثل سے کم پر کرایہ پر دینا جائز نہیں، کیونکہ جو کمی ہوگی اس میں فقراء ہی کا نقصان ہوگا۔

۴۔ اجرت مثل سے زیادہ پر کسی کو وقف کا ملازم رکھنا:

وقف کے امور کی انجام دہی اور انتظام و انصرام کے لئے متولی کسی کو ملازم رکھ سکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی تنخواہ وہ رکھی جائے جو عام طور پر اس طرح کے کام کرنے والے افراد کی ہوتی ہے اگر عام تنخواہ سے زیادہ تنخواہ رکھی جائے گی تو یہ متولی کے لئے جائز نہیں، اس پر اس کا ضمان آئے گا۔

صاحب اسعاف لکھتے ہیں:

---

(۱) نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادي عشر. الفتاوى الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳ (۴۱۸/۲) وكذا في البحر الرائق (۲۳۸/۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۴/۵) مزيد ديكهئے: رد المحتار (۴۰۲/۴)

ولو استأجر المتولی رجلا فی عمارة المسجد بدرهم و دانق واجر مثله درهم فاستعمله فی عمارته و نقد الأجر من مال الوقف قالوا یکون ضامنا جمیع مانقد لأنه لما زاد فی الأجر اکثر مما یتغابن الناس فیه صار مستأجر النفسه دون المسجد فاذا نقد من ماله یلزمه ضمانه. (۱)

اگر متولی نے مسجد کی تعمیر کے لئے ایک شخص کو ایک درہم اور ایک دانق میں اجرت پر لیا حالانکہ اس کی اجرت مثل ایک درہم ہے پھر اس سے کام کروایا اور یہ اجرت وقف کے مال میں سے دی تو علماء نے فرمایا کہ متولی اس پوری رقم کا ضامن ہوگا جو اس نے وقف کے مال میں ادا کی ہے کیونکہ جب اجرت میں متولی نے اتنا اضافہ کیا کہ وہ غبن فاحش میں داخل ہوگیا اور لوگ اس اضافہ کو عام طور پر گوارا نہیں کرتے تو گویا اس نے اس شخص کو اپنی ذات کے لئے اجرت پر لیا نہ کہ مسجد کے لئے، لہٰذا اگر مسجد کے مال سے اس کی اجرت ادا کی گئی تو متولی اس کا ضامن ہوگا۔

۵۔ وقف چیز ذاتی استعمال میں لانا:

متولی کے لئے وقف یا اس کی مملوکات اپنے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں اسے خیانت تصور کیا جائے گا۔ البحر الرائق میں ہے:

فی الاسعاف لیس لمتولی المسجد أن یحمل سراج المسجد الی بیته. (۲)

اسعاف میں ہے کہ متولی مسجد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مسجد کا چراغ اپنے گھر لے جا کر استعمال کرے۔

یہ نہ صرف خیانت ہے بلکہ اس کی تلافی بھی بہت مشکل ہے کیونکہ عام طور پر اوقاف و مساجد میں بیشمار لوگ چندہ دیتے ہیں اور ان کا کچھ اتہ پتہ بھی نہیں ہوتا، ہر ایک سے معافی مانگنا بھی ممکن نہیں، اور اصل چندہ دہندگان کے علم میں لا کر ادائیگی بھی ناممکن کی حد تک دشوار ہے اس لئے اوقاف اور مساجد کی چیزوں کو

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۶۲)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/ ۲۵۰)

ذاتی استعمال میں لانا بہت خطرناک ہے اور اس کی بعینہٖ وہ مثال ہے جو بیت المال اور مال غنیمت میں خیانت کی ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کے بعد ایک صاحب سے جوتے کا وہ تسمہ لینے سے انکار کر دیا تھا جو انہوں نے تقسیم سے پہلے لے لیا تھا اور فرمایا تھا کہ شراک من النار، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس میں تمام غانمین کا حق ہے انہیں ان کا حق پہنچانا بہت مشکل ہے۔

٦۔موقوفہ چیز رہن رکھوانا:

متولی کے لئے وقف یا اس کی مملوکہ چیز کسی شخص کے پاس دین کے عوض رہن رکھوانا جائز نہیں ہے۔علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

ولا يصح ان يرهن القيم الوقف بدين لأنه يلزم منه تعطيله، فلو رهن دارا من الوقف وسكن المرتهن فيها قالوا يجب عليه أجر مثلها سواء كانت معدة للاستغلال أو لم تكن احتياطاً في أمر الوقف.[1]

متولی کے لئے وقف کو کسی دین کے عوض رہن رکھوانا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے تعطیل وقف لازم آتا ہے، لہٰذا اگر متولی نے موقوفہ گھر رہن رکھوایا اور اس میں مرتہن نے رہائش اختیار کی تو علماء نے فرمایا کہ اس پر اس گھر کی اجرت مثل لازم آئے گی، خواہ وہ موقوفہ گھر کرایہ پر دینے کے لئے تیار کیا گیا ہو یا نہیں کیا گیا ہو، وقف کے معاملہ میں احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ مرتہن سے اجرت مثل لی جائے۔

المحیط البرہانی میں بھی یہی حکم بیان کیا گیا ہے۔[2]

۷۔واقف کی عائد کردہ شرائط کی خلاف ورزی کرنا:

متولی کے لئے واقف کی عائد کردہ جائز شرائط جو خلافِ شریعت وخلافِ مصلحتِ وقف وموقوف علیہم نہ ہوں ان کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ١٣٢٠ه (٥٧)

(۲) دیکھئے: ابن مازه البخاری، برهان الدن ابو المعالی محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاری ٦١٦ه. المحيط البرهانی، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ٢٠٠٤م (٩/٣٩)

بهذا ظهر أن الشرائط الراجعة الى الغلة وتحصيلها لايقدر المتولى على مخالفتها.[1]

ان جزئیات سے یہ واضح ہے کہ واقف کی طرف سے عائد کردہ وہ شرائط جن کا وقف کی آمدنی اور اس کے حصول سے تعلق ہے متولی ان کی مخالفت نہیں کرسکتا۔

البتہ اگر وقف کی مصلحت واقف کی عائد کردہ شرط کی خلاف ورزی میں ہو تو ایسی صورت میں متولی کے لئے قاضی کی اجازت سے خلاف ورزی جائز ہے، مثال کے طور پر واقف نے شرط لگائی کہ وقف کو ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دیا جائے گا لیکن ایک سال کے لئے اسے کوئی کرایہ پر لے نہیں رہا یا مناسب کرایہ نہیں مل رہا تو متولی قاضی کی اجازت سے اس شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر دے سکتا ہے۔[2]

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۲۴۷)

(۲) حواله بالا.

متولی کے اختیارات

اس میں اصول تو وہی ہے جو فقیہ ابو جعفر رحمہ اللہ کے حوالہ سے علامہ طرابلسیؒ نے لکھا ہے:

ماکان أدر علی الوقف وانفع للفقراء جاز له فعله. (۱)

جو کام وقف کے لئے زیادہ آمدنی کا ذریعہ اور فقراء کے لئے فائدہ مند ہو متولی کے لئے وہ جائز ہے۔

اس اصول کی روشنی میں فقہاء کرام رحمہم اللہ نے متولی کے کچھ اختیارات ذکر فرمائے ہیں ذیل میں ان میں سے چند اختیارات بطور مثال ذکر کئے جا رہے ہیں:

ا۔ وقف کے لئے ملازمین رکھنا:

وقف کے انتظام و انصرام کے لئے اگر ملازمین رکھنے کی ضرورت پیش آئے تو متولی ان کی تقرری کرسکتا ہے۔ ہندیہ میں ہے:

وللقائم بأمر الوقف أن يستأجر الاجراء فی عملها وحفر سواقيها و سائر مايرجع الی مصالحها اذا كانت تحتاج اليها. (۲)

متولی کے لئے موقوفہ زمین میں کام کرنے کے لئے اور اس کے پانی کے کناروں کو کھودنے کے لئے مزدور رکھنا جائز ہے، اسی طرح وقف کی دیگر ضرورتوں کے لئے بھی ملازم رکھنا جائز ہے بشرطیکہ وقف کو ضرورت ہو۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۶۳)

(۲) نظام، الشيخ نظام و جماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاوی الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳ (۴۲۳/۲) وكذا فی البحر الرائق (۲۴۱/۵)

البتہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ان ملازمین کی اجرت اور تنخواہ وہ ہونی چاہئے جو عام طور پر اس طرح کے کام کرنے والوں کی ہوتی ہے اس میں غیر معمولی اضافہ غبن فاحش میں داخل ہوگا اور متولی خود اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا۔

اسی طرح وقف کے لئے ملازم رکھنے میں متولی کو اس کا خیال بھی رکھنا چاہئے کہ روزانہ کی اجرت پر ملازم رکھنا بہتر ہوگا یا مہینہ کی تنخواہ پر، اگر کام اتنا زیادہ نہیں ہے کہ اس کے لئے ہمہ وقتی ملازم کی ضرورت ہو تو متولی کو روزانہ کی اجرت پر ملازم رکھنا چاہئے تاکہ جب کام ختم ہوجائے تو اسے اب اجرت نہ دینی پڑے، اور اگر کام زیادہ ہے اور اس کے لئے ہمہ وقتی ملازم کی ضرورت ہے تو ایسی صورت میں ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھنا بہتر ہے، روزانہ کی اجرت پر رکھا جائے گا تو زیادہ رقم خرچ ہوگی۔

اور متولی کو اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ملازم کا عارضی تقرر کیا جائے یا مستقل تقرر، بہتر تو یہ ہے کہ ملازم کا کام دیکھنے کے لئے اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے ابتداءً اس کا عارضی تقرر کیا جائے اور اطمینان ہوجانے کے بعد اسے مستقل کیا جائے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے قاضی خان کے حوالہ سے ایک جزئیہ لکھا ہے:

القاضی اذا قرر فراشا فی المسجد بغیر شرط الواقف وجعل له معلوماً فانه لا یحل للقاضی ذلک ولا یحل للفراش تناول المعلوم اھ. فان قلت تقریر الفراش مصلحة، قلت: یمکن خدمة المسجد بدون تقریره بأن یستأجر المتولی فراشا له والممنوع تقریره فی وظیفة تکون حقا له ولذا صرح قاضیخان بأن للمتولی أن یستأجر خادماً بأجرة المثل. (۱)

واقف کی شرط کے بغیر اگر قاضی مسجد کے لئے دریاں بچھانے والے کا تقرر کرے اور اس کے لئے ایک وظیفہ مقرر کردے تو یہ جائز نہیں ہے، اور اس شخص کے لئے وظیفہ لینا جائز نہیں، اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس کے تقرر میں تو وقف کی مصلحت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وقف کی اس مصلحت کو بغیر تقرر بھی پورا کیا جاسکتا ہے کہ متولی کسی کو اجرت پر رکھ کر یہ کام کروالے، قاضی کے لئے وقف میں ایسا تقرر منع ہے کہ وہ منصب اس کا شخص کا حق بن

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۲۷)

جائے، اس لئے قاضی خان میں صراحت کی ہے کہ متولی کے لئے جائز ہے کہ کسی خادم کو مسجد کے لئے اجرت پر رکھے لیکن اجرت اجرتِ مثل ہونی چاہئے۔

جب قاضی کے لئے یہ حکم ہے تو متولی کے لئے تو بطریق اولیٰ ہوگا کہ وہ ملازم رکھتے وقت وقف کی بہتری کو ملحوظ رکھے، اور جب تک روزانہ کی اجرت (دہاڑی) یا عارضی تقرر سے کام چل سکتا ہو وقف میں مستقل ملازم کا تقرر نہ کرے۔

اور جس طرح متولی کو ملازم رکھنے کا اختیار حاصل ہے اسی طرح بوقتِ ضرورت اسے معزول کرنے کا اختیار بھی اسے حاصل ہے۔ ردالمحتار میں ہے:

ففي لسان الحكام عن الخانية: اذا عرض للامام والمؤذن عذر منعه من المباشرة ستة أشهر للمتولي أن يعزله و يولي غيره. [1]

لسان الحکام میں خانیہ سے منقول ہے کہ اگر امام یا موذن کو کوئی ایسا عذر پیش آ جائے جو چھ مہینہ تک انہیں وقف کی خدمت سے روک دے تو متولی انہیں معزول کر سکتا ہے۔

۲۔ وقف کے لئے خریداری:

متولی وقف کی مملوکہ آمدنی سے وقف کے لئے اگر کوئی چیز خریدنا چاہے تو اسے اس کا اختیار بھی حاصل ہے البتہ دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں:

نمبر ا: واقف یا وقف کو چندہ دینے والے کی طرف سے اس رقم کو کسی مخصوص مد میں خرچ کرنے کی پابندی نہ ہو اگر اس طرح کی کوئی ہدایت ہوگی تو اس کی پابندی ضروری ہے مثال کے طور پر واقف نے وقف کی آمدنی یا چندہ دینے والے نے چندہ کی رقم وقف کی تعمیر پر خرچ کرنے کی ہدایت کی تو یہ آمدنی تعمیر کے علاوہ کسی اور مصرف میں استعمال کرنے کی اجازت نہیں وہ اس سے وقف کے لئے قالین وغیرہ نہیں خرید سکتا۔ علامہ ونشریسی المعیار المعرب میں تحریر فرماتے ہیں:

وسئل السرقسطي عن مسجد عليه الحبس والنص في الحبس المذكور للبناء والحصر و زيت الاستصباح ومايحتاج اليه المسجد

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۲۷/۴)

المذكور فهل يجوز لجماعة المسجد أن يعطوا من ذلك الحبس للامام بالمسجد المذكور أو للمؤذن أم لا؟

فأجاب: الحبس لايصرف فى غير المصرف الذى عينه محبسه له وهو البناء والحصر والزيت فلا تتعدى هذه الأشياء الى غيرها ومن بدل كان عليه اثم تبديله.[1]

علامہ سرقسطی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ایک مسجد کے کچھ اوقاف ہیں ان میں یہ صراحت ہے کہ یہ مسجد کی تعمیر، چٹائی اور تیل وغیرہ پر خرچ کئے جائیں گے تو کیا ان اوقاف سے امام مسجد اور موذن مسجد کو کچھ دیا جا سکتا ہے؟

علامہ نے جواب دیا کہ نہیں، واقف نے وقف کا جو مصرف متعین کر دیا ہے اس کے علاوہ کسی اور پر یہ وقف خرچ نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی اس مصرف کو تبدیل کرے گا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا۔

نمبر۲: دوسری بات یہ ملحوظ رہنی چاہئے کہ وقف کے لئے جو چیز خریدی جارہی ہے اس میں وقف کی مصلحت ہو۔ فتاویٰ خانیہ میں ہے:

مسجد له مستغلات وأوقاف، أراد المتولى أن يشترى من غلة الوقف للمسجد دهناً أو حصيراً أو حشيشاً أو اجرا أو جصاً لفرش المسجد أو حصىً، قالوا ان وسع الواقف ذلك للقيم وقال تفعل ماترى من مصلحة المسجد، كان له أن يشترى للمسجد ماشاء، وان لم يوسع ذلك ولكنه وقف لبناء المسجد وعمارة المسجد، ليس للقيم أن يشترى ماذكرنا، لأن هذا ليس من العمارة ولا من البناء، وان لم يعرف شرط الواقف فى ذلك، ينظر هذا القيم الى من كان قبله، فان كانوا يشترون من أوقاف المسجد الدهن والحصير والحشيش والأجر وماذكرنا، كان للقيم أن يفعل ذلك والافلا، وكذا فى

---

(۱) الونشريسى، محمد بن يحيىٰ الونشريسى ۹۱۴ھ. المعيار المعرب، بيروت، دار الغرب الاسلامى ۱۹۸۱م (۱۶۰/۷)

الهندية و التتارخانية. (۱)

ایک مسجد کے اوقاف بھی ہیں اور آمدنی بھی، متولی وقف کی آمدنی سے مسجد کے لئے تیل، چٹائی، گھانس، بلاک اور مسجد کے فرش کے لئے پتھر وغیرہ خریدنا چاہتا ہے علماء نے فرمایا کہ اگر واقف نے اسے مکمل اختیار دیا تھا تو اس کے لئے گنجائش ہے اور اگر مکمل اختیار نہیں دیا تھا تو اگر یہ تعمیر مسجد کے لئے وقف ہے تو ان چیزوں کے خریدنے کی گنجائش نہیں کیونکہ ان کا تعلق تعمیر سے نہیں ہے، اور واقف نے تعمیر وغیرہ کی کوئی شرط نہیں لگائی تھی تو متولی اپنے سے پہلے متولیین کا عمل دیکھے اگر وہ مسجد کے اوقاف سے یہ چیزیں خریدتے تھے تو وہ بھی خرید سکتا ہے ورنہ نہیں۔

کسی چیز کا مصالحِ وقف سے ہونا عرف پر مبنی ہے:

کیا چیز وقف کے مصالح میں داخل ہے اور کونسی چیز داخل نہیں؟ اس کا مدار عرف پر ہے، جس زمانہ اور جگہ میں وہ وقف موجود ہے اس زمانہ اور جگہ کے عرف میں جن جن چیزوں کو اس وقف کے مصالح میں سمجھا جاتا ہو متولی کے لئے وہ چیزیں وقف کے لئے خریدنا جائز ہے اور جنہیں وقف کے مصالح میں سے نہیں سمجھا جاتا انہیں خریدنا جائز نہیں ہوگا۔

مثال کے طور پر علامہ ابن نجیمؒ نے البحر الرائق میں لکھا ہے کہ پنکھا (مروحۃ) وقف کے مصالح میں سے نہیں ہے، فرماتے ہیں:

> ففي القنية قال كتبت الى المشائخ ورمز للقاضي عبد الجبار وشهاب الـدين الامـامـي هـل للقيم شراء المرواح من مصالح المسجد فقال لاثـم رمز للعلاء الترجماني فقال الدهن والحصير والمرواح ليس من مـصـالـح الـمسـجـد وانـما مصالحه عمارته ثم رمز لابي حامد وقال الـدهـن والـحـصـيـر مـن مصالحه دون المرواح قال يعني مولانا بديع الدين وهو أشبه للصواب وأقرب الى غرض الواقف. (۲)

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۲۹۵. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲۹۱/۳)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۱۲/۵)

قنیہ میں ہے کہ میں نے قاضی عبد الجبار اور شہاب الدین امامی سے پوچھا کہ کیا متولی کے لئے مصالح مسجد کے لئے مخصوص آمدنی سے پنکھا خریدنا جائز ہے؟ دونوں نے فرمایا کہ نہیں، پھر صاحب قنیہ نے علاء ترجمانی کے حوالہ سے نقل کیا کہ تیل، چٹائی اور پنکھے مسجد کی مصالح میں داخل نہیں، مسجد کی مصالح اس کی عمارت ہے پھر صاحب قنیہ نے ابوحامد کے حوالہ سے نقل کیا کہ تیل اور چٹائی تو مسجد کی مصالح میں داخل ہیں لیکن پنکھا نہیں، ہمارے آقا بدیع الزمان فرمایا کرتے تھے امام ابوحامد کی بات زیادہ صحیح ہے اور واقف کی غرض کے زیادہ قریب ہے۔

یہ بات علامہ کے زمانہ اور بلاد کے عرف کے مطابق تو ہوسکتی ہے لیکن آج کل پنکھے مساجد واوقاف کے اہم مصالح میں داخل ہیں، اور وقف کرتے وقت واقف کی طرف سے اور چندہ دیتے وقت چندہ دینے والے کی طرف سے دلالۃً اس کی خریداری کی بھی اجازت ہوتی ہے، آج بغیر پنکھے کے کسی گھر کا تصور نہیں کیا جاسکتا، مسجد میں تو اس کا بطریق اولیٰ انتظام ہونا چاہئے، بدلتے ہوئے عرف وحالات کا لحاظ رکھنا مفتی کے لئے بہت ضروری ہے، علامہ ابن عابدین اپنے رسالہ نشر العرف میں تحریر فرماتے ہیں:

فان قلت: العرف يتغير مرة بعد مرة فلو حدث عرف اخر لم يقع فی الزمان السابق، فهل يسوغ للمفتى مخالفة المنصوص واتباع العرف الحادث؟

قلت: نعم فان المتاخرين الذين خالفوا المنصوص فی المسائل المارة لم يخالفوه الا لحدوث عرف بعد زمن الامام، فللمفتى اتباع عرفه الحادث فی الالفاظ العرفية، وكذا فی الاحكام التی بناها المجتهد علی ماكان فی عرف زمانه، وتغير عرفه الی عرف اخر اقتداءً بهم، لكن بعد أن يكون المفتی ممن له رأی و نظر صحيح ومعرفة بقواعد الشرع حتی يميز بين العرف الذی يجوز بناء الاحكام عليه وبين غيره.(۱)

اگر آپ یہ سوال کریں کہ عرف تو بدلتا رہتا ہے اگر ایک نیا عرف رائج ہوگیا جو پہلے زمانہ میں نہیں تھا تو کیا مفتی کے لئے فقہاء کرام کی منصوص آراء سے ہٹ کر نئے عرف کی اتباع جائز ہے؟

---

(۱) الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. مجموعه رسائل ابن عابدین، لاهور، سهیل اکیڈمی ۱۳۹۶ھ (رساله نشر العرف)

اس کا جواب یہ ہے کہ جائز ہے، متاخرین نے بہت سے مسائل میں جن کا ذکر پہلے گذرا ہے متقدمین کی منصوص آراء سے اختلاف کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک نیا عرف پیدا ہوگیا جو کہ امام کے زمانہ میں نہیں تھا، الفاظ عرفیہ میں اور ان مسائل میں جنہیں مجتہد نے عرف ہی پر مبنی رکھا ہے ان میں مفتی کو اپنے زمانہ کے جدید عرف کا ہی اتباع کرنا چاہئے لیکن شرط یہ ہے کہ مفتی ایسا ہو جو ذی رائے اور صاحب بصیرت ہو اور شریعت کے قواعد سے خوب واقف ہوتا کہ وہ اس عرف میں جس پر احکام کی بنیاد رکھنا درست ہے اور اس عرف میں جس پر احکام کی بنیاد رکھنا درست نہیں ہے فرق کر سکے۔

ایک ہی زمانہ میں مختلف جگہوں کے حالات کے اعتبار سے وقف کی مصلحت مختلف ہوسکتی ہے مثال کے طور پر ایک مسجد کوئٹہ میں ہے، جہاں سردیوں میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر جاتا ہے اور ایک مسجد کراچی میں ہے جہاں سردی زیادہ نہیں پڑتی۔

کوئٹہ کی مسجد کے لئے اگر متولی ہیٹر (سخان) خریدنا چاہے تو اسے اس کی اجازت ہوگی لیکن کراچی کی مسجد کے لئے ہیٹر خریدنا چاہے تو ممکن ہے اسے اجازت نہ دی جائے، کیونکہ کوئٹہ کی آب وہوا کے لحاظ سے ہیٹر مسجد کی مصلحت میں داخل ہے لیکن کراچی کی آب وہوا کے اعتبار سے ہیٹر مصالح میں داخل نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وقف کے لئے خریداری کرتے وقت وقف کی مصلحت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور مصالح وقف میں کوئی لگی بندھی اشیاء داخل نہیں ہیں اور اس کا مدار اس زمانہ اور جگہ کے عرف پر ہے جہاں یہ وقف واقع ہے۔

مصالحِ مسجد کے علاوہ متولی وقف کی زائد آمدنی سے وقف کے لئے مستغلات یعنی ایسی جائیدادیں، گھر یا دوکان یا کسی اور شکل میں خرید سکتا ہے جن کے ذریعہ وقف کی آمدنی کی کوئی صورت بنے۔

الاسعاف میں ہے:

ولو اشترى المتولي بما فضل من غلة وقف المسجد حانوتاً أو مستغلاً اخر جاز لأن هذا من مصالح المسجد. (۱)

اگر متولی مسجد کی زائد آمدنی سے کوئی دوکان یا آمدنی دینے والی اور کوئی جگہ خریدے تو یہ جائز ہے کیونکہ یہ مسجد کی مصالح میں داخل ہے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۵۶)

۳۔ وقف کی آمدنی سے قرض دینا:

متولی اگر وقف کی زائد آمدنی اس ارادہ سے کسی کو قرض دے کہ اس میں حفاظت زیادہ ہے، مقروض کے ذمہ تو قرض کی ادائیگی بہرحال لازم ہے جبکہ یہ آمدنی اگر متولی کے پاس بلاتعدی ہلاک ہو جائے تو اس کا ضمان لازم نہیں تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

أراد المتولى أن يقرض مافضل من غلة الوقف ذكر فى وصايا أبى الليث: رجوت أن يكون ذلك واسعا اذا كان ذلك أصلح وأحرز للغلة من امساك الغلة. [1]

متولی چاہتا ہے کہ وقف کی زائد آمدنی قرض دیدے تو کیا یہ جائز ہے؟ وصایا ابی اللیثؒ میں ہے کہ میں توقع رکھتا ہوں کہ اس کی گنجائش ہونی چاہئے بشرطیکہ قرض دینے میں وقف کی آمدنی کی حفاظت اور مصلحت اسے جمع رکھنے کی نسبت زیادہ ہو۔

البتہ اگر یہ ارادہ نہ ہو بلکہ محض کسی کو سہولت پہنچانے کے لئے قرض دیا جائے تو اس میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

قال فى القنية طالب القيم أهل المحلة أن يقرض من مال المسجد للامام فأبى فأمره القاضى به فأقرضه ثم مات مفلساً لايضمن القيم اه مع أن القيم ليس له اقراض مال المسجد قال فى جامع الفصولين ليس للمتولى ايداع مال الوقف والمسجد الا ممن فى عياله ولا اقراضه فلو اقرضه ضمن وكذا المستقرض و ذكر أن القيم لو أقرض مال المسجد لياخذه عند الحاجة وهو أحرز من امساكه فلا بأس به وفى عمدة يسع للمتولى اقراض مافضل من غلة الوقف لو أحرز. [2]

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوى التتارخانيه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۸۹۰/۵)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۳۹/۵) وكذا فى تنقيح الحامدية (۲۴۰/۱)

اہل محلّہ نے متولی سے مطالبہ کیا کہ وہ مسجد کا مال امام کو قرض دیدے اس نے انکار کیا لیکن قاضی نے امام کو قرض دینے کا حکم دیا چنانچہ اس نے دیدیا اس کے بعد امام مفلس ہو کر مر گیا تو متولی ضامن نہیں ہوگا، جبکہ متولی کے لئے مسجد کا مال قرض دینا جائز نہیں، جامع الفصولین میں ہے کہ متولی کیلئے وقف کا مال اپنے اہل وعیال کے علاوہ کسی اور کے پاس ودیعت رکھوانا جائز نہیں اسی طرح اسے قرض دینا بھی جائز نہیں، قرض دیا تو ضامن ہوگا، جامع الفصولین ہی میں ہے کہ اگر متولی مسجد کا مال کسی کو قرض دیدے تا کہ ضرورت پڑنے پر اس سے لے لے اور قرض دینے میں مال کی زیادہ حفاظت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، عمدہ میں ہے کہ وقف کا زائد مال قرض دینے کی متولی کے لئے گنجائش ہے بشرطیکہ اس میں حفاظت زیادہ ہو۔

قرض دینے کی شرائط:

احقر کو راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کو سہولت پہنچانے کے ارادہ سے قرض دیا جائے تو درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہونا چاہئے:

۱۔ وقف کے پاس اس کی ضرورت سے زائد آمدنی موجود ہو۔

۲۔ قرض کی واپسی محفوظ بنانے کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں جس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(الف) مقروض سے کوئی رہن لیا جائے۔

(ب) مقروض سے قرض کی ادائیگی کی تاریخ کا پہلے سے (Post Dated) چیک لے لیا جائے، یہ چیک دینے کے بعد اگر مقررہ تاریخ کو وہ ادائیگی نہیں کرتا کہ اس کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہ ہو تو یہ قانوناً جرم ہے اس کی بنیاد پر متولی اس کے خلاف ایف آئی آر درج کروا کر عدالتی چارہ جوئی کرسکتا ہے۔

(ج) مقروض سے قرض کے بقدر رقم کا اسٹامپ پیپر سائن کروایا جائے۔

(د) اگر قرض لینے والا وقف ہی کا ملازم ہے تو اس سے تحریری طور پر یہ اختیار لے لیا جائے کہ متولی اس کی ہر مہینہ کی تنخواہ سے قرض کی مد میں اتنی رقم کاٹے گا۔

(ہ) تحریری دستاویز تیار کئے بغیر متولی کسی کو قرض نہ دے اس دستاویز پر گواہی کا بھی اہتمام کیا جائے۔

یہ تمام تدابیر یا ان میں سے ممکنہ تدابیر اختیار کر کے قرض کی واپسی کو محفوظ بنایا جاسکتا ہے اور درحقیقت

یہ دونوں فریق کی آراء میں تطبیق کی بھی ایک صورت ہے جو حضرات فقہاء کرام منع فرماتے ہیں وہ اس اندیشہ کے پیش نظر منع فرماتے ہیں کہ کہیں وقف کی آمدنی ضائع نہ ہو جائے اور جو اجازت دیتے ہیں وہ وقف کی ضرورت سے زائد ہونے کو ملحوظ رکھتے ہیں ہماری تجویز کردہ شرائط کی وجہ سے دونوں آراء پر عمل ہو سکے گا۔

عام مسلمانوں کی منفعت کے لئے قرض دینا:

عام مسلمانوں کے مصالح کیلئے اگر وقف کی زائد آمدنی قرض دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس کی فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اجازت دی ہے۔تتارخانیہ میں ہے:

وفی فتاویٰ الفضلی: مال موقوف علی سبیل الخیر والفقراء بغیر أعیانهم و مال موقوف علی المسجد الجامع فاجتمعت من غلتهما ثم نابت الاسلام نائبة مثل حادثة الروم واحتیج الی النفقة فی تلک الحادثة: أما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان لم یکن للمسجد حاجة للحال فللقاضی أن یصرفه فی ذلک، لکن علی وجه القرض فیکون دینا علی مال الفیئ.[1]

فتاویٰ فضلی میں ہے کہ راہ خیر اور فقراء پر وقف کیا ہوا مال ہے اسی طرح جامع مسجد پر وقف شدہ مال موجود ہے، ان کی آمدنی کچھ جمع ہوگئی، اتنے میں اسلام پر کوئی اجتماعی مصیبت آگئی کہ مثلاً رومیوں نے حملہ کر دیا اس کے لئے رقم کی ضرورت پیش آگئی تو مسجد جامع کا موقوف مال اس میں قاضی کے لئے خرچ کرنا جائز ہے بشرطیکہ مسجد کو فی الحال ضرورت نہ ہو، یہ خرچ قرض کے طور پر ہوگا، مال فیئ پر مسجد کا قرض ہوگا۔

متولی کا خود وقف سے قرض لینا:

متولی اپنی ذاتی ضرورت کے لئے اگر وقف سے قرض لے تو اسے پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا کیونکہ اس میں تہمت کا زیادہ اندیشہ ہے اس لئے متولی کو اس سے احتراز ہی کرنا چاہئے۔

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۸۸۰/۵)

علامہ اندریتیؒ لکھتے ہیں:

ولو أراد أن يصرف فضل الغلة الى حوائجه على أن يؤديه اذا احتيج الى العمارة فليس له ذلک، وينبغي أن ينتزه غاية التنزه، فان فعل مع ذلک ثم انفق مثل ذلک في العمارة رجوت أن يكون مبرئا له عما وجب عليه، وفي فتاوى الفضلي: أنه يبرأ عن الضمان مطلقا.[1]

اگر متولی وقف کی زائد آمدنی اپنی ضرورت میں خرچ کرنا چاہے کہ جب وقف کو ضرورت پیش آئے گی وہ وقف کو ادا کردے گا تو اسے یہ اختیار حاصل نہیں حتی الامکان اس سے احتراز کرنا چاہئے، اس کے باوجود اس نے وقف کی زائد آمدنی اگر اپنی ضرورت میں خرچ کرلی اور پھر وقف کو یہ رقم ادا کردی تو مجھے امید ہے کہ وہ اپنے واجب سے بری الذمہ ہوجائے گا فتاویٰ فضلی میں ہے کہ وہ مطلقاً بری ہوجائے گا۔

البتہ اگر کبھی مجبوری میں قرض لینے کی نوبت آ بھی جائے تو متولی کو اپنے لئے بھی وہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جو ہم نے کسی اور کو قرض دینے کے سلسلے میں تحریر کی ہیں۔ نیز اسٹامپ پیپر، گواہوں کی گواہی، وقف کے لئے رہن اور ضامن وغیرہ کا بھی اہتمام کرلینا مناسب ہے تاکہ متولی کی موت کی صورت میں ورثاء سے اس کا مطالبہ کیا جاسکے۔

۴۔ مالِ وقف کا حوالہ یا کفالہ قبول کرنا:

متولی نے اگر کسی کو قرض دیا اور وہ شخص اس قرض کا کسی پر احالہ کرنا چاہے کہ میرے بجائے فلاں سے متولی یہ قرض وصول کرلے تو اگر محتال علیہ یعنی جس کی طرف حوالہ کیا جارہا ہے وہ مالی لحاظ سے مدیون سے بہتر ہو اور اس سے قرض وصول ہونے کا زیادہ امکان ہو تو متولی کے لئے یہ حوالہ قبول کرنا جائز ہے اسی طرح اگر متولی مدیون سے کفیل لینا چاہے تو وہ بھی جائز ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

في الوالوالجية: للمتولي أن يحتال بمال الوقف على انسان اذا كان مليا وان أخذ كفيلا كان أحب الي.[2]

---

(۱) الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوى التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۸۸۰/۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۰/۵)

ولوالجیہ میں ہے: متولی کے لئے جائز ہے کہ وہ وقف کے مال کا حوالہ قبول کرے بشرطیکہ جس پر حوالہ کیا جا رہا ہے وہ مالدار ہو اور اگر متولی وقف کے مال کے عوض کوئی کفیل قبول کر لے تو یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔

۵۔ وقف کے لئے قرض لینا (استدانہ):

متولی وقف کے لئے قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر واقف نے وقف کرتے وقت متولی کو بوقت ضرورت وقف کے لئے قرض لینے کی اجازت دی تھی تو ایسی صورت میں بالاتفاق متولی ضرورت کے وقت وقف کے لئے قرض لے سکتا ہے اور اس کی ادائیگی وقف کے ذمہ ہوگی۔

المحیط البرہانی میں ہے:

قیم وقف طلب منه الجبایات والخراج ولیس فی یده من مال الوقف شیئاً فأراد أن یستدین، فهٰذا علی وجهین: ان أمره الواقف بالاستدانة فله ذلک، وان لم یأمره بالاستدانة فقد اختلف المشایخ فیه. [1]

متولیِ وقف سے وقف کے اوپر واجب شدہ خراج اور ٹیکس مانگا گیا، متولی کے پاس مالِ وقف میں سے کچھ بھی نہیں ہے وہ قرض لینا چاہتا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ اس کی دو صورتیں ہیں اگر واقف نے اسے قرض لینے کی اجازت دی تھی تو وہ قرض لے سکتا ہے اور اگر اجازت نہیں دی تھی تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔

اگر واقف کی طرف سے صراحۃً اجازت نہ ہو تو اس میں اختلاف ہے امام ہلال الرأیؒ کی رائے تو یہ ہے کہ متولی وقف کے لئے قرض نہیں لے سکتا اور اگر لے گا تو اس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہوگی۔

علامہ طرسوسیؒ امام ہلال الرأی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ذکر هلال فی وقفه قال قلت: أرایت الصدقة اذا احتاجت الی العمارة ولم یکن عند القائم بأمرها مایعمرها أتری له أن یستدین علیها قال لا. قلت: لم؟ قال انما تجعل العمارة فی الغلة ولم تجعل فی شیئی سوی ذلک. [2]

---

(۱) ابن مازه البخاری، برهان الدن ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۹/۳۹)

(۲) الطرسوسی، ابراهیم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۱۰۶)

امام ہلالؒ نے اپنی وقف کے موضوع پر کتاب میں لکھا ہے: اگر وقف کو تعمیر کی ضرورت ہے اور متولی وقف کے پاس تعمیر کے لئے رقم نہیں ہے تو کیا اس کے لئے وقف کی تعمیر کی غرض سے قرض لینا جائز ہے؟ امام نے فرمایا نہیں، سائل نے پوچھا کیوں؟ امام نے فرمایا تعمیر وقف صرف اس کی آمدنی سے ہوسکتی ہے اس کے علاوہ کسی اور رقم سے نہیں ہوسکتی۔

علامہ شامیؒ اس کی وجہ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لأن الدین لایثبت ابتداءً الا فی الذمة ...... أما الوقف فلا ذمة له والفقراء وان کانت لهم ذمة لکن لکثرتهم لاتتصور مطالبتهم، فلایثبت الا علی القیم، وما وجب علیه لایملک قضاء ہ من غلة للفقراء ذکرہ هلال وهذا هو القیاس. (۱)

دین تو ذمہ میں ثابت ہوتا ہے، وقف کا تو کوئی ذمہ نہیں، فقراء ان کا اگرچہ ذمہ ہے لیکن ان کی کثرت کی وجہ سے ان سب سے مطالبہ کرنا ممکن نہیں، لہٰذا یہ دین متولی ہی کے ذمہ ثابت ہوگا اور جو چیز متولی کے ذمہ ثابت ہو وہ اسے وقف کی اس آمدنی سے جو فقراء کے لئے مخصوص ہے ادا نہیں کرسکتا، یہ وجہ امام ہلالؒ نے ذکر کی ہے اور یہی قیاس کا تقاضہ ہے۔

فقیہ ابو اللیثؒ کے نزدیک ضرورت کے وقت متولی وقف کے لئے قرض لے سکتا ہے۔ اسی رائے کو جمہور فقہاء، متاخرین نے چند شرائط کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ (۲)

علامہ طرسوی رحمہ اللہ اسے ترجیح دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فحاصل هذا أن فی الاستدانة اختلافا بین هلال وبین اللیث والناطفی والذی یظهر ان ماقاله هلال قیاس وما ذهب الیه أبو اللیث والناطفی استحسان حفظاً للاوقاف من الخراب وانقطاع الثواب عن الواقف

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۹)

(۲) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۲۱۰) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ام سعید کپمنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۹) ابن مازه البخاری، برهان الدین ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۲ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۹/۳۹)

والراجح عندی ماقاله أبو الليث والناطفی وعمل الناس عليه و عمل من أدركناه من القضاة وهو حسن. [1]

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ وقف کے لئے قرض لینے میں اختلاف ہے امام ہلال اور ابواللیث وناطفیؒ کے درمیان، ظاہری بات یہ ہے کہ امام ہلالؒ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ قیاس ہے اور امام ابواللیث اور ناطفی کا موقف استحسان ہے اس کی وجہ وقف کو ویران ہونے سے بچانا اور واقف کے ثواب کو منقطع ہونے سے بچانا ہے، انہی کا موقف میرے نزدیک راجح ہے اس پر لوگوں کا عمل ہے جن قضاۃ کو ہم نے پایا ان کا عمل بھی اسی پر تھا اور یہی بہترین رائے ہے۔

حنبلی فقیہ علامہ بہوتی لکھتے ہیں:

وللناظر الاستدانة علی الوقف بلا اذن حاكم كسائر تصرفاته لمصلحة كشرائه للوقف نسيئة أو بنقد لم يعينه لأن الناظر مؤتمن مطلق التصرف فالاذن والائتمان ثابتان. [2]

متولی کے لئے حاکم کی اجازت کے بغیر بھی وقف کی مصلحت کے لئے قرض لینا جائز ہے دیگر تصرفات کی طرح جیسے وقف کے لئے کوئی چیز ادھار خریدنے کی ضرورت پیش آ گئی کیونکہ متولی امین ہے اسے تمام تصرفات کی اجازت ہے جب اذن اور ائتمان دونوں موجود ہے تو وہ وقف کے لئے بوقت مصلحت قرض بھی لے سکتا ہے۔

مالکی فقیہ علامہ دسوقیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو التزم حين أخذ النظر أن يصرف علی الوقف من ماله ان احتاج لم يلزمه ذلک وله الرجوع بما صرفه وله أن يقترض لمصلحة الوقف من غير اذن الحاكم ويصدق فی ذلک. [3]

---

(۱) الطرسوسی، ابراهيم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶ء (۱۰۸)

(۲) البهوتی، منصور بن يونس بن ادريس البهوتی ۱۰۵۱ھ. كشاف القناع عن متن الاقناع، مكة المكرمة، مطبعة الحكومة، الطبعة الاولىٰ ۱۳۹۴ھ (۲۹۵/۴)

(۳) الدسوقی، شمس الدين محمد عرفه الدسوقی. حاشية الدسوقی علی الشرح الكبير، بيروت، دار الفكر (۸۹/۴)

تولیت سنبھالتے وقت اگر متولی نے یہ التزام کیا تھا کہ بوقت ضرورت وہ اپنے پاس سے وقف پر خرچ کرے گا تو یہ اس کے ذمہ لازم نہیں ہوا اس کے لئے جائز ہے کہ اس نے جو خرچ کیا اس کا وقف کے مال پر رجوع کرلے، وقف کی مصلحت کے لئے حاکم کی اجازت کے بغیر قرض لینا بھی اس کے لئے جائز ہے اور اس سلسلہ میں اس کی تصدیق بھی کی جائے گی۔

وقف کے لئے قرض لینے کی شرائط:

البتہ فقہاء کرام نے اس کے لئے کچھ شرائط بیان کی ہیں قرض لیتے وقت ان کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے:

۱۔ وقف کی ضرورت ایسی ہو کہ اگر اسے پورا نہ کیا جائے تو وقف کے معطل ہونے کا اور ویران ہونے کا اندیشہ ہو، جیسے وقف کی ضروری تعمیر، وقف کے ایسے ملازمین کی تنخواہ جن کے نہ ہونے کی وجہ سے وقف کے معطل ہونے کا اندیشہ ہو، جیسے امام، خطیب، موذن، وقف کا خادم، چوکیدار وغیرہ، اسی طرح وقف کے غیر تعمیری اخراجات جن کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے وقف کا ضررِ بیّن لازم آتا ہو جیسے مسجد کے لئے لائٹ کا انتظام، پانی کا انتظام اور بچھانے کے لئے دریاں وغیرہ۔ ان ضروریات کے لئے قرض لینا جائز ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

وهو المختار انه اذا لم يكن من الاستدانة بدتجوز بأمر القاضي ان لم يكن بعيداً عنه، لأن ولايته أعم في مصالح المسلمين وقيل تجوز مطلقاً للعمارة، والمعتمد في المذهب الأول، أما ماله منه بد كالصرف على المستحقين فلاكما في القنية الا الامام والخطيب، والمؤذن فيما يظهر لقوله في جامع الفصولين لضرورة مصالح المسجد اه والا للحصر والزيت بناء على القول بأنهما من المصالح وهو الراجح هذا خلاصة ما أطال به البحر. [1]

راجح یہی ہے کہ اگر وقف کے لئے قرض لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ ہو تو اگر متولی قاضی سے دور نہ ہو تو قاضی کی اجازت سے قرض لینا جائز ہے، کیونکہ قاضی کو مسلمانوں کے

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (٤٣٩/٤)

مصالح میں ولایت عامہ حاصل ہے ایک قول یہ ہے کہ وقف کی تعمیر کے لئے قاضی کی اجازت کے بغیر بھی قرض لینا جائز ہے لیکن راجح پہلی ہی بات ہے البتہ جہاں قرض لئے بغیر کام چل سکتا ہو وہاں قرض لینا جائز نہیں ہے جیسے مستحقین کو دینے کے لئے، ہاں امام، خطیب اور موذن کو دینے کے لئے قرض لیا جاسکتا ہے کیونکہ جامع الفصولین میں مصالح مسجد کی ضرورت کے لئے قرض لینے کی اجازت دی گئی ہے اسی طرح چٹائی اور تیل کے لئے قرض لینا جائز ہے اس قول پر جس کے مطابق یہ مصالح مسجد میں سے ہیں، وہی راجح ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

والمتعمد فی المذهب ان كان له منه بد لایستدین مطلقا وان كان لابدله فان كان بأمر القاضی جاز والا فلا والعمارة لابدلها فيستدين لها بأمر القاضی وأما غير العمارة فان كان للصرف على المستحقين لاتجوز الاستدانه ولو بأذن القاضی لأن له منه بدا. [۱]

معتمد بات یہ ہے کہ اگر وقف کی ضرورت ایسی ہے جس سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے تو متولی بہرصورت اس کے لئے قرض نہیں لے سکتا، اور اگر صرفِ نظر نہ کیا جاسکتا ہو تو قاضی کی اجازت سے جائز ہے ورنہ نہیں، وقف کی تعمیر سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا لہٰذا قاضی کی اجازت سے تعمیر کے لئے قرض لے سکتا ہے، تعمیر کے علاوہ اگر مستحقین وقف کو دینے کے لئے قرض لے تو اس کی اجازت نہیں اگرچہ قاضی اجازت دیدے کیونکہ انہیں نہ دینے میں وقف کے تعطل کا اندیشہ نہیں ہے۔

۲۔ وقف کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قرض کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہ ہو، اگر کسی اور طریقہ سے یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہو تو بھی قرض لینا جائز نہیں جیسے وقف کے ملازمین کو تنخواہ دینی ہے اور وقف کے پاس آمدنی نہیں ہے تو متولی پہلے تو یہ کوشش کرے کہ وقف کی نوعیت اگر ایسی ہے کہ اسے کرایہ پر دیا جاسکتا ہے تو اسے کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرے اور اس سے ملازمین کو تنخواہ دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مجبوری میں قرض لے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۱۱/۵)

صاحب اشباہ لکھتے ہیں:

الاستدانة علی الوقف لاتجوز الا اذا احتیج الیها لمصلحة الوقف کتعمیر وشراء بذر فتجوز بشرطین: الأول: اذن القاضی، الثانی: أن لاتتیسر اجارة العین والصرف من أجرتها کما حرره ابن وهبان. (۱)

وقف کے لئے قرض لینا جائز نہیں ہے الا یہ کہ وقف کی مصلحت کے لئے قرض لینے کی ضرورت پیش آئے جیسے تعمیر کرنی ہو یا زراعت کے لئے بیج خریدنی ہو، ایسی صورت میں قرض لینا دو شرطوں کے ساتھ جائز ہے نمبر ۱ قاضی کی اجازت ہو، نمبر ۲ عین وقف کو اجارہ پر دے کر اس کی اجرت سے تعمیر ممکن نہ ہو جیسا کہ ابن وھبان نے لکھا ہے۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ قرض لینے کے لئے حاکم یا اس کے مجاز قاضی سے اجازت لی جائے۔

البحر الرائق میں ہے:

والأحوط فی هذه الصورة کونها بأمر الحاکم لأن ولایة الحاکم أعم فی مصالح المسلمین من ولایته الا أن یکون بعیداً عن الحاکم ولایمکنه الحضور فلا بأس بأن یستدین بنفسه. (۲)

اَحوط یہ ہے کہ قرض حاکم کی اجازت سے لیا جائے کیونکہ حاکم کو مصالح مسلمین میں ولایہ عامہ حاصل ہے جبکہ متولی کو ولایہ عامہ حاصل نہیں، الا یہ کہ متولی حاکم سے دور ہو اور اس کے لئے حاکم کے پاس آکر اجازت لینا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں قاضی کی اجازت کے بغیر اس کے لئے خود ہی وقف کے لئے قرض لینا جائز ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

اذا لم یکن من الأستدانة بدتجوز بأمر القاضی ان لم یکن بعیداً منه، لأن ولایته أعم فی مصالح المسلمین. (۳)

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/۱۰۳)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۱۰)

(۳) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۹)

اگر قرض لئے بغیر کوئی صورت ممکن نہ ہو تو قاضی کی اجازت سے قرض لینا جائز ہے الا یہ کہ وہ قاضی سے دور ہو کیونکہ قاضی کو ولایت عامہ حاصل ہے۔

البتہ قاضی سے اجازت لینا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو جیسا کہ وہ قاضی سے بہت دور ہو اور اجازت حاصل کرنے تک وقف کی مصلحت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں یہ تیسری شرط نظر انداز کی جاسکتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کردہ دونوں عبارتوں میں صراحت ہے۔

اسی میں وہ صورت بھی داخل ہے کہ قاضی سے اجازت لینے کا جو طریقہ کار ہے وہ اتنا طویل اور پیچیدہ ہو کہ اس طریقہ کار کے مطابق اجازت حاصل کرنے تک وہ ضرورت فوت ہونے کا اندیشہ ہو جس کے لئے قرض لیا جارہا ہے، یا اسی طرح وقف ایسے علاقہ میں ہو کہ وہاں اوقاف کے امور قاضی کے دائرہ اختیار میں نہ آتے ہوں یا قاضی کے علم میں لانے میں وقف کے تعطل یا نقصان کا اندیشہ ہو تو مذکورہ بالا عبارات کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں اسے قاضی کی اجازت کے بغیر قرض لینے کا اختیار حاصل ہونا چاہئے۔

لیکن احقر کی رائے یہ ہے کہ ان صورتوں میں متولی کو قرض لینے کے لئے مکمل با اختیار بنانا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وقف کے لئے استدانہ (قرض لینا) کے جواز کے لئے ایسی ضرورت کا پیش آنا شرط ہے جس کی وجہ سے وقف کے تعطل کا اندیشہ ہو، اب اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی تو اعلیٰ اختیاراتی فرد یا محکمہ یا کمیٹی ہونی چاہئے، اگر متولی ہی پر فیصلہ چھوڑ دیا جائے تو یہ امکان کافی بڑھ جاتا ہے کہ معمولی امور کے لئے بھی قرض لے لیا جائے گا اور وقف پر ادائیگی کا بوجھ بڑھ جائے گا اور عدمِ ادائیگی کی صورت میں وقف پر دائنین کے قبضہ کر لینے کا بھی امکان پیدا ہو جائے گا۔

اس لئے احقر کی رائے یہ ہے کہ جہاں قاضی تک رسائی ممکن نہ ہو یا وقف کے امور قاضی کے دائرہ اختیار میں نہ آتے ہوں وہاں متدین معاملہ فہم مسلمانوں کی کمیٹی کا تعین ہونا چاہئے جس کی اجازت سے متولی وہ امور انجام دے جن کے لئے فقہاء کرام نے قاضی کی اجازت شرط قرار دی ہے۔ (اس کی مزید تفصیل اس باب کے آخر میں آئے گی)

خلاصہ:

یہاں متولی کے تمام اختیارات کو شمار کرنا تو ممکن نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ کام جس میں وقف کی بہتری ملحوظ ہو اور اس میں واقف کی عائد کردہ شرائط کی خلاف ورزی بھی لازم نہ آتی ہو، متولی کے لئے وہ

جائز ہے، دیکھئے اگر واقف نے زمین وقف کی ہے تو اس کا اصل حکم تو یہ ہے کہ اس میں زراعت کی جائے اور اس کے ذریعہ وقف کی آمدنی کا انتظام ہو لیکن اگر وہ زمین شہر کے قریب ہو اور اس میں گھر بنا کر کرایہ پر دینے میں زیادہ آمدنی حاصل ہونے کا امکان ہو تو متولی کے لئے اس میں گھر بنانا اور اسے کرایہ پر دینا جائز ہے کیونکہ اس میں وقف کا فائدہ زیادہ ہے۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

وليس له أن يبني في الأرض الموقوفة بيوتا لتستغل بالاجارة لان استغلال الارض بالزراعة فان كانت متصلة ببيوت المصر و ترغب الناس في استئجار بيوتها و الغلة من البيوت فوق غلة الزراعة جاز له حينئذ البناء لكون الاستغلال بهذا أنفع للفقراء. (۱)

متولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وقف زمین میں گھر بنائے تاکہ انہیں کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرے، کیونکہ زمین سے آمدنی کی صورت تو زراعت ہے البتہ اگر وہ زمین شہر کے قریب ہو اور لوگ اس میں بنے ہوئے گھروں کو اجارہ پر لینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہوں اور گھروں سے حاصل ہونے والی آمدنی زراعت کی آمدنی سے زیادہ ہو تو اس صورت میں اس کے لئے وقف زمین پر گھر تعمیر کر کے انہیں کرایہ پر دینا جائز ہے کیونکہ اس طرح کرایہ پر دینے میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے۔

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۵۸)

متولی کی تنخواہ

متولی وقف کی جوخدمات انجام دیتا ہےاس کےعوض اگروہ تنخواہ لیناچاہےتواس کی اسےاجازت ہے، کیونکہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کی حفاظت، ترقی اوراس کی آمدنی کےانتظام وحصول میں صرف کرتا ہے اور اپنا تمام تر وقت مصالح وقف ہی میں خرچ کرتا ہے اس لئے اگر وہ اپنی ان خدمات کے عوض اجرت/تنخواہ لیناچاہےتواسےاس کاحق حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے واضح دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقف والی حدیث ہے اس میں وقف کرتے وقت آپ نےفرمایا:

لاجناح علی من ولیه أن یأكل منه بالمعروف. (۱)

جوشخص اس وقف کا متولی بنے اس کے لئے مناسب انداز میں اس وقف سے کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح امام بخاریؒ نے ایک اورحدیث سےبھی متولی کی اجرت کاجوازثابت کیاہے،وہ حدیث یہ ہے:

عن أبی هر یرة رضـی الله عنـه أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لاتـقتسـم ورثتـی دیـناراً أولا درهما، ماتركت بعد نفقة نسائی ومؤنة عاملی فهو صدقة. (۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری میراث تقسیم نہیں ہوگی۔گھر والیوں کےنفقہ اور میرے عامل کےاخراجات سے جو بچے وہ صدقہ (وقف) ہے۔

---

(۱) البخاری، الامام ابوعبد الله محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دارنشر للكتب الاسلامیة (۳۹۹/۵ رقم الحدیث: ۲۷۷۲)

(۲) حواله بالا (۴۰۶/۵ رقم الحدیث: ۲۷۷٦)

اس حدیث پر امام بخاری نے "باب نفقة القيم للوقف" کے عنوان سے باب قائم فرمایا ہے، اس حدیث کے تحت حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

هو دال على مشروعية أجرة العامل على الوقف والمراد بالعامل في هذا الحديث القيم على الارض الخ. (۱)

یہ حدیث عامل علی الوقف کی اجرۃ کی مشروعیت پر دلالت کر رہی ہے، اور عامل سے مراد اس حدیث میں موقوفہ زمین کا قیم اور متولی ہے۔

علامہ قرطبیؒ نے متولی کی اجرۃ پر تعامل ناس نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

جرت العادة بأن العامل يأكل من ثمرة الوقف. حتى لو اشترط الواقف أن العامل لايأكل منه يستقبح ذلك منه. (۲)

عام معمول یہ چلا آرہا ہے کہ متولی وقف کی آمدنی میں سے کھاتا ہے حتی کہ اگر واقف یہ شرط لگادے کہ متولی وقف کی آمدنی میں سے کچھ نہیں لے گا تو اسے عرف میں برا سمجھا جاتا ہے۔

امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قلت: أرأيت رجلاً جعل أرضا له وحددها صدقة موقوفة لله تعالىٰ ابداً على وجوه سماها وقفا صحيحاً وجعل القيام بأمر هذا الوقف في حياته وبعد وفاته الى رجل وجعل لهذا الرجل من غلة هذا الوقف في كل سنة مالاً معلوما لقيامه بأمر هذا الوقف هل يجوز هذا؟ قال: هذا جائز قياسا على مافعله عمر بن الخطاب رضى الله عنه فيما جعل للقيم بصدقته اذا قال على أن لو لى هذه الصدقة أن يأكل منها غير متأثل مالاً وعلى ماجعله على بن أبى طالب رضى الله عنه للعبيد الذين كان وقفهم مع صدقته، يقومون بعمارة صدقته وهذا بمنزلة الأجراء والوكلاء في الوقف، ألا ترى أن لو الى الوقف أن يستاجر الأجراء لما

---

(۱) ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاهور، دار نشر للكتب الاسلامية (۴۰۶/۵)

(۲) حواله بالا (۴۰۱/۵)

یحتاج الیه من العمارة؟ وهذا شیئی قد کفینا مؤنة الاحتجاج له لأن عمل الناس علیه.[1]

میں نے دریافت کیا کہ ایک شخص نے متعین جہت پر وقف کیا اور اس کی تولیت ایک شخص کے سپرد کردی اور متولی کے لئے اس وقف کی آمدنی میں سے سالانہ کچھ مقرر کردیا تو کیا یہ جائز ہے؟ امام نے جواب دیا جائز ہے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے فرمادیا تھا کہ اس وقف کا متولی اس میں سے کھا سکتا ہے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان غلاموں کے لئے وظیفہ مقرر کیا تھا جنہیں انہوں نے اپنی زمین کے ساتھ وقف کیا تھا، یہ متولی اجیر اور وکیل کی طرح ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ وقف کے متولی کے لئے وقف کی تعمیر کروانے کے لئے مزدور اجرت پر رکھنا جائز ہے؟ یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے استدلال کے لئے کافی ہے اور اسی پر لوگوں کا عمل ہے۔

متولی کی تنخواہ کیا ہوگی اور اسے مقرر کرنے کا اختیار کسے ہے؟

متولی کی تنخواہ واقف مقرر کرسکتا ہے، اور اس کے اختیار میں ہے جو چاہے مقرر کرے اجرتِ مثل کے بقدر یا اس سے زائد ہو، امام خصافؒ لکھتے ہیں:

قلت: فما تقول ان کان الواقف قد جعل القیام بأمر هذه الصدقة الی رجل وجعل له علی القیام به مالاً معلوماً فی کل سنة وکان هذا المال الذی سماه الواقف لهذا الرجل اکثر من أجر مثله علی القیام به قال: هذا جائز له لاینظر فی هذا الی اجر مثله، ألا تری أنه لو سمی له مالاً معلوماً یأخذه فی کل سنة من غلة هذا الوقف ولم یقل أن ذلک له لقیامه بأمر هذا الوقف أما کان یجوز له ذلک؟ هذا جائز، ألا تری أنه لو جعل هذا الوقف علی رجل واحد وجعل غلته له مادام حیا وجعل القیام بأمر هذا الوقف الیه فاذا مات هذا الرجل کانت هذه الغلة

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م (۲۹۲)

للمساكين أو لقوم آخرين ثم تصير للمساكين أما يجوز ذلك؟ هذا كله جائز مطلق للواقف.[1]

میں نے دریافت کیا کہ واقف نے وقف کی نگرانی کے لئے ایک شخص کو مقرر کیا اور ہر سال اس کے لئے ایک مخصوص رقم متعین کردی جو کہ اس کی اجرت مثل سے زیادہ ہے کیا یہ جائز ہے؟ امام نے جواب دیا کہ یہ جائز ہے اس صورت میں اس کی اجرت مثل کی طرف نہیں دیکھا جائے گا۔

دیکھئے اگر واقف اس شخص کو تولیت کی ذمہ داری دیئے بغیر وقف کی آمدنی میں سے سالانہ اس کے لئے کچھ مخصوص کردیتا تو کیا یہ جائز نہ ہوتا؟ یہ بالکل جائز ہے تو متولی کے لئے اجرتِ مثل سے زیادہ مقرر کرنا بھی جائز ہونا چاہئے، اس کی مثال ایسی ہے کہ واقف کسی متعین شخص پر وقف کردے کہ جب تک وہ زندہ ہے اس وقف کی آمدنی اسے ملتی رہے گی، وقف کی تولیت بھی اسے حاصل ہوگی، جب اس کا انتقال ہوجائے گا تو پھر وقف کی آمدنی فقراء کو یا کچھ مخصوص لوگوں کو دی جائے گی، یہ صورت بالکل جائز ہے اور واقف کو اس کی اجازت حاصل ہے تو ہماری مبحوث عنہا صورت میں بھی اسے اجرتِ مثل سے زیادہ اجرت مقرر کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

اور اگر واقف کی طرف سے مقرر کردہ تنخواہ اجرتِ مثل سے کم ہو تو ایسی صورت میں متولی قاضی سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرسکتا ہے اور قاضی اس کی تنخواہ اتنی بڑھا سکتا ہے کہ عام طور پر متولی اوقاف کو جتنی تنخواہ ملتی ہے اتنی اس کی بھی ہوجائے، علامہ طرسوسیؒ نے اس پر بڑی نفیس بحث فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

ثم قوله "فان كان الذى جعله للقيم أكثر من أجر مثله قال هذا جائز" ولم يذكر اذا كان الذى جعله أقل من أجر مثله كيف يكون الحكم فيه هل يجوز للحاكم أن يزيده الى مقدار أجر مثله أولا؟ وذلك بشرط أن يطلب منه الناظر ذلك بطريقة: هذه المسألة لم أقف عليها ولا وجدت أحداً من الاصحاب ذكر سوىٰ مانقلته عن

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۹۷)

الخصاف من كون القدر الذى جعله الواقف أكثر من أجر المثل هل يجوز له أخذه أم لا . ولكن الذى يظهر أنه يجوز للحاكم أن يكمل له أجر مثله ويقتصد فى ذلك من غير توسع ولا كثرة فى القدر الذى يزيده بل بقدر أجر المثل فما دونه بقليل يتسامح فيه القوام غالباً نظراً للوقف، على أنى رأيت الزاهدى قد ذكر فى القنية مسألة يحسن أن يتمسك بها ويخرج عليها جوابنا هذا وهى: لو قال الامام للقاضى أن مرسومى المعين لايفى بنفقتى و نفقة عيالى فزاد القاضى فى مرسومه من أوقاف المسجد بغير رضا أهل المحلة والامام مستغن وغيره يؤم بالمرسوم المعهود قال تطيب له الزيادة اذا كان عالما تقيا، هذه عبارة القنية فقد جوز الزيادة للامام مع أن غيره يقوم مقامه بالوظيفة من غير زيادة فلان يجوز للناظر أولى لأن معلومه فى مقابلة عمل ليس هو بدل عن اقامة أمر دينى هو فرض عليه فالاولى أن يجوز أن يزاد لتكملة أجر مثله.[1]

اگر واقف نے متولی کی اجرت اجرتِ مثل سے کم مقرر کی تو کیا متولی کے مطالبہ پر قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کی اجرت میں اجرتِ مثل کی حد تک اضافہ کردے؟ اس سلسلہ میں مجھے کوئی واضح عبارت نہیں ملی، امام خصافؒ نے صرف اتنا نقل کیا ہے کہ اگر اس کی اجرت اجرتِ مثل سے زیادہ ہو تو اس کے لئے لینا جائز ہے یا نہیں، اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ قاضی کے لئے اجرتِ مثل کی حد تک یا اس کے آس پاس اضافہ کرنا جائز ہونا چاہئے، اس کی تائید قنیہ کے اس مسئلہ سے ہوتی ہے کہ اگر امامِ مسجد قاضی سے کہے کہ واقف نے میرا جو وظیفہ مقرر کیا ہے وہ میرے اور میرے گھر والوں کے لئے کافی نہیں ہے، اس میں اضافہ کیا جائے جبکہ دوسرا شخص واقف کے مقرر کردہ وظیفہ ہی میں امامت کرنے کے لئے تیار ہے تو کیا قاضی پہلے امام کے وظیفہ میں اضافہ کرے گا؟ اس کا جواب دیا کہ ہاں اگر وہ عالم متقی ہو تو اس کے وظیفہ میں اضافہ کردیا جائے گا، اس مسئلہ میں باوجود اس کے کہ دوسرا شخص متعینہ

---

(۱) الطرسوسى، ابراهيم بن على الطرسوسى. انفع الوسائل، مطبع الشرق ١٩٢٦ م (١٣٢)

وظیفہ لے کر امامت کرنے کے لئے تیار ہے پہلے امام کے وظیفہ میں اضافہ کی اجازت دی گئی ہے متولی کی تنخواہ میں اضافہ تو بطریق اولیٰ جائز ہونا چاہئے کیونکہ ایک تو اس کی اجرت کسی ایسے امر دینی کے عوض نہیں ہے جو اس پر فرض ہو (بخلاف امام کے) دوسرے وہ تو اجرتِ مثل کی حد تک اضافہ کی درخواست کر رہا ہے۔

اسی میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ جس وقت واقف نے متولی کی اجرت طے کی تھی اس وقت تو وہ اجرت مثل تھی لیکن بعد میں مہنگائی کی وجہ سے یا متولی کی اہلیت میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے وہ مقررہ اجرت اجرتِ مثل سے کم ہوگئی تو بھی متولی اس میں اضافہ کی درخواست قاضی سے کرسکتا ہے۔

اور اگر واقف نے متولی کی اجرت مقرر نہ کی ہو یا متولی کا تقرر ہی واقف نے نہ کیا ہو تو ایسی صورت میں قاضی متولی کی تنخواہ مقرر کرسکتا ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اجرتِ مثل سے زیادہ تنخواہ مقرر نہ کی جائے، اگر اجرت مثل سے زیادہ تنخواہ مقرر کی جائے گی تو متولی کے لئے وہ لینا جائز نہیں ہوگا۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

وان كان منصوب القاضى فله أجر مثله. (۱)

اگر متولی قاضی کی طرف سے مقرر ہوتو اسے اس کی اجرت مثل ملے گی۔

علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ليس للقاضى أن يقرر وظيفة فى الوقف بغير شرط الواقف ولا يحل للمقرر الأخذ الا النظر على الوقف بأجر مثله. (۲)

قاضی کے لئے واقف کی شرط کے بغیر کسی کے لئے وقف میں سے وظیفہ مقرر کرنا جائز نہیں ہے اور جس کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس کے لئے لینا بھی جائز نہیں ہے سوائے وقف کی تولیت کے اگر وہ اجرت مثل پر ہو۔

علامہ دسوقیؒ لکھتے ہیں:

للقاضى أن يجعل للناظر شيئاً من الوقف اذا لم يكن له شيئى وافتاء

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹہ، مكتبہ رشيديہ (۲۴۴/۵)

(۲) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ایچ ایم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴۳۴/۴)

ابن عتاب بأن الناظر لایحل له اخذ شئی من غلة الوقف بل من بیت المال الا اذا عین الواقف له شیئا ضعیف. (۱)

قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ ناظر کے لئے وقف میں سے کچھ متعین کردے اگر واقف نے کچھ متعین نہ کیا ہو، ابن عتاب نے یہ جوفتویٰ دیا ہے کہ ناظر کے لئے وقف سے کچھ لینا جائز نہیں وہ بیت المال سے لے گا یہ بات ضعیف ہے۔

مواہب الجلیل میں ہے:

قال ابن عرفة عن ابن فتوح للقاضی أن یجعل لمن قدمه للنظر فی الأحباس رزقا معلوما فی کل شهر باجتهاده فی قدر ذلک بحسب عمله وفعله. (۲)

ابن عرفہ نے ابن فتوح سے نقل کیا ہے کہ جس شخص کو وقف کا متولی مقرر کیا جائے قاضی کے لئے اس کا کام دیکھتے ہوئے اس کے لئے ماہانہ تنخواہ مقرر کرنا جائز ہے۔

اگر متولی کی تنخواہ نہ واقف نے مقرر کی اور نہ ہی قاضی نے تو کیا ایسی صورت میں اسے وقف سے کچھ لینے کا استحقاق ہوگا؟

علامہ ابن نجیمؒ نے فقہاء کرام کی دونوں طرح کی عبارتیں نقل کی ہیں بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایسی صورت میں کچھ نہیں ملے گا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ملے گا، لکھتے ہیں:

واختلفوا هل یستحقه بلاتعیین القاضی فنقل فی القنیة أولاً ان القاضی لو نصب قیما مطلقا ولم یعین له أجرا فسعی فیه سنة فلا شئی له وثانیا أن القیم یستحق أجر مثل سعیه سواء شرط له القاضی أو أهل المحلة أجراً أولا لانه لایقبل القوامة ظاهراً الا بأجر المعهود کالمشروط. (۳)

---

(۱) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر (۸۸/۴)
(۲) الحطاب، ابو عبد الله محمد بن عبد الرحمن الحطاب، مواهب الجلیل، بیروت، دار الفکر ۱۳۹۸ھ (۴۰/۶)
(۳) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۴۴/۵)

اس میں اختلاف ہوا ہے کہ کیا قاضی کی طرف سے تنخواہ مقرر کئے بغیر متولی وقف سے کچھ لینے کا استحقاق رکھتا ہے یا نہیں؟ قنیہ میں نقل کیا گیا ہے کہ اگر قاضی نے متولی مقرر کیا اور اس کے لئے کوئی اجرت طے نہیں کی اور اس نے ایک سال تک کام کیا تو اسے کچھ نہیں ملے گا، جبکہ قنیہ ہی میں ایک دوسرا جزئیہ بھی ہے کہ متولی اپنے کام کے بقدر اجرت کا مستحق ہوگا قاضی یا اہل محلّہ نے اس کی اجرت مقرر کی ہو یا نہ کی ہو، کیونکہ عام طور پر تولیت بغیر اجرت کے قبول نہیں کی جاتی، اور معہود کالمشروط ہوتا ہے۔

ان دونوں طرح کی آراء میں علامہ شامیؒ تطبیق یہ دیتے ہیں کہ اگر وہ وقف ایسا ہو کہ اس میں یہ معمول چلا آرہا ہو کہ اس کا متولی اس قدر اجرت وصول کرتا ہے یا اس زمانہ میں عام طور پر متولیین کا اجرت لینے کا معمول ہو تو ایسی صورت میں بقدرِ عرف اجرت وصول کرنا متولی کے لئے جائز ہے اگرچہ واقف اور قاضی نے اس کی اجرت مقرر نہ کی ہو۔ اور اگر اجرت لینے کا عرف نہ ہو تو پھر بغیر واقف یا قاضی کے مقرر کئے ہوئے متولی اجرت نہیں لے سکتا۔

منحۃ الخالق میں علامہ رملیؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ قنیہ کی پہلی عبارت اس پر محمول ہے کہ وہاں متولی کا اجرت لینا معہود نہ ہو اور دوسری عبارت اس پر محمول ہے کہ اس کے لئے اجرت مقرر کی گئی ہو یا وہاں اجرت لینا معہود ہو۔[1] اور ردالمحتار میں تحریر فرماتے ہیں:

لكن أفتى فى الخيرية بأنه اذا كان فى ريع الوقف عوائد قديمة معهودة يتناولها الناظر بسعيه له طلبها لقول الأشباه عن اجارات الظهيرية والمعروف عرفا كالمشروط شرطا فهو صريح فى استحقاقه ماجرت به العادة اهـ. قلت: ويؤخذ مافى البحر من جواز أخذ الامام فاضل الشمع فى رمضان اذا خرجت به العادة وقد ظهر له أنه لاينافى ماذكره المصنف لأن هذا المتعارف أخذه من ريع الوقف بأن تعورف مثلاً أن هذا الوقف يأخذه متوليه عشر ريعه فحيث كان

---

(۱) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۴۴/۵)

قديما يجعل كأن الواقف شرطه له.[1]

خیر یہ میں فتویٰ اس پر دیا ہے کہ اگر وقف میں پہلے سے یہ معمول چلا آرہا ہو کہ متولی وقف اس میں سے کچھ مخصوص حصہ لیتا ہے تو اس متولی کے لئے بھی اس کا مطالبہ کرنا جائز ہے کیونکہ اشباہ میں قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ جو چیز عرفاً معروف ہو وہ ایسی ہے جیسے کہ اس کی شرط لگائی گئی ہو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ جتنی اجرت کا عرف چلا آرہا ہو یہ متولی وہ اجرت لے سکتا ہے، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی تائید بحر کے اس جزئیہ سے ہوتی ہے کہ جہاں یہ عرف ہو کہ رمضان میں جو شمع بچ جاتی ہو وہ امام لیتا ہے تو امام کے لئے وہ شمع لینا جائز ہے لہٰذا جہاں متولی کے اجرت لینے کا عرف ہو کہ متولی مثلاً وقف کی آمدنی کا دسواں حصہ لیتا ہو وہاں اسے یہ لینے کی اجازت حاصل ہوگی کیونکہ یہ پرانا عرف ایسا ہے گویا کہ واقف نے خود متولی کو دینے کی شرط لگائی ہے۔

یہی بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مدار عرف پر ہونا چاہئے اگر عرف میں عام طور پر متولی اجرت لئے بغیر کام نہ کرتے ہوں تو یہ متولی بھی اجرت کا حقدار ہوگا اگرچہ واقف یا قاضی نے اس کے لئے اجرت طے نہ کی ہو اور اگر وہاں اجرت لینے کا عرف نہ ہو تو پھر تعیین کے بغیر اجرت لینا جائز نہیں ہوگا۔

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴۵۰/۴)

متولی کا محاسبہ

اوقاف کی حفاظت کے لئے متولی کا محاسبہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے وقف کی آمدن اور خرچ کا حساب کتاب لیا جاتا رہے تاکہ خیانت کا احتمال کم سے کم ہوتا جائے اور واقف نے جس مقصد کے لئے وقف کیا ہے اسے بطریقہ اتم پورا کیا جاتا رہے، فقہاء کرامؒ نے عام حالات میں تو اجمالی حساب کتاب کو کافی سمجھا ہے اور اسے بھی ہر سال لازم قرار نہیں دیا۔

علامہ حصکفیؒ تحریر کرتے ہیں:

لاتلزم المحاسبة فی کل عام و یکتفی القاضی منه بالاجمال لو معروفا بالامانة ...... قلت وقدمنا فی الشرکة أن الشریک والمضارب والوصی والمتولی لایلزم بالتفصیل.[1]

متولی کا محاسبہ ہر سال لازم نہیں، اگر متولی امانت میں معروف ہے تو قاضی اجمالی محاسبہ پر اکتفا کرسکتا ہے، ہم نے شرکت کے باب میں بھی لکھا ہے کہ شریک، مضارب، وصی اور متولی کے ذمہ تفصیلی حساب کتاب دینا نہیں ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

وفی القنية وینبغی للقاضی أن یحاسب أمناء ه فیما فی ایدیهم من اموال الیتامیٰ لیعرف الخائن فیستبدله و کذا القوام علی الأوقاف ویقبل قولهم فی مقدار ماحصل فی أیدیهم من مقدار الغلات الوصی والقیم فیه سواء والأصل فیه أن القول قول القابض فی مقدار المقبوض وفیما یخبر من الانفاق علی الیتیم أو علی الضیعة ومؤنات الأراضی.[2]

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۴۸/۴)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۴۲/۵)

قنیہ میں ہے کہ قاضی کو اپنے امناء کا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے جن کے پاس یتیموں کا مال ہے تا کہ خائن امناء کا علم ہو سکے اور اسے بدلا جا سکے اسی طرح اوقاف کے جو متولی ہیں ان کا محاسبہ بھی قاضی کو کرتے رہنا چاہئے اور ان کے پاس جو آمدنی ہو اس میں ان کا قول قبول کر لینا چاہئے۔ اصل یہ ہے کہ مقدار مقبوض میں قابض ہی کا قول معتبر ہوتا ہے اسی طرح امین کا قول یتیم پر خرچ کئے جانے والے مال کے سلسلہ میں یا وقف زمین پر خرچ کئے جانے والے مال میں یا وقف زمین کے اخراجات کے سلسلہ میں قابض کا قول ہی معتبر ہوتا ہے۔

البتہ اگر متولی متہم ہو یا غیر امین ہو تو ایسی صورت میں قاضی اسے تفصیلی حساب کتاب پیش کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، اس کا طریقہ کار علامہ ابن نجیم بیان کرتے ہیں:

فان عرف بالامانة يقبل القاضي الاجمال ولايجبر على التفسير شيئا فشيئا، وان كان متهما يجبره القاضي على التفسير شيئا فشيئا ولا يحبسه ولكن يحضره يومين أو ثلاثة أو يخوفه ويهدده ان لم يفسر فان فعل والا يكتفى منه باليمين. (۱)

اگر متولی امانت میں معروف ہو تو قاضی اس کا قول اجمالاً بھی قبول کرے گا اسے ایک ایک چیز کی تفسیر پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اور اگر متولی متہم ہو تو قاضی اسے ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کرنے پر مجبور کرے گا، اسے قید تو نہیں کرے گا لیکن دو تین دن بعد اسے بلاتا رہے گا اور اسے کچھ ڈرا بھی سکتا ہے، اگر وہ بیان کر دے تو اچھی بات ہے ورنہ اس کی یمین پر اکتفا کیا جائے گا۔

متولی کے احتساب کے سلسلہ میں احقر کی رائے:

احقر یہ سمجھتا ہے کہ فقہاء کرامؒ نے متولی کے احتساب کے سلسلہ میں جو تفصیل بیان کی ہے یہ اپنے زمانہ کی خیریت کو دیکھتے ہوئے بیان کی ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ بھی نہیں کیونکہ یہ کوئی منصوص چیز تو ہے نہیں، ماخذ شریعہ میں غور کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں لیکن ہمارا زمانہ جہاں شر خیر پر غالب ہے، امانت و دیانت مفقود ہے اور خاص طور پر وہ محکمے جو حکومت کی نگرانی میں ہیں یا ذاتی طور پر ان کی خبر گیری

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۳/۵) وكذا في تنقيح الحامديه (۲۳۸/۱)

کرنے والا کوئی نہیں ہے ان میں بددیانتی اور کرپشن اپنے عروج پر ہے، اس ماحول اور معاشرے میں متولی کے احتساب کے سلسلہ میں فقہاء کرامؒ کی بیان کردہ اس تفصیل کو اگر اختیار کیا جائے گا تو نجی وحکومتی نگرانی کے تحت اوقاف میں بلا کسی روک ٹوک خیانت کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا اور وقف کے مستحقین جو پہلے ہی محرومی کا شکار ہیں مزید محرومی کا شکار ہو جائیں گے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ آج اوقاف کی تولیت باقاعدہ خفیہ نیلامی کے ذریعہ حاصل کی جارہی ہے، منہ بولی رقوم تولیت دینے والے حاصل کررہے ہیں، کیا یہ تولیت کا حصول نیک جذبات اور وقف کی خیرخواہی کے جذبہ کے تحت ہے؟ ہرگز نہیں ان لوگوں کی نگاہیں اوقاف کی آمدنی پر ہیں اور نیلامی پر یہ جتنا خرچ کررہے ہیں اس سے کہیں زیادہ بلکہ کئی گنا یہ ان اوقاف سے کمالیں گے، ایسی صورتحال میں فقہاء کرام کا ذکر کردہ اصولِ محاسبہ بلکہ رائج طریقہ احتساب بھی ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے بندہ کی تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ سب سے پہلے تو متولی کا تقرر کرتے وقت ان تمام شرائط کا لحاظ رکھا جائے جو ہم نے اس باب کے شروع میں تفصیل سے بیان کی ہیں، تاکہ ایسے افراد جن سے وقف کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا امکان ہے ان کی دخل اندازی کم سے کم ہو۔

۲۔ متولی وقف کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وقف کی املاک، آمدنی اور مصارف کے لئے باقاعدہ رجسٹر رکھے اور اس میں ایک ایک آمدنی اور ایک ایک مصرف کا اندراج کرے۔

۳۔ متولی وقف کو اس کا پابند بنایا جائے کہ ہر سال وہ منظور شدہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ فرم سے وقف کے جملہ حساب کتاب کا آڈٹ کرا کر اس کی رپورٹ حکومت کے پاس جمع کرایا کرے۔

۴۔ حکومت کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً وقف کی آمدنی ومصارف کو چیک کیا جاتا رہے اور اگر آڈٹ رپورٹ اور اصل صورتحال میں فرق ہو تو اس آڈٹ فرم کا لائسنس منسوخ کردیا جائے۔

۵۔ وقف کی آمدنی کے لئے اکاؤنٹ کھلوانا لازمی قرار دیا جائے اور اس اکاؤنٹ ہی کے ذریعہ تمام لین دین کیا جائے۔

۶۔ وقف میں اگر خیانت ثابت ہو جائے تو اس پر سخت سزا دی جائے اور اس کے لئے مناسب قانون سازی کی جائے۔

۷۔ اوقاف کے معاملات کی نگرانی اور مقدمات کے لئے اسپیشل عدالتیں قائم کی جائیں۔

ان امور سے انشاء اللہ امید ہے کہ اوقاف کی حفاظت اور اصل مستحقین تک اوقاف کا فائدہ پہنچانے اور متولینِ اوقاف کی خیانت اور غبن کم کرنے میں مدد ملے گی۔

متولی کی حیثیت

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ متولیِ وقف وکیل کی حیثیت سے وقف کا انتظام وانصرام سنبھالتا ہے اور مال وقف اس کے پاس بطور امانت ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی تعدی اور قصور کے بغیر مالِ وقف کو نقصان پہنچے تو اس پر کوئی ضمان نہیں۔ امام خصافؒ فرماتے ہیں:

قلت: فان باع الأرض وقبض الثمن فضاع؟ قال: فلا ضمان عليه من قبل انه في يده على الأمانة.[1]

میں نے دریافت کیا کہ اگر متولی نے موقوفہ زمین کسی وجہ سے بیچی اور اس کی حاصل شدہ قیمت ضائع ہوگئی تو کیا ہوگا؟ امام نے جواب دیا کہ اس پر ضمان نہیں آئے گا کیونکہ یہ قیمت اس کے پاس امانت تھی۔

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ متولی واقف کا وکیل ہے یا موقوف علیہم کا، اس میں فقہاء کرامؒ کی دو رائے ہیں:

پہلی رائے:

پہلی رائے فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور فقہاء احناف میں سے امام ابو یوسفؒ کی ہے کہ متولی واقف کا وکیل ہے۔ صاحب اسعاف لکھتے ہیں:

عند أبي يوسف هو وكيله (الواقف) فله عزله وان شرط على نفسه عدم العزل.[2]

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م (۱۳۳)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۴۹)

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک متولی واقف کا وکیل ہے اس کے لئے اسے معزول کرنا جائز ہے اگرچہ اس نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگائی ہو کہ وہ متولی کو معزول نہیں کرے گا۔

مالکی فقیہ علامہ حطابؒ لکھتے ہیں:

لو قدم المحبس من رأى لذلك اهلا فله عزله و استبداله. (۱)

اگر واقف کسی کو وقف کا متولی بنادے جسے وہ اس کا اہل سمجھتا ہو تو اسے اس متولی کو معزول کرنے اور بدلنے کا اختیار حاصل ہے۔

محرر مذہب شافعی علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

للواقف أن يعزل من ولاه وينصب غيره كما يعزل الوكيل وكان المتولى نائب عنه هذا هو الصحيح. (۲)

واقف کے لئے اپنے مقرر کردہ متولی کو معزول کرنا اور اس کی جگہ کسی اور کو مقرر کرنا جائز ہے جیسا کہ موکل وکیل کو معزول کرسکتا ہے گویا کہ متولی واقف کا نائب ہے، یہی صحیح مذہب ہے۔

دوسری رائے:

دوسری رائے امام محمد رحمہ اللہ کی ہے اور یہی کتب حنابلہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ متولی وقف فقراء کا وکیل ہے واقف کا وکیل نہیں۔ الاسعاف میں ہے:

ولو لم يشرط لنفسه ولاية عزل المتولى ليس له عزله من بعدما سلمها اليه عند محمد لكونه قائما مقام أهل الوقف. (۳)

اگر واقف نے وقف کرتے وقت اپنے لئے متولی کو معزول کرنے کی شرط نہیں لگائی تھی تو وہ متولی کو معزول نہیں کرسکتا امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک، کیونکہ یہ متولی موقوف علیہم کے قائم مقام ہے۔

فقہ حنبلی کی مشہور کتاب الانصاف میں ہے:

---

(۱) الحطاب، ابو عبد الله محمد بن عبد الرحمن الحطاب، مواهب الجليل، بيروت، دار الفكر ۱۳۹۸ھ (۳۹/۶)

(۲) النووی، يحيىٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامی ۱۹۸۵ م (۳۴۹/۵)

(۳) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۴۹)

اذا عزل الواقف من شرط النظر له لم ينعزل الا أن يشرط لنفسه ولاية العزل. [1]

واقف نے جسے متولی بنایا ہے وہ اگر اسے معزول کردے تو وہ معزول نہیں ہوگا، الا یہ کہ وقف کرتے وقت وہ اپنے لئے عزل کی شرط بھی لگائے۔

واقف کو عزل کا اختیار نہ ملنا اس بات کی علامت ہے کہ متولی اس کا وکیل نہیں ہے، اگر اس کا وکیل ہوتا تو اسے معزول کرنے کا حق بھی حاصل ہوتا۔

منشاءِ اختلاف:

یہ اختلاف درحقیقت اس اصولی اختلاف پر مبنی ہے کہ وقف کی حقیقت کیا ہے؟ وقف بحکم صدقہ ہے یا بحکم اعتاق؟

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف بحکم اعتاق ہے:

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف اعتاق کے حکم میں ہے کیونکہ جس طرح اعتاق میں اسقاطِ ملک پایا جاتا ہے کہ معتِق معتَق سے اپنی ملکیت ساقط کرتا ہے اسی طرح وقف میں بھی واقف شیئ موقوف سے اپنی ملکیت ساقط کرتا ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک وقف بحکم صدقہ ہے:

جبکہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک وقف صدقہ کے حکم میں ہے کہ جس طرح صدقہ میں انسان اپنی مملوکہ چیز کا اللہ تعالیٰ کا مالک بناتا ہے اسی طرح وقف میں بھی واقف شئی موقوف کو اپنی ملکیت سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دیتا ہے، لہٰذا وقف صدقہ کے مشابہ ہوا۔ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا بيان شرائطه الخاصة على قول محمد لأنه كالصدقة وجعله ابويوسفؒ كالاعتاق. [2]

---

(۱) المرداوی، علاء الدین ابو الحسن علی بن سلیمان المرداوی. الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف، بیروت، دار احیاء التراث العربی الطبعة الثانية ۱۹۸۰م (۶۰/۷)

(۲) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۸/۴)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وقف صدقہ کی طرح ہے جبکہ امام ابو یوسفؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اعتاق کی طرح قرار دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ وقف میں تسلیم اور قبضہ کو شرط قرار نہیں دیتے ان کے نزدیک محض تکلم سے وقف لازم ہو جاتا ہے جس طرح اعتاق کے لئے تسلیم اور قبضہ شرط نہیں اور جب تسلیم شرط نہیں تو متولی کو فقراء کا وکیل بنانے کی ضرورت بھی نہیں وہ اسی کا وکیل ہونا چاہئے جس سے اسے ولایت ملی ہے یعنی واقف۔

اور امام محمدؒ کے نزدیک وقف محض تکلم سے مکمل نہیں ہوتا اس میں تسلیم اور قبضہ شرط ہے کیونکہ یہ صدقہ کے حکم میں ہے اور صدقہ میں تسلیم الی العبد شرط ہے، لہٰذا متولی فقراء کا وکیل ہونا چاہئے تا کہ تسلیم کا تحقق ہو سکے۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

فانه يلزم بمجرد القول عند ابی یوسف بمنزلة الاعتاق بجامع اسقاط الملک، وعند محمدؒ لابد من التسليم الى المتولى والافراز والتابيد أما الاول (التسليم الى المتولى) فلان حق الله تعالىٰ انما يثبت فيه فی ضمن التسليم الى العبد لأن التمليک الى الله تعالىٰ وهو مالک الأشياء لايتحقق مقصودا وقد يكون تبعاً لغيره فيأخذه حكمه فينزل منزلة الزكاة والصدقة.(۱)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محض تکلم سے وقف لازم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بحکم اعتاق ہے دونوں میں اسقاطِ ملک پایا جاتا ہے اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک متولی کے حوالہ کرنا وقف کے لزوم کے لئے شرط ہے کیونکہ اس شئی موقوف میں اللہ تعالیٰ کا حق (ملکیت) ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے بندہ کے حوالہ کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی تمام اشیاء کے مالک ہیں انہیں براہ راست مالک بنانا ممکن نہیں ہے ہاں بندہ کے حوالہ کر دیا جائے تو ضمناً اللہ تعالیٰ کا حق (ملکیت) ثابت ہو جائے گا لہٰذا وقف زکوٰۃ اور صدقات کے حکم میں ہوا۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۱۹۷)

اختلاف پر متفرع مسائل:

اس اختلاف پر کئی مسائل متفرع ہیں ذیل میں ان میں سے چند ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔ وقف کرتے وقت اگر واقف نے اپنے لئے عزلِ متولی کی شرط نہیں رکھی تھی تو امام محمدؒ کے نزدیک اب وہ متولی کو معزول نہیں کرسکتا، کیونکہ متولی اس کا وکیل نہیں، جبکہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ معزول کرسکتا ہے کیونکہ متولی اس کا وکیل ہے۔ علامہ طرابلسیؒ لکھتے ہیں:

ولو لم يشرط لنفسه ولاية عزل المتولي ليس له عزله من بعدما سلمها اليه عند محمد لكونه قائما مقام اهل الوقف وعند أبي يوسفؒ هو وكيله فله عزله وان شرط على نفسه عدم العزل. (۱)

اگر واقف نے اپنے لئے متولی کو معزول کرنے کی شرط نہیں رکھی تھی تو امام محمدؒ کے نزدیک وقف متولی کے حوالہ کردینے کے بعد اسے واقف معزول نہیں کرسکتا، کیونکہ متولی موقوف علیہم کا قائم مقام ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک متولی واقف کا وکیل ہے لہٰذا وہ اسے معزول کرسکتا ہے اگرچہ اس نے وقف کرتے وقت اپنے لئے عزل کا اختیار نہ رکھا ہو۔

۲۔ امام محمدؒ کے نزدیک واقف کے انتقال سے متولی معزول نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس کا وکیل نہیں ہے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک واقف کے انتقال سے متولی معزول ہوجائے گا کیونکہ متولی واقف کا وکیل ہے اور موکل کے انتقال سے وکیل معزول ہوجاتا ہے۔

البتہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت یہ صراحت کردی تھی کہ یہ اس کی زندگی میں اور موت کے بعد بھی متولی رہے گا تو پھر واقف کے انتقال سے متولی معزول نہیں ہوگا کیونکہ زندگی میں تو وہ وکیل کی حیثیت سے کام کرے گا اور انتقال کے بعد اگرچہ اس کی وکیل کی حیثیت ختم ہوگئی لیکن اب اس کی وصی کی حیثیت شروع ہوگئی اور اس حیثیت میں وہ وقف کا انتظام و انصرام سنبھالا رہے گا۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۴۹)

لومات الواقف فلا ولاية للناظر لكونه وكيلاً عنه، فيملك عزله بلاشرط وتبطل ولايته بموته وعند محمد ليس بوكيل فلا يملك عزله، ولاتبطل بموته، والخلاف فيما اذا لم يشترط له الولاية فى حياته وبعد مماته، وأما لوشرط ذلک لم تبطل بموته اتفاقا. (۱)

اگر واقف مر گیا تو متولی کی ولایت باقی نہیں رہے گی، کیونکہ متولی واقف کا وکیل ہے، امام محمدؒ کے نزدیک متولی واقف کا وکیل نہیں ہے لہٰذا نہ وہ اسے معزول کرسکتا ہے اور نہ ہی واقف کے انتقال سے اس کی تولیت ختم ہوگی، یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ واقف نے اپنی زندگی اور مرنے کے بعد اس کے لئے ولایت کی شرط نہ لگائی ہو، اگر یہ شرط لگائی ہوگی تو بالاتفاق واقف کے انتقال سے اس کی تولیت باطل نہیں ہوگی۔

اس اختلاف پر اور بھی مسائل متفرع ہوتے ہیں جن کی تفصیل تسکین الارواح والضمائر کتاب الوقف صفحہ ۱۸۳ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ترجیح:

ان دونوں آراء میں سے امام ابو یوسفؒ کی رائے پر فتویٰ کی فقہاء کرام نے صراحت کی ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ ترجیح کے اختلاف کو ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

فالحاصل أن الترجيح قد اختلف والأخذ بقول ابى يوسف أحوط وأسهل ولذا قال فى المحيط ومشايخنا أخذوا بقول أبى يوسف ترغيباً للناس فى الوقف. (۲)

حاصل یہ ہے کہ ترجیح میں بھی اختلاف ہے، امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کرنا باعث احتیاط بھی ہے اور باعث سہولت بھی، اس لئے محیط میں کہا ہے کہ ہمارے مشائخ نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو اختیار کیا ہے لوگوں کو وقف کی ترغیب دینے کے لئے۔

امام خصافؒ نے بھی امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق فتویٰ دیا ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم، الاشباه والنظائر، كراچى، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۱۰۹/۲)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۱۹۷/۵)

قلت: ولم جعلت للواقف أن يبيع ذلک وانما اشترطه لو الى الصدقة؟ قال: من قبل أن واليها انما هو وكيل الواقف فى حياة الواقف ووصى له بعد موته اذا كان قد جعل اليه ولاية هذه الصدقة فى حياته وبعد وفاته، ألا ترى أن للواقف اخراج هذا الوالى مماجعل اليه والاستبدال به فاشتراطه لوكيله أو لوصيه اشتراط منه لنفسه.[1]

میں نے دریافت کیا کہ آپ نے واقف کو یہ اختیار کیوں دیا ہے کہ وہ اسے بیچے، یہ اختیار تو متولی کو حاصل ہے؟ امام نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ متولی واقف کی زندگی میں اس کا وکیل ہے اور انتقال کے بعد اس کا وصی ہے اگر اس نے اپنی زندگی اور موت کے بعد تولیت اسے ہی دی ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ واقف متولی کو ہٹا بھی سکتا ہے اسے بدل بھی سکتا ہے، جو اختیار کسی کے وکیل یا وصی کو حاصل ہوتا ہے وہ خود اسے بھی حاصل ہوتا ہے۔

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م (۲۳)

متولی کو معزول کرنے کا اختیار کسے ہے؟

تولیتِ وقف حاصل ہونے کی مختلف صورتیں ہم اس باب کے شروع میں ولایتِ اصلیہ اور ولایتِ فرعیہ کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں، اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں وہ بحث سامنے رکھنی پڑے گی اور اس کا جائزہ لینا پڑے گا کہ متولی وقف کو تولیت حاصل کہاں سے ہوئی ہے، بیشتر مواقع پر تو جس فرد یا جہت سے تولیت متولی کو حاصل ہوتی ہے عزل کا اختیار بھی اسی فرد یا جہت کو حاصل ہوتا ہے، اور کبھی ولایتِ عامہ کی وجہ سے کسی اور کو بھی ہوتا ہے، ذیل میں ہم تولیت حاصل ہونے کی مختلف صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہر صورت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ متولی اگر خود واقف ہو:

وقف کا متولی اگر واقف ہے تو اسباب عزل پائے جانے کی صورت میں اسے معزول کرنے کا اختیار حاکمِ وقت یا اس کے نمائندہ کے طور پر قاضی یا مجاز محکمہ کو حاصل ہوگا۔ امام خصافؒ تحریر فرماتے ہیں:

قلت: وان آجرها فحط من الأجر مالا يتغابن الناس في مثله؟ قال: لاتجوز الاجارة وينبغي للقاضي اذا رفع ذلك اليه أن يبطل الاجارة فان كان الواقف مأمونا وكان مافعل من هذا على طريق السهو والغفلة فسخ القاضي الاجارة وأقر الأرض في يده وأمره باستغلالها واجارتها ان كان أصلح والا استقصى بذلك وان كان الواقف غير مأمون أخرجها من يده وصيرها في يدغيره ممن يوثق بدينه. (۱)

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۷۲)

میں نے عرض کیا کہ اگر واقف نے وقف کو اجارہ پر دیا اور کرایہ میں غیر معمولی کمی کر دی تو کیا یہ جائز ہے؟ امام نے فرمایا کہ یہ اجارہ جائز نہیں قاضی کو چاہئے کہ جب یہ معاملہ اس کے سامنے پیش ہو تو اسے باطل کر دے، البتہ اگر واقف امانتدار ہو اور اس نے غلطی سے یہ معاملہ کر لیا ہو تو عقد کو تو باطل قرار دیدے اور وقف اسی کی تولیت میں رہنے دے اور اسے صحیح طریقہ سے اجارہ پر دینے کا حکم دے، اور اگر واقف قابل اطمینان نہ ہو تو وقف اس کی تولیت سے نکال لے اور کسی اور با اعتماد و امانتدار شخص کے سپرد کر دے۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

ويعزل القاضي الواقف المتولي على وقفه لو كان خائنا كما يعزل الوصي الخائن نظرا للوقف واليتيم ولااعتبار بشرط الواقف أن لايعزله القاضي والسلطان لأنه شرط مخالف لحكم الشرع فبطل واستفيد منه أن للقاضي عزل المتولي الخائن غير الواقف بالاولى وصرح في البزازية ان عزل القاضي الخائن واجب عليه و مقتضاه الاثم بتركه والاثم بتولية الخائن. (۱)

واقف جو کہ خود ہی متولی بھی ہو اگر خائن ہو تو قاضی اسے معزول کر دے جیسے کہ خائن وصی کو وہ معزول کر سکتا ہے دونوں میں وقف اور یتیم کی رعایت ملحوظ ہے، اور واقف کی اس شرط کا کوئی اعتبار نہیں کہ قاضی یا حاکم اسے معزول نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ شرط شریعت کے احکام کے خلاف ہے اس لئے باطل ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ واقف کے علاوہ اگر اور کوئی متولی ہو اور وہ خائن ہو تو اسے قاضی بطریق اولیٰ معزول کر سکتا ہے، بزازیہ میں یہ صراحت ہے کہ ایسے خائن متولی کو معزول کرنا قاضی پر واجب ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے برقرار رکھنے میں قاضی گناہگار ہوگا جیسے کہ خائن شخص کو متولی مقرر کرنے میں گناہ ہے۔

۲۔ واقف نے خود کسی کو متولی مقرر کیا ہو:

اگر متولی وہ ہو جسے خود واقف نے مقرر کیا ہے تو واقف جب چاہے اسے معزول کر سکتا ہے خواہ

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۵/۵)

اسبابِ عزل میں سے کوئی سبب پایا جائے یا نہیں وقف کی مصلحت ہو یا نہ ہو، یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے وجہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ متولی جسے واقف نے مقرر کیا ہے واقف کا وکیل ہے اور موکل جب چاہے بلا کسی وجہ کے بھی وکیل کو معزول کر سکتا ہے، جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک عام حالات میں واقف متولی کو معزول نہیں کر سکتا کیونکہ ان کے نزدیک متولی فقراء کا وکیل ہے جب وہ واقف کا وکیل ہی نہیں ہے تو واقف کو اسے معزول کرنے کا اختیار بھی نہیں ہوگا، تفصیلی دلائل ہم ''متولی کی حیثیت'' کے تحت بیان کر چکے ہیں اور وہاں یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ کا قول راجح ہے، لہٰذا اس قولِ راجح کے مطابق واقف کو اپنے مقرر کردہ متولی کو بلا اسبابِ عزل بھی معزول کرنے کا حق حاصل ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

للواقف عزل الناظر مطلقا أى سواء كان بجنحة أولا وسواء كان شرط له العزل أولا وهذا عند أبى يوسف لأنه وكيل عنه وخالفه محمد كما فى البحر: أى لأنه وكيل الفقراء عنده.[1]

واقف کے لئے متولی کو معزول کرنا مطلقاً جائز ہے اس کا کوئی قصور ہو یا نہ ہو واقف نے عزل کی شرط متولی بناتے وقت لگائی ہو یا نہ لگائی ہو، یہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے کیونکہ ان کے نزدیک متولی واقف کا وکیل ہے، امام محمدؒ کا اس میں اختلاف ہے کیونکہ ان کے نزدیک متولی فقراء کا وکیل ہے۔

الاسعاف میں ہے:

ولولم يشرط لنفسه ولاية عزل المتولى ليس له عزله من بعدما سلمها اليه عند محمد لكونه قائم مقام أهل الوقف وعند أبى يوسف هو وكيله فله عزله وان شرط على نفسه عدم العزل.[2]

اگر واقف نے متولی بناتے وقت اپنے لئے عزل کی شرط نہیں لگائی تھی تو وقف متولی کے حوالہ کرنے کے بعد امام محمدؒ کے نزدیک واقف کو متولی کو معزول کرنے کا حق حاصل نہیں کیونکہ

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۲۷/۴)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۴۹)

ان کے نزدیک متولی موقوف علیہم کا وکیل ہے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک متولی واقف کا وکیل ہے لہٰذا وہ اسے معزول کرسکتا ہے اگرچہ متولی بناتے وقت اس نے معزول نہ کرنے کی شرط لگائی ہو۔

علامہ نوویؒ تحریر فرماتے ہیں:

للواقف أن يعزل من ولاه، وينصب غيره، كما يعزل الوكيل، وكأن المتولي نائب عنه، هذا هو الصحيح، وبه قال الاصطخرى، وأبو الطيب ابن سلمة. [1]

واقف کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ متولی کو معزول کردے اور کسی اور کو متولی مقرر کردے، جیسا کہ مؤکل وکیل کو معزول کرسکتا ہے گویا کہ متولی واقف کا وکیل ہے، یہی صحیح ہے، یہی امام اصطخری اور ابوالطیب ابن سلمہ نے فرمایا ہے۔

البتہ قاضی کے لئے واقف کے مقرر کردہ متولی وقف کو بلا اسبابِ عزل معزول کرنا جائز نہیں ہے، ہاں اسبابِ عزل میں سے کوئی سبب پایا جائے یا وقف کی مصلحت اس متولی کو معزول کرنے میں ہو تو قاضی اسے معزول کرسکتا ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وأما عزل القاضي له فشرطه أن يكون بجنحة. [2]

قاضی کے متولی وقف کو معزول کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عزل کسی قصور اور وجہ کی بنیاد پر ہو۔

اسی طرح اگر متولی کو معزول کرنے میں وقف کی مصلحت ہو تب بھی قاضی اسے معزول کرسکتا ہے جس کی مثال ہم نے اسبابِ عزل کے تحت لکھی ہے کہ واقف کا مقرر کردہ متولی واقف کی مقرر کردہ تنخواہ سے زیادہ کا مطالبہ کر رہا ہے اور دوسرا شخص بلا تنخواہ تولیت کی ذمہ داری سنبھالنے کو تیار ہے تو قاضی وقف کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے پہلے متولی کو معزول کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں فقہی عبارات بھی ہم نے وہاں ذکر کی ہیں۔

---

(۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ۱۹۸۵م (۳۴۹/۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۲۶/۵)

۳۔تولیتِ وقف قاضی کو حاصل ہو:

اگر قاضی خود ہی وقف کی نگرانی کر رہا ہو، کسی اور کو اس نے متولی مقرر نہ کیا ہو اور اسبابِ عزل میں سے کوئی سبب پایا جائے تو حاکمِ مسلمین کو اسے معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے کیونکہ قاضی کو ولایت حاکمِ مسلمین ہی کی طرف سے حاصل ہوئی ہے لہٰذا وہ اسے معزول بھی کرسکتا ہے۔

۴۔قاضی کی طرف سے مقرر کردہ متولی:

قاضی کی طرف سے مقرر کردہ متولی کو قاضی اسبابِ عزل یا مصلحتِ وقف پائے جانے کی صورت میں تو معزول کرسکتا ہے لیکن بلا وجہ معزول نہیں کرسکتا۔ البحر الرائق میں ہے:

الموضع الثالث فی الناظر المولی من القاضی ...... الثالث: اذا ظهرت خیانته فان القاضی یعزله وینصب أمینا قال فی آخر أوقاف الخصاف ماتقول ان طعن علیه فی الأمانة فرأی الحاکم أن یدخل معه آخر أو یخرجه من یده ویصیره الی غیره قال أما اخراجه فلیس ینبغی أن یکون الا بخیانة ظاهرة مبینة فاذا جاء من ذلک مایصح واستحق اخراج الوقف من یده قطع عنه ماکان أجری له الواقف ...... وقد علمت فیما سبق انه لوعزله بغیر جنحة لاینعزل. [1]

جس متولی کو قاضی نے مقرر کیا ہو اس کے بارے میں گفتگو چل رہی ہے، اگر اس کی خیانت ظاہر ہو جائے تو قاضی اسے معزول کردے گا اور کسی امانتدار شخص کو مقرر کرے گا اُوقافِ خصاف کے آخر میں ہے اگر متولی کی امانت کے بارے میں طعن کیا جائے تو آپ کی کیا رائے ہے اس کے ساتھ کسی کو تولیت میں شامل کر دیا جائے یا اس سے تولیت لے لی جائے؟ امام نے فرمایا کہ بغیر خیانتِ ظاہرہ کے اسے معزول کرنا تو مناسب نہیں ہے، البتہ اگر صحیح طریقہ سے خیانت ثابت ہو جائے اور اس کے ہاتھ سے وقف کی تولیت لے لینے کا استحقاق ثابت ہو جائے تو واقف نے اس کے لئے تولیت کا جو وظیفہ مقرر کیا ہے وہ روک دیا جائے

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ(۵/۲۳۳)

گا، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر قاضی اپنے مقرر کردہ متولی کو بلاقصور و بلاوجہ معزول کرے تو وہ معزول نہیں ہوگا۔

لیکن اگر واقف قاضی کے مقرر کردہ متولی کو معزول کرنا چاہے تو اسے یہ اختیار حاصل نہیں۔

ردالمحتار میں ہے:

أما الواقف فله عزل الناظر مطلقاً به يفتى ولو لم يجعل ناظرا فنصبه القاضى لم يملك الواقف اخراجه. (۱)

واقف متولی کو مطلقاً معزول کرسکتا ہے، اسی پر فتویٰ ہے، البتہ اگر واقف نے متولی مقرر نہیں کیا قاضی نے مقرر کیا ہے تو واقف اسے نہیں نکال سکتا۔

اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر قاضی کے مقرر کردہ متولی میں اسبابِ عزل میں سے کوئی سبب پایا جارہا ہے، تب تو قاضی خود ہی اسے معزول کرسکتا ہے، واقف کی ضرورت نہیں اور اگر اس میں اسبابِ عزل نہیں پایا جارہا ہو تو پھر واقف کو اختیار دینا قاضی کے فیصلہ کو توڑنے کے اختیار دینے کے مترادف ہوگا جو کہ کسی بھی صورت موافقِ مصلحت نہیں ہے۔

۵۔ موقوف علیہم اگر خود متولی ہوں:

اگر متولی وقف موقوف علیہم ہوں تو اگر انہیں واقف نے متولی مقرر کیا ہے تب تو ان کا حکم وہ ہوگا جو ہم نے نمبر ۲ کے تحت بیان کیا ہے اور اگر واقف نے مقرر نہ کیا ہو تو ایسی صورت میں واقف تو انہیں معزول نہیں کرسکتا البتہ اسبابِ عزل پائے جانے کی صورت میں قاضی انہیں معزول کرسکتا ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

قال فى الاسعاف ولو جعلها للموقوف عليه ولم يكن أهلا أخرجه القاضى وان كانت الغلة له وولى عليه مأمونا لأن مرجع الوقف للمساكين وغير المأمون لايؤمن عليه من تخريب أو بيع فيمتنع وصوله اليهم ولو أوصى الواقف الى جماعة وكان بعضهم غير مأمون بدله القاضى بمأمون وان رأى اقامة واحد منهم مقامه فلابأس به. (۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۲/۴)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲٦/۵)

اسعاف میں ہے کہ اگر واقف نے تولیت موقوف علیہم کے سپرد کی حالانکہ وہ اس کا اہل نہیں ہے تو قاضی اسے تولیت سے نکال دے گا خواہ وقف کی آمدنی اسی کے لئے ہواس کی جگہ کسی امانتدار شخص کو مقرر کرے گا، کیونکہ وقف کا بالآخر مصرف مساکین ہی ہیں، غیر امانتدار شخص سے کوئی بعید نہیں کہ وقف کو برباد کردے یا اسے بیچ دے جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مساکین تک وقف نہیں پہنچ سکے گا۔

اگر واقف نے ایک جماعت کو متولی بنانے کی وصیت کی جبکہ ان میں سے بعض غیر مامون ہوں تو قاضی اسے بدل کر کسی مامون کو اس جماعت و کمیٹی میں شامل کردے گا، اور اگر انہیں میں سے کسی ایک کو اس غیر مامون کے قائم مقام بنائے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

۶۔ وہ متولی جسے موقوف علیہم نے مقرر کیا ہو:

وہ متولی جسے موقوف علیہم نے مقرر کیا ہو اسے معزول کرنے کا حق کسے ہے؟ اس بارے میں صریح عبارت تو نہیں مل سکی البتہ احقر کی رائے یہ ہے کہ اس کا حکم بعینہٖ اس متولی کا ہونا چاہئے جسے واقف نے خود مقرر کیا ہو اور اس کی تفصیل ہم نمبر۲ کے تحت ذکر کر چکے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

۷۔ واقف یا قاضی کا مقرر کردہ متولی بطور وکیل کسی کو متولی مقرر کرے:

ایسی صورت میں اصل متولی کو اپنے وکیل کو معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے خواہ اسبابِ عزل میں سے کوئی سبب پایا جائے یا نہیں۔ علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

وللناظر أن يؤكل من يقوم بما كان اليه من أمر الوقف ويجعل له من جعله شيئا وله أن يعزله ويستبدل به أو لايستبدل ولو جن انعزل وكيله. (۱)

ناظر کے لئے جائز ہے کہ اس کے سپرد جو امور وقف ہیں ان کی ادائیگی کے لئے کسی کو وکیل مقرر کردے، اور اسے اپنے وظیفہ میں سے کچھ دیدے۔

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/ ۴۵۱)

اسے اس وکیل کو معزول کرنے کا حق بھی حاصل ہے اور اسے اس وکیل کو بدلنے اور نہ بدلنے کا بھی اختیار ہے اگر متولی مجنون ہو جائے تو یہ وکیل خود ہی معزول ہو جائے گا۔

یہی بات علامہ ابن نجیمؒ نے بھی بحر میں تحریر فرمائی ہے۔[1]

۸۔ واقف یا قاضی کا مقرر کردہ متولی اصالۃً کسی اور کو متولی مقرر کرے:

یہ صورت تفویض کی ہے کہ واقف یا قاضی کے مقرر کردہ متولی نے اپنی جگہ مستقلاً کسی اور کو متولی مقرر کیا ہو اس دوسرے متولی کو کون معزول کر سکتا ہے؟ اس میں تفصیل ہے:

(الف) متولی اُصیل کو واقف یا قاضی نے متولی بناتے وقت تفویض کا اختیار دیا تھا اور عزل کا بھی اختیار دیا تھا ایسی صورت میں یہ متولی اصیل اگر کسی اور کو تولیت تفویض کرے گا تو اسے عزل کا اختیار بھی حاصل ہو گا وہ بلا سبب بھی اسے معزول کر سکتا ہے۔

(ب) متولی اُصیل کو واقف یا قاضی نے متولی بناتے وقت تفویض کا اختیار تو صراحۃً دیا تھا لیکن عزل کے اختیار کی یا تو نفی کی تھی یا اس سے سکوت کیا تھا تو ایسی صورت میں متولی اصیل متولی ثانی کو معزول نہیں کر سکے گا۔ علامہ طرسوسیؒ انفع الوسائل میں تحریر فرماتے ہیں:

والذی یظهر لی أن الکلام فی هذه المسئلة علی التفصیل: وهو ان کان الواقف قال وجعل له أی للناظر ان یسند النظر فی هذا الوقف الی من شاء و یعزل له اذا أراد ویعیده اذا اختار فان فی هذه الصورة یملک الناظر أن یرجع فی التفویض الذی فوضه ویفوض الی غیره أویباشر بنفسه وان کان سکت عن الأخیر وهو أن یعزله اذا أراد ففی هذه الصورة لایملک الرجوع ولا العزل فیبقی کالوکیل اذا اذن له الموکل فی أن یوکل فوکل حیث لم یملک العزل وکالقاضی اذا أذن له السلطان فی الاستخلاف فاستخلف شخصاً فانه لایملک أن یعزله الا أن یکون السلطان قد شرط له أن یعزله.[2]

---

(۱) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۲۳۰، ۲۴۵)

(۲) الطرسوسی، ابراهیم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۱۲۷)

مجھے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر واقف نے متولی کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ جسے چاہے تولیت سپرد کرسکتا ہے، اور جب چاہے اسے معزول کرسکتا ہے تو اس صورت میں متولی کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی تفویض سے رجوع کرلے اور کسی اور کے سپرد کردے یا خود ہی یہ ذمہ داری انجام دے اور اگر واقف اس سے خاموش رہا تھا کہ ''متولی اپنے مقرر کئے ہوئے شخص کو معزول بھی کرسکتا ہے'' تو اس صورت میں متولی اپنی تفویض سے رجوع بھی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اپنے مقرر کئے ہوئے شخص کو معزول کرسکتا ہے۔ اس صورت میں متولی کی حیثیت وکیل کی ہوگی کہ اگر موکل نے اسے وکیل بنانے کی اجازت دی ہوتو وہ وکیل تو بنا سکتا ہے لیکن اسے معزول نہیں کرسکتا، اسی طرح قاضی کو اگر حاکم نے اپنا نائب بنانے کی اجازت دی ہوتو وہ نائب تو بنا سکتا ہے لیکن اسے معزول نہیں کرسکتا، الا یہ کہ حاکم نے اسے معزول کرنے کی بھی صراحۃً اجازت دی ہو۔

(ج) واقف یا قاضی نے اپنے مقرر کردہ متولی کو تفویض یعنی کسی اور کو اصالۃً اور مستقلاً متولی بنانے کی صراحۃً اجازت نہیں دی تھی ایسی صورت میں یہ متولی اپنی صحت والی زندگی میں تو کسی کو متولی بنا ہی نہیں سکتا لہٰذا اسے معزول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ مرض الوفات میں وہ کسی اور کو اصالۃً متولی مقرر کرسکتا ہے چنانچہ اگر اس نے مرض الوفات میں کسی کو متولی مقرر کیا تو اسے عزل کا اختیار بھی راجح قول کے مطابق حاصل ہوگا کیونکہ اس متولی ثانی کی حیثیت متولی اصیل کے وصی کی ہے اور موصی جب چاہے اپنے وصی کو معزول کرسکتا ہے۔

الدر المختار میں ہے:

وان فوض فی مرض موته صح وینبغی أن یکون له العزل والتفویض الی غیره کالایصاء. (۱)

اگر متولی مرض الموت میں تفویض ولایت کرے تو یہ صحیح ہے اور مناسب یہ ہے کہ اسے تفویض اور عزل دونوں اختیار حاصل ہوں وصی بنانے کی طرح۔

البتہ ان تینوں صورتوں میں ولایت عامہ کے تحت حاکم مسلمین یا اس کے نمائندے کو اسبابِ عزل پائے جانے کی صورت میں اس متولی ثانی کو معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۲۵/۴)

۹۔ متولی وقف خود معزول ہو جائے:

آخری صورت یہ ہے کہ متولی وقف خود معزول ہو جائے تو یہ بھی صحیح ہے بشرطیکہ وہ واقف یا قاضی کے علم میں لے آئے کہ میں اب اس وقف کی تولیت کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا، اور اس میں کسی سبب کا پایا جانا یا بتانا بھی ضروری نہیں۔ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

اذا عزل نفسه عند القاضی فانه ینصب غیره وهل ینعزل بعزل نفسه فی غیبة القاضی؟ الجواب لاینعزل حتی یبلغ القاضی کما صرحوا به فی الوصی والقاضی وظاهر کلامهم فی کتاب القضاء انه ینعزل اذا علم القاضی سواء عزله القاضی أو لم یعزله وفی القنیة لو قال المتولی من جهة الواقف عزلت نفسی لاینعزل الا أن یقول له او للقاضی فیخرجه. [1]

اگر متولی اپنے آپ کو قاضی کے سامنے معزول کرلے تو یہ صحیح ہے، قاضی اس کی جگہ کسی اور کو مقرر کرے گا، لیکن اگر قاضی کی غیر موجودگی میں وہ معزول کرلے تو کیا اس سے وہ معزول ہوجائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ معزول نہیں ہوگا جب تک قاضی کو اطلاع نہ مل جائے، جیسا کہ وصی اور قاضی کے بارے میں فقہاء کرام نے صراحت کی ہے، کتاب القضاء کے ذیل میں فقہاء کرام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر قاضی کے علم میں آجائے تو وہ معزول ہوجائے گا چاہے قاضی معزول کرے یا نہ کرے قنیہ میں ہے کہ اگر واقف کا مقرر کردہ متولی کہے کہ میں نے اپنے آپ کو معزول کیا تو وہ معزول نہیں ہوگا جب تک کہ یہ بات واقف یا قاضی کے سامنے نہ کہے۔

البتہ اگر تولیت کے معاہدہ میں کوئی نوٹس پیریڈ طے ہوا تھا کہ تولیت چھوڑنے سے اتنا عرصہ پہلے متولی واقف یا قاضی کو بتلائے گا تو اس کی پابندی ضروری ہے، نوٹس دیئے بغیر اگر وہ فرائض چھوڑ دے گا تو یہ معاہدہ کی خلاف ورزی ہوگی اور خلاف ورزی کی صورت میں معاہدہ میں جو بھی شق ہوگی اس کا اطلاق ہوگا۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۳۴/۵)

وہ اسباب جن کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جا سکتا ہے

ایسے اسباب تو بہت ہیں لیکن بنیادی اصول صرف یہ ہے کہ ہم نے متولی کی ذمہ داریاں جو ذکر کی ہیں اگر متولی انہیں پورا نہیں کرتا یا وہ امور جن کا ارتکاب کرنا متولی کے لئے جائز نہیں ہے ان کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے معزول کیا جا سکتا ہے، فقہاء کرام نے عزل کے جو مختلف اسباب بیان فرمائے ہیں وہ سب اسی اصول پر متفرع ہیں اسی اصول کو بسا اوقات خیانت سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

ویعزل القاضی الواقف المتولی علی وقفه لو کان خائناً کما یعزل الوصی الخائن نظراً للوقف والیتیم ...... واستفید منه أن للقاضی عزل المتولی الخائن غیر الواقف بالأولیٰ، وصرح فی البزازیة ان عزل القاضی للخائن واجب علیه. [۱]

اگر واقف خود ہی متولی ہو لیکن خائن ہو تو قاضی اسے معزول کر سکتا ہے جیسے کہ وصی خائن کو معزول کر سکتا ہے یہ اختیار وقف اور یتیم پر شفقت کے مدنظر اسے حاصل ہے اس سے معلوم ہوا کہ متولی اگر واقف کے علاوہ اور کوئی ہو اور خائن ہو تو اسے بطریق اولیٰ قاضی معزول کر سکتا ہے، بزازیہ میں ہے خائن شخص کو معزول کرنا قاضی پر واجب ہے۔

اس کے بعد خیانت کی تعریف بھی علامہ خود ہی فرماتے ہیں:

الخائن هو الذی خان ماجعل علیه أمیناً. [۲]

خائن وہ شخص ہے جو اس چیز میں خیانت کرے جس پر اسے امین مقرر کیا گیا ہو۔

متولی کو بھی وقف کا امین بنایا گیا ہے لہٰذا اگر وقف سے متعلق وہ اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرتا یا ایسا

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۴۵/۵)
(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۴۵/۵)

کوئی کام کرتا ہے جس سے وقف کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اسے امانت میں خیانت کرنے والا کہا جائے گا۔
ذیل میں ہم اس اصول پر متفرع اسبابِ عزل میں سے چند اسباب ذکر کر رہے ہیں تا کہ اس اصول کا دائرہ کار سمجھنا آسان ہو جائے۔

ا۔ فسق:

اسبابِ عزل میں سے ایک بنیادی سبب فسق ہے اگر متولی گناہ کبیرہ کا علی الاعلان ارتکاب کرتا ہے، یا صغیرہ پر اصرار کرتا ہے تو قاضی اسے معزول کر سکتا ہے۔ اس کی تفصیل اس باب کے آغاز میں بھی گذر چکی ہے۔ علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

مما يخرج به الناظر ما اذا ظهر به فسق كشربه الخمر ...... وان الناظر اذا فسق استحق العزل. [1]

جن اسباب کی وجہ سے متولی کو معزول کیا جا سکتا ہے ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی فسق ظاہر ہو جائے جیسے شراب پینا اور جب ناظر فاسق ہو جائے تو وہ معزولی کا حقدار بن جاتا ہے۔

المغنی میں علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

وان ولّاه الواقف وهو فاسق، أو ولاه وهو عدل وصار فاسقا، ضم اليه أمين يحفظ به الواقف، ولم تزل يده، لأنه أمكن الجمع بين الحقين، ويحتمل أن لايصح توليته، وأنه ينعزل اذا فسق فى أثناء ولايته، لأنها ولاية على حق غيره، فنافاها الفسق، كما لوولاه الحاكم، وكما لو لم يمكن حفظ الوقف منه مع بقاء ولايته على حق غيره، فانه متى لم يمكن حفظه منه أزيلت ولايته، فان مراعاة حفظ الوقف أهم من ابقاء ولاية الفاسق عليه. [2]

اگر واقف نے کسی کو متولی مقرر کیا اور وہ پہلے سے فاسق تھا یا جس وقت متولی بنایا تھا اس وقت تو عادل تھا بعد میں فاسق ہو گیا تو قاضی اس کے ساتھ کسی اور امانتدار شخص کو تولیت

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۲۶/۵)

(۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ - ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۷/۸)

وقف میں ملادے گا تا کہ وقف کی حفاظت کی جاسکے، پہلے متولی سے ولایت لی نہیں جائے گی کیونکہ دونوں حق میں اس طرح جمع کرنا ممکن ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس فاسق کی تولیت صحیح نہ ہو اور فاسق ہوتے ہی وہ معزول ہوجائے، کیونکہ یہ غیر کے حق پر ولایت ہے فسق اس کے منافی ہے جیسے کہ حاکم متولی مقرر کرے جب اس کی تولیت برقرار رکھتے ہوئے وقف کی حفاظت ممکن نہ ہو اس سے تولیت لے لی جائے گی، کیونکہ وقف کی حفاظت فاسق کی ولایت باقی رکھنے سے زیادہ اہم ہے۔

۲۔ وقف کا خیال نہ رکھنا اور اس کی دیکھ بھال نہ کرنا:

وقف کی دیکھ بھال بھی متولی کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے اگر متولی اس میں کوتاہی کرتا ہے تو اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

القيم اذا لم يراع الوقف يعزله القاضى. (۱)

متولی اگر وقف کا خیال نہ رکھے تو قاضی اسے معزول کرسکتا ہے۔

دیکھ بھال نہ کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً:

(الف) وقف کی ضروری تعمیر نہ کروانا:

اگر وقف کو تعمیر کی ضرورت ہو اور متولی اس کی ضروری تعمیر نہیں کرواتا تو یہ بھی موجب عزل ہے کیونکہ واقف کا مقصود وقف سے یہ ہوتا ہے کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ اس کا ثواب ملتا رہے اور ظاہر ہے ضروری تعمیر کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ تنقیح الحامدیہ میں ہے:

(سئل) عن متول قبض الغلة ووفى دينه بها وترک العمارة مع الحاجة اليها هل تثبت خيانته بذلک ويجب اخراجه أم لا (أجاب) نعم تثبت خيانته بذلک ويجب اخراجه فقد صرح فى البحر بأن امتناعه من التعمير خيانة وصرح فى البزازية بان عزل القاضى للخائن واجب عليه. (۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۰/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۹/۱) و کذا فی البحر (۲۳۴/۵)

ایک متولی کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ وقف کی آمدنی پر قبضہ کر کے اس سے اپنے یا وقف کے دیون ادا کرتا ہے اور تعمیر کی ضرورت کے باوجود وقف کی آمدنی تعمیر میں خرچ نہیں کرتا تو کیا یہ اس کی خیانت سمجھا جائے گا اور اسے معزول کیا جائے گا؟ شیخ نے جواب دیا کہ اس سے اس کی خیانت ثابت ہو جائے گی اسے ہٹانا واجب ہے، بحر میں صراحت ہے کہ تعمیر نہ کرنا خیانت ہے بزازیہ میں ہے کہ قاضی پر خائن متولی کو معزول کرنا واجب ہے۔

(ب) وقف کو نقصان پہنچانے والے کو نہ روکنا:

دیکھ بھال نہ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص وقف کو نقصان پہنچا رہا ہے یہ متولی کے علم میں بھی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے نہیں روکتا تو یہ بھی اپنے فرائض منصبی سے خیانت ہے اور ایسا متولی مستحق عزل ہے۔ علامہ اندریتیؒ لکھتے ہیں:

وفی فتاویٰ أبی الليث: توت وقف علی أرباب مسمين فی يد متول باع ورق أشجار التوت جاز، لأنها بمنزلة الغلة، فلو أراد المشتری قطع قوائم الشجر يمنع لأنها ليست بمبيعة، ولو امتنع المتولی من منع المشتری عن قطع القوائم كان ذلک خيانة منه.[1]

فتاویٰ ابواللیث میں ہے کہ شہتوت کا درخت کچھ متعین لوگوں کے لئے وقف ہے، متولی اس کی نگرانی کرتا ہے متولی اگر درخت کے پتے بیچے تو جائز ہے کیونکہ یہ اس کی آمدنی کے حکم میں ہے لیکن اگر مشتری درخت کی شاخ کاٹے تو اسے منع کیا جائے گا کیونکہ پتے بیچے گئے ہیں درخت نہیں بیچا گیا اور اگر متولی مشتری کو درخت کی شاخ کاٹنے سے نہ روکے تو یہ اس کی طرف سے خیانت ہوگی۔

(ج) وقف کی آمدنی وصول کرنے میں سستی کرنا:

اگر متولی وقف کی آمدنی لوگوں سے بروقت وصول نہیں کرتا اور اس میں غیر معمولی سستی کرتا ہے جس سے اس کے ضائع ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے تو بھی اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) الاندريتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندريتی. الفتاوی التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ١٤١١ھ (٥/٢٦١)

تنقیح الحامدیہ میں ہے:

یفسق هذا الناظر ...... بتهاونه فی استخلاص الربع وضیاعه عند السكان ...... ویستحق بذلك العزل. (۱)

متولی اگر وقف کی آمدنی وصول کرنے میں سستی کرے اور اس کے ضائع ہونے کا امکان ہو تو اس سے وہ فاسق ہو جائے اور معزولی کا مستحق بن جائے گا۔

۳۔ وقف یا اس کی املاک وآمدنی کو ذاتی استعمال میں لانا:

متولی وقف اگر وقف یا اس کی املاک وآمدنی کو ذاتی استعمال میں لاتا ہے تو یہ بھی خیانت ہے اور ایسا متولی قابلِ عزل ہے۔

علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر متولی موقوفہ زمین میں اپنے لئے زراعت کرتا ہے تو یہ موجبِ عزل ہے، اسی طرح اگر متولی بغیر کرایہ ادا کئے یا عام کرایہ دے کر وقف مکان میں رہتا ہے تو یہ بھی خیانت ہے اور باعثِ عزل ہے، لکھتے ہیں:

وفی خزانة المفتین اذا زرع القیم لنفسه یخرجه القاضی من یده ...... لو سكن الناظر دار الوقف ولو بأجر المثل له عزله لأنه نص فی خزانة الأكمل انه لایجوز له السكنی ولو بأجر المثل. (۲)

اور اگر متولی وقف کی آمدنی مستحقین کے بجائے خود استعمال کر لیتا ہے تو یہ تو صریح خیانت ہے ایسے متولی کے عزل میں تو تأمل نہیں کرنا چاہئے۔ (۳)

عرف کے مطابق استعمال کی اجازت ہے:

البتہ اگر وقف یا اس کی املاک کو اتنا استعمال کرے جتنا اس کے استعمال کا عام عرف ہے تو ایسی صورت میں اس کی گنجائش ہوگی کیونکہ عرف کی وجہ سے اس کی دلالۃً واقف یا معطین کی طرف سے اجازت سمجھی جائے گی۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیه (۱/۲۲۹)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۸۰)

(۳) دیکھئے: الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیه (۱/۲۲۹)

و فی القنیه من آخر الوقف بعث شمعا فی شهر رمضان الی مسجد فاحترق وبقی منه ثلثه أو دونه لیس للامام ولا للمؤذن أن یاخذ بغیر اذن الدافع ولو کان العرف فی ذلک الموضع أن الامام والمؤذن یأخذ من غیر صریح الاذن فی ذلک فله ذلک.[1]

قنیہ میں ہے کہ کسی نے رمضان میں مسجد کے لئے شمع بھیجی، اسے جلایا گیا ایک تہائی یا اسے کم باقی رہ گئی تو امام اور موذن کے لئے اسے دینے والے کی اجازت کے بغیر لینا جائز نہیں ہے، البتہ اگر اس جگہ یہ عرف ہو کہ دینے والے کی صریح اجازت کے بغیر امام اور موذن باقیماندہ شمع لے لیتے ہوں تو ایسی صورت میں ان کے لئے لینے کی گنجائش ہوگی۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ وقف یا اس کی مملوکہ اشیاء کا ذاتی استعمال عرف پر مبنی ہے، عرف میں جس قدر استعمال کی اجازت سمجھی جاتی ہے، وہ جس طرح امام اور موذن کو حاصل ہے اسی طرح اگر متولی کے بارے میں بھی یہ عرف ہو تو اسے بھی اجازت حاصل ہوگی۔

۴۔ ایسا عقد کرنا جس میں وقف کا ابطال لازم آئے یا اس کا صریح نقصان ہو:

متولی کوئی ایسا عقد بھی نہیں کرسکتا جس میں وقف کو ختم کرنا لازم آئے جیسے موقوفہ چیز کو بیچنا یا کسی کو ہبہ کرنا وغیرہ۔ البحر الرائق میں ہے:

ومن الخیانة المجوزة لعزله أن یبیع الوقف أو بعضه لکن ظاهر مافی الذخیرة أنه لابد من هدم المشتری البناء فانه قال واذا خربت أرض الوقف و أراد القیم أن یبیع بعضا منها لیرم الباقی لیس له ذلک فان باعه فهو باطل فان هدم المشتری البناء أو صرم النحل فینبغی للقاضی أن یخرج القیم عن هذا الوقف لأنه صار خائنا ولا ینبغی للقاضی أن یأمن الخائن بل سبیله أن یعزله.[2]

وہ خیانت جس کی وجہ سے متولی کو معزول کرنا جائز ہے اس میں سے ایک یہ ہے کہ وہ وقف یا اس کا کوئی حصہ بیچے...... ذخیرہ میں ہے کہ اگر وقف زمین ویران ہوگئی اور متولی یہ چاہے کہ

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۲۵۰)
(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۵/۲۳۴)

اس کا کچھ حصہ بیچ کر باقی کی مرمت کرائی جائے تو اس کا اختیار اسے حاصل نہیں، اگر وہ اسے بیچے گا تو یہ باطل ہوگا، اگر مشتری اس بیچی گئی زمین کی عمارت منہدم کردے یا اس کے درخت کو کاٹے تو قاضی کو چاہئے اس متولی کے ہاتھ سے وقف لے لے کیونکہ وہ خائن ہے، قاضی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ کسی خائن پر بھروسہ کرے، اسے معزول کردینا چاہئے۔

اسی طرح اگر متولی ایسا عقد کرتا ہے جس میں وقف کا صریح نقصان واضح ہے تو بھی اسے معزول کیا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر ایک شخص نے گھر وقف کیا اس کا مارکیٹ میں کرایہ دس ہزار ماہانہ چل رہا ہے متولی اسے پانچ ہزار میں کرایہ پر دیتا ہے یا اتنا کرایہ لیتا ہے جتنا مارکیٹ میں اس جیسے گھر کا کہیں بھی رائج نہیں ہے تو اس کی طرف سے خیانت سمجھی جائے گی، اور اس کی وجہ سے اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔

امام خصافؒ تحریر فرماتے ہیں:

قلت: وان أجرها فحط من الأجر ما لايتغابن الناس فى مثله؟ قال: لاتجوزا لاجارة وينبغى للقاضى اذا رفع ذلك اليه أن يبطل الاجارة فان كان الواقف مأمونا وكان مافعل من هذا على طريق السهو والغفلة فسخ القاضى الاجارة وأقر الأرض فى يده وأمره باستغلالها و اجارتها ان كان أصلح والا استقصىٰ بذلك وان كان الواقف غير مأمون أخرجها من يده وصيرها فى يد غيره ممن يوثق بدينه.[1]

اگر واقف نے وقف کو کرایہ پر دیا اور اس کے کرایہ میں غیر معمولی کمی کی تو یہ اجارہ جائز نہیں، قاضی کے سامنے اگر یہ معاملہ پیش ہو تو اس پر لازم ہے اسے باطل قرار دے اور واقف بااعتماد امانتدار ہو غلطی سے اس نے یہ کام کیا ہو تو وقف کی تولیت اس کے پاس برقرار رکھے اور اجارہ فسخ کرکے اسے صحیح طریقہ سے اجارہ پر دینے کا حکم دے، اور اگر واقف قابل اعتماد نہ ہو تو وقف اس سے لے لیا جائے اور ایسے شخص کو اس کی تولیت دیجائے جو قابل اعتماد اور دیندار ہو۔

یہ عبارت نقل کرنے کے بعد علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

فاذا كان هذا فى الواقف فالمتولى اولىٰ.[2]

جب واقف کو معزول کیا جاسکتا ہے تو متولی کو تو بطریق اولیٰ معزول کیا جاسکے گا۔

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۷۲)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۹/۵)

بڑی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے یہاں سب سے کم کرایہ اوقاف اور مساجد کی دوکانوں کا مقرر کیا جاتا ہے، اگر ایک دوکان کا کرایہ عام مارکیٹ میں پانچ ہزار روپے ہے تو یہی دوکان اوقاف میں ایک ہزار کرایہ میں مل جائے گی، اوقاف میں یہ صریح خیانت ہے اور اوپر ذکر کردہ جزئیات کی رو سے ایسے اوقاف کے متولیین واجب العزل ہیں، اور اس قدر کم کرایہ پر دوکان حاصل کرنے والوں کے لئے بھی یہ عقدِ اجارہ جائز نہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ ان دوکانوں کا عام مارکیٹ میں جو کرایہ ہے وہ اوقاف کو ادا کریں ورنہ عنداللہ مواخذہ کا شدید اندیشہ ہے۔

۵۔ واقف کی عائد کردہ شرائط کی خلاف ورزی کرنا:

جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ واقف کی عائد کردہ جائز شرائط کی پابندی کرنا متولی کے ذمہ لازم ہے، اگر متولی ان شرائط کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ تنقیح الحامدیہ میں ہے:

اذا لم یراع شرط الواقف فانه ینعزل بعزل القاضی. (۱)

اگر متولی واقف کی شرائط کی رعایت نہ کرے تو قاضی اسے معزول کرسکتا ہے۔

۶۔ وقف کے انتظام وانصرام کی اہلیت باقی نہ رہنا:

اگر متولی اس قدر بیمار ہوجائے کہ اس کے لئے وقف کا انتظام وانصرام ممکن نہ ہو تو بھی اسے معزول کیا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

وینعزل الناظر بالجنون المطبق اذا دام سنة ...... ولذا قلنا لو عمی أو عرش أو خرس أو فلج ان کان بحیث یمکنه الکلام من الأمر والنهی والآخذ و الاعطاء فله الأجر الذی عینه له الواقف. (۲)

لمبے عرصہ تک جنون رہنے سے متولی معزول ہوجائے گا اگر یہ ایک سال تک جاری رہے، اسی وجہ سے ہم نے کہا ہے اگر متولی اندھا ہوجائے یا بہرا ہوجائے یا اسے فالج ہوجائے تو اگر اس کے لئے بات چیت کرنا ممکن ہو کہ وہ حکم دے سکے، منع کرسکے لین دین کرسکے تو اسے واقف کی متعین کردہ اجرت ملے گی ورنہ نہیں۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۹/۱)

(۲) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸٦۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۵۱/۵)

یا اسی طرح متولی کو کوئی ایسا عذر پیش آ جائے جس کی وجہ سے وہ ایک معتد بہ عرصہ کے لئے وقف کی تولیت اور اس کا انتظام سنبھالنے سے قاصر ہو تو بھی اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔

علامہ بیریؒ شارح اشباہ لکھتے ہیں:

قال فی لسان الحکام ناقلاً عن فتاوی قاضیخان ماصورته: اذا عرض للامام والمؤذن عذر منعه من المباشرة مدة ستة أشهر للمتولی أن یعزله ویولی غیره. (۱)

لسان الحکام میں قاضیخان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر امام اور موذن کو کوئی ایسا عذر پیش آ جائے جو چھ مہینہ تک انہیں اپنی ذمہ داری ادا کرنے سے مانع ہو تو متولی کے لئے انہیں معزول کر کے کسی اور کو مقرر کرنا جائز ہے۔

۷۔ متولی کا عزل وقف کے لئے بہتر ہو:

اگر متولی کو معزول کرنا وقف کے حق میں بہتر ہو تو ایسی صورت میں اگر چہ وہ مستحق عزل تو نہیں ہوتا لیکن اسے معزول کیا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر وقف کا متولی اجرت لے کر کام کر رہا ہے جبکہ دوسرا شخص اس وقف کی تولیت بغیر اجرت کے سنبھالنے کو تیار ہے اور دونوں کی صلاحیت اور امانت و دیانت تقریباً یکساں ہیں تو قاضی پہلے متولی کو معزول کر سکتا ہے۔

اسی طرح واقف نے ایک شخص کو متولی مقرر کیا اور اس کی تنخواہ فرض کریں پانچ ہزار ماہانہ مقرر کی، واقف کے انتقال کے بعد یہ شخص پانچ ہزار سے زیادہ تنخواہ مانگ رہا ہے ورنہ کام کرنے کو تیار نہیں جبکہ دوسرا شخص بلا تنخواہ وقف کی تولیت کی ذمہ داری لینے کو تیار ہے تو ایسی صورت میں بھی قاضی پہلے متولی کو معزول کر سکتا ہے۔

علامہ اَبوسعود الأشباہ والنظائر کی شرح میں لکھتے ہیں:

ینبغی أن یقید بما اذا لم یکن فیه فائدة للوقف أما اذا کان عزله خیراً للوقف کان له عزله کما فی جامع الفصولین، ویؤخذ منه جواز تولیة النظر لغیر المشروط له اذا قبله بلا أجر عند امتناع المشروط له من قبوله الا بأجر لم یشترطه الواقف، حیث کان فیه نفع للوقف، ویؤیده

---

۱) البیری، ابراهیم بن حسین بن بیری زاده ۱۰۹۹ھ. عمدة ذوی البصائر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، نبریری جامعه دارالعلوم کراچی (۱۸۴)

قول المصنف فيما يأتي ويتعين الافتاء فى الوقف بما هو الأنفع والاصلح للوقف، ثم رأيت فى الحاوى الحصيرى ناقلاً عن وقف الأنصارى مانصه: فان لم يوجد من يتولى من جير ان الوقف وقراباته الابرزق، وقبل شخص لم يكن منهم بغير رزق، قال ذلک الى القاضى ينظر ماهو الأصلح. [1]

قاضی کو بلا وجہ متولی کو معزول کرنے کا اختیار نہیں اسے اس قید کے ساتھ مقید کرنا چاہئے کہ اس کے عزل میں وقف کا فائدہ نہ ہو اگر اس کا عزل وقف کے لئے بہتر ہو تو قاضی اسے معزول کرسکتا ہے جیسا کہ جامع الفصولین میں لکھا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ واقف نے جس کے لئے تولیت کی شرط لگائی ہو اگر وہ واقف کی بیان کردہ اجرت کے علاوہ مزید اجرت لئے کام کرنے پر تیار نہ ہو جبکہ دوسرا شخص بغیر اجرت کے تولیت کی ذمہ داری لینے پر تیار ہو تو قاضی واقف کے متعین کردہ متولی کو معزول کرسکتا ہے، کیونکہ اس میں وقف کا فائدہ ہے اور اس کی تائید اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ جو بات وقف کے لئے زیادہ بہتر واصلح ہو اس پر فتویٰ دینا متعین ہے، علامہ ابوسعودؒ فرماتے ہیں پھر میں نے حاوی حصیری میں دیکھا کہ انہوں نے وقفِ انصاری سے نقل کیا ہے کہ اگر وقف کے پڑوسی اور واقف کے رشتہ داروں میں سے کوئی بغیر تنخواہ لئے وقف کا انتظام سنبھالنے پر تیار نہ ہو اور ان کے علاوہ اور کوئی شخص بغیر تنخواہ لئے انتظام سنبھالنے پر رضامند ہو تو یہ معاملہ قاضی کے سپرد ہونا چاہئے وہ وقف کی زیادہ مصلحت دیکھ کر فیصلہ کرے گا۔

جامع الفصولین میں ہے:

للقاضى عزل قيم نصبه الواقف لو خيراً للوقف. [2]

قاضی کے لئے واقف کے مقرر کردہ متولی کو معزول کرنے کا اختیار ہے اگر اسے معزول کرنا واقف کے لئے بہتر ہو۔

بہتری کی کیا صورت ہوسکتی ہے اس کی کچھ مثالیں ہم اوپر دے چکے ہیں۔

---

(۱) ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفى الآفندى ۹۸۲ھ. عمدة الناظر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، لائبریری جامعه دارالعلوم کراچی (۳۲/۲)

(۲) ابن سماوه، محمود بن اسماعيل الشهير بابن قاضى سماوه. جامع الفصولين، کراچی، اسلامی کتب خانه ۱۴۰۲ھ (۱۸۷/۲)

اوقاف میں حاکم مسلمین یا اس کے نامزد نمائندہ کا دائرہ اختیار

حاکم مسلمین کو اپنی ولایت عامہ کے تحت اوقاف کی بھی تولیتِ عامہ حاصل ہے، کیونکہ حاکم اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے اور اللہ رب العزت کی زمین اور اس کے بندوں پر اللہ کا نظام نافذ کرتا ہے، وقف بھی چونکہ واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ رب العزت کی ملکیت میں داخل ہوجاتا ہے اس لئے اس کی بھی تولیتِ عامہ حاکم کو حاصل ہوتی ہے، پھر اسے یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے کسی کو یہ ذمہ داریاں سپرد کردے، چنانچہ وہ قاضی کے سپرد بھی اوقاف کی نگرانی کرسکتا ہے اور اس مقصد کے لئے کوئی مستقل محکمہ بھی قائم کرسکتا ہے، اسی باب کے شروع میں احقر نے بڑی تفصیل سے واضح کیا ہے کہ فقہاء کرام اوقاف کی بحث میں جہاں قاضی کا ذکر کرتے ہیں اس سے مراد وہ قاضی ہوتا ہے جس کے سپرد امور اوقاف کئے گئے ہوں، اگر حاکم مسلمین نے امور اوقاف کسی کے سپرد نہیں کئے بلکہ براہِ راست اپنے پاس رکھے یا اس کے لئے مستقل کوئی محکمہ یا ادارہ قائم کیا تو ایسی صورت میں قاضی کو براہِ راست اوقاف کی ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہوگی اور وہ اوقاف میں براہِ راست کوئی تصرف نہیں کرسکتا، بلکہ خود حاکم مسلمن تصرف کرے گا یا وہ ادارہ اور محکمہ نگرانی کرے گا جسے اس مقصد کے لئے حاکم نے قائم کیا ہے، ہاں اگر قاضی کی عدالت میں اوقاف کے حوالہ سے کوئی مقدمہ پیش کیا جائے تو بیشک وہ اس کا فیصلہ کرسکتا ہے، یا حاکم نے قاضی کو خود ایکشن لینے اور نوٹس لینے کا اختیار دیا ہو تو بھی وہ اس اختیار کے تحت بوقتِ ضرورت ہی اوقاف کے امور میں دخل اندازی کرسکے گا اسے عمومی ولایتِ وقف پھر بھی حاصل نہیں ہوگی، ذیل میں ہم اصولی طور پر تو حاکم مسلمین کا اوقاف کے معاملات میں دائرہ اختیار بیان کررہے ہیں، اگر حاکم نے یہ اختیارات مطلقاً کسی اور فرد یا محکمہ کے سپرد کئے تو اس کا دائرہ اختیار بھی وہی ہوگا جو حاکم مسلمین کا ہے۔

اصولی طور پر حاکم یا اس کے نامزد نمائندہ کو وقف کے امور میں مداخلت کی اجازت بوقتِ ضرورت ہے، وقف کے روزمرہ کے معاملات کی نگرانی اور ان فرائض کی ادائیگی جو متولی وقف کے ہم نے ماقبل میں بیان کئے ہیں یہ واقف اگر وہ خود متولی بھی ہو یا اس کے مقرر کردہ متولی یا حاکم کے مقرر کردہ متولی کی ذمہ داری ہے، بلاضرورت قاضی اس میں مداخلت نہیں کرسکتا، کیونکہ متولی کو ولایت خاصہ حاصل ہے اور حاکم یا اس کے نمائندہ کو ولایت عامہ حاصل ہے، اصول یہ ہے ولایت خاصہ ولایت عامہ سے قوی ہوتی ہے۔ فقہی اصول ہے:

الولاية الخاصة اقوى من الولاية العامة.

اس اصول کے تحت علامہ ابن نجیمؒ الاشباہ والنظائر میں لکھتے ہیں:

فی فتاویٰ رشید الدین ان القاضی لایملک عزل القیم علی الوقف من جهة الواقف الا عند ظهور الخیانة منه وعلی هذا لایملک القاضی التصرف فی الوقف مع وجود ناظره ولو من قبله. (۱)

فتاویٰ رشید الدین میں ہے کہ قاضی واقف کی طرف سے متعین کردہ متولی کو معزول نہیں کرسکتا الا یہ کہ اس کی خیانت ظاہر ہو جائے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وقف کے متولی کے موجود ہوتے ہوئے قاضی وقف میں کوئی تصرف نہیں کرسکتا اگر چہ وہ متولی قاضی ہی کا مقرر کردہ ہو۔

علامہ شامیؒ فتاویٰ خیریہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

أفتى ایضاً بأن الناظر المشروط له التقریر لو قرر شخصاً فهو المعتبر دون تقریر القاضی أخذاً من القاعدة المشهورة وهی أن الولایة الخاصة أقوى من الولایة العامة وبه أفتى العلامة قاسم. (۲)

اس پر بھی فتویٰ دیا ہے کہ متولی جسے واقف نے وقف میں تقرری کا اختیار دیا ہے، اگر وہ کسی شخص کو وقف میں ملازم رکھتا ہے تو اس کا تقرر کرنا معتبر ہوگا، قاضی کا تقرر معتبر نہیں ہوگا، کیونکہ ولایت خاصہ ولایت عامہ سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس پر علامہ قاسم نے فتویٰ دیا ہے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، الاشباه والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (القاعدة السادسه عشره)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۳/۴)

منحۃ الخالق میں ہے:

أرض وقف بدرعم وهي ناحية من نواحي سمرقند ولها متولي من جهة قاضي سمرقند فاستأجرها رجل من حاكم بدراهم معلومة فزرعها فلما حصلت الغلة طلب المتولي الحصة من الغلة كماجرى العرف في المزارعة بدرعم فقال الرجل على الأجرة كان للمتولي ان يأخذ الحصة لانه لاولاية للحاكم لان تولية القاضي لهٰذا المتولي ان كان قبل تقليد الحاكم لم يدخل ذلک في تقليده وان كان بعد تقليده خرج الحاكم عن ولاية تلک الارض فلم تصح اجارته.(۱)

سمرقند کے مضافات درعم میں ایک وقف زمین تھی، قاضی کی طرف سے اس کا متولی مقرر ہے، ایک شخص نے حاکم سے وہ وقف زمین کرایہ پر لے لی، اس میں زراعت کی، جب زرعی پیداوار تیار ہوگئی تو متولی نے اس شخص سے پیداوار میں وقف کا حصہ طلب کیا جیسا کہ درعم میں معمول ہے، اس شخص نے کہا کہ میں نے یہ زمین تو کرایہ پر لی ہے، فقہاء کرام نے فرمایا کہ متولی کو اس سے پیداوار میں وقف کا حصہ لینے کا حق حاصل ہے، کیونکہ حاکم کو اس وقف پر ولایت حاصل نہیں ہے، قاضی نے متولی کو جو مقرر کیا ہے وہ اگر حاکم کے منصب سنبھالنے سے پہلے کیا تھا تو یہ متولی حاکم کے ماتحت داخل ہی نہیں ہوا اور اگر حاکم کے منصب سنبھالنے کے بعد مقرر کیا تھا تو تب بھی یہ زمین حاکم کی ولایت میں نہیں ہے اس کا اجارہ پر دینا صحیح نہیں ہے۔

ان جزئیات سے یہ واضح ہے کہ متولی کے ہوتے ہوئے حاکم یا اس کا نمائندہ وقف کے امور میں مداخلت نہیں کرسکتا اگرچہ وہ متولی وہی ہو جسے اس حاکم نے خود ہی مقرر کیا ہو، البتہ ضرورت کے موقعہ پر حاکم کو اپنی ولایتِ عامہ کے تحت مداخلت کی اجازت ہے، اور ضرورت سے مراد یہ ہے کہ متولی یا واقف وقف کی مصلحت کو ملحوظ نہیں رکھ رہے یا ایسا کام کر رہے ہیں جس میں وقف یا موقوف علیہ کا نقصان واضح ہے تو ایسی صورت میں حاکم یا اس کے نمائندہ کو مداخلت کی اجازت ہے بلکہ اس کے منصب کا تقاضہ ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۹/۵)

شرط الواقف ان يكون المتولي من أولاده وأولاد أولاده هل للقاضي أن يولي غيره بلاخيانة ولو ولاه هل يصير متولياً؟ قال لا. فقد أفاد حرمة تولية غيره وعدم صحتها لو فعل، وفي القنية نصب القاضي قيماً أخر لاينعزل الاول ان كان منصوب الواقف اھ والحاصل ان تصرف القاضي في الاوقاف مقيد بالمصلحة لاانه يتصرف كيف شاء فلو فعل مايخالف شرط الواقف فانه لايصح الا لمصلحة ظاهرة.[1]

واقف نے شرط لگائی کہ متولی اس کی اولاد میں سے کوئی ہوگا کیا قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ بغیر کسی خیانت کے کسی اور کو متولی مقرر کردے؟ فرمایا نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی کسی اور کو متولی مقرر نہیں کرسکتا، قنیہ میں ہے کہ اگر متولی واقف کا مقرر کیا ہوا ہو تو اگر قاضی کسی اور کو مقرر کردے تو پہلا متولی معزول نہیں ہوگا۔

ذیل میں ہم فقہاء کرام کے کلام سے چند مثالیں ذکر کررہے ہیں جس سے مصالح کی نوعیت واضح ہوجائے گی کہ کن مصالح کی وجہ سے حاکم اوقاف کے معاملات میں مداخلت کرسکتا ہے۔

المحیط البرہانی میں ہے:

اذا كان الوقف على الفقراء وشرط الواقف الولاية لنفسه وكان هو متهما غير مامون على الوقف فللقاضي ان ينزعها من يده لان القاضي نصب ناظراً لكل من عجز عن النظر لنفسه بنفسه وبالوقف زال ملكه وثبت الحق فيه للفقراء فاذا كان متهماً كان للقاضي ان يخرجه نظراً للفقراء كما له أن يخرج الموصى نظراً للضعفاء وكذلك لوترك العمارة وفي يده من غلته مايمكنه ان يعمره فالقاضي يجبره على العمارة فان فعل والا أخرجه من يده.[2]

اگر وقف فقراء پر ہو اور واقف نے اپنے لئے ولایت کی شرط لگائی ہو لیکن وہ متہم ہو، وقف کے سلسلہ میں قابل اعتماد نہ ہو تو قاضی اس سے وقف کی تولیت لے سکتا ہے، کیونکہ قاضی ہر

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۲۷/۵)

(۲) ابن مازه البخاری، برهان الدن ابو المعالی محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ ۵. المحيط البرهانی، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۲۰/۹)

اس فرد کے لئے ناظر ہے جو اپنے حقوق کی خود حفاظت کرنے سے عاجز ہو، وقف کرنے سے واقف کی ملکیت زائل ہو جاتی ہے اور اس میں حقدار کا حق ثابت ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر واقف متہم ہو قاضی اس وقف کو اس کی تولیت سے نکال سکتا ہے جیسا کہ ضعفاء کی رعایت کرتے ہوئے موصی کو ہٹا سکتا ہے، اسی طرح اگر وہ وقف کی ضروری تعمیر نہ کروائے جبکہ اس وقف کی اتنی آمدنی ہو کہ اس سے تعمیر کرائی جا سکتی ہو تو قاضی اسے تعمیر پر مجبور کرے گا، اگر کر لے تو اچھی بات ہے ورنہ قاضی اس سے وقف لے لے گا۔

علامہ اندریتیؒ لکھتے ہیں:

الواقف اذا أجر الوقف اجارة طويلة ان كان يخاف على رقبتها التلف بسبب هٰذه الاجارة فللحاكم ان يبطلها و كذلك ان أجرها من رجل يخاف على رقبتها من المستأجر فينبغي للحاكم أن يبطل الاجارة. (۱)

واقف نے وقف کو طویل المیعاد اجارہ پر دیا ہو تو اگر وقف کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو حاکم اسے باطل قرار دے سکتا ہے، اس طرح اگر ایسے شخص کو اجارہ پر دیا جس سے وقف کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی قاضی اسے معزول کر سکتا ہے۔

البحر الرائق میں ہے:

ان الواقف ايضاً اذا اجر بالاقل ممالايتغابن الناس فى مثله فانها غير جائزة ويبطلها القاضى فان كان الواقف مامونا و فعل ذلک على طريق السهو و الغفلة اقره القاضى فى يده و امره باجارتها بالاصلح و ان كان غير مامونا اخرجها من يده و جعلها فى يدمن يثق بدينه. (۲)

اگر واقف نے اجرت مثل سے کم پر کرایہ پر دیا تو یہ جائز نہیں، قاضی اسے باطل کر سکتا ہے، اگر واقف نے غلطی سے یہ اجارہ کر لیا تھا اور وہ با اعتماد ہے تو قاضی اسے برقرار رکھے گا، اور اسے صحیح طریقہ سے اجارہ پر دینے کی ہدایت کرے گا، اور اگر واقف با اعتماد نہ ہو تو یہ وقف اس سے لے لیا جائے گا اور کسی با اعتماد شخص کو مقرر کرے گا۔

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۷۵۲/۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۸/۵)

ان جزئیات سے واضح ہے کہ اگر متولی ایسا کوئی اقدام کرے جس سے وقف کو یا موقوف علیہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتو حاکم یا اس کا نمائندہ مداخلت کرتے ہوئے متولی کو اس اقدام سے روک سکتا ہے اور اگر اس نے اقدام کرلیا تو اسے منسوخ بھی کرسکتا ہے۔

اسی طرح اگر متولی کا اقدام وقف کے لئے نقصان دہ تو نہ ہو لیکن اس کی مصلحت کا تقاضہ کچھ اور ہو تو بھی حاکم مداخلت کرسکتا ہے، مثال کے طور پر واقف نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگادی کہ اسے کسی بھی حالت میں بدلا نہیں جاسکتا، لیکن قاضی یہ سمجھتا ہے کہ اس وقف کی مصلحت اس کے استبدال میں ہے تو وہ مداخلت کرتے ہوئے اس کے استبدال کا فیصلہ کرسکتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ عام حالات میں تو حاکم اوقاف کے متولی کے ہوتے ہوئے اس کے امور میں مداخلت نہیں کرسکتا، لیکن ضرورت کے وقت اسے ولایت عامہ کے تحت مداخلت کی اجازت ہے۔

وزارۃ اوقاف کی حیثیت اور دائرہ کار:

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہے کہ اصولی طور پر تو حاکم مسلمین کو اپنی ولایت عامہ کی وجہ سے اوقاف کی بھی تولیت عامہ حاصل ہوتی ہے، اور اسے یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تولیت عامہ کسی کے سپرد کردے، وزارۃِ اوقاف کی حیثیت درحقیقت حاکم مسلمین کے اس نمائندہ کی ہے جسے حاکم مسلمین نے اوقاف کے حوالے سے اپنی تولیت عامہ سپرد کی ہے، لہٰذا اس کے اختیارات اور دائرہ کار وہی ہوگا جو ہم نے حاکم مسلمین کے حوالہ سے بیان کیا ہے، البتہ اگر وقف براہِ راست اس وزارۃ کی تولیت میں ہے اس پر کسی کو مستقلاً متولی مقرر نہیں کیا گیا، وزارۃ اپنے ملازمین کے ذریعہ اس کا انتظام و انصرام سنبھالتی ہے تو ایسی صورت میں وزارۃ اوقاف کی حیثیت متولی وقف کی ہوگی اور اسے تولیت عامہ کے ساتھ ساتھ تولیت خاصہ بھی حاصل ہوگی اور متولی وقف کے جو فرائض و اختیارات ہم نے اس باب میں بیان کئے ہیں وہ تمام اختیارات اور فرائض وزارت کے بھی ہوں گے، پاکستان میں دونوں طرح کے اوقاف پائے جاتے ہیں، بہت سے اوقاف وہ ہیں جو براہِ راست وزارتِ اوقاف کے تحت آتے ہیں ان کا مکمل انتظام و انصرام، ملازمین کا عزل و نصب براہِ راست وزارت کرتی ہے اور زیادہ تر اوقاف وہ ہیں جو براہِ راست اس کے تحت نہیں آتے ان میں وزارت کو وہ اختیارات حاصل ہوں گے جو حاکم مسلمین کو ان اوقاف کے حوالہ سے حاصل ہیں۔

جہاں مسلمان حاکم یا اس کا نامزد نمائندہ نہ ہو وہاں حاکم مسلمین کے قائم مقام کون ہوگا؟

یہ بڑا اہم سوال ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اب تک ہم یہ دیکھتے آئے ہیں کہ وقف میں حاکم مسلمین یا اس کے نامزد نمائندہ قاضی وغیرہ کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے، بہت سے معاملات میں حاکم سے اجازت لینا ضروری ہے جیسا کہ استدانہ وغیرہ میں اور بہت سے معاملات میں حاکم کی مداخلت کی ضرورت پڑتی ہے، اگر وقف ایسی جگہ ہے جہاں مسلمان حاکم یا اس کا کوئی نمائندہ ہی موجود نہیں ہے یا مسلمان حاکم کا نمائندہ قاضی وغیرہ تو ہے لیکن اس کے دائرہ اختیار میں امور وقف نہیں آتے یا اسی طرح مسلمان حاکم یا اس کا نمائندہ تو موجود ہے لیکن یہ خوف ہے کہ اگر اس کے علم میں وقف کا معاملہ لایا جائے گا تو وقف کو مزید نقصان ہی پہنچے گا، ایسی صورتحال میں حاکم مسلمین کا قائم مقام کون ہوگا؟

فقہاء کرامؒ کی بعض عبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورتحال میں عامۃ مسلمین حاکم مسلمین کے قائم مقام ہوں گے، وہاں کے مسلمانوں کو چاہئے کہ تین یا اس سے زائد متدین مسلمانوں پر مشتمل کمیٹی تشکیل دیں اور وقف کے معاملات میں جہاں جہاں حاکم مسلمین یا قاضی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ان معاملات میں اس کمیٹی کی طرف رجوع کریں۔ تاتارخانیہ میں ہے:

فی مجموع النوازل: سئل شیخ الاسلام عن اهل مسجد اتفقوا علی نصب رجل متولیا لمصالح مسجد هم فتولی ذلک باتفاقهم هل یصیر متولیا مطلق التصرف فی مال المسجد علی حسب مالو قلده القاضی؟ قال: نعم، قال: مشایخنا المتقد مون یجیبون عن هٰذه المسالة ویقولون نعم والأفضل ان یکون ذلک بأمر القاضی، ثم اتفق المشایخ المتأخرون واستأذونا علی أن الافضل أن ینصبوا متولیا ولا یعلموا القاضی فی زماننا لما عرف من طمع القضاة فی أموال الاوقاف.[1]

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۸۴۳/۵)

مجموع النوازل میں ہے کہ شیخ الاسلام سے ایک مسجد کے بارے میں پوچھا گیا کہ اہل مسجد نے مسجد کے مصالح کے لئے کسی کو متولی مقرر کرلیا تو کیا وہ متولی بن جائے گا اور اس کو مسجد کے مال میں تصرف کا حق حاصل ہوگا جیسا کہ قاضی کے مقرر کردہ متولی کو حاصل ہوتا ہے؟ فرمایا: ہاں، ہمارے مشایخ متقدمین تو فتویٰ دیا کرتے تھے کہ بہتر یہ ہے کہ قاضی کی اجازت سے متولی مقرر کیا جائے لیکن پھر مشائخ متاخرین اس بات پر متفق ہوگئے اور فتویٰ دینے لگے کہ بہتر یہ ہے کہ وہ خود متولی مقرر کرلیں قاضی کے علم میں نہ لائیں ہمارے زمانے میں، کیونکہ قضاۃ کی طمع اموال وقف میں معروف ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے بھی البحر الرائق میں یہی عبارت نقل کی ہے اور حاکم کے پاس معاملہ لے جانے میں اگر وقف کے ضرر کا اندیشہ ہو تو اہل محلّہ کو حاکم وقاضی کے قائم مقام قرار دیا ہے۔[1] علامہ شامیؒ یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قلت: ذكر وامثل هذا في وصي اليتيم وأنه لو تصرف في ماله أحد من أهل السكة من بيع أو شراء جاز في زماننا للضرورة، وفي الخانية أنه استحسان وبه يفتي. [2]

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس جیسی بات فقہاء کرام نے یتیم کے وصی کے بارے میں بھی ذکر کی ہے کہ اگر محلّہ والوں میں سے کوئی اس کے مال میں خرید وفروخت کا تصرف کرلے تو اس کی اجازت ہے ہمارے زمانہ میں ضرورت کی وجہ سے، خانیہ میں ہے کہ یہ استحسان ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسی صورتحال میں یہی تجویز دی ہے، امداد الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

اور اگر حاکم مسلم موجود نہ ہو تو پھر عامہ ثقات مسلمین کو متولی منتخب کرنے کا حق شرعاً حاصل ہے...... اور اگر متولی میں خیانت ثابت ہو خواہ وہ واقف کا مقرر کیا ہوا ہو یا قاضی کا یا عامۃ

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۳۲/۵)

(۲) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۲۲/۴)

مسلمین کا اس کو معزول کر دینا واجب ہے اور یہ حق معزول کر دینے کا بھی اصل میں قاضی کو ہے...... اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عامہ مسلمین بجائے قاضی کے ہیں اس لئے اگر قاضی نہ ہو تو عامہ مسلمین کو یہ حق معزول کرنے کا حاصل ہے، لیکن اگر عامہ مسلمین بذات خود اپنے اس اختیار شرعی کو نافذ کرنے پر قانوناً قادر نہ ہوں تو ان پر لازم ہے کہ حکامِ وقت سے استعانت کریں اور ان سے درخواست کر کے متولی صالح کو مقرر کرا کر وقف کے انتظام کی اصلاح کریں پس یہ متولی صالح شرعاً عامہ مسلمین کی طرف سے ہوگا اور قانوناً حکامِ وقت کی طرف سے ہوگا۔[1]

بعینہٖ یہی فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عزیز الفتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں نقل فرمایا ہے۔[2]

حیلہ ناجزہ میں بھی تمام علماء ہند نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جہاں مسلمان حاکم یا قاضی نہ ہو وہاں متدین ثقات مسلمان حاکم کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔[3]

مشہور حنبلی فقیہ علامہ بہوتی رحمہ اللہ نے بھی کشاف القناع میں اسی رائے کا اظہار فرمایا ہے البتہ اس میں یہ اضافہ فرمایا ہے کہ وقف جس جگہ ہے اگر وہاں کے مسلمان کمیٹی بنا کر وقف کا انتظام و انصرام کسی وجہ سے نہ سنبھال سکیں تو مقامی طور پر جو بھی رئیس ہوگا اسے وقف کے انتظام و انصرام سنبھالنے اور عزل و نصب کا حق حاصل ہوگا۔ لکھتے ہیں:

فان لم یوجد القاضی کالقری الصغائر والأماکن النائیة أی البعیدة أو وجد القاضی وکان غیر مامون أو وجد القاضی وهو مأمون لکن ینصب غیر مامون فلهم أی أهله النصب تحصیلا للغرض ودفعا للمفسدة وکذا ماعدا المسجد من الأوقاف لأهله نصب ناظر فیه لعدم وجود القاضی المأمون ناصباً لمامون وان تعذر النصب من جهة

---

(۱) تھانوی، حکیم الامۃ اشرف علی تھانوی. امداد الفتاویٰ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم (۲/۲۱۵)

(۲) شفیع، مفتی محمد شفیع. عزیز الفتاویٰ، کراچی، دارالاشاعت (۵۸۳)

(۳) تھانوی، حکیم الامت اشرف علی تھانوی. حیلہ ناجزہ. کراچی، دار الاشاعت ۱۹۸۷م (۴۳)

هٰـولاء فلـرئيـس الـقرية او رئيس المكان النظر والتصرف لأنه محل حاجة وقد نص أحمد على مثله.[1]

اگر کسی جگہ قاضی ہی نہ ہو جیسے دور دراز علاقے، یا قاضی تو ہو لیکن قابل اعتماد نہ ہو یا قاضی خود تو بااعتماد ہو لیکن غیر معتمد آدمی کو متولی مقرر کرنا چاہے تو اہل مسجد کو چاہئے کہ وہ خود ہی متولی مقرر کرلیں تاکہ مقصد حاصل ہو سکے اور نقصان سے بھی حفاظت ہو، اسی طرح مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف میں بھی اہلِ وقف کے لئے خود متولی مقرر کرنا جائز ہے اگر قاضی غیر معتمد ہو، اور اہل محلّہ واہل وقف کی طرف سے متولی کا تقرر مشکل ہو تو اس گاؤں یا شہر کے رئیس کو اس وقف کی تولیت اور اس میں تصرف کا حق حاصل ہوگا، امام احمدؒ نے اس کی صراحت کی ہے۔

یہ تمام عبارات اس سلسلہ میں واضح ہیں کہ حاکم مسلمین کے نہ ہونے کی صورت میں عامۃ مسلمین اس کے قائم مقام ہوتے ہیں، انہیں چاہئے کہ اپنے میں سے چند متدین اور معاملہ فہم لوگوں کی ایک کمیٹی تشکیل دے کر وقف کی عمومی نگرانی اس کمیٹی کے سپرد کردیں وہ کمیٹی متولی مقرر کرلے اور اس کے عزل کا اختیار بھی اس کے پاس ہو، جن معاملات میں حاکم یا قاضی کی اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے ان میں متولی اسی کمیٹی سے رجوع کرے جہاں ضرورت پیش آئے وہاں یہ کمیٹی مقامی انتظامیہ سے تعاون بھی لے سکتی ہے، خواہ انتظامیہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، ہمارے یہاں جو اوقاف وزارتِ اوقاف کے تحت نہیں ہیں ان میں یہی دستور چلا آرہا ہے کہ حاکم یا قاضی کی جگہ اوقاف کی عمومی نگرانی کے لئے کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے اور وہ وقف کا انتظام وانصرام سنبھالتی ہے، یہ شرعاً درست ہے اور مذکورہ بالا جزئیات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔

---

(۱) البهوتي، منصور بن يونس بن ادريس البهوتي ١٠٥١هـ. كشاف القناع عن متن الاقناع، مكة المكرمة، مطبعة الحكومة، الطبعة الاولىٰ ١٣٩٤هـ (٣٠٣/٤)

بابِ ہفتم

واقف کی عائد کردہ شرائط

ساتواں باب:

واقف کی عائد کردہ شرائط

شرعی حیثیت:

وقف بنیادی طور پر عقدِ تبرع ہے، جس طرح نفسِ وقف کرنے نہ کرنے کا شریعت نے اختیار دیا ہے کہ وقف کریں یا نہ کریں اور اگر وقف کیا جائے تو کتنا کیا جائے اسی طرح وقف کے انتظام وانصرام، اس کے منافع کے مصارف اور تقسیم وغیرہ میں بھی شریعت نے واقف کو اختیار دیا ہے کہ وہ اگر وقف کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس کی بہتری کے لئے کوئی شرط عائد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

شرط کے بارے میں عمومی طور پر شریعت کا مزاج یہ ہے کہ اگر اس میں حدود کی رعایت رکھی گئی ہے تو اس کا احترام ہونا چاہئے اور حتی الامکان اسے پورا کیا جانا چاہئے، ایک حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

المسلمون علی شروطهم الا شرطاً حرّم حلالاً أو احلّ حراماً. (۱)

مسلمانوں کی عائد کردہ شرائط کا خیال رکھنا ضروری ہے سوائے ایسی شرط کے جس میں کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کیا جائے۔

اس حدیث میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف عقود میں عائد کی جانے والی شرائط کی حیثیت اور اس کی حدود کو واضح فرما دیا ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حجر مدریؒ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مُخیرِیق کے باغات وقف فرمائے تو اس میں یہ صراحت تھی:

---

(۱) الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ الترمذی. سنن الترمذی مع تحقیق احمد شاکر، بیروت، دار احیاء التراث العربی (رقم الحدیث: ۱۳۷۵ باب فی الوقف)

أن يأكل منها أهلها بالمعروف غير المنكر.[۱]

ان باغات کا متولی مناسب مقدار میں اس سے کھا سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وقف والی روایت وقف کے باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس میں آپ نے یہ شرط لگائی تھی کہ اس وقف کا متولی خود بھی اس وقف سے مناسب حد تک کھا سکتا ہے اور اگر کسی دوست کو کھلانا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہے البتہ اس کی اجازت نہیں کہ متولی اپنی ضرورت سے زائد وقف کی آمدنی لے اور اسے جمع کرے اور اس کی ذریعہ سے خوب مالدار ہو جائے۔ فرمایا:

لاجناح على من وليها أن يأكل بالمعروف وأن يطعم صديقاً غير متمول منه.[۲]

اسی طرح اس وقف کی تولیت کی وصیت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے لئے کی۔[۳]

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے اپنے وقف میں یہ شرط لگائی تھی:

وأن للمردودة من بناته أن تسكن غير مضرة ولا مضربها فاذا استغنت بزوج فلا حق لها.[۴]

میری بیٹیوں میں سے جو بیوہ یا مطلقہ ہو جائے وہ اس موقوفہ گھر میں رہ سکتی ہے نہ وہ کسی کو ضرر پہنچائے نہ اسے ضرر پہنچایا جائے، اور جب اس کا نکاح ہو جائے تو اب اس کا اس موقوفہ گھر میں کوئی حق نہیں رہے گا۔

اسی طرح کی شرط حضرت سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ کے وقف میں بھی ملتی ہے۔[۵]

ابو جعفر تابعی رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے مسجد میں پانی پلانے کے لئے اپنا مال وقف کیا۔[۶]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک گھر خرید کر وقف فرمایا اور وقف نامہ میں لکھا کہ اس میں فلاں اور اس کی اولاد کو رہنے کا حق ہے اگر ان میں سے کوئی بھی نہ رہے تو یہ گھر آل أبي بکر کی طرف لوٹ آئے گا۔[۷]

---

(۱) عثمانی، ظفر احمد عثمانی. اعلاء السنن، کراچی، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ (۳۹/۱۳) ابن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ. مصنف ابن ابی شیبہ ۲۲۵ھ، ادارۃ القرآن ۱۹۸۷م (۲۷/۱۴)

(۲) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۹۹۹م (۸)

(۳) حوالہ بالا (۴) حوالہ بالا (۱۲) (۵) حوالہ بالا (۱۴)

(۶) حوالہ بالا (۱۷) (۷) حوالہ بالا (۱۳)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ یہ وقف اللہ کے راستہ میں اور میرے قریب اور دور کے رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے، اسے نہ بیچا جائے اور نہ میراث میں تقسیم کیا جائے۔[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے وقف نامہ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور بنو ہاشم و بنو عبدالمطلب کے فقراء پر خرچ کرنے کی شرط لگائی۔[2]

ان تمام روایات سے واضح ہے کہ شرعی حدود کی رعایت رکھتے ہوئے واقف اگر کوئی شرط عائد کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اس کی پابندی ضروری ہے۔

واقف کی عائد کردہ شرائط کی ضرورت:

اگر غور کیا جائے تو واقف کی طرف سے شرائط لگانے کی بسا اوقات ضرورت بھی ہوتی ہے اور شرائط نہ لگانے کی صورت میں وقف کے مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے مثال کے طور پر اگر واقف وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہ لگائے تو اب سوائے مخصوص حالات اور شرائط کے استبدال کی اجازت نہیں ہے، کسی وجہ سے اگر وقف کی منفعت کم ہوگئی ہے اس سے مکمل طور پر استفادہ مشکل ہوگیا ہے تب بھی استبدال کی اجازت نہیں ہوگی، لیکن اگر واقف اپنے لئے استبدال کی شرط لگالے تو ایسی صورت میں وقف کی منفعت کم ہونے کی صورت میں اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ استبدالِ وقف کرلے اور موقوفہ جگہ بیچ کر اس کے بجائے ایسی جگہ خرید لے جس سے زیادہ بہتر انداز میں موقوف علیہم فائدہ اٹھاسکیں۔

اسی طرح اگر وقف علی الاولاد کیا اور تولیت کے سلسلہ میں کوئی شرط نہیں لگائی تو ظاہر ہے متولی کا تقرر قاضی کی طرف سے ہوگا، یہ متولی یقیناً اپنی ذمہ داریاں ادا کرے گا لیکن اس کی اس وقف سے براہِ راست دلچسپی کی کوئی وجہ نہیں، چنانچہ اس سے ان نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی جن کی توقع اس صورت میں ہے کہ واقف اپنی اولاد ہی میں سے کسی کے لئے تولیت کی شرط لگائے یہ متولی وقف کی بہتری کے لئے اول لذکر کی نسبت زیادہ محنت کرے گا کیونکہ اس وقف کی بہتری سے براہِ راست اس کی منفعت وابستہ ہے۔

اسی طرح اگر وقف کرتے وقت اپنے لئے یہ اختیار نہیں رکھا کہ جو موقوف علیہم طے کئے گئے ہیں ن کے علاوہ بھی کسی کو وقف سے فائدہ پہنچا سکتا ہوں تو بسا اوقات شدید ضرورت مند بھی سامنے ہوگا لیکن

---

۱) الشیرازی، الامام ابو اسحاق الشیرازی. المهذب، مصر، عیسیٰ البابی (۱/۴۴۳) رواه الشافعی بسنده فی ئتاب الام (۴/۵۹) وكذا فی السنن الكبری للبیهقی (۶/۱۶۱)

۲) حوالہ بالا

اسے وقف سے فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا، جبکہ اگر واقف اپنے لئے اس اختیار کی شرط لگالیتا کہ میں موقوف علیہم کے علاوہ بھی مزید کسی اور کو بھی وقف سے فائدہ پہنچا سکتا ہوں تو ایسی صورت میں اگر ایسا ضرورت مند سامنے آتا تو اسے وقف سے فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا، مثال کے طور پر کسی شخص نے مدارس کے طلبہ کے لئے جائیداد وقف کی لیکن ایسا ضرورت مند سامنے آگیا جو طالب علم تو نہیں ہے لیکن اس کی ضرورت طلبہ سے زیادہ ہے تو اسے اس وقف سے فائدہ پہنچانا اس قسم کی شرط وقف نامہ میں ہونے نہ ہونے پر موقوف ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ واقف کو وقف کرتے وقت شرائط لگانے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، جو امور وقف کے مقتضیات میں سے ہیں اور وقف کے ضمن میں شرعاً خود ہی ثابت ہو جاتے ہیں ان کے بارے میں بھی فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ انہیں وقف نامہ میں صراحۃً بطور شرط بھی ذکر کر دینا مناسب ہے تا کہ ان کی اہمیت بڑھ جائے اور یہ صرف ضمناً ہی ثابت نہ ہوں بلکہ صراحۃً بطورِ شرط ذکر کر دینے کی بناء پر بھی ان پر عمل کیا اور کرایا جا سکے۔

مبسوط سرخسی میں امام محمدؒ کے حوالہ سے تحریر ہے:

ذكر محمدؒ فی الاصل فی شیء من رسم الصكوك فاشترط أن يرفع الوالی من غلته كل عام مايحتاج اليه لأداء العشر والخراج والبذر وأرزاق الولاة عليها والعملة وأجور الحراس والحصادين والدراسين، لأن حصول منفعتها فی كل وقت لايتحقق الا بدفع هذه المؤن من رأس الغلة. (۱)

امام محمدؒ نے کتاب الاصل میں دستاویزات کے ضمن میں لکھا ہے کہ واقف وقف نامہ میں یہ شرط لگادے کہ متولی اس وقف کی آمدنی میں سے ہر سال اتنی آمدنی محفوظ رکھے گا جس سے عشر و خراج ادا کیا جا سکے، آئندہ سال کی فصل کے لئے بیج خریدی جا سکے، اس وقف کے متولی اور دیگر عمال کے وظائف ادا کئے جا سکیں، چوکیداروں کی تنخواہ، فصل کاٹنے اور گاھنے والوں کی اجرت ادا کی جا سکے، یہ شرط اس لئے لگانی چاہئے کہ اس وقف سے ہمیشہ ہمیشہ فائدہ اٹھانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وقف کی آمدنی سے یہ تمام اخراجات نہ کئے جائیں اس لئے وقف کی آمدنی سے ان مقاصد کے لئے کچھ پس انداز کر کے رکھنے کی شرط لگانی چاہئے۔

---

(۱) السرخسی، شمس الائمہ محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی، المبسوط للسرخسی، بیروت، دار المعرفۃ ۱۹۹۳م (۱۲/۴۳)

حالانکہ اگر واقف یہ شرط نہ لگاتا تب بھی متولی کی ذمہ داری ہے کہ وہ وقف کی آمدنی پوری کی پوری مصارفِ وقف پر خرچ نہ کرے بلکہ ان مقاصد کے لئے حسب ضرورت کچھ بچا کر رکھے کیونکہ وقف کا دوام و بقاء ان امور پر موقوف ہے، لیکن اس بات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے امام محمدؒ نے اسے بطورِ شرط دستاویزِ وقف میں صراحۃً ذکر کرنے کی تاکید فرمائی۔

علامہ ابن الہمامؒ مبسوط سرخسی کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وذلک وان کان یستحق بلاشرط عندنا لکن لایؤمن جهل بعض القضاة فیذهب رأیه الی قسمة جمیع الغلة، فاذا شرط ذلک فی صکه یقع الأمن بالشرط. [1]

یہ بات اگرچہ بلاشرط بھی ثابت ہو جاتی لیکن بعض قضاۃ کی جہالت سے اندیشہ ہو سکتا تھا کہ وہ پوری آمدنی کی تقسیم کا فیصلہ کر دے، اس لئے جب یہ شرط دستاویز وقف میں لگادی گئی تو یہ خطرہ نہیں رہا۔

معلوم ہوا کہ کسی چیز کی اہمیت کے پیش نظر بھی وقف میں اس کی شرط لگائی جاسکتی ہے اور شرط سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو مطلق وقف سے حاصل نہیں ہوتے۔

واقف کے لئے شرائط لگانے کی اجازت اور اس کی عائد کردہ جائز شرائط کی تعمیل کی اہمیت کا اندازہ فقہاءِ کرام رحمہم اللہ کے اس معروف جملہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ''شرط الواقف کنص الشارع'' یہاں اس جملہ کے مفہوم سے متعلق ضروری تفصیل ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۴/۵)

"شرط الواقف کنص الشارع" کا مفہوم

اس جملہ کے مفہوم میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے مختلف اقوال ہیں:

اس جملہ کی تفسیر میں پہلا قول:

پہلا قول یہ ہے کہ شرطِ واقف وجوبِ عمل میں نصِ شارع کی طرح ہے یعنی جس طرح نصِ شارع پر عمل کرنا واجب ہے اسی طرح واقف کی طرف سے عائد کردہ جائز شرطوں کی تعمیل بھی واجب ہے۔

علامہ خرشی فقیہ مالکی تحریر فرماتے ہیں:

الفاظ الواقف کالفاظ الشارع فی وجوب الاتباع. [1]

الفاظِ واقف الفاظِ شارع کی طرح ہیں وجوبِ عمل میں۔

علامہ ابن نجیم الاشباہ والنظائر میں تحریر فرماتے ہیں:

شرط الواقف کنص الشارع أی فی وجوب العمل به. [2]

شرطِ واقف نصِ شارع کی طرح ہے یعنی اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

یہاں تک کہ فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر قاضی واقف کی جائز شرائط کی بلاضرورتِ شرعیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کے خلاف فیصلہ دیدے تو وہ فیصلہ احناف کے نزدیک نافذ نہیں ہوگا، کیونکہ قاضی کا فیصلہ نص کے خلاف قابلِ قبول نہیں ہوتا، واقف کی شرائط بھی چونکہ حکمِ نص میں ہیں اس لئے ان کے خلاف بلاضرورتِ شرعیہ قاضی کا فیصلہ بھی قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ علامہ ابن عابدینؒ منحۃ الخالق میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الخرشی، محمد بن عبد اللہ بن علی الخرشی المالکی. شرح الخرشی علی مختصر سیدی خلیل، بیروت دار صادر (۷/۹۲)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/۱۲۱ کتاب الوقف)

ان قضاء القاضي ينقض عند الحنفية اذا كان حكما لادليل عليه قال: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم لادليل عليه سواء كان نصه في الوقف نصاً أو ظاهراً. (۱)

دوسرا قول:

دوسرا قول یہ ہے کہ شرطِ واقف نصِ شارع کی طرح ہے وجوبِ عمل میں لیکن وجوبِ عمل سے مراد یہ ہے کہ اگر واقف کسی کو وقف کی کوئی ذمہ داری دیدے تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو پوری طرح ادا کرے یا اپنی جگہ کسی اور کو مقرر کردے تاکہ وقف کا انتظام وانصرام چلتا رہے، اگر وہ شخص جسے واقف نے وقف کے انتظام وانصرام کے حوالہ سے کوئی ذمہ داری دی تھی خود بھی وہ ذمہ داری ادا نہیں کرتا اور نہ ہی اپنی جگہ کسی اور کو کام کرنے دیتا ہے تو ایسا شخص اسی طرح گناہگار ہوگا جس طرح تارکِ نص گناہگار ہوتا ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وأى مانع من أنه كنص الشارع في وجوب العمل به؟ فاذا شرط عليه أداء خدمة كقراءة أو تدريس وجب عليه اما العمل أو الترك لمن يعمل، حتى لو لم يعمل أو لم يترك ينبغي أن لايتردد في اثمه ولا سيما ان كانت الخدمة لما يلزم بتعطيلها ترك شعيرة من شعار الاسلام كالأذان ونحوه فتدبر. (۲)

اس بات سے کیا مانع ہے کہ شرطِ واقف نص شارع کی طرح ہو وجوب عمل میں، لہٰذا اگر واقف نے کسی پر خدمتِ قراءۃ یا تدریس کی ذمہ داری عائد کی تو اس پر واجب ہے کہ وہ خود یہ ذمہ داری ادا کرے یا یہ عہدہ کسی اور کے لئے چھوڑ دے کہ وہ یہ خدمت ادا کرسکے، اگر وہ شخص خود بھی ذمہ داری ادا نہیں کرتا اور نہ ہی یہ عہدہ چھوڑتا ہے تو اس کے گناہگار ہونے میں کوئی شبہ نہیں، خصوصاً جبکہ وہ ذمہ داری ایسی ہو کہ اسے ادا نہ کرنے کی صورت میں شعائرِ اسلام میں سے کسی شعار کا ترک لازم آتا ہو جیسے اذان وغیرہ۔

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۶/۵)

(۲) حواله بالا.

اس عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ واقف اگر کسی کو وقف کی کوئی ذمہ داری دے تو اس کے لئے وہ ذمہ داری پوری کرنا ضروری ہے ورنہ گناہگار ہوگا۔

اس پر بعض حضرات علامہ ابن نجیمؒ کی ایک عبارت سے اعتراض کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جسے واقف نے وقف کی کوئی ذمہ داری دی ہے اور وہ وقف کا ملازم ہے اگر وہ بعض اوقات کام نہ کرے تو گناہگار نہیں ہوگا، زیادہ سے زیادہ اس کے لئے تنخواہ حلال نہیں ہوگی۔

علامہ ابن نجیم تحریر فرماتے ہیں:

اذا ترک صاحب الوظيفة مباشرتها فی بعض الأوقات المشروط له فيها العمل لاياثم عند الله تعالیٰ، غايته انه لايستحق المعلوم. (۱)

اس اعتراض کا جواب علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ صاحبِ بحر کی عبارت میں اس صورت کا ذکر ہے جہاں وقف کا ملازم اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہا اور وقف سے تنخواہ بھی وصول نہیں کر رہا، اس کی جگہ اور کوئی وقف کا کام کر رہا ہے، چونکہ یہ تنخواہ بھی وصول نہیں کر رہا اور وقف کا کام بھی اس کی وجہ سے رک نہیں رہا اس لئے یہ گناہگار نہیں ہوگا۔ ہماری ذکر کردہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ وہ کام نہ کرنے کے باوجود اپنا عہدہ نہیں چھوڑ رہا اور تنخواہ وصول کر رہا ہے کسی اور کو اپنی جگہ مقرر نہیں کر رہا تو ایسی صورت میں وہ بلا کام کئے تنخواہ وصول کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا کیونکہ یہ واقف کی شرط کے صریح خلاف ہے۔ (۲)

دونوں اقوال پر علامہ ابن تیمیہؒ کا اعتراض:

شرط الواقف کنص الشارع کی مندرجہ بالا دونوں تفسیروں پر علامہ ابن تیمیہؒ اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شرطِ واقف کو وجوبِ عمل میں نصِ شارع کی طرح قرار دینا تو کفر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ واقف کی عائد کردہ شرائط جائز اور ناجائز دونوں طرح کی ہوتی ہیں لہٰذا شرط واقف میں دونوں طرح کی شرائط داخل ہیں اسے مطلقاً واجب العمل قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ناجائز شرائط کو بھی واجب العمل قرار دیا جا رہا ہے جو کہ موجبِ کفر ہے۔ ھذا ما فهمت من کلامہ۔ علامہ کا یہ اعتراض ان کی تلمیذِ رشید ابن قیمؒ نقل کرتے ہیں:

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۶/۵)

(۲) الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۳۴/۴)

أما أن يجعل نصوص الواقف أو نصوص غيره من العاقدين كنصوص الشارع في وجوب العمل بها فهذا كفر بالاتفاق اذ لايطاع أحد من البشر في كل مايأمر بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد اتفق المسلمون على أن شروط الواقف تنقسم الى قسمين: صحيح وفاسد كالشروط في سائر العقود، فالشروط ان وافقت كتاب الله كانت صحيحة وان خالفت كتاب الله كانت باطلة.(١)

واقف یااس کے علاوہ دیگر عاقدین کی شرط کووجوبِ عمل میں نص شارع کی طرح قرار دینا تو کفر ہے اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی بشر نہیں ہے جس کے امر کی اطاعت کی جائے، تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ واقف کی شرط صحیح بھی ہوتی ہے اور فاسد بھی دیگر عقود کی شرائط کی طرح، پس اگر واقف کی شرط کتاب اللہ کے موافق ہوگی تو صحیح ہوگی، مخالف ہوگی تو فاسد ہوگی۔

لیکن احقر کی رائے میں یہ کوئی وزنی اعتراض نہیں کیونکہ جوفقہاء کرام رحمہم اللہ شرطِ واقف کووجوبِ عمل میں نص شارع کی طرح قرار دیتے ہیں ظاہر ہے وہ شرطِ واقف سے واقف کی ہر شرط مراد نہیں لیتے بلکہ واقف کی عائد کردہ جائز شرائط ہی مراد لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ جملہ نقل کیا ہے انہوں نے واقف کی عائد کردہ شرائط کا تفصیلی جائزہ بھی لیا ہے کہ کونسی شرائط باطل ہیں اور کونسی شرائط جائز، اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ واقف کی عائد کردہ ایسی شرائط جومقصدِ وقف اور مقتضاءِ وقف کے خلاف ہوں وہ باطل ہیں نا قابلِ عمل ہیں بلکہ بعض کے نزدیک ان میں سے بعض شرائط سے وقف بھی باطل ہوجاتا ہے، اس لئے ان کے اس جملہ کوموجبِ کفر قرار دینا ان کی ذکر کردہ دیگر تفصیلات سے آنکھ بند کر لینے کے مترادف ہے۔

تیسرا قول:

تیسرا قول اس جملہ کی تشریح میں یہ ہے کہ شرطِ واقف مفہوم میں نص شارع کی طرح ہے یعنی جس طرح نصوصِ شرعیہ میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں ہوتا اسی طرح کلامِ واقف میں بھی مفہومِ مخالف کا اعتبار نہیں ہوگا، لہٰذا جس صورت کا کلامِ واقف میں صراحۃً ذکر نہیں وہ صورت مسکوت عنہ ہوگی۔

---

(١) ابن قيم، ابو عبد الله محمد بن ابى بكر الدمشقى المعروف بابن قيم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين، بيروت، دار احياء التراث العربى (٩٢/٣)

ردالمحتار میں ہے:

وقد یقال ان مراده بقوله: "فی المفهوم" انه لا یعتبر مفهومه کما لایعتبر فی نصوص الشارع.

وفی البیری: نحن لانقول بالمفهوم فی الوقف کما هو مقرر ونص علیه الامام الخصاف وأفتی به العلامة قاسم. (۱)

بعض حضرات نے کہا "شرط الواقف کنص الشارع أی فی المفہوم" کا مطلب یہ ہے کہ شرطِ واقف کا مفہوم مخالف بھی معتبر نہیں جیسے نص شارع میں مفہومِ مخالف کا اعتبار نہیں۔

شارحِ اشباہ علامہ بیری نے فرمایا کہ وقف میں ہم مفہوم مخالف کے قائل نہیں ہیں، یہ طے شدہ امر ہے، علامہ خصاف رحمہ اللہ نے اس کی صراحت فرمائی ہے اور علامہ قاسم رحمہ اللہ نے اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

لیکن یہ تعبیر فقہاء کرام رحمہم اللہ کے موقفِ راجح کے خلاف ہے کیونکہ فقہاء کرام رحمہم اللہ کی مختلف نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ مفہوم مخالف معتبر ہونے نہ ہونے میں نصِ شارع اور کلامِ غیر شارع میں فرق ہے۔ فقہاء احناف رحمہم اللہ کے نزدیک نصِ شارع میں بالاتفاق مفہوم مخالف معتبر نہیں، البتہ کلامِ ناس، معاملات، امورِ عقلیہ اور نصوصِ کتب میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح عقود رسم المفتی میں اس پر بڑی نفیس بحث فرمائی ہے اور فقہاء کرام رحمہم اللہ کی مختلف عبارات نقل کرنے کے بعد یہی نتیجہ اخذ فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

والحاصل أن العمل الآن علی اعتبار المفهوم فی غیر کلام الشارع. (۲)

حاصل یہ ہے کہ اب عمل اس پر ہے کہ غیر کلامِ شارع میں مفہومِ مخالف کا اعتبار ہے۔

کلام واقف بھی کلام الناس کی قبیل سے ہے اس لئے اس میں بھی مفہومِ مخالف کا اعتبار ہوگا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ ردالمحتار میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۲ھ (۴۳۳/۴) مزید دیکھئے: ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفیٰ الآفندی ۹۸۲ھ. عمدة الناظر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، لائبریری جامعه دار العلوم کراچی (۲۵/۲)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. شرح عقود رسم المفتی، کراچی، قدیمی کتب خانه (۳۶)

وحيث كان المفهوم معتبرا فى متفاهم الناس وعرفهم وجب اعتباره فى كلام الواقف أيضا لأنه يتكلم على عرفه.(۱)

جب تفاہمِ ناس اوران کے عرف میں مفہومِ مخالف معتبر ہےتو کلامِ واقف میں بھی مفہومِ مخالف معتبر ہوگا کیونکہ وہ بھی اپنےعرف کے مطابق کلام کرتا ہے۔

لہٰذا جب کلامِ واقف میں مفہوم معتبر ہےتو اسے مفہوم کے اعتبار سے نصِ شارع سے تشبیہ دینا درست نہیں ہوگا کیونکہ دونوں کا حکم ایک نہیں۔

چوتھا قول:

چوتھا قول جوعلامہ ابن تیمیہ وابن القیم رحمہما اللہ کی طرف منسوب ہےاور فقہاء احناف میں سے علامہ قاسم رحمہ اللہ نے اسے اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ شرطِ واقف فہم ودلالۃ میں نصِ شارع کی طرح ہے یعنی جس طرح مرادِ شارع سمجھنے کے لئے الفاظِ شارع پرغور کیا جاتا ہے کہ وہ عام ہیں یا خاص، مطلق ہیں یا مقید، مفسر ہیں یا مجمل، اسی طرح واقف کی مراد سمجھنے کے لئے الفاظِ واقف پرغور کیا جائے گا، الفاظِ شارع سے مرادِ شارع سمجھنے کے لئے اور مراد پر دلالۃ کرنے کے لئے جو اصول موضوع ہیں وہی اصول الفاظِ واقف اورشروطِ واقف میں بھی جاری ہوں گے۔علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وان أحسن الظن بقائل هذا القول حمل كلامه على انها كنصوص الشارع فى الدلالة و تخصيص عامها بخاصها وحمل مطلقها على مقيدها واعتبار مفهومها كما يعتبر منطوقها وأما أن تكون كنصوصه فى وجوب الاتباع وتأثيم من أخل بشىء منها فلا يظن ذلک بمن له نسبة مَّا الى العلم الخ.(۲)

اس جملہ ''شرط الواقف كنص الشارع'' کے قائل کےساتھ احسن ظن یہ ہے کہ اس کے کلام کو اس پر محمول کیا جائے کہ شرطِ واقف دلالۃ، خاص کے ذریعہ عام کی تخصیص اور

---

(۱) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۴)

(۲) ابن قيم، ابو عبد الله محمد بن ابى بكر الدمشقى المعروف بابن قيم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين مكة المكرمة، مكتبة نزار مصطفى الباز، الطبعة الثانية ۲۰۰۳م (۱/۳۰۴، ۴/۱۲۹۹)

مطلق کو مقید پر محمول کرنے میں نصِ شارع کی طرح ہے اسی طرح شرطِ واقف کے مفہوم کا بھی اس کے منطوق کی طرح اعتبار کیا جائے گا۔

اس جملہ سے یہ مراد لینا کہ ''وجوب اتباع میں شرط واقف نصِ شارع کی طرح ہے اور جو ان شروط کا کسی بھی درجہ میں لحاظ نہ رکھے وہ گناہگار ہوگا جیسے کہ نص شارع کا اہتمام نہ کرنے والا گناہگار ہوتا ہے'' اس کی اس شخص سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی جسے علم سے ادنیٰ درجہ کی نسبت بھی ہو۔

علامہ قاسم قطلو بغا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واذا كان المعنى ماذكر فما كان من عبارة الواقف من قبيل المفسر لا يحتمل تخصيصا ولا تأويلا يعمل به وما كان من قبيل الظاهر كذلک، وما احتمل وفيه قرينة حمل عليها وماكان مشتركاً لايعمل به لأنه لاعموم له عندنا ولم يقع فيه نظر المجتهد ليترجح أحد مدلوليه وكذلک ماكان من قبيل المجمل اذا مات الواقف وان كان حيا يرجع الى بيانه. [1]

جب اس جملہ کا مطلب وہ ہے جو ذکر کیا گیا (کہ شرطِ واقف فہم و دلالۃ میں نص شارع کی طرح ہے) تو واقف کی وہ عبارت جو مفسر ہو جس میں تاویل و تخصیص کا احتمال نہ ہو اس پر عمل کیا جائے گا اور جو عبارت ظاہر کی قبیل سے ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اور جس میں کوئی اور احتمال بھی ہو اور اس پر قرینہ بھی موجود ہو تو اس پر محمول کیا جائے گا، اور جو از قبیل مشترک ہو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ہمارے نزدیک عمومِ مشترک جائز نہیں اور مجتہد نے مختلف معانی میں سے کسی کو ترجیح دی نہیں، اسی طرح جو مجمل ہو اور واقف کا انتقال ہو گیا ہو تو اس پر بھی عمل نہیں کیا جائے گا البتہ اگر واقف زندہ ہو تو اس کی طرف رجوع کیا جائے گا تاکہ وہ اس کے معنی بیان کردے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۳۴/۴)

پانچواں قول:

شرط الواقف کنص الشارع کی تشریح میں پانچواں قول یہ ہے کہ شرطِ واقف فہم ودلالۃ اور وجوبِ عمل میں نصِ شارع کی طرح ہے،یعنی شرطِ واقف پرعمل بھی واجب ہے اوراس کے سمجھنے کے اصول بھی وہی ہیں جو نص شارع کے سمجھنے کے ہیں۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

شرط الواقف كنص الشارع أى فى المفهوم والدلالة ووجوب العمل به. (1)

یہ قول درحقیقت پہلے اور چوتھے قول کا جامع ہے۔

قولِ راجح:

ان پانچوں اقوال میں یہ آخری قول راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جو حضرات وجوبِ عمل میں شرط واقف کو نصِ شارع سے تشبیہ دیتے ہیں وہ بھی اس کا انکار نہیں کرتے کہ کلامِ واقف کے سمجھنے کے وہی اصول ہیں جو کلامِ شارع کے سمجھنے کے ہیں، اور جو حضرات فہم ودلالۃ میں نص شارع سے تشبیہ دیتے ہیں وہ بھی واقف کی جائز شرائط کی پابندی ضروری قرار دیتے ہیں گویا کہ یہ دو باتیں ہر فریق کے یہاں متفق علیہ ہیں، لہٰذا یہ آخری قول جوان دونوں امور پر مشتمل ہے راجح ہوگا۔

بہرحال فقہاء کرام رحمہم اللہ کے بیان کردہ اس جملہ سے واقف کی عائد کردہ شرائط کی اہمیت اور اس کے مطابق عمل کا لزوم خوب واضح ہوجاتا ہے۔

واقف کی عائد کردہ شرائط کی اہمیت فقہی جزئیات کی روشنی میں:

اب ہم ذیل میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے بیان کردہ فقہی جزئیات میں سے چند جزئیات نقل کرتے ہیں جن سے یہ بات مزید واضح ہوگی کہ ان کے نزدیک واقف کی عائد کردہ جائز شرائط کی کیا اہمیت ہے:

---

(۱) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۳)

۱۔ اگر کسی شخص نے مکان وقف کیا اور وقف نامہ میں یہ شرط لگائی کہ موقوف علیہم اس مکان کو رہائش کے لئے استعمال کریں گے تو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ موقوف علیہم اب اس مکان کو کرایہ پر نہیں دے سکتے۔(۱)

۲۔ اسی طرح اگر واقف نے شرط لگائی کہ موقوف علیہم اس مکان کو کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی استعمال کریں گے تو اب ان کے لئے اس مکان میں خود رہنا جائز نہیں کیونکہ اس میں واقف کی شرائط کی خلاف ورزی ہے۔(۲)

۳۔ امام ابوالفضل سے پوچھا گیا کہ واقف نے زمین وقف کی اور یہ شرط لگائی کہ اس کی چوتھائی آمدنی مدرسہ کی عمارت پر خرچ کی جائے اور تین چوتھائی آمدنی فقہاء کرام پر خرچ کی جائے۔ ایک سال مدرسہ کو عمارت کی ضرورت نہیں لیکن فقہاء کو ضرورت ہے تو کیا مدرسہ کی عمارت کے لئے مخصوص چوتھائی آمدنی بھی فقہاء پر خرچ کی جاسکتی ہے؟ امام نے فرمایا کہ نہیں، عمارت کے لئے مخصوص آمدنی فقہاء پر خرچ نہیں کی جاسکتی۔(۳)

۴۔ اگر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ اس کی آمدنی اصحابِ حدیث کو ملے گی تو ان کے علاوہ کسی اور کو یہ آمدنی نہیں دی جاسکتی۔(۴)

۵۔ علامہ ونشریسی رحمہ اللہ "المعیار المعرب" میں تحریر فرماتے ہیں:

> علامہ سرقسطی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ایک مسجد کے کچھ اوقاف ہیں ان میں یہ صراحت ہے کہ یہ مسجد کی تعمیر، چٹائی اور تیل وغیرہ پر خرچ کئے جائیں گے تو کیا ان اوقاف سے امامِ مسجد اور موذن مسجد کو کچھ دیا جاسکتا ہے؟ علامہ نے جواب دیا کہ نہیں، واقف نے وقف کا جو مصرف متعین کردیا ہے اس کے علاوہ کسی اور پر یہ وقف خرچ نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی اس مصرف کو تبدیل کرے گا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا۔(۵)

---

(۱) نظام، الشیخ نظام وجماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاوی الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۲/۴۱۴)

(۲) حواله بالا (۲/۴۱۵)

(۲۸) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۷۴۹)

(۳) نظام، الشیخ نظام وجماعة علماء الهند من القرن الحادی عشر. الفتاوی الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م (۲/۳۷۰)

(۴) الونشریسی، محمد بن یحییٰ الونشریسی ۹۱۴ھ. المعیار المعرب، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۹۸۱م (۷/۱۶۰)

واقف کی عائد کردہ ممکنہ شرائط کی تین قسمیں

واقف کی عائد کردہ ممکنہ شرائط کو ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ وہ شرائط جو مقتضائے وقف، حکمِ وقف اور غایتِ وقف کے منافی ہوں جیسے وقف کرتے وقت واقف کا یہ شرط لگانا کہ وہ جب چاہے اس وقف کو بیچ سکتا ہے، ہبہ کر سکتا ہے۔

۲۔ وہ شرائط جو مقتضائے وقف اور حکمِ وقف کے تو منافی نہیں لیکن وہ یا تو شریعت کے خلاف ہیں یا موقوف علیہم کی مصلحت کے خلاف ہیں یا وقف کی مصلحت کے خلاف ہیں یا وقف سے فائدہ حاصل کرنے میں خلل پیدا کرنے کا باعث ہیں۔

جیسے: واقف یہ شرط لگا دے کہ متولی وقف چاہے خیانت کیوں نہ کرے اسے کوئی معزول نہیں کر سکتا، یا وقف کی کچھ آمدنی جہتِ معصیت پر خرچ کرنے کی شرط لگا دے، یا یہ شرط لگا دے کہ وقف کی آمدنی مستحقین پر خرچ کی جائے گی وقف کی عمارت پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا چاہے وہ عمارت منہدم کیوں نہ ہو جائے۔

۳۔ وہ شرائط جو نہ مقتضائے وقف کے خلاف ہوں نہ شریعت کے خلاف ہوں نہ مصلحتِ وقف و موقوف علیہم کے خلاف ہوں اور نہ ہی انتفاع از وقف میں مخل ہوں جیسے: واقف کا اپنے لئے تولیت کی شرط لگانا، استبدال کی شرط لگانا وغیرہ۔

اب ہم تینوں قسموں کے شرعی حکم پر گفتگو کرتے ہیں جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ فقہائے کرام کے ارشاد نص الواقف کنص الشارع کا یہ مطلب نہیں کہ واقف کی ہر طرح کی شرط واجب العمل ہے بلکہ اس میں قدرے تفصیل ہے اور یہ جملہ ایک مخصوص قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

پہلی قسم یعنی مقتضائے وقف کے منافی شرائط کا حکم:

وہ شرائط جو مقتضائے وقف اور حکم کے منافی ہیں مثلاً وقف کرتے وقت یہ شرط لگانا کہ واقف جب

چاہے وقف کو باطل کرسکتا ہے یا جب چاہے اس وقف کو بیچ سکتا ہے یا ہبہ کرسکتا ہے، ایسی شرائط کے بارے میں فقہاء احناف رحمہم اللہ کی آراء مختلف ہیں۔

امام ہلالؒ کی رائے:

۱۔ امام ہلال رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی شرائط نہ صرف یہ کہ خود باطل ہیں بلکہ ان سے وقف بھی باطل ہوجاتا ہے۔فرماتے ہیں:

قلت: أرأيت رجلا يقف ارضا له على وجوه سماها وعلى انه بالخيار في ابطال أصل الوقف متى مابداله؟ قال: الوقف باطل لا يجوز. (۱)

سائل نے سوال کیا کہ ایک شخص متعینہ مصارف پر وقف کرتا ہے اور یہ شرط عائد کرتا ہے کہ میں جب چاہوں اس وقف کو باطل کرسکتا ہوں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام ہلال رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وقف باطل ہے، جائز نہیں۔

ہندیہ اور تاتارخانیہ میں ذکر کردہ جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین میں سے امام ابوبکر الاسکاف رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی تھی۔ (۲)

امام ابونصرؒ، امام ابوالقاسمؒ اور امام یوسف بن خالد السمتیؒ کی رائے:

۲۔ امام ابونصرؒ، امام ابوالقاسمؒ اور امام ہلالؒ کے استاذ امام یوسف بن خالد السمتی رحمہم اللہ کے نزدیک ایسی شرائط خود تو باطل ہیں لیکن ان کی وجہ سے وقف باطل نہیں ہوگا۔علامہ اندریتی فتاویٰ تاتارخانیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

وفي سير العيون: حبس فرساً في سبيل الله عشر سنين ثم هي مردودة الى صاحبها فهو باطل، وعن يوسف بن خالد السمتي أستاذ هلال أن

---

(۱) هلال الراى، هلال بن يحيى بن مسلم الراى. كتاب احكام الوقف، حيدر آباد دكن، دائرة المعارف العثمانية ۱۳۵۵ھ (۸۴)

(۲) دیکھئے: الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۲۲۷) نظام، الشيخ نظام وجماعة علماء الهند من القرن الحادى عشر. الفتاوى الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۲/۴۰۲)

الوقف جائز والشرط باطل، وكذا فى الوقف على شرط أن يبيعه كما قال ابو القاسم وأبو نصر.[۱]

سیر العیون میں ہے کہ کسی نے اللہ کے راستہ میں گھوڑا وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ یہ وقف دس سال کے لئے ہے، دس سال بعد یہ مالک کے پاس واپس آجائے گا، تو یہ وقف باطل ہے۔ یوسف بن خالد سمتیؒ جو امام ہلال الرائیؒ کے استاد ہیں ان کے نزدیک وقف جائز ہے اور شرط باطل، یہی حکم اس صورت میں بھی ہے جب وقف میں یہ شرط لگائی کہ واقف اسے بیچ سکتا ہے جیسا کہ ابو القاسم اور ابو نصر رحمہما اللہ نے صراحت کی ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا موقف:

امام خصاف رحمہ اللہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک جزئیہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا موقف بھی یہی تھا، فرماتے ہیں:

وقد روى عن أبى يوسف فى رجل وقف أرضا له وجعل غلة ذلك راجعاً الى المساكين وشرط أن له ابطال ذلك وبيعه ولم يقل يستبدل بثمنه مايكون وقفا مكانه أن الوقف جائز والشرط الذى اشترطه من البيع باطل لايجوز.[۲]

امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے وقف کیا، وقف کی آمدنی فقراء کے لئے مخصوص کردی اور یہ شرط لگائی کہ وہ وقف کو باطل کرسکتا ہے اور اسے بیچ سکتا ہے، یہ صراحت نہیں کی کہ بیچ کر اس کی قیمت سے ایسی چیز خریدوں گا جو اس کی جگہ وقف ہوگی (اگر یہ صراحت کردیتا تو بلاشبہ بالاتفاق وقف اور شرط دونوں درست ہوتے) تو ایسی صورت میں وقف جائز ہے اور شرط باطل۔

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۲۲۷)

(۲) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹ء (۲۱)

لیکن خود امام خصافؒ کی رائے اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے انہوں نے متعدد مواقع پر یہ صراحت کی ہے کہ ایسی شرط اگر لگائی جائے گی تو وقف بھی باطل ہو جائے گا ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔[1]

امام محمدؒ کی رائے:

علامہ اندریتی رحمۃ اللہ نے فتاویٰ کبریٰ کے حوالہ سے ایک جزئیہ نقل کیا ہے جس میں صراحت ہے کہ امام ابو یوسفؒ ایسی شرائط لگانے کی صورت میں وقف کو جائز اور شرط کو باطل قرار دیتے تھے جبکہ امام محمد رحمہ اللہ وقف کو بھی باطل قرار دیتے تھے:

وان شرط فی الوقف أن له أن يبيع ذلک ولم يشترط الاستبدال بثمنه مايكون وقفاً مكانه، قال محمد: الوقف باطل، وعن أبی يوسف ان الوقف جائز والشرط باطل وفی الكبریٰ هو المختار.[2]

اگر وقف میں شرط لگائی کہ واقف وقف کو بیچ سکتا ہے اور یہ صراحت نہیں کی کہ اسے بیچ کر اس کی قیمت سے جو خریدا جائے گا وہ اس کی جگہ وقف ہوگا تو امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وقف باطل ہے، جبکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وقف جائز ہے اور شرط باطل ہے، کبریٰ میں ہے کہ یہی مذہب مختار ہے۔

المحیط البرہانی میں بھی اسی طرح کی عبارت موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ حضرات صاحبینؒ میں بھی مختلف فیہا تھا۔[3] متاخرینِ فقہاء احناف رحمہم اللہ کی آراء میں بھی یہی اختلاف ملتا ہے۔

متاخرین فقہاء کرامؒ کی آراء:

(۱) بیشتر اصحابِ متون نے ایسی صورت میں وقف کو باطل قرار دیا ہے، علامہ حصکفی رحمہ اللہ "الدر المختار" میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) دیکھئے: الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانی المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹ء (۱۰۸ و ۱۳۲)

(۲) الاندريتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندريتی. الفتاوی التتارخانيه، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۷۲۳)

(۳) دیکھئے: ابن مازه البخاری، برهان الدن ابو المعالی محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ھ. المحيط البرهانی، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴ء (۵/۹)

ولا ذكر معه اشتراط بيعه وصرف ثمنه لحاجته فان ذكره بطل وقفه. بزازية.[1]

وقف میں یہ شرط نہ لگائی جائے کہ واقف اسے بیچ کر اس کی قیمت اپنی ضروریات میں خرچ کرسکتا ہے، اگر ایسی شرط ذکر کی گئی تو اس سے وقف باطل ہوجائے گا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تائید میں امام خصافؒ کی عبارات بھی نقل کی ہیں اور مسجد کے علاوہ اوقاف میں جامع الفصولین کے حوالہ سے باطل ہونے کی رائے کو مختار قرار دیا ہے۔[2]

(۲) علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریرات رافعی میں اس کی تردید کی ہے اور راجح یہ قرار دیا ہے کہ ایسی منافیِ وقف شرائط سے وقف باطل نہیں ہوگا بلکہ یہ شرائط باطل ہوں گی، ان سے وقف کی صحت متاثر نہیں ہوگی۔ فرماتے ہیں:

فی حاشية الاسقاطی بعد ذكر عبارة البزازی التی ذكرها الشراح مانصه: وفی فتاویٰ الشيخ قاسم ان الوقف صحيح والشرط باطل وهو المختار وفی منهوّات فتاویٰ الأنقروی ولو شرط فی الوقف أن له أن يبيع ذلک ولم يشترط الاستبدال بثمنه مايكون وقفا مكانه قال محمد: الوقف باطل، وعن أبی يوسف أن الوقف جائز والشرط باطل، وفی الكبریٰ هو المختار، كذا فی وقف التتارخانيه اه، ثم رأيت بخط الشيخ محمد الطائی علی هامش الخصاف بخطه ايضاً مانصه: سئل شيخنا العلامة الاسقاطی عن واقف شرط فی وقفه النقض والابرام والتبديل الخ ثم نوزع فی هذا الشرط وأراد المنازع ابطال الوقف به قائلاً ان النقض هو الابطال وهو مبطل للوقف فحكم القاضی بعدم الابطال وصحة الوقف، فهل يسوغ لأحد بعد ذلک ابطاله أو الافتاء بالابطال؟ فأجاب: الوقف المذكور صحيح معمول

---

(۱) الحصكفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدين الحصكفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچی، ایچ ایم سعید كمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۲/۴)

(۲) الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید كمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۲/۴)

به وان لم يحكم الحاكم بصحته، وأما شرط الواقف نقضه وابطاله فهو شرط غير صحيح على ماهو المختار للفتوىٰ، صرح بذلك العلامة قاسم والشيخ الطوسى فى فتاو يهما، و نقله الطرسوسى عن التتارخانية والفتاوىٰ الكبرىٰ، ثم بعد ما حكم الحاكم بالصحة لايجوز الافتاء بالابطال ولا العمل بتلك الفتوىٰ والله اعلم اھ۔
وجعل فى خزانة الأكمل القول ببطلان الوقف بهذا الشرط هو القياس والاستحسان صحة الوقف.[1]

علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس طویل عبارات میں فتاویٰ شیخ قاسم، فتاویٰ انقرویہ، فتاویٰ کبریٰ اور فتاویٰ تتارخانیہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اگر واقف وقف میں مقتضائے وقف کے منافی کوئی شرط لگادے تو ایسی صورت میں یہ شرط باطل ہوگی، وقف باطل نہیں ہوگا، یہی رائے ان حضرات کے نزدیک مختار ہے۔ علامہ اسقاطی رحمہ اللہ سے بھی ایسی صورت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا اور فرمایا کہ فتویٰ کے لئے یہی رائے مختار ہے۔

آخر میں علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے خزانۃ الاکمل کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایسی شرط کی وجہ سے وقف کے باطل ہونے کو قیاس قرار دیا ہے اور وقف کے باطل نہ ہونے کو استحسان قرار دیا ہے۔

قولِ راجح:

احقر کو عبارات میں غور کرنے سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ مقتضائے وقف کے منافی شرائط سے وقف باطل نہیں ہونا چاہئے بلکہ وہ شرط خود ہی باطل ہونی چاہئے، اس کی وجوہِ ترجیح درج ذیل ہیں:

پہلی وجہِ ترجیح:

بہت سے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ صراحت کی ہے کہ فتویٰ کے لئے یہی رائے مختار ہے، جیسا کہ علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں موجود ہے۔

---

(۱) الرافعي، عبد القادر الرافعي. تقريرات الرافعي ملحق برد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى (۷۵/۴)

دوسری وجہِ ترجیح:

صاحبِ خزانۃ الاکمل نے اس رائے کو استحسان قرار دیا ہے اور بطلان وقف والی رائے کو قیاس قرار دیا ہے، ظاہر ہے قیاس کے مقابلہ میں استحسان کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء تحریر فرماتے ہیں:

هذا هو الحكم المشهور في المذهب والمنقول في كتاب الاسعاف عن أحكام الأوقاف للامامين هلال والخصاف وفي الدر المختار ورد المحتار الخ، وهو القياس، لكن نقل الرافعي في تعليقاته على ردالمحتار نقلاً عن كتب معتبرة في المذهب كالتتارخانيه وفتاوىٰ العلامة قاسم أن الاستحسان خلافه وأن الرأى المختار للفتوىٰ اعتبار صحة الوقف ولزومه موبدا وبطلان هذه الشروط المنافية له.

فيجب التعويل على هذا على لأن من المقرر انه عند وجود الترجيح الصريح المعتبر يجب الأخذ به وان كان المشهور خلافه، ولا سيما أن الاستحسان مقدم على القياس. [1]

مقتضائے وقف کی منافی شرائط کی وجہ سے وقف کا باطل ہونا یہ مذہبِ حنفی میں مشہور ہے اور صاحبِ اسعاف نے امام ہلال الرأی اور امام خصافؒ کے حوالہ سے یہی نقل کیا ہے، الدر المختار اور ردالمختار میں بھی یہی منقول ہے، اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔

لیکن علامہ رافعیؒ نے ردالمختار پر اپنی تعلیقات میں فقہ حنفی کی کتبِ معتبرہ مثلاً فتاویٰ تتارخانیہ اور فتاویٰ علامہ قاسم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ استحسان اس کے برخلاف ہے، اور فتویٰ کے لئے مختار رائے یہی ہے کہ وقف کو صحیح اور ہمیشہ کے لئے لازم کیا جائے اور ان شرائطِ منافیہ کو باطل قرار دیا جائے۔

شیخ زرقاء فرماتے ہیں کہ علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے پر اعتماد کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ بات طے ہے کہ جب معتبر ترجیحِ صریح کسی ایک رائے کی موجود ہو تو اس کو اختیار کرنا

---

(۱) الزرقاء، مصطفى احمد الزرقاء. احكام الاوقاف، دمشق (۱/۳۶)

واجب ہے چاہے مشہور اس رائے کے خلاف کیوں نہ ہو، اور خاص طور پر استحسان تو قیاس پر مقدم ہی ہوتا ہے۔

تیسری وجہِ ترجیح:

کونسے عقود شرطِ فاسد سے فاسد ہوتے ہیں کون سے نہیں؟ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے شرطِ فاسد سے عقد کے فاسد ہونے نہ ہونے کا ضابطہ یہ بیان فرمایا ہے کہ جن عقود میں مبادلۃ المال بالمال پایا جاتا ہے وہ شرطِ فاسد سے فاسد ہوجاتے ہیں جیسے بیع، اجارہ، صلح علی مال وغیرہ اور جن عقود میں مبادلۃ المال بالمال نہیں پایا جاتا وہ شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتے بلکہ وہ شرط ہی غیر معتبر ہوتی ہے، عقد درست رہتا ہے جیسے قرض، ہبہ، وصیۃ، طلاق، نکاح وغیرہ۔ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

كل ما كان مبادلة مال بمال يفسد بالشرط الفاسد كالبيع وما لافلا كالقرض. (۱)

جو عقد مبادلۃ المال بالمال کی قبیل سے ہو وہ شرطِ فاسد سے فاسد ہوجاتا ہے جیسے بیع، اور جو مبادلۃ المال بالمال کی قبیل سے نہ ہو وہ فاسد نہیں ہوتا، جیسے قرض۔

یہی ضابطہ علامہ ابن نجیم اور علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہما نے بھی ذکر کیا ہے۔ (۲)

اس قاعدہ کی رو سے اگر وقف پر غور کیا جائے تو اس کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ منافیِ وقف شرائطِ فاسدہ کی وجہ سے وقف فاسد نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ شرائط خود غیر معتبر ہونی چاہئیں، کیونکہ وقف میں مبادلۃ المال بالمال یعنی مالی تبادلہ نہیں پایا جاتا، یہ ہبہ، صدقہ اور وصیۃ وغیرہ کی طرح عقدِ تبرع ہے، جس طرح یہ عقودِ تبرع شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتے اسی طرح وقف بھی شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہونا چاہئے۔

اہم سوال:

یہاں ایک اہم سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ بیشتر اصحابِ متون یہ اصول ذکر کرتے وقت وقف کو بیع،

---

(۱) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ١٠٠٨ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (٥/٢٤٠)

(۲) دیکھئے: ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (٦/١٧٩) الزيلعى، فخر الدين عثمان بن على الزيلعى ٧٤٣ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دار الكتب العلميه، الطبعة الاولىٰ ٢٠٠٠م (٤/٣٤١)

اجارہ وغیرہ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں جو شرطِ فاسد سے فاسد ہو جاتے ہیں صاحبِ کنزؒ نے یہی صنیع اختیار کیا ہے۔[1] صاحبِ تنویر الابصار[2] اور صاحبِ ملتقی الابحر علامہ حلبی رحمہما اللہ[3] نے بھی وقف کو بیع وغیرہ کے ساتھ قسمِ اول کے تحت ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیع کی طرح وقف بھی شرطِ فاسد سے فاسد ہو جاتا ہے۔

جواب:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ کے صنیع اور انداز سے واقعی یہ شبہ ہوتا ہے، لیکن اگر ان کی عبارات میں غور کیا جائے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس مقام پر دو الگ الگ قاعدوں اور ضابطوں کو متوازی لے کر چل رہے ہیں۔

ایک ضابطہ تو اس سلسلہ میں یہ ہے کہ کونسے عقود شرطِ فاسد سے فاسد ہو جاتے ہیں اور کونسے عقود شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتے، جبکہ دوسرا ضابطہ اس سلسلہ میں ہے کہ کون سے عقود شرط پر معلق ہو سکتے ہیں اور کونسے معلق نہیں ہو سکتے۔

پہلے ان عقود کی مثالیں ذکر کی گئی ہیں جو شرطِ فاسد سے فاسد ہو جاتے ہیں یا انہیں شرط پر معلق کرنا درست نہیں، فقہاء کرامؒ کی ذکر کردہ مثالوں میں بعض مثالیں وہ ہیں جو دونوں ضابطوں کی مثال ہیں جیسے بیع، مبادلۃ المال بالمال کی وجہ سے یہ شرطِ فاسد سے فاسد ہو جاتی ہے اور اسے شرط پر معلق کرنا بھی درست نہیں، اور بعض مثالیں وہ ہیں جو دوسرے قاعدہ کی ہیں یعنی انہیں شرط پر معلق کرنا درست نہیں جیسے رجعۃ، عزلِ وکیل، ان میں چونکہ مبادلۃ المال بالمال نہیں پایا جاتا اس لئے یہ شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتے لیکن انہیں شرط پر معلق کرنا درست نہیں۔

وقف بھی رجعۃ اور عزلِ وکیل کی طرح دوسرے ضابطہ (یعنی کن عقود کو شرط پر معلق کرنا درست نہیں) کی مثال ہے، اس کا پہلے ضابطہ سے تعلق نہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بحث کے آغاز ہی میں تمہید کے طور پر ذکر کردہ تفصیلات

---

(۱) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۱۸۶/۲)

(۲) دیکھئے: التمرتاشی، محمد بن عبد اللہ بن احمد الخطیب التمرتاشی ۱۰۰۴ھ. تنویر الابصار مع الدر المختار والشامیة، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۴۸/۵)

(۳) دیکھئے: الحلبی، محمد ابراهیم الحلبی. ملتقی الابحر مع شرحه مجمع الانهر، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۸م (۱۵۶/۳)

وضاحت کے ساتھ بیان کردی ہیں تا کہ یہ شبہ نہ ہو، رجعۃ کی مثال پر بعض حضرات نے یہی اعتراض کیا جو بندہ نے وقف کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والجواب عما قاله في البحر أنه مبني على أن قولهم مايبطل بالشرط الفاسد ولايصح تعليقه به قاعدة واحدة والفروع المذكورة بعدها مفرعة عليها، وذلك غير صحيح بل هما قاعدتان كما قررناه، والرجعة مفرعة على الثانية منهما فقط، فلا بطلان في كلامهم بعد فهم مرامهم. [1]

صاحبِ بحر نے جو سوال اٹھایا ہے یہ اس پر مبنی ہے کہ اصحابِ متون کا یہ جملہ ''وہ عقود جو شرط فاسد سے باطل ہوجاتے ہیں اور جنہیں شرط پر معلق کرنا درست نہیں ہے'' ایک قاعدہ فرض کیا جائے اور بعد میں آنے والی تفریعات اسی ایک قاعدہ پر متفرع ہوں، یہ تصور درست نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ اصحابِ متون کے اس جملہ میں دو قاعدے بیان کئے گئے ہیں ایک قاعدہ تو یہ کہ کونسے عقود شرطِ فاسد سے باطل ہوجاتے ہیں جبکہ دوسرا قاعدہ یہ کہ کونسے عقود ایسے ہیں جنہیں شرط پر معلق کرنا درست نہیں، رجعۃ یہ صرف دوسرے قاعدہ پر متفرع ہے، اس کا پہلے قاعدہ سے کوئی تعلق نہیں، جب اصحابِ متون کی مراد واضح ہوگئی تو اب کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

مذکورہ ضابطہ کی رو سے علامہ شامیؒ کے موقف پر اشکال:

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنا رجحان چونکہ اس طرف ہے کہ وقف شرطِ فاسد سے فاسد ہوجاتا ہے اس لئے ان پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب وقف عقودِ تبرع کی قبیل سے ہے تو اصحابِ متون کے ذکر کردہ اس قاعدہ کی رو سے وقف شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہونا چاہئے۔

علامہ شامیؒ کا جواب:

اس کا جواب علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمحتار اور منحۃ الخالق میں یہ دیا ہے کہ عقدِ تبرع عام

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ١٤٠٦ھ (٢٤٤/٥)

شرائطِ فاسدہ سے تو فاسد نہیں ہوتا لیکن ایسی شرطِ فاسد جو اصل عقد ہی کے لئے موجبِ نقض ہو اس سے عقد باطل ہوجاتا ہے اس شرطِ فاسد کے لگانے کی وجہ سے اصل عقد ہی کا وجود متحقق نہیں ہوتا، وقف میں ابطال، بیع اور ہبہ وغیرہ کی شرائط اسی قبیل سے ہیں، اس لئے ہم نے کہا کہ ان شرائط کی وجہ سے وقف باطل ہوجائے گا۔ منحۃ الخالق میں علامہ فرماتے ہیں:

أقول: فی کونه مما یبطل بالشرط الفاسد نظر لما قدمه المؤلف من الأصل وهو أن ما کان مبادلة مال بغیر مال أو کان من التبرعات لا یبطل بالشرط الفاسد والوقف من التبرعات وفی العزمیة علی الدرر صرح قاضیخان بأن الوقف لا یبطل بالشروط الفاسدة اهـ۔

وقد یجاب أن الشرط الفاسد انما لا یبطل به التبرعات اذا لم یکن موجبهٔ نقض عقد التبرع من أصله، فان اشتراط أن تبقی رقبة الأرض له وأنه لا یزول ملکه عنها أو أنه یبیع أصلها بلا استبدال شئی مکانها نقض للتبرع، لأنه بذلک الشرط لم یوجد التبرع أصلاً، کما اذا قال فی الهبة: وهبتک هذه الدار بشرط أن لا تخرج عن ملکی بخلاف ما اذا قال: بشرط أن تخدمنی سنة. (۱)

علامہ شامیؒ کے جواب پر نظر

پہلا اعتراض:

احقر کی رائے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب محض اپنے مؤقف کے دفاع کے لئے ہے ورنہ جن حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے یہ ضابطہ ذکر کیا ہے انہوں نے مطلقاً یہ کہا ہے کہ شرطِ فاسد سے عقودِ تبرع باطل نہیں ہوتے، شرطِ فاسد میں تفصیل نہیں کی کہ شرطِ فاسدِ اصل عقد کے لئے موجبِ نقض ہو یا نہ ہو، اس قاعدہ کے اطلاق کو مقید کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۸۲/۲)

دوسرا اعتراض:

دوسرے یہ کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عبارت میں فرمایا کہ ''عقدِ تبرع میں جب کوئی ایسی شرط عائد کی جاتی ہے جو اصلِ عقد کے لئے موجبِ نقض ہو تو وہ عقد تبرع ہی اصلاً نہیں پایا جاتا'' اگر علامہ کی یہ بات مان لی جائے تو پھر شرط اور تعلیق میں فرق ہی ختم ہو جائے گا۔

شرط اور تعلیق میں فرق:

شرط تو کہتے ہی اسے ہیں جہاں اصلِ عقد کا وجود یقینی ہو پھر اضافی طور پر اس میں کسی ایسی چیز کو شرط قرار دیدیا جائے جس کا اب تک وجود نہ ہو جبکہ تعلیق میں اصل عقد ہی کا وجود ایک ایسی چیز پر موقوف ہوتا ہے جو خود بھی اب تک وجود میں نہیں آئی۔ خود علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ دونوں میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> **الفرق بين التعليق والشرط أن التعليق داخل فى أصل الفعل بان ونحوها، والشرط ماجزم فيه بأصل الفعل.** (۱)

> تعلیق اور شرط میں فرق یہ ہے کہ تعلیق اصل فعل پر داخل ہوتی ہے (یعنی اصل فعل کا وجود معلق ہوتا ہے) جبکہ شرط میں اصل فعل کا وجود یقینی ہوتا ہے۔

علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> **والشرط ماجزم فيه بالأصل أى أصل الفعل وشرط فيه أمر أخر وان شئت فقل فى الفرق ان التعليق ترتيب أمر لم يوجد على أمر لم يوجد بان أو احدى اخواتها، والشرط التزام أمر لم يوجد فى أمر وجد بصيغة مخصوصة.** (۲)

> شرط وہ ہے جس میں اصلِ فعل کا پایا جانا یقینی ہو اور اس میں کسی دوسری چیز کو بطور شرط ذکر کر دیا جائے۔ اور اگر آپ چاہیں تو شرط اور تعلیق میں فرق یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ تعلیق

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۴۰/۵)

(۲) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقريرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۱۷۳/۵)

یہ ہے کہ کسی ایسے فعل کو جواب تک پایا نہ گیا ہو معلق کرنا ایسی چیز پر جواب تک وجود میں نہ آئی ہو، اور شرط یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کا جواب تک پائی نہ گئی ہو التزام کرنا ایسے فعل میں جو وجود میں آچکا ہو۔

اس فرق کو سادہ سی مثال کے ذریعہ یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "اگر زید راضی ہو تو میں یہ وقف کرتا ہوں" یہ تعلیق ہے اور اگر یوں کہے کہ "میں نے یہ وقف فقراء پر کیا اس شرط کے ساتھ کہ میں جب چاہوں اسے بیچ سکتا ہوں" یہ شرط کی مثال ہے۔

اگر اصلِ عقد کے لئے موجبِ نقض شرطِ فاسد کی وجہ سے یہ کہا جائے کہ اصل عقد ہی نہیں پایا گیا تو پھر یہ شرط نہیں رہے گی بلکہ تعلیق ہو جائے گی، حالانکہ ہماری گفتگو شرط کے بارے میں ہے نہ کہ تعلیق کے بارے میں۔

تیسرا اعتراض:

تیسری بات یہ ہے کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ وقف کو ہبہ پر قیاس فرما رہے ہیں کہ اگر اس طرح ہبہ کیا جائے کہ میں یہ گھر ہبہ کرتا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ میری ملکیت سے نہیں نکلے گا، تو ہبہ درست نہیں ہوتا، اسی طرح وقف میں اگر ایسی مفسد شرائط عائد کی جائیں تو وقف بھی درست نہیں ہونا چاہئے۔

احقر کے نزدیک یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے، اس کی وجہ میں جانے سے پہلے میں یہ چاہوں گا کہ کتبِ فقہ سے وہ شرائط ذکر کر دی جائیں جو زیر بحث ہیں اور مختلف فیہا ہیں:

مقتضائے وقف کے منافی شرائط:

۱۔ گھر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ میں جب چاہوں اس گھر کو وقف سے خارج کرسکتا ہوں یا وقف کو باطل کرسکتا ہوں۔(۱)

۲۔ گھر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ میں جب چاہوں اسے کسی کو ہبہ کرسکتا ہوں۔(۲)

۳۔ یہ شرط لگائی کہ میں جب چاہوں اسے بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کرسکتا ہوں یا اُبوابِ خیر میں خرچ کرسکتا ہوں۔(۳)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۲/۴) الاسعاف (۲۹) هندیه (۴۰۲/۲) احکام الوقف لهلال الرأی (۸۴)

(۲) رد المحتار (۳۴۲/۴) احکام الوقف لهلال الرأی (۸۵)

(۳) رد المحتار (۳۴۲/۴) احکام الوقف لهلال الرأی (۸۸) هندیه (۴۰۲/۲)

۴۔ یہ شرط لگائی کہ میں جب چاہوں اسے وقف سے نکال کر رہن رکھوا سکتا ہوں۔[1]

۵۔ یہ شرط لگائی کہ میں جب چاہوں اسے بیچ سکتا ہوں۔[2]

۶۔ وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ میری ملکیت اس سے زائل نہیں ہوگی۔[3]

۷۔ وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ اصلِ دار میری ملکیت میں رہے گا۔[4]

کتبِ فقہ میں تتبع و تلاش کے نتیجہ میں یہ سات مثالیں ملی ہیں ان کے علاوہ اگر کوئی مثال ہوگی تو وہ بھی انہی میں سے کسی ایک میں انشاء اللہ داخل ہوگی۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ ان تمام مثالوں میں وقف کو باطل قرار دیتے ہیں، اور ہبہ پر قیاس کرتے ہیں حالانکہ ان سات شرائط میں سے آخری دو شرائط کو چھوڑ کر بقیہ شرائط اگر ہبہ میں پائی جائیں تو ان سے ہبہ باطل نہیں ہوتا بلکہ یہ شرائط خود باطل ہوتی ہیں۔ فتاویٰ ہندیہ میں تحریر ہے:

قال أصحابنا جميعاً: اذا وهب هبة وشرط فيها شرطا فاسداً فالهبة جائزة والشرط باطل كمن وهب لرجل أمة فاشترط عليه أن لايبيعها أو شرط عليه أن يتخذها أم ولد أو أن يبيعها من فلان أو يردها عليه بعد شهر فالهبة جائزة وهذه الشروط كلها باطلة، كذا فى السراج الوهاج...... وفى الاسبيجابى: رجل وهب لرجل هبة أو تصدق عليه بصدقة على أن يرد عليه ثلثها أو ربعها أو بعضها فالهبة جائزة ولا يرد عليه شيء ولا يعوضه بشيء.[5]

ہمارے اصحاب اس پر متفق ہیں کہ جب ہبہ کیا اور اس میں کوئی شرط فاسد لگا دی تو ہبہ جائز ہوگا اور شرط باطل ہو جائے گی، جیسے ایک شخص نے کسی کو اپنی باندی ہبہ کی اور یہ شرط لگا دی کہ وہ اسے آگے نہیں بیچے گا یا اسے ام ولد بنائے گا یا یہ باندی فلاں کو بیچے گا، یا ایک مہینہ بعد یہ باندی وہ ہبہ کرنے والے کو واپس کر دے گا، تو ان تمام صورتوں میں ہبہ جائز ہے اور یہ شروط

---

(۱) رد المحتار (۳۴۲/۴) الاسعاف (۲۹)

(۲) الاسعاف (۲۹) احکام الوقف لهلال الرأى (۸۵)

(۳) هنديه (۴۰۲/۲)

(۴) هنديه (۴۰۲/۲) احکام الوقف لهلال الرأى (۸۸)

(۵) نظام، الشيخ نظام وجماعة علماء الهند من القرن الحادى عشر. الفتاوى الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ۱۹۸۳م (۳۹۶/۴)

باطل ہیں، السراج الوھاج۔ اسبیجابی میں ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ہبہ کیا یا صدقہ دیا اور یہ شرط لگادی کہ وہ اس ہبہ یا صدقہ کا تہائی یا چوتھائی یا کچھ حصہ اسے واپس کرے گا تو یہ ہبہ جائز ہے اور موہوب لہ کچھ واپس نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی عوض دے گا۔

وقف کو ہبہ پر قیاس کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان پانچوں صورتوں میں وقف بھی باطل نہ ہو یہ شرائط باطل ہو جائیں۔

جہاں تک آخری دو صورتوں کا تعلق ہے تو بیشک ان شرائط کے ساتھ ہبہ درست نہیں ہوگا، لیکن وقف کو ہبہ پر قیاس کرنا ان دو صورتوں میں قیاس مع الفارق ہوگا۔

وقف اور ہبہ میں فرق:

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہبہ میں شئی موہوب کی ذات اور اصل کسی کو دینا مقصود ہوتا ہے اس چیز کی صرف منفعت دینا اور ذات اپنے پاس رکھنا مقصود نہیں ہوتا ورنہ وہ ہبہ نہیں رہے گا عاریہ بن جائے گا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اسی فرق کو بیان فرماتے ہیں:

لأن ماقبلها (العارية) تمليك المنفعة بلا عوض وهي تمليك العين كذلك.[1]

عاریۃ بلاعوض کسی کو کسی چیز کی منفعت کا مالک بنانا ہے اور ہبہ بلاعوض کسی کو کسی چیز کے عین کا مالک بنانا ہے۔

لہٰذا اگر ہبہ میں یہ شرط لگادی جائے کہ شئی موہوب لہ سے واہب کی ملکیت زائل نہیں ہوگی یا شئی موہوب لہ کی اصل اور ذات واہب کی ملکیت ہی میں رہے گی تو اس سے ہبہ کا مقصد ہی حاصل نہیں ہوگا، اس لئے ایسی شرائط عائد کرنے کی صورت میں ہبہ کو کالعدم سمجھا جاسکتا ہے۔

وقف میں منفعت سے فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے:

بخلاف وقف کے کہ اس میں شئی موقوف (جو چیز وقف کی جارہی ہے) کی ذات موقوف علیہم کو دینا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اس چیز کی منفعت یا اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے موقوف علیہم کو فائدہ

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۶۸۷/۵)

پہنچانا مقصود ہوتا ہے، فقہاء کرام رحمہم اللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر گھر فقراء کے لئے وقف کیا اور اس گھر کا کچھ حصہ منہدم ہوگیا تو وہ منہدم شدہ گھر کا حصہ یعنی ملبہ بیچا جائے گا اور حاصل ہونے والی قیمت اس گھر کی تعمیر پر خرچ کی جائے گی، اس ملبہ میں یا اس کی قیمت میں فقراء کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

علامہ اندریتی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

قال: وما يسقط من البناء فللقيم أن يبيعه وهذا اذا لم يمكن اعادته الى موضعه، فأما اذا أمكن أعيد الى موضعه، فاذا لم يمكن اعادته بيع وصرف الثمن الى مرمة الوقف، وكذلک ماتناثر من البناء فللقيم بيعه و صرف ثمنه الى المرمة، ولا يصرف شيئا من ثمن ماسقط الى الفقراء وانما يصرف الى المرمة وما فضل من ذلک عن المرمة يمسكه القيم الى وقت الحاجة الى المرمة. (۱)

فرمایا کہ عمارت کا جو حصہ گر جائے قیم کے لئے اسے بیچنا جائز ہے اور یہ اس وقت ہے جبکہ اسے اس کی جگہ پر دوبارہ لگانا ممکن نہ ہو، ورنہ اگر یہ ممکن ہو تو اس ملبہ کو اس کی جگہ دوبارہ لگا دیا جائے گا۔ جب دوبارہ لگانا ممکن نہ ہو تو اسے بیچ دیا جائے گا اور حاصل ہونے والی ثمن وقف کی مرمت پر خرچ کی جائے گی، اسی طرح عمارت کا جو حصہ جھڑ جائے تو قیم اسے بیچے گا اور اس کی ثمن وقف کی مرمت پر خرچ کرے گا، ملبہ کی قیمت میں سے کچھ بھی فقراء پر خرچ نہیں کیا جائے گا، بلکہ مرمت پر خرچ کیا جائے گا اور جو مرمت سے بچ جائے قیم اسے آئندہ پیش آنے والی مرمت کی ضرورت کے لئے محفوظ رکھے گا۔

صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولايجوز أن يقسمه يعنى النقض بين مستحقى الوقف لأنه جزء من العين ولا حق للموقوف عليهم فيه وانما حقهم فى المنافع والعين حق الله تعالىٰ فلا يصرف اليهم غير حقهم. (۲)

---

(۱) الاندريتى، عالم بن العلاء الانصارى الاندريتى. الفتاوى التتارخانيه، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ١٤١١ھ (٤٣٨/٥)

(۲) المرغينانى، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (٤٣٦/٥)

ملبہ وقف کو وقف کے مستحقین میں تقسیم کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ ملبہ عین وقف کا جزء ہے، مستحقین (موقوف علیہم) کا عینِ وقف میں کوئی حق نہیں، ان کا حق وقف کے منافع میں ہے اور عینِ وقف تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے لہٰذا مستحقین کو ملبہ وقف نہیں دیا جائے گا جو کہ ان کا حق نہیں ہے۔

علامہ خصاف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

انما حقوق أهل الوقف المساكين كانوا أوقوماً بأعيانهم فى الغلة وأما الرقبة وما يحدث بسببها فلا حق لهم فى قسمتها بينهم. (۱)

اہلِ وقف چاہے مساکین ہوں یا متعین قوم ان کا حق وقف کی آمدنی اور منفعت میں ہے، وقف کی ذات یا اس سے وجود میں آنے والی کسی چیز میں ان کا کوئی حق نہیں ہے کہ اسے ان میں تقسیم کیا جاسکے۔

لہٰذا جب وقف سے مقصود مستحقین کو وقف کی منفعت اور آمدنی سے فائدہ پہنچانا ہے تو اس طرح کی شرائط (یعنی وقف سے واقف کی ملکیت زائل نہیں ہوگی، یا اصل وقف واقف کی ملکیت میں باقی رہے گا) سے وقف کا مقصد فوت نہیں ہوگا، اور ان شرائط کی وجہ سے اصل وقف کو کالعدم سمجھنا مناسب نہیں ہوگا، خصوصاً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے مطابق کہ ''وقف واقف کی ملکیت سے نہیں نکلتا'' یہ شرائط تو مناقضِ وقف بھی نہیں قرار دی جائیں گی بلکہ واقعہ کا بیان ہوں گی، البتہ جمہور کے موقف کے مطابق کہ ''وقف کرنے سے شیءِ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے'' یہ شرائط مناقضِ وقف شمار ہوں گی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوگیا کہ ذکرکردہ مناقضِ وقف شرائط میں سے آخری دو شرط اگر ہبہ میں ہوں تو بیشک وہ اصلِ عقد کے لئے موجبِ نقض ہیں لیکن اگر یہی دو شرائط وقف میں ہوں تو اصلِ عقد کے لئے موجبِ نقض نہیں، کیونکہ یہ شرائط عائد کرنے کے باوجود وقف کا مقصد اور روح فوت نہیں ہوتی، اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کا وقف کو ہبہ پر قیاس کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹ م (۲۰۳) مزید دیکھئے: تنقيح الحامديه (۱/۱۱۷)

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ بیان کردہ ان تین وجوہِ ترجیح کی وجہ سے احقر کا رجحان اس طرف ہے کہ مقتضائے وقف کے منافی شرائط کی وجہ سے وقف باطل نہیں ہوگا بلکہ یہ شرائط خود باطل ہوں گی۔

واللہ سبحانہ أعلم و علمہ أتم وأحکم

مسجد میں ایسی شرائط عائد کرنے کا حکم:

لیکن یہ اختلاف مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف میں ہے، مسجد بناتے وقت اگر اس میں یہ شرائط لگائیں تو بالاتفاق سب کے نزدیک وقف صحیح رہے گا، اور یہ شرائط باطل ہوں گی۔

وجہِ فرق:

جو حضرات مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف کو مقتضائے وقف کے منافی شرائط کی وجہ سے باطل قرار دیتے ہیں وہ مسجد اور دیگر اوقاف میں فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ مسجد کا وقف شرائط قبول نہیں کرتا حتی کہ وہ جائز شرائط جنہیں مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف میں عائد کرنا درست ہے مسجد میں انہیں عائد کرنا بالاتفاق سب کے نزدیک درست نہیں، مثلاً مسجد کے علاوہ دیگر اوقاف میں واقف یہ شرط لگا سکتا ہے کہ اس وقف سے فلاں فلاں لوگ مستفید ہوں گے، لیکن مسجد میں اگر واقف یہ شرط لگادے کہ اس میں فلاں فلاں نماز پڑھیں گے تو یہ شرط معتبر نہیں ہوگی، ہر مسلمان کے لئے نماز پڑھنا جائز ہوگا، لہٰذا جب مسجد کا وقف جائز شرائط کو قبول نہیں کرتا تو مقتضائے وقف کے منافی شرائط کو تو بطریق اولیٰ قبول نہیں کرے گا، جائز شرائط کی طرح یہ شرائط بھی غیر معتبر ہوں گی، بخلاف دیگر اوقاف کے کہ ان میں شرائط قبول کرنے کی صلاحیت ہے، لہٰذا وہ شرائط سے متاثر بھی ہوتے ہیں، جائز شرائط معتبر ہوتی ہیں، اور مقتضائے وقف کے منافی شرائط سے وقف متاثر ہو کر باطل ہو جاتا ہے۔ علامہ خصاف رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> **قلت: أرأیت رجلا جعل دارہ مسجداً وبناہ وأشھد علی ذلک علی أن لہ ابطالہ أو علی أن لہ أن یبیعہ؟ قال: اشتراط ھذا فی المسجد باطل لایجوز، قلت: فما الفرق بین المسجد وبین الوقف وکلاھما انما یطلب بھما ماعند اللہ تعالیٰ؟**

قال: الا ترى الوقف أن الشروط فيها جائزة و علىٰ هذا جرى الأمر فيها على أن له أن يدخل فيها من رأى و يخرج من شاء ويزيد من شاء وينقص من شاء وتكون وقفاً على قوم عشر سنين ثم تكون بعد العشر سنين وقفا على قوم آخرين أن هذا كله جائز فى الوقف وأن المساجد ليست على هذا ولو أن رجلا بنى مسجداً لأهل محلة وقال قد جعلته لأهل هذه المحلة خاصة كان لمن جاء من المسلمين من غير أهل تلك المحلة أن يصلى فيه فالاشتراط فى المساجد لم يجوزه أحد فهذا الفرق بينهما. (۱)

میں نے عرض کیا کہ ایک شخص نے اپنے گھر کو مسجد بنا دیا اور اسے تعمیر بھی کر دیا اور اس بات پر گواہ بنا لئے کہ اسے اس مسجد کو باطل کرنے کی اجازت ہے اور یا یہ شرط لگائی کہ اسے اس مسجد کو بیچنے کی اجازت ہے تو کیا یہ جائز ہے؟

امام نے فرمایا کہ مسجد میں اس طرح کی شرط لگانا باطل ہے جائز نہیں، میں نے عرض کیا کہ مسجد اور دیگر اوقاف میں فرق کیا ہے، دونوں میں اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے؟

امام نے فرمایا کہ کیا آپ نے یہ غور نہیں کیا کہ اوقاف میں شرائط لگانا جائز ہے کہ واقف اپنے لئے ادخال، اخراج، ازدیار اور تنقیص کی شرط لگا سکتا ہے اور یہ شرط بھی لگا سکتا ہے کہ دس سال تک یہ ایک قوم پر وقف ہے اور دس سال بعد یہ دوسری قوم پر وقف ہوگا، وقف میں یہ تمام شرائط جائز ہیں، لیکن مساجد کی نوعیت اس طرح کی نہیں ہے اگر کسی نے اہلِ محلّہ کے لئے مسجد بنائی اور اس نے یہ صراحت کردی کہ میں نے یہ مسجد صرف اس محلّہ والوں کے لئے بنائی ہے تو ان اہلِ محلّہ کے علاوہ دیگر مسلمانوں کے لئے بھی اس مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے، معلوم ہوا کہ مسجد میں شرائط عائد کرنے کو کسی نے جائز نہیں قرار دیا، یہ مسجد اور دیگر اوقاف میں فرق ہے۔

امام ہلال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے ملتا جلتا فرق تحریر کیا ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۱۰)

هما مفترقان ألا ترى أن رجلا لووقف أرضا على قوم بأعيانهم لم يكن لغيرهم ولو جعل داره مسجداً لقوم بأعيانهم كان لغيرهم أن يصلى فيه، ألا ترى أن شرطه فيمن يصلى فى المسجد باطل لايجوز وشرطه فيما يعطى من غلة الوقف جائز، فلما كان شرطه فى الغلة فى الوقف جائزا كان شرطه فى أصل الوقف جائزاً والوقف اذا كان شرطه فى منفعة المسجد ومن جعلها له باطلا لايجوز فكذلك شرطه فى أصل المسجد.[1]

---

(١) هلال الراى، هلال بن يحيى بن مسلم الراى. كتاب احكام الوقف، حيدر آباد دكن، دائرة المعارف العثمانية ١٣٥٥ھ (٩٠)

دوسری قسم کی شرائط کا شرعی حکم

واقف کی طرف سے عائد کی جانے والی ممکنہ شرائط کی دوسری قسم یہ تھی کہ وہ شرائط جو یا تو شریعت کے خلاف ہیں یا مصلحتِ وقف وموقوف علیہم کے خلاف ہیں یا وقف سے فائدہ حاصل کرنے میں خلل پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ ایسی شرائط بالاتفاق سب کے نزدیک خود غیر معتبر ہیں ان سے وقف باطل نہیں ہوگا۔

علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ خیریہ میں فرماتے ہیں:

لأن العلماء صرحوا بأن كل شرط لافائدة فيه و لا مصلحة لايقبل. [۱]

علماء نے صراحت کی ہے کہ ہر ایسی شرط جس میں نہ کوئی فائدہ ہو اور نہ وقف کی مصلحت ہو وہ قابلِ قبول نہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا شرط فيه تفويت المصلحة للموقوف عليهم و تعطيل للوقف فيكون شرطاً لافائدة فيه للوقف و لا مصلحة فلا يقبل. [۲]

یہ ایسی شرط ہے کہ جس میں موقوف علیہم کی مصلحت فوت ہو رہی ہے اور یہ شرط وقف کو معطل کرنے کا باعث ہے، لہٰذا یہ ایسی شرائط میں داخل ہوگی جن میں وقف کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ مصلحت، اس لئے یہ شرط قابلِ قبول نہیں۔

اور یہ ضابطہ تو مشہور ہے:

شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع. [۳]

---

(۱) الرملي، خير الدين الرملي. الفتاوى الخيرية، مصر، مطبع بولاق (۲/۲۱۶)

(۲) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۸۶)

(۳) حواله بالا (۴/۴۴۳) قانون العدل والانصاف (۴۳)

دوسری قسم کے تحت داخل ہونے والی ممکنہ شرائط:

ہم ذیل میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے کلام سے اخذ کر کے دوسری قسم کے تحت داخل ہونے والی ممکنہ شرائط تحریر کر رہے ہیں جو خود باطل ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے وقف باطل نہیں ہوتا، اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان جیسی شرائط آج کے اوقاف میں پائی جائیں تو ان کا حکم معلوم ہو سکے اور اگر ان سے ملتی جلتی مثالیں شرائط کی ملیں تو ذکر کردہ شرائط پر قیاس کر کے ان کا حکم تلاش کرنے میں بھی آسانی ہو۔

خلافِ شریعت کام کرنے کی شرط لگانا:

ا۔ واقف نے ایک فقیر کے لئے گھر وقف کیا اور اس میں یہ شرط لگائی کہ وہ پانچوں نمازیں یہیں پڑھے گا، مسجد نہیں جائے گا۔ یہ شرط شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے البتہ اس سے وقف باطل نہیں ہوگا۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فاذا شرط الواقف أن يصلى الموقوف عليه فى هذا المكان المعين الصلوات الخمسة ولو كان وحده والى جانبه المسجد الأعظم وجماعة المسلمين لم يجب عليه الوفاء بهذا الشرط، بل ولا يحل له التزامه اذا فاتته الجماعة، فان الجماعة اما شرط لاتصح الصلوٰة بدونها واما واجبة يستحق تاركها العقوبة وان صحت صلاته، واما سنة موكدة يقاتل تاركها وعلى كل تقدير فلايصح التزام شرط يخل بها. [1]

اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ موقوف علیہ اس متعینہ جگہ پر پانچوں نمازیں پڑھے گا اگر چہ وہ تنہا ہی کیوں نہ ہو جبکہ اس کے قریب ہی جامع مسجد ہے جہاں مسلمان جماعت سے نماز پڑھتے ہیں اس پر یہ شرط پورا کرنا واجب نہیں بلکہ اگر جماعت چھوٹتی ہو تو اس کا التزام ناجائز ہے، کیونکہ جماعت یا تو صحت نماز کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر نماز درست ہی نہیں ہوتی

---

(۱) ابن قیم، ابو عبد الله محمد بن ابی بکر الدمشقی المعروف بابن قیم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين، بيروت دار احياء التراث العربی (۱۵۳/۴)

یا جماعت واجب ہے جس کا تارک مستحق عقوبہ ہے اگر چہ نماز اس کے بغیر ہو جاتی ہے یا
جماعت سنت مؤکدہ ہے جس کے تارک سے قتال کیا جا سکتا ہے، بہر حال ایسی شرط جو نماز
کی جماعت ترک کرنے کا باعث ہو اس کو پورا کرنا جائز نہیں ہے۔

قبر پر نماز پڑھنے کی شرط:

۲۔ اسی طرح اگر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ میرے مرنے کے بعد موقوف علیہ (مستحق) میری قبر
پر آ کر نماز پڑھے گا، مسجد میں نہیں پڑھے گا۔

یہ شرط بھی نا جائز ہے کیونکہ اس میں ایک تو جماعت ترک کروائی جارہی ہے، دوسرے جناب نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے، یہاں یہ قبر پر نماز پڑھنے
کی شرط لگا رہا ہے۔[۱]

قبر پر چراغاں کرنے کی شرط:

۳۔ وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ اس کی آمدنی سے یا موقوف علیہ اپنے پاس سے میری قبر پر چراغ
جلائے گا۔ یہ شرط بھی نا جائز ہے، علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومن ذلک اشتراط ایقاد سرج أو قندیل علی القبر فلا یحل للواقف اشتراط ذلک ولا للحاکم تنفیذه ولا للمفتی تسویغه ولا للموقوف علیه فعله والتزامه فقد لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم المتخذین السرج علی القبر، فکیف یحل للمسلم أن یلزم أو یسوغ فعل ما لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم فاعله. [۲]

شرائطِ فاسدہ میں سے ایک شرط یہ ہے کہ قبر پر چراغ جلانے کی شرط لگائی جائے، واقف
کے لئے ایسی شرط لگانا جائز نہیں، حاکم کے لئے اسے نافذ قرار دینا جائز نہیں، مفتی کے لئے
اس کی گنجائش دینا جائز نہیں اور موقوف علیہ (مستحق) کے لئے اس کا التزام کرنا اور یہ شرط

---

(۱) ابن قیم، ابو عبد الله محمد بن ابی بکر الدمشقی المعروف بابن قیم الجوزیة. اعلام الموقعین عن رب العالمین، بیروت دار احیاء التراث العربی (۱۵۴/۴)

(۲) حواله بالا (۱۵۴/۴)

پورا کرنا جائز نہیں، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے، ایک مسلمان کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے فعل کو لازم قرار دے یا اس کی گنجائش دے جس کے کرنے والے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہو۔
آج کل بھی ایسی شرائط وقف ناموں میں ملتی ہیں یہ کسی بھی طرح جائز نہیں۔

مسجد میں چراغاں کرنے کی شرط:

۴۔ واقف نے وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ اس کی آمدنی سے مسجد میں رمضان کی راتوں میں چراغاں کیا جائے۔ یہ شرط بھی جائز نہیں اسے پورا نہیں کیا جائے گا، کیونکہ ضرورت سے زائد روشنی کر کے چراغاں کرنا اسراف میں داخل ہے جو کہ جائز نہیں خصوصاً مالِ وقف میں تو اور احتیاط کی ضرورت ہے۔
علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فی الخانية: رجل أوصى بثلث ماله لأعمال البرهل يجوز أن يسرج المسجد منه؟ قال الفقيه ابوبكر يجوز، ولا يجوز أن يزاد على سراج المسجد لأن ذلك اسراف سواء كان ذلك في رمضان أو غيره ولا يزين المسجد بهذه الوصية اه ومقتضاه منع الكثرة الواقعة في رمضان في مساجد القاهرة ولو شرط الواقف لأن شرطه لايعتبر في المعصية، وفي القنية اسراج السرج الكثيرة في السكك والأسواق ليلة البراءة بدعة، وكذا في المساجد ويضمن القيم، وكذا يضمن اذا أسرف في السرج في رمضان وليلة القدر. (۱)

خانیہ میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے تہائی مال کی اعمالِ خیر میں خرچ کرنے کی وصیت کی تو کیا اس رقم سے مسجد میں روشنی کا انتظام کیا جاسکتا ہے؟
فقیہ ابوبکر رحمہ اللہ نے فرمایا: کیا جاسکتا ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ معمول کی روشنی سے زیادہ روشنی کی جائے، کیونکہ یہ اسراف ہے خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں، اس وصیت کے ذریعہ مسجد کو مزین نہیں کیا جاسکتا، علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں کہ فقیہ کی اس بات کا تقاضہ یہ

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۱۵/۵)

ہے کہ قاہرہ کی مساجد میں رمضان میں کثرت سے جو چراغاں کیا جاتا ہے وہ جائز نہیں ہے، اگر چہ واقف نے اس کی شرط کیوں نہ لگائی ہو، معصیت میں واقف کی شرط معتبر نہیں ہوتی۔

قنیہ میں ہے کہ لیلۃ البراءۃ کو راستوں، بازاروں میں بہت زیادہ روشنی کرنا (چراغاں کرنا) بدعت ہے، اسی طرح مساجد میں بھی چراغاں کرنا بدعت ہے، اگر مسجد کا متولی یہ کرے گا تو ضامن ہوگا۔

اسی طرح اگر متولی رمضان اور لیلۃ القدر میں مسجد میں چراغاں کر کے اسراف کرے گا تو اس صورت میں بھی وہ ضامن ہوگا۔

اس عبارت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ فضیلت والی راتوں میں مساجد، بازار، راستوں اور قبرستان میں چراغاں کرنا قطعاً جائز نہیں، بدعت ہے اور اسراف کی وجہ سے بھی ناجائز ہے۔

ایسی شرط جو اعانت علی المعصیت کا سبب بنے:

۵۔ گھر وقف کیا اور یہ شرط لگادی کہ اس گھر میں رقص کرنے والے یا شراب پینے والے یا کسی اور معصیت میں مبتلا لوگ رہیں گے۔[1] یہ شرط بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں معصیت میں ایک طرح کا تعاون پایا جارہا ہے۔

موقوف علیہم پر قبر پر قرآن پڑھنے کی شرط لگانا:

۶۔ وقف کیا اور یہ شرط لگادی کہ موقوف علیہ (مستحق) واقف کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر قرآن کریم پڑھا کرے گا۔ اس شرط کو الاشباہ والنظائر میں ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

لو شرط أن يقرأ على قبره فالتعيين باطل. [2]

اگر واقف نے یہ شرط لگادی کہ موقوف علیہ اس کی قبر پر قرآن کریم کی تلاوت کرے گا تو یہ تعیین باطل ہے۔

---

(۱) ابن قيم، ابو عبد الله محمد بن ابی بكر الدمشقی المعروف بابن قيم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين، بيروت دار احياء التراث العربی (۱۵۶/۴)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. الاشباه والنظائر، كراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (كتاب الوقف)

علامہ شامیؒ، علامہ رملیؒ وغیرہ کے نزدیک یہ شرط ناجائز ہے:

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمحتار میں اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتاویٰ رملی میں اس شرط کو ناجائز اور باطل قرار دیا ہے، وصیت کے باب میں تحریر فرماتے ہیں:

فی وصایا البزازیة أو صی لقاریء یقرأ القرآن عند قبره بشیء فالوصیة باطلة وفی التتارخانیة: اذا أو صی بأن یدفع الی انسان کذا من ماله لیقرا القرآن علی قبره فهذه وصیة باطلة لاتجوز، وسواء کان القاریء معینا أو غیر معین و عللوا ذلک بأن ذلک بمنزلة الأجرة ولا یجوز أخذ الأجرة علی طاعة الله تعالیٰ وان کانوا استحسنوا جوازها علی تعلیم القرآن فذلک للضرورة ولاضرورة الی القول بجوازها علی القراء ة علی قبور الموتیٰ. فافهم.[2]

بزازیہ کی کتاب الوصایا میں ہے کہ ایک شخص نے کسی قاری کے لئے جو اس کی قبر پر قرآن کریم کی تلاوت کرے کسی چیز کی وصیت کی تو یہ وصیت باطل ہے، اور تتارخانیہ میں ہے کہ اگر کسی نے وصیت کی کہ اتنا مال فلاں کو دیدیا جائے کہ وہ اس کی قبر پر قرآن پڑھے تو یہ وصیت باطل ہے، قاری متعین ہو یا نہ ہو، وصیت کے باطل ہونے کی علت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ یہ وصیت بمنزلہ اُجرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت وتلاوت پر اجرت لینا جائز نہیں، فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اگرچہ تعلیم القرآن پر اجرت لینے کی استحساناً اجازت دی ہے لیکن وہ ضرورت کی وجہ سے ہے، اور اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ مردوں کی قبر پر تلاوت قرآن کی اجرت کی اجازت دی جائے۔

یہ عبارت اگرچہ وصیت کے بارے میں ہے لیکن وقف بھی عام طور پر وصیت ہی کے حکم میں ہوتا ہے، علامہ شامی رحمۃ اللہ نے بھی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے خیریہ کی اسی عبارت کا حوالہ دیا ہے، اور دیگر حضرات نے بھی اس مقام پر وصیت کے باب میں ذکر کردہ جزئیہ سے استدلال کیا ہے، اور بعض

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۶/۶۹۰ قبیل باب الوصیة بالخدمة والسکنی والثمرة)

(۲) الرملی، خیر الدین الرملی. الفتاوی الخیریة، مصر، مطبع بولاق (۲/۲۲۱)

حضرات نے وصیت کے باب میں وقف کے اس جزئیہ سے استدلال کیا ہے معلوم ہوا کہ وقف اور وصیت دونوں کا حکم اس مسئلہ میں یکساں ہے۔

بہر حال ان تین حضرات کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرط ناجائز ہے۔

علامہ حصکفیؒ، علامہ رافعیؒ اور شراح اشباہ کے نزدیک یہ شرط درست ہے:

دوسری جانب الاشباہ والنظائر کے شراح علامہ حمویؒ، علامہ بیریؒ، علامہ ابوسعودؒ اور شیخ ہبۃ اللہ التاجیؒ اس طرف گئے ہیں کہ یہ شرط درست ہے اور اس کی پابندی ضروری ہے۔ علامہ حموی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قوله: الثالثة: لوشرط أن يقرأ على قبره الخ هكذا وقع فى القنية، وهو كما فى البحر مبنى على قول أبى حنيفة من كراهة القراء ة على القبور، فلذا بطل التعيين والصحيح المختار للفتوىٰ قول محمد، انتهى. وفى مجمع الفتاوىٰ الوصية بالقراء ة على قبره باطلة، ولكن هذا اذا لم يعين القارىء أما اذا عينه فينبغى أن يجوز على وجه الصلة، ويفهم منه أن الوصية بالقراء ة اما بطلت لعدم جواز الاجارة على القراء ة، وينبغى أن تكون صحيحة على المفتىٰ به من جواز الاجارة على الطاعة كما هو مذهب عامة المتأخرين...... فعلم من هذا أن قول المصنفؒ هنا "فالتعيين باطل" ضعيف. (۱)

قنیہ میں بھی یہی عبارت ہے جو ماتن یعنی ابن نجیم رحمہ اللہ نے الاشباہ والنظائر میں ذکر کی ہے کہ یہ شرط ناجائز ہے، تعیین باطل ہے، لیکن یہ بات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر مبنی ہے کہ قبر کے پاس قراءت کرنا مکروہ ہے جیسا کہ صاحبِ بحر نے تحریر کیا ہے، لیکن صحیح اور فتویٰ کے لئے مختار بات امام محمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ قبر پر تلاوتِ قرآن مکروہ نہیں ہے، مجمع الفتاویٰ میں ہے کہ قبر پر تلاوتِ قرآن کرنے کی وصیت باطل ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ قاری کو متعین نہ ہو، البتہ اگر قاری متعین کر دیا ہو تو جائز ہونا چاہئے اور یہ سمجھا جائے گا کہ واقف قاری بطورِ عطیہ کچھ دے رہا ہے، مجمع الفتاویٰ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے

---

(۱) الحموى احمد بن محمد الحموى ۱۰۹۸ھ. غمزعيون البصائر مع الاشباه والنظائر، كراچى، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (كتاب الوقف)

کہ قبر پر تلاوت کی وصیت باطل ہونے کی وجہ قرأتِ قرآن پر اجرت کا ناجائز ہونا ہے، (علامہ حموی فرماتے ہیں) مفتیٰ بہ قول کے مطابق اجارہ علی الطاعۃ جائز ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بھی اجرت لینا جائز ہو...... اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صاحبِ اشباہ کا اس شرط کو باطل قرار دینا ضعیف ہے۔

علامہ بیریؒ، ابوسعودؒ اور ہبۃ اللہ التاجی رحمہم اللہ نے بھی اسی سے ملتی جلتی بات فرمائی ہے۔ (۱)

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی موقف ہے فرماتے ہیں:

قلت: وكذا ينبغي أن يكون القول ببطلان الوصية لمن يقرأ عند قبره بناء على القول بكراهة القراءة على القبر أوبعدم جواز الاجارة على الطاعات، أما على المفتى به من جوازها فينبغي جوازها مطلقاً وتمامه في حواشي الاشباه من الوقف. (۲)

میں عرض کرتا ہوں کہ قبر پر تلاوتِ قرآن کی وصیت کے بطلان کا قول یا تو اس مسئلہ پر مبنی ہے کہ قبر پر تلاوت کرنا مکروہ ہے یا اس مسئلہ پر مبنی ہے کہ اجارہ علی الطاعات جائز نہیں ہے لیکن دونوں مسئلوں میں مفتیٰ بہ قول جواز کا ہے لہٰذا یہ وصیت بھی جائز ہونی چاہئے، تفصیل الاشباہ والنظائر کی شروح میں ہے۔

علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ یہ شرط جائز ہونی چاہئے فرماتے ہیں:

فعلى المختار تتعين القراءة على القبر. (۳)

مختار یہی ہے کہ قبر پر قراءت کی شرط درست ہے اور متعین ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے الاشباہ کے برعکس البحر الرائق میں اسی کو ترجیح دی ہے کہ واقف اگر قبر پر تلاوتِ قرآن کی شرط لگاتا ہے تو یہ درست ہے اور موقوف علیہ قبر پر تلاوت کرے گا تو اسے وقف کی آمدنی

---

(۱) دیکھئے: البيري، ابراهيم بن حسين بن بيري زاده ۱۰۹۹ھ. عمدة ذوي البصائر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه لائبريري جامعه دارالعلوم كراچي (۱۸۱) عمدة الناظر لابي سعود (۲/۲۹) التاجي، محمد هبة الله التاجي ۱۲۲۴ھ. التحقيق الباهر في شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، لائبريري جامعه دارالعلوم كراچي (۲۴۶)

(۲) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۶/۲۹۰)

(۳) الرافعي، عبد القادر الرافعي. تقريرات الرافعي ملحق برد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني (۴/۸۵)

ملے گی۔ فرماتے ہیں:

والذی ظهرلی أنه مبنی علی قول أبی حنیفة بکراهة القراء ة عند القبر فلذا یبطل التعیین والفتویٰ علی قول محمدؒ من عدم کراهة القراء ة عنده کما فی الخلاصة فیلزم التعیین. (١)

مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قبر پر تلاوتِ قرآن کی وصیت کا بطلان یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر مبنی ہے کہ قبر پر تلاوت کرنا مکروہ ہے اس لئے تعیین باطل ہے، لیکن فتویٰ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر ہے کہ قبر پر تلاوت مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ خلاصہ میں ہے لہٰذا قبر کی تعیین درست ہونی چاہئے اور یہ شرط جائز ہونی چاہئے۔

جو حضرات وقف میں قبر پر تلاوتِ قرآن کی شرط کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے دلائل

پہلا استدلال:

پہلا استدلال تو یہ ہے کہ اگر واقف قراءۃِ قرآن اور تدریس کے لئے کوئی جگہ متعین کردے تو یہ تعیین شرعاً معتبر ہے، لہٰذا اگر مدرس اس جگہ نہ پڑھائے اور بلاعذر کسی دوسری جگہ پڑھائے تو وہ واقف کی طے کردہ آمدنیِ وقف کا حقدار نہیں ہوگا، کیونکہ واقف کا مقصود اس متعینہ جگہ کا تلاوتِ قرآن یا تدریس کے ذریعہ احیاء تھا وہ حاصل نہیں ہو رہا۔

معلوم ہوا کہ واقف کوئی جگہ متعین کرسکتا ہے چنانچہ اگر وہ جگہ قبر ہو تو وہ بھی متعین ہوجائے گی اور وقف کے استحقاق کے لئے اس شرط کو پورا کرنا ضروری ہوگا۔ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وحرر فی تنویر البصائر أنه یتعین المکان الذی عینه الواقف لقراء ة القرآن أو للتدریس، فلو لم یباشر فیه لایستحق المشروط له، لما فی

---

(١) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (٥/٢٢٨)

شارع المنظومة: یجب اتباع شرط الواقف، وبالمباشرة فی غیر المکان الذی عینه الواقف یفوت غرضه من احیاء تلک البقعة. [۱]

تنویر البصائر میں لکھا ہے کہ واقف جس جگہ کو قرأتِ قرآن یا تدریس کے لئے متعین کردے وہ جگہ متعین ہو جاتی ہے اگر اس جگہ یہ خدمت انجام نہیں دی جارہی تو مدرس اور قاری وقف کی اس آمدنی کے مستحق نہیں ہوں گے جو واقف نے ان کے لئے متعین کی ہے کیونکہ شرح منظومہ میں ہے کہ واقف کی شرط کی اتباع ضروری ہے، اور اگر قاری اور مدرس واقف کی متعینہ جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ خدمات انجام دیتے ہیں تو اس سے واقف کا مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس خاص جگہ کا احیاء چاہتا تھا۔

تقریباً یہی دلیل علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کے کلام سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ [۲]

دوسری دلیل:

دوسری دلیل علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کی ہے کہ واقف نے یہ شرط جو لگائی ہے کہ موقوف علیہ اس کی قبر پر قرآن کریم پڑھے گا اس سے واقف کا مقصود یہ ہے کہ اس تلاوت کی وجہ سے اس کی قبر پر رحمتیں نازل ہوں، اور یہ غرض غرضِ صحیح ہے۔ فرماتے ہیں:

لأن للواقف فیها غرضاً صحیحاً وهو تنازل الرحمات علی القبر بالقراءة عنده زیادة عن ثواب القراءة فیراعی شرطه ذلک. [۳]

کتاب الوصیۃ میں علامہ سندی رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں:

فی السندی: قلت: ومن تحقق قوله صلی الله علیه وسلم: "اقرؤا یٰسن علی موتاکم" وحمله علی حقیقته دون مجازه وهو المحتضر وکذا قراءته صلی الله علیه وسلم أول البقرة وخاتمتها علی المقبور والأمر بذلک وسوال التثبیت للمیت أیضاً لم یتوقف فی جواز الایصاء

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۹۱/۲)

(۲) دیکھئے: ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۲۸/۵)

(۳) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۸۵/۴)

بـنـحـو ذلک، لأنـا نقيس الايصاء من الميت على أمره عليه الصلوٰة والسلام ولا أدرى الى الان فارقاً بينهما. (۱)

علامہ سندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تحقیق ہو کہ آپ نے فرمایا: ''اپنے مردوں پر سورۃ یٰسین پڑھا کرو'' اور وہ اسے اس کی حقیقت ہی پر محمول کرتا ہو (یعنی اس کے مجازی معنیٰ قریب الموت مراد نہ لیتا ہو) اور اسی طرح جس کو یہ معلوم ہو کہ خود حضور نے مردہ کو دفنانے کے بعد اس کی قبر پر سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائی تھیں، صحابہ کرام کو اس کا حکم بھی دیا تھا اور میت کے لئے ثابت قدمی کی دعا کے لئے فرمایا تھا، اسے ہرگز قبر پر تلاوتِ قرآن کی وصیت کے جواز میں توقف نہیں ہوسکتا۔ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات پر اس وصیت کو قیاس کر رہے ہیں دونوں میں مابہ الفرق اب تک ہم پر واضح نہیں ہوسکا۔

تیسرا استدلال:

تیسرا استدلال علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تتارخانیہ کے ایک جزئیہ سے کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

فـی حـاشية أبـی السـعـود على الأشباه عن التتارخانيه أن الحسين بن عـلـی بنى مدرسة وبنى فيها مقبرة لنفسه ووقف ضيعة وذكر أن ثلاثة أربـاعهـا لـلمتفقهة والرابع يصرف الى من يقوم بكنس المقبرة وفتح بابها والى من يقرأ عند قبره ورفع هذا الى الحاكم فقضى فيه بصحته، هـل يـحـل لمن يقرأ عند قبره أخذ هذا المرسوم قال نعم، قيل واذا لم يـكـن هـنـاک قـضـاء قـاض هـل يـحـل لـمن يقرأ عند قبره أخذ هذا المرسوم قال: نعم. (۲)

علامہ ابوسعود شارح اشباہ نے تتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حسین بن علی نے مدرسہ بنایا اور اس میں اپنے لئے ایک مقبرہ بھی بنایا اور کچھ زمین الگ سے وقف کی جس میں یہ شرط لگائی کہ اس کی تین چوتھائی آمدنی مدرسہ میں فقہ کا علم حاصل کرنے والوں پر خرچ کی جائے

---

(۱) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۳۴۷/۲)
(۲) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۸۵/۴)

اور ایک چوتھائی آمدنی اسے دیجائے جو میرے مقبرہ پر جھاڑو لگائے اور اس کا دروازہ کھولے اور جو شخص میری قبر پر آ کے تلاوت قرآن کرے، یہ قضیہ حاکمِ وقت کے پاس گیا تو اس نے اس کی صحت کا فیصلہ کیا، تو کیا جو شخص اس کی قبر پر تلاوتِ قرآن کریم کرے اس کے لئے یہ متعینہ آمدنی لینا جائز ہے؟ فرمایا: جی ہاں، سوال کیا گیا کہ اگر قاضی کا فیصلہ نہ ہوتا تو پھر تلاوت کرنے والے کے لئے یہ لینا جائز ہوتا؟ فرمایا: ہاں۔

یہ جزئیہ بہت واضح ہے کہ قبر پر تلاوتِ قرآن کرنے والا وقف کی آمدنی لے سکتا ہے، ان تین دلائل کی بنیاد پر شراحِ اشباہ، علامہ ابن نجیم، علامہ حصکفی اور علامہ رافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر واقف یہ شرط لگادے کہ موقوف علیہ (مستحق) اس کی قبر پر تلاوت کرے گا تب اسے وقف کی آمدنی دی جائے گی تو یہ شرط درست ہے اس کی پابندی ضروری ہے۔

وقف میں قبر پر تلاوتِ قرآن کی شرط کو جائز قرار نہ دینے والوں کے دلائل

پہلا استدلال:

پہلی دلیل بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قبر پر تلاوتِ قرآن کریم مکروہ ہے، اس کی وجہ سے واقف کی اس شرط کو نا جائز قرار دیا جاتا ہے، علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

قلت: وكذا ينبغي أن يكون القول ببطلان الوصية لمن يقرأ عند قبره بناء على القول بكراهة القراءة على القبور. [1]

قبر پر قراءتِ قرآن کی وصیت کا بطلان اس قول پر مبنی ہونا چاہئے جس میں قبر پر قراءت کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

---

(۱) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ١٠٠٨ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ١٤٠٦ھ (٦/٦٩٠)

شارح اشباہ علامہ حمویؒ نے اور علامہ ابن نجیمؒ نے البحر الرائق میں شرط کے بطلان کی ایک وجہ یہی تحریر کی ہے۔

لیکن علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم جو وقف میں اس شرط کو ناجائز قرار دیتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے جو یہ حضرات بیان فرمارہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

أقول: ليس كذلك لما في الولو الجية: لوزار قبر صديق أو قريب له وقرأ عنده شيئاً من القرآن فهو حسن اه...... فقد صرح بحسن القراءة على القبر وببطلان الوصية فلم يكن مبنيا على القول بالكراهة. (۱)

میں عرض کرتا ہوں کہ یہ وجہ نہیں، کیونکہ ولوالجیہ میں ہے اگر کوئی شخص اپنے دوست یا رشتہ دار کی قبر کی زیارت کرے اور قبر کے پاس کچھ تلاوت کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ صاحب ولوالجیہ نے قبر پر قرأت کو اچھی بات قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود قبر پر تلاوت قرآن کی وصیت کو باطل قرار دیا ہے معلوم ہوا کہ اس کی وجہ قبر پر تلاوتِ قرآن کی کراہت نہیں ہے۔

نیز بہت سے حضرات نے اس کی صراحت کی ہے کہ مفتیٰ بہ قول امام محمد رحمہ اللہ کا ہے کہ قبر پر تلاوت قرآن مکروہ نہیں ہے۔ (۲)

اور یہ بات احادیث سے بھی ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر سورہ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات تلاوت فرمائی، نیز ایصال ثواب بھی ثابت ہے اس لئے وقف میں قبر پر تلاوتِ قرآن کی شرط کو ناجائز قرار دینے کی یہ وجہ بیان کرنا درست نہیں۔

دوسرا استدلال:

اس شرط کے ناجائز ہونے کی اصل وجہ ان حضرات کے نزدیک تلاوتِ قرآن کریم پر اجرت کا ناجائز ہونا ہے اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تم میری قبر پر تلاوت قرآن کریم کرو گے تو تمہیں اس وقف کی

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۹۰/۶)

(۲) دیکھئے: الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۲۹۰/۶) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۲۸/۵)

آمدنی ملے گی تو یہ اجارہ کے مشابہ ہے کہ واقف وقف کی آمدنی کے عوض اس سے قبر پر تلاوتِ قرآن کرا رہا ہے اور ظاہر ہے تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

بـل البـطلان مبنی علی ماقدمناه عن الولوالجية وصرح به فی الاختيار وكثير من الكتب وهو أنه يشبه الاستئجار على قراء ة القرآن. [1]

قبر پر تلاوتِ قرآن کی وصیت کا باطل ہونا اس بات پر مبنی ہے کہ یہ قراءتِ قرآن پر اجرت لینے کے مشابہ ہے جیسا کہ ولوالجیہ، اختیار اور دیگر کتب میں صراحت ہے۔

اور علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وعـلـلـوا ذلک بأن ذلک بمنزلة الأجرة ولا يجوز أخذ الاجرة على طاعة الله تعالىٰ. [2]

فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ وصیت بمنزلہ اجرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

اس استدلال پر شراح اشباہ، علامہ ابن نجیم اور علامہ حصکفی رحمہم اللہ نے یہ اعتراض کیا کہ فتویٰ تو اس پر ہے کہ قراءتِ قرآن پر اجرت لینا جائز ہے، لہٰذا اگر وصیت کو اور وقف میں اس شرط کو بمنزلہ اجرت بھی قرار دیا جائے تو مفتیٰ بہ قول کے مطابق تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا جائز ہے لہٰذا وصیت اور وقف میں یہ شرط بھی جائز ہونی چاہیے۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

لأن صـاحـب الاختيـار عـلـلـه بـأن أخـذ شـيء للقراء ة لايجوز لأنـه كـالأجرة فأفاد أنه مبنى على غير المفتى به فان المفتى به جواز الأخذ على القراء ة. [3]

صاحبِ اختیار نے وصیت کے بطلان کی علت یہ بیان کی ہے کہ قراءت قرآن پر کچھ لینا جائز نہیں کیونکہ یہ اجرت کی طرح ہے معلوم ہوا کہ یہ غیر مفتیٰ بہ قول پر مبنی ہے، مفتیٰ بہ قول تو قراءت پر اجرت کے جواز کا ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۶/۶۹۱)

(۲) الرملی، خير الدين الرملی. الفتاوی الخيرية، مصر، مطبع بولاق (۲/۲۲۱)

(۳) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشيديه (۵/۲۲۸) مزید دیکھئے: الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدين الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۶/۶۹۱)

متاخرین نے تعلیم القرآن پر اجرت کی اجازت دی ہے نہ کہ تلاوتِ قرآن پر:

ان اکابرین فقہاء رحمہم اللہ کی طرف سے یہ اعتراض کرنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ متقدمین فقہاء کرام رحمہم اللہ نے تو مطلقاً تعلیم القرآن اور تلاوتِ قرآن پر اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا تھا، لیکن متأخرین فقہاء کرام رحمہم اللہ نے جب یہ دیکھا کہ معلمینِ قرآن کی کفالت کا حکومت کی طرف سے کوئی انتظام نہیں رہا اور اگر معلمینِ قرآن معاشی ضروریات پوری کرنے کے لئے کوئی دوسرا کام شروع کریں تو ایسی صورت میں تعلیمِ قرآن کا سلسلہ صحیح طریقہ سے باقی نہیں رہ سکتا اور ضیاعِ قرآن کا اندیشہ ہے تو انہوں نے قرآن کی حفاظت کے لئے تعلیمِ قرآن پر اجرت لینے کو جائز قرار دیدیا، لیکن قراءتِ قرآن اور تلاوتِ قرآن پر اجرت لینے کی بہرحال اجازت نہیں دی کیونکہ تلاوتِ قرآن نہ کرنے کی صورت میں ضیاعِ قرآن کا اندیشہ نہیں ہے۔

تعلیمِ قرآن پر اجرت کے جواز سے قبر پر تلاوتِ قرآن کی اجرت کے جواز پر استدلال کرنا بعید از فہم معلوم ہوتا ہے، تعلیم قرآن پر اجرت کی اجازت حفاظتِ قرآن کی ضرورت کی وجہ سے دی گئی ہے کیا قبر پر تلاوت نہ کرنے کی صورت میں بھی ضیاعِ قرآن کا اندیشہ ہے؟ اور اس درجہ کی ضرورت متحقق ہے جو تعلیم قرآن میں پائی جارہی ہے؟

علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وان کانوا استحسنوا جوازها علی تعليم القرآن فذلک للضرورة، ولاضرورة الی القول بجوازها علی القراءة علی قبور الموتیٰ.(۱)

اگرچہ فقہاء کرام نے تعلیم قرآن پر اجرت کو جائز قرار دیا ہے لیکن وہ ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، جبکہ مُردوں کی قبر پر تلاوت کی کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے کہ اس پر اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا جائے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

لأن ماأجازوه انما أجازوه فی محل الضرورة کالاستئجار لتعليم القرآن أو الأذان او الامامة خشية التعطيل لقلة رغبة الناس فی الخير،

---

(۱) الرملی، خير الدين الرملی. الفتاوی الخيرية، مصر، مطبع بولاق (۲/۲۲۱)

ولا ضرورة فی استئجار شخص یقرأ علی القبر أو غیره اھ۔ رحمتی.
أقول: هذا هو الصواب، وقد أخطأ فی هذه المسئلة جماعة ظناً منهم أن المفتی به عند المتأخرین جواز الاستئجار علی جمیع الطاعات مع أن الذی أفتی به المتأخرون انما هو التعلیم والأذان والامامة و صرح المصنف فی المنح فی کتاب الاجارات وصاحب الهدایة وعامة الشراح وأصحاب الفتاویٰ بتعلیل ذلک بالضرورة وخشیة الضیاع کمامر، ولو جاز علی کل طاعة لجاز علی الصوم والصلاة او الحج مع أنه باطل بالاجماع.[1]

فقہاءکرام رحمہم اللہ نے جس کی اجازت دی ہے وہ ضرورت کے موقع پراجازت دی ہے جیسے تعلیم قرآن یافقہ یااذان یاامامت پراجرت لینااور یہ اجازت اس وجہ سے دی ہے کہ خیر کے کاموں میں لوگوں کی رغبت کم ہوجانے کی وجہ سے ان مناصب کے معطل ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا،جبکہ قبر پرتلاوتِ قرآن کروانے کے لئے کسی کواجرت پر لینے میں یہ ضرورت متحقق نہیں ہے۔رحمتی

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ یہ بالکل درست ہےاورایک بہت بڑی جماعت سے اس مسئلہ میں غلطی ہوئی وہ یہ سمجھے کہ متاخرین کےنزدیک مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ تمام طاعات پراجرت لیناجائز ہے۔حالانکہ متاخرین فقہاءنے صرف تعلیم،اذان اورامامت پراجرت لینے کے جائز ہونے کافتویٰ دیاہے،خودعلامہ حصکفیؒ نے منح میں اورصاحبِ ہدایہ ودیگرشراح واصحابِ فتویٰ نے جواز کی علت یہ بیان کی ہے کہ ضرورت اوران اہم شعائر کے ضیاع کے اندیشہ کی وجہ سے اجرت کے جواز کافتویٰ دیاجارہاہے،اگر ہرطاعت پراجرت لیناجائز ہوتو پھرنماز، روزےاورحج پربھی اجرت لیناجائز ہوتاحالانکہ ان پراجرت لیناسب کےنزدیک بالاجماع باطل ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاجارۃ میں بھی اس مسئلہ پربڑی تفصیلی اورنفیس بحث فرمائی ہے۔[2]

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ(۲۹۱/۶)

(۲) دیکھئے:حوالہ بالا(۵۵/۶ کتاب الاجارہ) منحة الخالق (۲۲۸/۵)

علامہ سندھیؒ کے نزدیک قبر پر تلاوت میں بھی ضرورت متحقق ہے:

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ قبر پر تلاوتِ قرآن کریم میں بھی ضرورت کا تحقق فرماتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ بات تو ثابت ہے کہ میت کو قرآن کریم اور صدقہ کا ثواب ملتا ہے، بسا اوقات میت کو ثواب کی ضرورت ہوتی ہے اور میت کے وارث خود قرآن پڑھ نہیں سکتے اس لئے یہاں میت اور اس کے ورثاء کی نسبت سے ضرورت متحقق ہے کہ کسی کو اجرت دے کر اس سے قبر پر تلاوتِ قرآن کروائی جائے تاکہ میت کو ثواب پہنچ سکے، فرماتے ہیں:

وقد أقر اهل السنة والجماعة بوصول ثواب القراء ة والصدقة للميت ممن أهدى اليه، فربما كان الميت مضطرا الى مايهدى له من الطاعات، والوارث أو الوصي لايمكنه القراء ة بنفسه فعند ذلك تتحقق الضرورة في جانب المستأجر والميت. (۱)

اہلِ سنت والجماعت کے یہاں یہ بات طے ہے کہ قراءت اور صدقہ کا ثواب میت کو اس شخص کی طرف سے پہنچتا ہے جو میت کو ان کا ثواب ہدیہ کرے، بسا اوقات میت کو ان عبادات کے ثواب کی ضرورت ہوتی ہے جن کا ثواب میت کو بھیجا جاتا ہے لیکن میت کے وارث یا وصی خود قرآن نہیں پڑھ سکتے تو ایسی صورت میں متاجر یعنی وارث یا وصی اور خود میت کی نسبت سے ضرورت متحقق ہوگئی۔

کس ضرورت کے تحت اجرت علی القرآن کی اجازت دی گئی:

لیکن علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات بظاہر درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ متاخرین فقہاء کرامؒ نے جس ضرورت کی وجہ سے تعلیم قرآن پر اجرت کی اجازت دی ہے اس سے ثواب کی ضرورت مراد نہیں بلکہ قرآن کریم اور دیگر شعائرِ دینیہ کی بقاء کی ضرورت مراد ہے۔

علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اما اليوم فذهب ذلک كله واشتغل الحفاظ بمعاشهم وقل من يعلّم

---

(۱) الرافعي، عبد القادر الرافعي. تقريرات الرافعي ملحق برد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۳۴۷/۶)

حسبة ولايتفرغون له ايضاً فان حاجتهم تمنعهم من ذلک فلو لم يفتح لهم باب التعليم بالأجر لذهب القرآن فأفتوا بجواز ذلک ورأوه حسناً. (۱)

آج وہ ساری سہولتیں ختم ہوگئیں جو متقدمین فقہاء کے دور میں تھیں حفاظ اپنے معاش میں مشغول ہوگئے، بہت کم ایسے لوگ ملتے ہیں جو بغیر کچھ لئے تعلیم دیں اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے پاس اس کے لئے فرصت بھی نہیں ہے ان کی ضروریات مانع ہیں اگر اجرت لے کر تعلیم دینے کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا تو قرآن چلا جائے گا، اس ضرورت کی وجہ سے متقدمین نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا۔

صاحب ہدایہ بھی متاخرین کا فتویٰ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ففي الامتناع يضيع حفظ القرآن. (۲)

اجرت لینے سے اگر منع کیا جائے گا تو حفظ قرآن کریم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

ان عبارات سے واضح ہے کہ حفاظتِ قرآن کی ضرورت کی وجہ سے متاخرین نے تعلیمِ قرآن پر اجرت کی اجازت دی، اس طرح کی ضرورت قبر پر تلاوت کرنے میں ہرگز نہیں ہے، لہٰذا اس پر اجرت جائز نہیں ہونی چاہئے۔

احقر کے نزدیک قبر پر تلاوت کی شرط لگانے کے دو مطلب:

احقر کے نزدیک فقہاء کرام رحمہم اللہ کی اس عبارت ''لو شرط أن يقرأ على قبره'' کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

ایک مطلب تو یہ ہے کہ واقف نے وقف کرتے وقت کسی متعین شخص سے کہا کہ اس وقف کی آمدنی تمہیں ملے گی لیکن شرط یہ ہے کہ تم میری قبر پر آکر تلاوتِ قرآن کیا کروگے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ واقف نے وقف کیا اور اس وقف کے مصارف بیان کرتے ہوئے کہا کہ جو شخص میری قبر پر آکر تلاوتِ قرآن کرے گا اسے اس وقف کی اتنی آمدنی دی جائے کسی شخص کو متعین نہیں کیا۔

---

(۱) الزيلعي، فخر الدين عثمان بن علي الزيلعي ۷۴۳ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۰م (۱۱۸/۲)

(۲) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن علي بن ابي بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۰/۸)

پہلا مطلب لینے کی صورت میں اجارہ کے ساتھ مشابہت:

اگر پہلا مطلب لیا جائے تو بلا شبہ اس میں اجارہ کی مشابہت پائی جارہی ہے کہ واقف ایک متعین شخص کو تلاوتِ قرآن کے عوض وقف کی آمدنی دے رہا ہے اور معاملہ باقاعدہ واقف اور موقوف علیہ (مستحق) کے درمیان طے ہو رہا ہے، اس کی شرط لگائی جارہی ہے۔

کسی کی خدمات کے عوض اسے طے کر کے کچھ دینا ہی اجارہ ہے، اسے فقہاء کرام رحمہم اللہ اجارۃ الاشخاص اور اجارۃ علی الاعمال کے عنوان سے تعبیر کرتے ہیں۔

دوسرا مطلب لینے کی صورت میں یہ شرط تعیینِ مصرف ہے:

اور اگر دوسرا مطلب لیا جائے تو اس صورت میں اجارہ نہیں بلکہ درحقیقت وقف کی آمدنی کا مصرف طے کرنا ہے کہ اس وقف کی آمدنی کہاں خرچ کی جائے، اور واقف وقف کی دیگر شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے جو مصرف طے کرنا چاہے کرسکتا ہے اور یہ مصرف کی تعیین بمنزلہ شرط ہوتی ہے اس کے علاوہ کہیں اور خرچ کرنا جائز نہیں۔

اجارہ نہ ہونے کی وجہ:

یہ اجارہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں کسی فردِ متعین سے شرط نہیں طے کی جارہی ہے بلکہ ایک جہت کی تعیین کی جارہی ہے کہ جو قبر پر آکر تلاوتِ قرآن کرے گا اسے وقف کی آمدنی دی جائے گی، تلاوت کرنے والا کوئی بھی ہوسکتا ہے اور جب مخاطب معین نہیں تو اسے اجارہ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اجارہ عقودِ معاوضہ میں سے ایک عقد ہے اور کسی بھی عقد کے لئے دو عاقدین کا ہونا ضروری ہے جو باہمی رضامندی سے عقد کریں۔ شیخ زحیلی عقد کے عناصر بیان فرماتے ہیں:

عناصر العقد: هی مقوماته الذاتية التی ينشاء بها العقد ولا يتحقق الابوجودها وهی أربعة: صيغة التعاقد والعاقدان ومحل العقد وموضوع العقد. (۱)

---

(۱) الزحيلی، الدكتور وهبة الزحيلی. الفقه الاسلامی وادلته، بيروت، دار الفكر، الطبعة الاولیٰ، ۱۹۸۴م (۹۴/۴)

عقد کے عناصر یعنی عقد کے وہ جوہری اجزاء جن سے عقد وجود میں آتا ہے چار ہیں، عقد کا صیغہ، دو عاقدین، محل عقد اور موضوع عقد۔

آگے جا کر ایک جگہ فرماتے ہیں:

تعدد العاقد شرط فی انعقاد العقد. (۱)

عاقدین کا متعدد ہونا عقد کے انعقاد کے لئے شرط ہے۔

لہٰذا جب اس دوسری صورت میں کوئی دوسرا معین عاقد نہیں پایا جا رہا کہ جس سے معاملہ طے کیا گیا ہو بلکہ ایک مصرف ذکر کیا جا رہا ہے تو اسے عقد نہیں کہہ سکتے اور جب یہ عقد نہیں ہے تو اجارہ بھی نہیں ہوسکتا۔

دونوں اقوال میں تطبیق:

پہلا مطلب لینے کی صورت میں علامہ رملیؒ، علامہ شامیؒ کا موقف احقر کے نزدیک راجح ہے کہ یہ شرط باطل ہے کیونکہ جب ایک معین شخص سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں وقف کی آمدنی اس شرط پر ملے گی کہ تم میری قبر پر تلاوت کیا کرو گے تو بلا شبہ یہ اجارہ ہے اور قبر پر تلاوتِ قرآن کے لئے اجارہ جائز نہیں، یہاں ضیاعِ قرآن کا اندیشہ نہیں ہے، متاخرین فقہاء کرام رحمہم اللہ نے صرف تعلیمِ قرآن کے لئے اجارہ کو ضرورتِ حفظِ قرآن کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، اس سے متعلق عبارات ماقبل میں گذر چکی ہیں۔

فقہاء کرام کی عبارت "لو شرط أن يقرأ على قبره" کا دوسرا مطلب اگر لیا جائے کہ واقف کسی معین شخص سے معاملہ نہیں کر رہا بلکہ وقف کی آمدنی کا مصرف طے کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ جو میری قبر پر تلاوت کرے گا اسے وقف کی آمدنی دی جائے تو اس صورت میں شراحِ اشباہؒ، علامہ حصکفیؒ، علامہ رافعیؒ اور علامہ ابن نجیمؒ کا البحر الرائق میں اختیار کردہ موقف راجح ہوگا کہ یہ شرعاً جائز ہے، کیونکہ اس صورت میں اجارہ علی تلاوت القرآن کی خرابی لازم نہیں آرہی، صرف واقف وقف کی آمدنی کا مصرف طے کر رہا ہے اور اس کا واقف کو اختیار ہے وہ اگر کوئی مصرف طے کردے تو یہ بمنزلہ شرط ہوتا ہے اسی مصرف میں وقف کی آمدنی خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے، جس طرح واقف دیگر مصارف بیان کرسکتا ہے اسی طرح اگر وہ یہ مصرف بیان کردے کہ جو میری قبر پر آکر تلاوتِ قرآن کیا کرے گا اسے وقف کی آمدنی دی جائے گی تو یہ شرط جائز ہوگی اور واجب الاتباع ہوگی۔ البحر الرائق میں ہے:

---

(۱) الزحیلی، الدکتور وھبۃ الزحیلی. الفقہ الاسلامی وادلتہ، بیروت، دار الفکر، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۸۴م (۱۷۲/۴)

فان الواقف اذا شرط على المدرسين والطلبة حضور الدرس فى المدرسة أياماً معلومة فى كل جمعة فانه لايستحق المعلوم الا من باشره، خصوصاً اذا قال الواقف ان من غاب عن المدرسة قطع معلومه فانه يجب اتباعه ولايجوز للناظر الصرف اليه زمن غيبته، وعلىٰ هذا لوشرط الواقف أن من زادت غيبته على كذا أخرجه الناظر وقرر غيره اتبع شرطه فلو لم يعزله الناظر وباشر لايستحق المعلوم، فان قلت: اذا كان له درس فى جامع ولازمه بنية أن يكون عما عليه فى مدرسة هل يستحق معلوم المدرسة؟ قلت: لايستحق الا اذا باشر فى المكان المعين بكتاب الوقف. (۱)

اگر واقف ہفتہ میں چند معین دن اساتذہ اورطلبہ پر مدرسہ میں حاضری کو شرط قرار دیدے تو یہ حضرات وظیفہ کے حقدار نہیں ہوں گے جب تک معین ایام میں مدرسہ حاضر نہ ہوں۔

خاص طور پر جب واقف نے یہ کہا ہو کہ جو مدرسہ سے غیر حاضر ہو اس کا وظیفہ روک دیا جائے تو اس کی شرط کی اتباع ضروری ہے اور متولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ جن دنوں وہ غیر حاضر رہا ہے ان دنوں کا وظیفہ اسے دے، اسی طرح اگر واقف نے یہ شرط لگادی کہ اساتذہ اور طلبہ میں سے جو اتنے دنوں سے زیادہ مدرسہ سے غائب رہے اس کا مدرسہ سے اخراج کردیا جائے اور اس کی جگہ متولی کسی اور کو رکھے تو اس شرط کی بھی اتباع کی جائے گی، اگر مدرس یا طالب علم اتنے دن غائب رہنے کے بعد دوبارہ آگیا اور کام شروع کردیا اور متولی نے اسے معزول نہیں کیا تو ایسی صورت میں اس کے لئے وظیفہ لینا بہر حال جائز نہیں ہوگا۔

اگر آپ یہ سوال کریں کہ ایک شخص کو واقف نے مدرسہ کے لئے متعین کردیا کہ وہ یہاں پڑھائے گا لیکن وہ مدرس جامع مسجد میں پڑھاتا ہے تو کیا اسے مدرسہ کا وظیفہ ملے گا؟ جواب یہ ہے کہ اسے اس وقت تک وظیفہ نہیں ملے گا جب تک اس معین جگہ پر تدریس نہ کرے جس کی واقف نے اپنی تحریر میں شرط لگائی ہو۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۲۷/۵)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اگر واقف وقف کی آمدنی کے استحقاق کے لئے کسی مخصوص جگہ مخصوص عمل کی ادائیگی کی شرط لگادے تو اس کی پابندی ضروری ہے۔

فریقین کے دلائل کے جوابات:

جو حضرات اس شرط کو مطلقاً جائز قرار دیتے ہیں ان کا پہلا استدلال یہ تھا کہ واقف اگر کوئی جگہ متعین کردے تو یہ متعین ہوجاتی ہے اس کی پابندی کئے بغیر مستحق وقف کی آمدنی کا استحقاق نہیں رکھتا، یہ اصول بالکل درست ہے لیکن آپ غور فرمائیں یہ واقف کی طرف سے مصرف کی تعیین ہے اس میں اجارہ کا پہلو نہیں ہے۔

ان کا دوسرا استدلال یہ تھا کہ واقف جو قبر پر تلاوت قرآن کی شرط لگا رہا ہے اس سے اس کی غرض صحیح وابستہ ہے لہٰذا اس کی رعایت رکھنی چاہئے، یہ بات بھی درست ہے لیکن اغراض کی رعایت اس وقت تک رکھی جاتی ہے جب تک وہ شریعت کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں، جہاں اغراض کا شرعی اصولوں سے تصادم آجائے وہاں اغراض کی رعایت جائز نہیں ہوتی، جو شخص مسجد میں چراغاں کرنے کے لئے وقف کررہا ہے اس کی بھی غرض مسجد کی تزئین اور اس کی عظمت میں اضافہ ہے لیکن چونکہ یہ غرض اسراف کے شرعی اصول سے متصادم ہے اس لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے اس کی غرض کی رعایت نہیں کی چوتھی شرط کے ضمن میں ہم اس کی تفصیل تحریر کرچکے ہیں۔

اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں بھی اگر اس شرط میں اجارہ کا پہلو نہیں آتا تو یہ شرط معتبر ہے واقف کی غرض صحیح کی رعایت کی جائے گی، لیکن اگر اس میں اجارہ کا پہلو آگیا کہ کسی معین شخص سے یہ معاملہ کیا جارہا ہے کہ تم میری قبر پر آکر اگر تلاوت کروگے تو تمہیں وقف کی آمدنی ملے گی ورنہ نہیں تو اب اجارہ علی تلاوۃ القرآن کے شرعی مفسدہ کی وجہ سے واقف کی غرض کی رعایت نہیں کی جائے گی اور اس شرط کو باطل قرار دیا جائے گا۔

تیسرا استدلال ان حضرات نے فتاویٰ تاتارخانیہ کے جزئیہ سے کیا تھا جس میں واقف نے وقف کی آمدنی ان لوگوں کے لئے مخصوص کردی تھی جو اس کی قبر پر جھاڑو لگائیں، مقبرہ کا دروازہ کھولیں یا اس کی قبر پر تلاوت کریں، ظاہر ہے یہاں بھی واقف مصرف بیان کررہا ہے، کسی شخص کو متعین نہیں کررہا لہٰذا یہاں بھی اجارہ کا پہلو نہیں پایا گیا اس لئے یہ شرط جائز ہے اور اسے پورا کیا جائے گا۔

علامہ رملیؒ اور علامہ شامیؒ نے اجارہ علی تلاوۃ القرآن کے ناجائز ہونے کی وجہ سے قبر پر تلاوتِ

قرآن کی شرط کو باطل قرار دیا تھا، ظاہر ہے یہ اس وقت درست ہے جبکہ اس شرط میں اجارہ کا پہلو پایا جائے اور کسی معین شخص سے واقف یہ معاملہ کرے، لیکن اگر اس جملہ کا دوسرا مطلب لیا جائے اور اسے تعیین مصرف پر محمول کیا جائے تو ایسی صورت میں یہ شرط جائز ہونی چاہئے کیونکہ اجارہ علی تلاوۃ القرآن کا مفسدہ نہیں پایا جارہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اس موقف سے دونوں فریقین کی رائے میں تطبیق ہوجاتی ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ قبر پر تلاوتِ قرآن کی شرط عائد کرنے کی جوصورت ناجائز ہے وہ یہ ہے کہ واقف کسی متعین شخص سے کہے کہ تم میری قبر پر آکر تلاوت قرآن کروگے تو وقف کی آمدنی کے مستحق ہوگے، یہ شرط ناجائز ہے کیونکہ اس میں تلاوتِ قرآن پر اجرت لینے کی خرابی پائی جارہی ہے۔ ہاں اگر تعیینِ مصرف کے طور پر یوں کہا جائے کہ جو قبر پر آکر تلاوت کرے گا اسے وقف کی آمدنی دی جائے گی تو اس کی اجازت ہے، البتہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ وقف میں ایسی شرط لگانے سے احتراز کرنا چاہئے جس کے جواز میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہو۔ واللہ سبحانہ اعلم

ذمی کے لئے تولیت کی شرط:

(۷) مسلمان شخص نے وقف کیا اور کسی ذمی کو متولی بنانے کی شرط لگائی تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ متولی کو موقوف علیہم پر ولایت حاصل ہوتی ہے اور کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہوسکتی، اس لئے یہ شرط جائز نہیں۔ علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> **فی منهوات الأنقروية: هذا يدل على أن تولية الذمی صحيحة وينبغی أن يخص بوقف الذمی فان تولية الذمی على المسلمين حرام ولا ينبغی اتباع شرط الواقف فيها.** [1]
>
> انقرویۃ میں ہے کہ بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمی کو متولی بنانا صحیح ہے، مناسب یہ ہے کہ اسے ذمی کے وقف کے ساتھ مخصوص قرار دیا جائے کیونکہ ذمی کو مسلمان پر ولایت دینا حرام ہے، اور اس سلسلہ میں اگر واقف نے ذمی کو متولی بنانے کی شرط لگائی ہو تو اس کی اتباع نہیں کرنی چاہئے۔

---

(۱) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی (۸۴/۴)

دوسری بات یہ ہے کہ ولایت میں مصلحتِ وقف بھی ملحوظ ہونی چاہئے ایک کافر سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اوقاف کی صحیح نگرانی رکھے گا اور واقف نے جو مصارف خیر طے کئے ہیں ان میں وہ خرچ کرنے کا اہتمام کرے گا۔

یہ شرط جہاں شریعت کے اصول سے متصادم ہے کہ اس میں تولیۃ الکافر علی المسلم لازم آرہا ہے وہاں یہ مصلحتِ وقف کے بھی خلاف ہے اس لئے ایسی شرط جائز نہیں۔

خیانت کی صورت میں متولی کو معزول نہ کرنے کی شرط:

(۸) واقف نے خود ہی کو وقف کا متولی قرار دیا اور یہ شرط لگادی کہ مجھے خیانت کے باوجود قاضی یا حاکم معزول نہیں کرسکتا۔

یا اسی طرح کسی اور کو متولی مقرر کیا اور یہ شرط عائد کردی کہ اس متولی کو خیانت کرنے اور نااہل ہوجانے کے باوجود قاضی معزول نہیں کرسکتا۔

یہ دونوں شرطیں باطل ہیں کیونکہ اول تو یہ شریعت کے خلاف ہیں کہ نااہل کو متولی برقرار رکھنے کی شرط لگائی جارہی ہے دوسرے یہ شرط مصلحتِ وقف کے خلاف بھی ہے کیونکہ جو شخص وقف کو نقصان پہنچانے اور وقف میں خیانت کا مرتکب ہوا سے متولی کی حیثیت پر برقرار رکھنے میں وقف کے مزید نقصان کا اندیشہ ہے۔ علامہ طرسوسی رحمۃ اللہ علیہ انفع الوسائل میں فرماتے ہیں:

> وكذا اذا شرط (الواقف) أن ليس لسلطان ولا لقاض أن يخرجها من يده ويوليها غيره، لأنه شرط مخالف لحكم الشرع.[1]
>
> اسی طرح اگر واقف نے یہ شرط لگادی کہ قاضی اور بادشاہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اس وقف کو اس کے ہاتھ سے لے لے اور کسی اور کو اس کا متولی بنادے تو یہ شرط جائز نہیں کیونکہ یہ شریعت کے حکم کے خلاف ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

> ويعزل القاضى الواقف المتولى على وقفه لو كان خائنا كما يعزل الوصى الخائن نظراً للوقف واليتيم، ولا اعتبار بشرط الواقف أن لايعزله القاضى والسلطان لأنه شرط مخالف لحكم الشرع فبطل.[2]

---

(۱) الطرسوسی، ابراهیم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۷۶)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۷/۵) مزید دیکھئے: هندیه (۴۰۹/۲)

وہ واقف جو اپنے وقف کا خود متولی بھی ہو اگر وہ خیانت کرے تو وقف کی رعایت اور حفاظت کی غرض سے قاضی اسے معزول کر دے گا، جیسے وصی خائن کو قاضی یتیم پر شفقت کی غرض سے معزول کر سکتا ہے، اور واقف کی اس شرط کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کہ قاضی اور حاکم اسے معزول نہیں کر سکتے کیونکہ یہ شرط شریعت کے حکم کے خلاف ہے اس لئے یہ شرط باطل ہوگی۔
صدر الشریعۃ ابن مازہ البخاری تحریر فرماتے ہیں:

ولو شرط الواقف ولايتها لنفسه وأن ليس للسلطان ولا للقاضي أن يخرجها من يده ويوليها غيره فهذا الشرط باطل، لأنه مخالف لحكم الشرع، لأن الشرع أطلق للقاضي اخراج من كان متهما دفعاً للضرر عن الفقراء ولو جعل الواقف ولاية الوقف لرجل كانت الولاية كما شرط الواقف، ولو أراد الواقف اخراجه كان له ذلك، ولو شرط الواقف أن ليس له اخراج القيم فهذا الشرط باطل، لأنه مخالف لحكم الشرع، لأن القوامة وكالة والوكالة ليست بلازمة. [1]

اگر واقف نے اپنے لئے ولایت کا حق رکھا اور یہ شرط لگا دی کہ قاضی اور حاکم اس وقف کو مجھ سے لے کر کسی اور کو اس کا متولی نہیں بنا سکتے، یہ شرط باطل ہے کیونکہ یہ شریعت کے حکم کے خلاف ہے، شریعت نے قاضی کو یہ اجازت دی ہے کہ جو شخص متہم ہو اسے وقف کی تولیت سے باہر نکال دے تاکہ فقراء سے ضرر دور ہو سکے، اور اگر واقف نے وقف کی ولایت کسی اور کو دی تو واقف کی شرط کے مطابق اسی شخص ہی کو ولایت دی جائے گی اور اگر واقف کسی وقت اس کو تولیت سے خارج کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لیکن اگر واقف نے یہ شرط لگا دی کہ وقف کی تولیت فلاں کو حاصل ہوگی اور خود مجھے بھی اسے تولیت سے نکالنے کا حق نہیں ہوگا تو یہ شرط باطل ہے کیونکہ یہ شریعت کے خلاف ہے، دوسرے یہ کہ وقف کی تولیت بحکم وکالت ہے اور وکالت عقدِ لازم نہیں ہے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

---

(۱) ابن مازہ البخاری، برهان الدن ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۲۰/۹) مزید دیکھئے: تتارخانیہ (۵/۲۳۹)

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ یہ شرط نہ یہ کہ شریعت کے خلاف ہے بلکہ وقف کی مصلحت اور موقوف علیہم یعنی فقراء کی مصلحت کے بھی خلاف ہے، اس لئے یہ شرط باطل ہے اس پر عمل نہیں کیا جائے گا، واقف یا متولی کی اگر خیانت ثابت ہو جائے تو قاضی یا حاکم انہیں معزول کرسکتا ہے بلکہ اس پر معزول کر کے کسی امین کو متعین کرنا واجب ہے نہ کرنے کی صورت میں گناہگار ہوگا۔[1]

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ بحث کا نتیجہ یوں بیان فرماتے ہیں:

حاصله أن الواقفين اذا شرطوا هذا الشرط ولعنوا من يداخل الناظر من الأمراء والقضاة كانوا هم الملعونين، لأنهم أرادوا بهذا الشرط أن مهما صدر من الناظر من الفساد لايعارضه أحد، وهذا شرط مخالف للشرع، وفيه تفويت المصلحة للموقوف عليهم وتعطيل الوقف فلايقبل. [2]

صاحب الدر المختار نے جو اس شرط کے سلسلہ میں تفصیل بیان فرمائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ واقفین اگر یہ شرط لگائیں کہ اس وقف کی تولیت ان کی اولاد کے پاس رہے گی انہیں کوئی معزول نہیں کرسکتا، امراء اور قضاۃ میں سے جو بھی اس میں دخل اندازی کرے اس پر لعنت ہو تو ایسے واقف خود مستحق لعنت ہیں کیونکہ وہ اس شرط سے چاہتے یہ ہیں کہ ناظر سے جو بھی جرائم اور فساد وقف کے سلسلہ میں ظاہر ہوں کوئی اس سے اس سلسلہ میں باز پرس نہ کرے، یہ شرط شریعت کے مخالف ہے اس میں موقوف علیہم کی مصلحت فوت ہو رہی ہے اور یہ وقف کو بھی معطل کرنے کا باعث ہے اس لئے اس پر ہرگز عمل نہیں کیا جائے گا۔

عدمِ استبدال کی شرط:

(۹) واقف وقف کرتے وقت یہ شرط لگا دے کہ کچھ بھی ہو جائے اس وقف کا استبدال نہیں کیا جائے گا یعنی اسے بیچ کر اس کی جگہ دوسری زمین خرید کر وقف نہیں کی جائے گی، اگر متولی استبدال کا ارادہ کرے تو وہ معزول سمجھا جائے گا۔

---

(۱) دیکھئے: ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۵/۵)

(۲) الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ايچ ايم سعيد كمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۹/۴) مزید دیکھئے: الدر المنتقى (۶۰۷/۲)

یہ شرط بھی باطل ہے اگر قاضی وقف کی مصلحت اس میں سمجھے کہ اسے بیچ کر اس کی جگہ کوئی دوسری جگہ وقف کر دی جائے تو اسے اختیار ہے (اس کی تفصیلی شرائط مسئلہ استبدال کے تحت ذکر کی جائیں گی) واقف کی یہ شرط وقف کی مصلحت کے خلاف ہے اس لئے اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

علامہ طرسوسی رحمۃ اللہ علیہ اس شرط کے بطلان کی وجہ بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

فالواقف اذا شرط ان لایستبدل بالوقف حتی رأی الحاکم المصلحة للوقف فی استبداله، فاجتمع معنا نص الواقف ورأی الحاکم والمخالفة بینهما ظاهرة، فان عملنا بماشرطه الواقف فقد فوتنا مصلحة الوقف وتتعطل مصلحة الموقوف علیهم، وان نظرنا الی رأی الحاکم فقد عملنا بمصلحته فبقی شرط الواقف فی معنی اشتراط شرط لافائدة فیه للوقف واشتراطه شرطا لافائدة فیه ولا مصلحة للوقف غیر مقبول ...... والمعنی فیها واحد وهو أن نظر القاضی أعلیٰ والواقف انما یختار مافیه المصلحة للوقف ولا یظن به أنه یکرهها، والوقف قد خرج عن ملکه وللحاکم الولایة العامة فاذا رای الحاکم المصلحة لجهة الوقف فی الاستبدال فعله ولا یضره قول الواقف: لایستبدل به. [1]

واقف اگر یہ شرط لگا دے کہ وقف کا استبدال نہیں کیا جائے گا جبکہ حاکم وقف کی مصلحت اس میں سمجھے کہ وقف کو تبدیل کر دینا بہتر ہے تو ایسی صورت میں ہمارے سامنے دو رائے آ گئیں، ایک واقف کی رائے اور دوسری طرف حاکم کی رائے، اور دونوں میں مخالفت بھی خوب واضح ہے۔

اگر ہم واقف کی رائے پر عمل کرتے ہیں تو اس میں وقف کی مصلحت کا فوت ہونا اور موقوف علیہم کی مصلحت کا معطل ہونا لازم آتا ہے، اور اگر حاکم کی رائے کو دیکھتے ہیں تو وقف کی مصلحت کے مطابق عمل ہوتا ہے تو فیصلہ یہی کیا جائے گا کہ حاکم کی رائے پر عمل کیا جائے گا

---

(۱) الطرسوسی، ابراهیم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۱۱۶) وکذا فی البحر الرائق (۲۲۳/۵)

اور واقف کی رائے اس شرط کے حکم میں ہوگی جس میں وقف کا کوئی فائدہ نہ ہو اور واقف کا ایسی شرط لگانا جس میں وقف کا کوئی فائدہ اور مصلحت نہ ہو غیر مقبول ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قاضی کو جو تولیتِ نظم حاصل ہے وہ واقف سے اولیٰ ہے، تیسری بات یہ ہے کہ واقف بھی اپنی شرط عائد کر کے وقف کی مصلحت ہی چاہتا ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ وقف کی مصلحت کو ناپسند کرے گا، لہٰذا جب وقف کی مصلحت اس کے استبدال میں ہے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ وقف واقف کی ملکیت سے تو نکل گیا ہے جبکہ حاکم کو ولایتِ عامہ حاصل ہونے کی وجہ سے وقف پر بھی ولایت حاصل ہے اس لئے اگر حاکم جہتِ وقف کی مصلحت اس میں سمجھے کہ اب اس وقف کو بیچ کر اس کی جگہ دوسری زمین خرید کر وقف کر دی جائے تو حاکم ایسا ہی کرے، واقف نے جو عدمِ استبدال کی شرط لگائی ہے یہ حاکم کے فیصلہ کے لئے مضر نہیں ہوسکتی۔

واقف کا اپنے انتقال کے بعد کسی اور کو متولی نہ بنانے کی شرط لگانا:

(۱۰) واقف اپنی زندگی میں خود ہی وقف کا متولی رہا اور یہ شرط لگادی کہ میرے مرنے کے بعد اس وقف کا کوئی اور متولی نہیں بن سکتا۔

یہ شرط بھی باطل ہے کیونکہ یہ مصلحتِ وقف کے خلاف ہے کہ وقف کا انتظام و انصرام سنبھالنے کے لئے کوئی نہ ہو، لہٰذا قاضی اس شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وقف کے لئے کسی متولی کا تقرر کرے گا۔[1]

وقف مکان کا متعینہ رقم سے زیادہ کرایہ نہ لینے کی شرط:

(۱۱) واقف نے وقف کرنے کے بعد شرط لگادی کہ وقف زمین یا مکان کا کرایہ مثلاً ایک ہزار مقرر کیا جائے گا اس سے زیادہ نہیں لیا جاسکتا، جبکہ صورتحال یہ ہے کہ عام مارکیٹ میں اس وقت اس جیسی زمین یا مکان کا کرایہ تقریباً دو ہزار روپے ہے تو واقف کی یہ شرط باطل ہوگی، اس کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا بلکہ عام

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المنتقی بھامش مجمع الانھر، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۹۹۸م (۲/۷۰۲)

مارکیٹ ریٹ کے مطابق وقف کو کرایہ پر دیا جائے گا، کیونکہ یہ شرط وقف اور موقوف علیہم کی مصلحت کے بالکل خلاف ہے اور ایسی شرط قابلِ قبول نہیں۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ شارح الاشباہ علامہ بیریؒ کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں:

یجوز مخالفة شرط الواقف فی مسائل اذا شرط أن لایؤجر بأکثر من کذا وأجر المثل اکثر. (۱)

واقف نے شرط لگائی کہ یہ وقف اتنے کرایہ سے زیادہ پر اجارہ پر نہیں دیا جائے گا جبکہ اجرتِ مثل اس سے زیادہ ہے تو اس شرط پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

مسجد کی آمدنی کم ہونے کی صورت میں بھی تمام ضروریات میں برابر خرچ کرنے کی شرط لگانا:

(۱۲) واقف مسجد بنائے اور یہ شرط لگادے کہ اگر کسی وقت مسجد میں ضروری تعمیر کی ضرورت ہو اور مسجد کی آمدنی اتنی کم ہوجائے کہ اس سے مسجد کے تمام اخراجات پورے نہ ہوں تو ایسی صورت میں وہ آمدنی صرف ضروری تعمیر پر خرچ نہ کی جائے بلکہ امام مسجد، موذن وغیرہ اور تعمیر میں برابر صرف کی جائے، تو یہ شرط باطل ہوگی، بلکہ صرف ضروری تعمیر ہی پر پہلے یہ آمدنی خرچ کی جائے گی۔

(۱۳) اگر واقف یہ شرط لگادے کہ مسجد کی آمدنی کم ہونے کی صورت میں صرف امام، موذن وغیرہ ہی پر یہ آمدنی خرچ نہ کی جائے بلکہ مسجد کی جو دیگر ضروریات ہیں ان پر اور امام وموذن پر برابر خرچ کی جائے تو یہ شرط بھی باطل ہے، بلکہ پہلے امام وموذن پر خرچ کی جائے گی، پھر اگر بچ جائے تو دیگر ضروریات میں خرچ کی جائے گی۔

ان دونوں شرطوں کے باطل ہونے کی وجہ سمجھنے سے پہلے ہم مسجد کی ضروریات میں غور کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ان میں کیا درجہ بندی کی ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۸/۴) مزید دیکھئے: عمدة ذوی البصائر للبیری (۱۸۰)

مسجد کی ضروریات:

۱۔ مسجد کی ضروری تعمیر جیسے اس کی چھت گر گئی یا دیوار گر گئی اسے صحیح کرنا یا ضروری مرمت کرنا۔

۲۔ مسجد کے وہ ملازم جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کا ضرر بین ہو جیسے امام، خطیب، موذن، مسجد کا خادم جو روشنی کا انتظام کرتا ہے، دریاں بچھاتا ہے، پانی کا انتظام کرتا ہے اسی طرح مسجد کا چوکیدار، یہ وہ تمام لوگ ہیں جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کے معطل اور بے آباد ہونے کا اندیشہ ہے۔

۳۔ مسجد کے غیر ضروری تعمیری یا ضروری غیر تعمیری اخراجات جیسے مسجد کے لئے لائٹ کا انتظام، پانی کا انتظام اور مسجد میں بچھانے کے لئے دریاں وغیرہ، غرضیکہ مسجد کی ایسی ضرورت جس کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مسجد کا ضرر بین ہو اور اس کے معطل ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

۴۔ مسجد کے وہ ملازم جن کے نہ ہونے کی صورت میں مسجد کو ضرر بین[1] لاحق نہ ہو جیسے متولی، شاہد یعنی مسجد کے ملازمین کی حاضری لینے والا، جابی یعنی مسجد کی دوکانوں یا مسجد کی مملوک دیگر جائیداد کا کرایہ لینے والا، شاد یعنی مسجد کی صفائی کی نگرانی کرنے والا، اسی طرح مسجد میں پینے کے لئے ٹھنڈے پانی کا انتظام کرنے والا۔

اگر مسجد کی آمدنی تمام ضروریات کے لئے کافی ہو تو ایسی صورت میں ان تمام ضرورتوں کو پورا کیا جائے گا اور ہر ملازم کو اس کی مقررہ تنخواہ دی جائے گی، کسی کو کسی پر مقدم نہیں کیا جائے گا۔

شیخ محمد قدری پاشا تحریر فرماتے ہیں:

> اذا كان الوقف على مصالح مسجد او مدرسة ان المسجد أو المدرسة محتاجة للعمارة يبدأ من غلة الوقف بالعمارة فاذا انتهت وكان مافضل من الغلة كافياً للصرف على جميع أرباب الشعائر وأصحاب الوظائف لصرف الناظر لكل منهم المعلوم المعين له أو قدر كفايته باذن القاضى ان لم يكف له المعلوم المعين على حد سواء

---

(۱) ضرر بین سے مراد یہ ہے کہ مسجد میں اہتمام کے ساتھ پنج وقتہ نماز نہ ہو سکے (تقریرات الرافعی) (۸۲/۴)

بدون تقديم أحد منهم على غيره. [1]

اگر مسجد یا مدرسہ کے مصالح پر وقف ہو اور مسجد و مدرسہ میں تعمیر کی ضرورت ہو تو وقف کی آمدنی سے پہلے تعمیر کی جائے گی، تعمیر مکمل ہونے کے بعد اگر اتنی آمدنی بچتی ہو جو تمام اربابِ شعائر (جن لوگوں کے نہ ہونے کی وجہ سے تعطیل مسجد کا اندیشہ ہو) اور اصحابِ وظائف (عموم بعد الخصوص کی قبیل سے ہے) کے لئے کافی ہو تو متولی مسجد و مدرسہ ہر ایک کو اس کی متعین تنخواہ دے گا، یا اگر متعین تنخواہ اس کے لئے کافی نہ ہو تو قاضی کی اجازت سے بقدرِ کفایت تنخواہ دے گا، سب کو تنخواہ ملے گی کسی کو کسی پر مقدم نہیں کیا جائے گا۔

لیکن اگر آمدنی کم ہو تو پھر فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ضروریات کی ترتیب اور درجہ بندی قائم کی ہے جس کا حاصل یہ ہے:

---

(۱) باشا، محمد قدری باشا. قانون العدل والانصاف، مصر، مكتبة الاهرام ۱۹۲۸م (۱۶۹)

مسجد کی ضروریات کی درجہ بندی

ضروری تعمیر:

ا۔ سب سے پہلے ضروری تعمیر کو مقدم رکھا جائے گا اگر ساری آمدنی اسی میں خرچ کرنے کی ضرورت ہو تو ساری آمدنی اسی ضروری تعمیر میں خرچ کی جائے گی، دیگر ضروریات پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

والحاصل مماتقرر و تحرر أنه يبدأ بالتعمير الضروری حتی لو استغرق جميع الغلة صرفت كلها اليه ولا يعطى لأحد ولو اماماً أو مؤذناً. (۱)

ماقبل میں جو تحریر کیا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ وقف کی ضروری تعمیر سے آغاز کیا جائے گا، یہاں تک کہ اگر تمام آمدنی اس تعمیر پر خرچ ہو جائے تو اس پر خرچ کی جائے گی کسی کو کچھ نہیں دیا جائے گا خواہ وہ امام ہو یا موذن۔

علامہ شامی رحمہ اللہ ایک جگہ اور تحریر فرماتے ہیں:

لا يخفى أنه لو احتيج قطع الكل للعمارة الضرورية قدمت على جميع الجهات اذ ليس من النظر خراب المسجد لأجل الامام والمؤذن. (۲)

اگر ضروری عمارت کے لئے بقیہ دیگر تمام ضروریات کو ترک کرنا پڑے تو ایسا ہی کیا جائے گا، کیونکہ امام و موذن کی خاطر مسجد کو ویران کر دینا کوئی حکمت کی بات نہیں۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۷۰/۴)

(۲) حواله بالا (۳۶۸/۴)

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

لأن الغرض لكل واقف وصول الثواب موبداً وذلک بصرف الغلة موبداً ولا يمكن ذلک بلاعمارة، فكانت العمارة مشروطة اقتضاء اً. (۱)

وجہ یہ ہے کہ واقف کا مقصود یہ ہے کہ اسے وقف کا ثواب ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے اور یہ اس وقت ہوگا جب وقف کی آمدنی مصارف پر ہمیشہ خرچ کی جائے، اور یہ بغیر تعمیر کے ممکن نہیں لہٰذا تعمیر کی شرط اقتضاءً واقف کی طرف سے پائی جارہی ہے۔

یہی وجہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے۔ (۲)

ضروری تعمیر سے کیا مراد ہے؟

ضروری تعمیر سے مراد یہ ہے کہ واقف نے وقف کو جس حالت میں وقف کیا تھا اسے اس حالت میں برقرار رکھنا۔ اس سے بہتر حالت میں لانا یہ ضروری تعمیر کے زمرہ میں داخل نہیں ہے۔

صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

وانما يستحق العمارة عليه بقدر مايبقى الموقوف على الصفة التي وقفه وان خرب يبنى على ذلک الوصف ...... لأن الصرف الى العمارة ضرورة ابقاء الوقف ولا ضرورة فى الزيادة. (۳)

وقف کی اتنی تعمیر ضروری ہے کہ وہ وقف اس حالت پر باقی رہے جس حالت پر اسے واقف نے وقف کیا تھا اور اگر وہ ویران ہوگیا تو اسے اس حالت پر لانا ضروری ہے جس پر واقف نے وقف کیا تھا، کیونکہ عمارت پر خرچ کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ وقف باقی رہے اور وقف میں اضافہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ٨٦١هـ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۴)

(۲) السرخسى، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابى سهل السرخسى، المبسوط للسرخسى، بيروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م (۱۲/۳۲)

(۳) المرغينانى، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۵) مزید دیکھئے: الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۶۶، ۳۷۳) البحر الرائق (۵/۲۰۸)

علامہ ابن نجیمؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وقف کی دیواروں پر رنگ کروانا بھی اسی وقت ضروری ہوگا جبکہ واقف نے خود کروایا ہو ورنہ نہیں، فرماتے ہیں:

وظاهر قوله بقدر مايبقى الموقوف على الصفة منع البياض والحمرة على الحيطان من مال الوقف ان لم يكن فعله الواقف وان فعله فلامنع. (۱)

اربابِ شعائر اور غیر ضروری تعمیر:

۲۔ضروری تعمیر کے بعد اگر کچھ آمدنی بچے تو اسے مسجد کی ان ضرورتوں پر خرچ کیا جائے گا جنہیں پورا نہ کرنے کی صورت میں مسجد کے معطل اور ویران ہو جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً:

ا۔امام، خطیب اور موذن کی تنخواہ۔

۲۔ مسجد کے خدام جو صفائی کرتے ہیں، دریاں بچھاتے ہیں، روشنی کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا انتظام کرتے ہیں، مسجد کے چوکیدار، ان سب کی تنخواہ۔

۳۔بجلی و پانی کے جملہ اخراجات، دریاں۔

۴۔ مسجد کے غیر ضروری تعمیراتی اخراجات، رنگ وروغن، فرش کی پالش وغیرہ۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

فتحصل أن الشعائر التى تقدم فى الصرف مطلقاً بعد العمارة الامام والخطيب والمدرس والوقاد والفراش والموذن والناظر وثمن القناديل والزيت والحصر، ويلحق بثمن الزيت والحصر ثمن ماء الوضوء وأجرة حمله وكلفة نقله من البير الى الميضاة. (۲)

خلاصہ یہ ہے کہ وہ شعائر جنہیں تعمیر کے بعد مقدم رکھا جائے گا یہ ہیں:

امام، خطیب، مدرسِ مدرسہ، بجلی کا انتظام کرنے والا خادم، دریاں بچھانے والا خادم، موذن، متولی، قندیل اور اس کے تیل کے اخراجات، چٹائی کے اخراجات، وضو کے پانی کے اخراجات، اسے کنویں سے وضو خانہ تک لانے کے اخراجات۔

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۰۸/۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۱۵/۵)

اربابِ شعائر میں الأ ھم فالأ ہم کا اصول ملحوظ رکھا جائے گا:

۳۔ اگر مسجد کی آمدنی سے بیک وقت یہ تمام ضرورتیں پوری نہ ہوسکیں تو ان میں الاھم فالاہم کا اصول ملحوظ رکھا جائے گا کہ امام ومؤذن کو دیگر پر مقدم رکھا جائے گا، اس کے بعد بجلی، پانی اور دری کے انتظام کو مقدم رکھا جائے گا، آخر میں غیر ضروری تعمیری اخراجات پورے کئے جائیں گے غرضیکہ مسجد کو جس چیز کی زیادہ ضرورت ہو اسے پہلے پورا کیا جائے گا۔ تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ میں ہے:

سئل فی وقف مسجد عامر ضاق ریعه عن أرباب الشعائر من الخطیب والامام والمؤذن وغیرهم وعن أرباب وظائفه فمن یقدم؟ أجاب: یقدم أرباب الشعائر الذین هم أقرب الی العمارة اذا باشروا العمل المشروط ویبدأ بالخطیب والامام والمؤذن سویة ویصرف الیهم ماشرط ثم الی المباشرین کما نص الواقف من سائر أرباب الشعائر کالمتولی ثم من أرباب الوظائف...... والذی یبتدأ به من ارتفاع الوقف عمارته ثم ماهو أقرب الی العمارة وأعم للمصلحة کالامام للمسجد والمدرس للمدرسة یصرف الیهم قدر کفایتهم ثم السراج والبساط کذلک الی آخر المصالح.[1]

ایک مسجد کے وقف کے بارے میں پوچھا گیا جس کی آمدنی تنگ ہوگئی ہے اس سے تمام اربابِ شعائر یعنی امام، خطیب، موذن وغیرہ کی تنخواہ اور دیگر ارباب وظائف کی تنخواہ پوری نہیں ہوسکتی، تو ان میں سے کس کو مقدم رکھا جائے گا؟

فرمایا: اربابِ شعائر جو تعمیر کے زیادہ قریب ہیں ضرورت ہونے کے اعتبار سے اگر وہ اپنے فرائض انجام دیں تو انہیں مقدم رکھا جائے گا، آغاز امام، خطیب اور موذن سے کیا جائے گا یہ سب برابر ہیں انہیں ان کی متعینہ تنخواہ دی جائے گی، پھر دیگر اربابِ شعائر جن کے بارے میں واقف نے صراحت کی ہو ان کی تنخواہ دی جائے گی، جیسے متولی، پھر دیگر اربابِ وظائف

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۱۹۵/۱)

کو دیا جائے گا...... وقف کی آمدنی سے سب سے پہلے ضروری تعمیر کی جائے گی، پھر جو عمارت کے زیادہ قریب اور اس کی مصلحت زیادہ عام ہے جیسے مسجد کا امام اور مدرسہ کا مدرس انہیں بقدرِ کفایت دیا جائے گا، پھر چراغ اور دری وغیرہ پر خرچ کیا جائے گا۔

ردالمحتار میں ہے:

فیقدم اولا العمارة الضرورية ثم الأهم فالأهم من المصالح والشعائر بقدر مايقوم به الحال، فان فضل شيء يعطى لبقية المستحقين اذ لاشك أن مراد الواقف انتظام حال مسجده أو مدرسته لامجرد انتفاع أهل الوقف وان لزم تعطيله. (۱)

سب سے پہلے عمارت کو مقدم رکھا جائے گا، پھر مصالح اور اربابِ شعائر میں سے جو سب سے اہم ہو اسے الاہم فالاہم کی ترتیب پر مقدم رکھا جائے گا اور انہیں بقدر کفایت اور گذارا دیا جائے گا، پھر اگر کچھ بچے تو وہ بقیہ مستحقین کو دیا جائے گا کیونکہ واقف کا مقصود مسجد اور مدرسہ کا انتظام باقی رکھنا ہے، محض اہلِ وقف کو فائدہ پہنچانا نہیں ہے خواہ مسجد و مدرسہ معطل کیوں نہ ہو جائیں۔

آگے جا کر مزید تحریر کرتے ہیں:

العمارة الغير الضرورية فان الامام يقدم عليها ...... ثم الفاضل الى الجهات الضرورية الأهم فالأهم. (۲)

امام کو غیر ضروری تعمیر پر مقدم رکھا جائے گا، ضروری تعمیر سے جو بچ جائے اسے ضروری جہات پر الاہم فالاہم کے اصول کے مطابق خرچ کیا جائے گا۔

آمدنی کم ہونے کی صورت میں ملازمین کو بقدرِ کفایت دیا جائے گا:

یہ واضح رہنا چاہئے کہ مسجد کی آمدنی تنگ ہونے کی صورت میں امام، موذن اور خدام وغیرہ کو جو دیا جائے گا ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی مقررہ تنخواہ ہی ہو، بلکہ بقدرِ کفایت دیا جائے گا کہ وہ اس میں اپنا گذارا

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۸/۴)

(۲) حواله بالا

کرسکیں، اگر تنخواہ ہی اتنی ہو جو بقدرِ کفایت ہو تو وہی دی جائے گی اور اگر وہ قدرِ کفایت سے کم ہو تو اس میں اضافہ کیا جائے گا اور اگر قدرِ کفایت سے زیادہ ہو تو آمدنی کم ہونے کی صورت میں اس تنخواہ میں کمی کی جائے گی۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ثم الظاهر أن المراد بالمشروط مايكفيه لأن المشروط له من الواقف لو كان دون كفايته وكان لايقوم بعمله الا بها يزاد عليه ويؤيده ماسيأتي في فروع الفصل الأول أن للقاضي الزيادة على معلوم الامام اذا كان لايكفيه وكذا الخطيب، قلت: بل الظاهر أن كل من في قطعه ضرر بين فهو كذالک، لأنه في حكم العمارة فهو مثل مالوزادت أجرة الأجير في التعمير، وأما لوكان المشروط له أكثر من قدر الكفاية فلايعطى الا الكفاية في زمن التعمير لأنه لاضرورة الى دفع الزائد المؤدي الى قطع غيره فيصرف الزائد الى من يليه من المستحقين. (۱)

ظاہر یہ ہے کہ متعینہ تنخواہ سے مراد بقدرِ کفایت ہے کیونکہ واقف نے مسجد کے ان ملازمین کی جو تنخواہ مقرر کی ہے وہ اگر بقدرِ کفایت سے کم ہو کہ اس میں یہ لوگ اپنے فرائض انجام نہ دیں تو اس تنخواہ میں اضافہ کردیا جائے گا، اس کی تائید اس جزئیہ سے ہوتی ہے جو آگے فصل اول کی فروع کے تحت آرہا ہے کہ قاضی امام کی تنخواہ میں اضافہ کرسکتا ہے اگر وہ تنخواہ امام کی ضرورتوں کے لئے کافی نہ ہو اسی طرح خطیب کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ یہی حکم وقف کے ہر اس ملازم کا ہے جس کے نہ ہونے کی صورت میں وقف کا ضرر بین ہو کیونکہ ان ملازمین کا وہی حکم ہے جو تعمیر کا ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے تعمیر کے زمانہ میں مزدور کی اجرت بڑھ گئی۔

اور اگر واقف کی طرف سے متعینہ تنخواہ بقدرِ کفایت سے زائد ہو تو تعمیر کے زمانہ میں ان لوگوں کو بقدرِ کفایت سے زیادہ تنخواہ نہیں دی جائے گی کیونکہ بقدرِ کفایت سے زائد دینے کی

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچي، ايچ ايم سعيد كمپني، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۷۰/۴)

کوئی ضرورت نہیں جبکہ کچھ لوگوں کو بالکل تنخواہ نہیں مل رہی ہے تنگی کی وجہ سے، زائد آمدنی دیگر مستحق ملازمین کو دی جائے گی۔

مسجد کی غیر تعمیری اور غیر ضروری تعمیری ضرورت احسن طریقہ سے پوری کی جائے گی:

اس مرحلہ پر مسجد کی جو غیر ضروری تعمیری و غیر تعمیری ضرورتیں پوری کی جائیں گی وہ بقدر کفایت نہیں کی جائیں گی بلکہ انہیں احسن طریقہ سے پورا کیا جائے گا۔

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ البحر الرائق میں لکھتے ہیں:

وفي القنية: لو اشترى بساطاً نفيساً من غلته جاز اذا استغنى المسجد عن العمارة اھ۔ [1]

قنیہ میں ہے کہ اگر مسجد کی تعمیر سے مستغنی ہو تو اس کی آمدنی سے نفیس دری (قالین) خریدنا جائز ہے۔

اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر مسجد کی غیر تعمیری اور غیر ضروری تعمیری ضرورتیں احسن طریقہ سے پوری کی جاسکتی ہیں۔

غیر اربابِ شعائر:

۴۔ مندرجہ بالا ضرورتیں پوری کرنے کے بعد اگر مسجد کی آمدنی بچتی ہو تو پھر ان ملازمین کو تنخواہ دی جائے گی جن کے نہ ہونے کی صورت میں مسجد کے معطل اور ویران ہونے کا اندیشہ نہیں ہے جیسے متولی، شاہد یعنی وہ شخص جو مسجد کے دیگر ملازمین کی حاضری لیتا ہے، جابی یعنی مسجد کی دوکانوں اور دیگر مملوکاتِ مسجد کا کرایہ لینے والا، شاد مسجد کی صفائی کی نگرانی کرنے والا، اسی طرح مسجد میں پینے کے لئے ٹھنڈے پانی کا انتظام کرنے والا ان سب کی تنخواہیں ادا کی جائیں گی، اسی طرح مسجد کی مملوکہ کتب کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنے والے کی تنخواہ ادا کی جائے گی، مسجد کے بیت الخلاء صاف کرنے والے کا بھی یہی حکم ہے۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۱۵/۵)

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

ليس المباشر والشاهد والجابي والشاد و خازن الكتب من الشعائر وقد جرت العادة بمصر في ديوان المحاسبة بتقديمهم مع المذكورين أولا وليس شرعياً. (۱)

مباشر، شاہد، جابی، شاد اور خازنِ کتب شعائر میں سے نہیں ہیں یعنی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں تعمیر کے بعد مقدم رکھا جاتا ہے۔ مصر میں یہ معمول ہے کہ دیوانِ محاسبہ میں ان لوگوں کو بھی شعائر کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے یہ طریقہ شریعت کے مطابق نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

معناه أن من يخاف بقطعه ضرربين لايقطع معلومه المشروط له بل يقدم ويأخذ بخلاف غيره من المستحقينٰ كالناظر والشاد والمباشر ونحو ذلک فانه يقطع ولايعطى شيئا أى الا اذا عمل زمن العمارة فله قدر أجرته فقط لا المشروط. (۲)

علامہ ابن الہمامؒ کی عبارات کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کا وہ ملازم جسے تنخواہ نہ دینے کی صورت میں مسجد کو ضررِ بین ہو اس کی متعینہ تنخواہ نہیں روکی جائے گی بلکہ اسے مقدم رکھا جائے گا، بخلاف اس کے علاوہ دیگر مستحقین جیسے ناظر، شاد، مباشر وغیرہ انہیں تنخواہ نہیں دی جائے گی، البتہ اگر یہ تعمیر کے زمانہ میں تعمیر کا کوئی کام انجام دیں تو انہیں اس عمل کی اجرت ملے گی، لیکن ان کے مناصب کی جو تنخواہ ہے وہ تنگی کی صورت میں انہیں نہیں دی جائے گی۔

متولی اربابِ شعائر میں سے ہے یا نہیں:

متولی کے بارے میں عبارات میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض عبارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نمبر۲ پر ذکر کردہ ملازمین میں داخل ہے جنہیں تعمیر کے بعد مقدم رکھا جائے گا، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نمبر۴ کے تحت ذکر کردہ ملازمین میں داخل ہے جنہیں سب سے آخر میں تنخواہ دی جائے گی، راجح یہی

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۱۵/۵)

(۲) الشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ه (۳۶۹/۴)

آخری رائے ہے اس لئے ہم نے اسے نمبر ۴ کے تحت ذکر کیا ہے، تفصیل کے لئے احقر کی تالیف تسکین الارواح والضمائر شرح الاشباہ والنظائر کتاب الوقف ملاحظہ فرمائیں۔[1]

شرط نمبر ۱۲ اور ۱۳ کی وضاحت اور بطلان کی وجہ:

اس تفصیل کے بعد ہم شرط نمبر ۱۲ اور شرط نمبر ۱۳ کو سمجھتے ہیں، شرط نمبر ۱۲ یہ تھی کہ واقف یہ شرط لگادے کہ جب مسجد میں ضروری تعمیر کی حاجت ہو اور مسجد کی آمدنی کم ہو تو ایسی صورت میں تعمیر کو مقدم نہ کیا جائے بلکہ تمام مصارف پر برابر خرچ کیا جائے۔

یہ شرط باطل ہے کیونکہ اصل تو مسجد کی عمارت ہے اگر وہ باقی نہ رہے تو وقف ہی باقی نہیں رہے گا، جبکہ مسجد کی دیگر ضروریات کو موخر کیا جاسکتا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اذ ليس من النظر خراب المسجد لأجل الامام والمؤذن. [2]

امام وموذن کی خاطر مسجد کو ویران کردینا دانشمندی نہیں ہے۔

الاشباہ والنظائر میں ہے:

ولو شرط استواء العمارة بالمستحقين لم يعتبر شرطه وانما تقدم عليهم. [3]

اور اگر واقف نے عمارت کی مستحقین کے ساتھ برابری کی شرط لگائی تو اس شرط کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ عمارت کو دیگر مستحقین پر مقدم رکھا جائے گا۔

شرط نمبر ۱۳ یہ تھی کہ واقف یہ شرط لگادے کہ اگر واقف کی آمدنی تنگ ہوجائے تو تب بھی وقف کے وہ ملازم جوار بابِ شعائر ہیں یعنی ان کے نہ ہونے کی وجہ سے وقف کو ضرر بین لاحق ہوگا اور وہ ملازم جوار بابِ شعائر نہیں ہیں دونوں برابر ہوں گے کسی کو کسی پر مقدم نہیں رکھا جائے گا۔

---

(۱) دیکھئے: الاعظمی، خلیل احمد الأعظمی. تسکین الارواح والضمائر شرح الاشباہ والنظائر کتاب الوقف، مخطوطہ لائبریری جامعہ دارالعلوم کراچی (۲۷۹ تا ۲۸۴)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/ ۱۲۱ کتاب الوقف) وکذا فی الدر المنتقی (۲/ ۲۰۷)

(۳) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. الاشباہ والنظائر، کراچی، ادارۃ القرآن، ۱۴۱۸ھ (۲/ ۱۲۱ کتاب الوقف) وکذا فی الدر المنتقی (۲/ ۲۰۷)

یہ شرط بھی باطل ہے کیونکہ جب دونوں طرح کے ملازمین کو برابر رکھا جائے گا تو اربابِ شعائر جیسے امام، موذن، صفائی کا خادم وغیرہ کی ضرورت پوری نہیں ہوگی، جس کی وجہ سے وہ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکیں گے نتیجۃً وقف کا تعطل لازم آئے گا، وقف کو تعطل اور ویران ہونے سے بچانے کے لئے اس شرط پر عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ مصلحتِ وقف کے خلاف ہے۔ منحۃ الخالق میں ہے:

ان عبارة الحاوی تفيد أن ارباب الشعائر يقدمون على غيرهم من المستحقين وان شرط الواقف الاستواء عن الضيق. (۱)

حاوی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ شعائر کو دیگر ملازمین وقف پر مقدم رکھا جائے گا اگر چہ واقف نے سب کو برابر رکھنے کی شرط لگائی ہو۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۴۶/۵)

واقف کی طرف سے عائد کردہ شرائط کی تیسری قسم کا شرعی حکم

واقف کی طرف سے عائد کردہ شرائط کی تیسری قسم ان شرائط کی تھی جو نہ مقتضائے وقف کے خلاف ہیں نہ شریعت کے خلاف ہیں نہ مصلحتِ وقف وموقوف علیہم کے خلاف ہیں اور نہ ہی وقف سے فائدہ حاصل کرنے میں خلل پیدا کرنے کا باعث ہیں۔

ایسی شرائط بالاتفاق سب کے نزدیک معتبر ہیں اورانہیں پورا کرنا شرعاً بھی ضروری ہے، حتی کہ اگر قاضی ان جائز شرائط کے خلاف بلا وجہ فیصلہ کردے تو وہ فیصلہ بھی نافذ نہیں ہوتا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ منحۃ الخالق میں فرماتے ہیں:

فهذه الشروط لابد من مراعاتها وذكر الشارح في كتاب القضاء عند الكلام على قوله: "واذا رفع اليه حكم قاضٍ أمضاه" نقلاً عن الاشباه والنظائر للأسيوطي معزيا الى فتاوىٰ السبكي ان قضاء القاضي ينقض عند الحنفية اذا كان حكما لادليل عليه قال: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم لادليل عليه سواء كان نصه في الوقف نصاً أو ظاهراً اه قال هذا الشارح: وهذا موافق لقول مشايخنا كغيرهم: شرط الواقف كنص الشارع فيجب اتباعه. (۱)

واقف کی ان شرائط کی رعایت رکھنا ضروری ہے اور شارح نے کتاب القضاء میں الاشباہ والنظائر للأسیوطی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فتاویٰ سبکی کی طرف نسبت کرتے

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۶/۴)

ہوئے فرمایا ہے کہ اگر قاضی کا فیصلہ ایسا ہو جو بلا دلیل ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس فیصلہ کو توڑ دیا جائے گا، جو فیصلہ واقف کی شرط کے خلاف ہو درحقیقت نص کے خلاف ہے اور ایسا فیصلہ ہے جو بلا دلیل ہے لہٰذا اس کی مخالفت کی جائے گی، شارح فرماتے ہیں یہ بات ہمارے اور مشائخ شافعیہ کے اس قول کے مطابق ہے کہ نص الواقف کنص الشارع لہٰذا واقف کی ان شرائط کا اتباع کیا جائے گا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وتصرف الغلة على شرط الواقف من الاثرة والتسوية والتفضيل والتقديم والتاخير والجمع والترتيب وادخال من شاء بصفة واخراجه بصفة، لأن الصحابة رضى الله عنهم وقفوا وكتبوا شروطهم الخ. (۱)

وقف کی آمدنی کو واقف کی شرط کے مطابق خرچ کیا جائے گا، خواہ اس نے موقوف علیہم میں سے کسی کو ترجیح دی ہو یا سب کو برابر رکھا ہو کسی کو مقدم رکھا ہو یا کسی کو موخر رکھا ہو، سب کو ایک ساتھ دینے کی شرط لگائی ہو یا ترتیب کی شرط لگائی ہو کسی خاص وصف کے ساتھ متصف شخص کو موقوف علیہم میں داخل کیا ہو یا نکالا ہو، بہر حال ان شرائط کی اتباع کی جائے گی، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وقف کئے اور اس میں شرائط لکھیں (اگر ان شرائط کی اتباع نہ کی جاتی ہوں تو ان کا کیا فائدہ)

اور یہی جائز شرائط وہ شرائط ہیں جن کے بارے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ''شرط الواقف کنص الشارع'' فرمایا ہے۔ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وبهذا علم ان قولهم: شرط الواقف كنص الشارع ليس على عمومه قال العلامة قاسم فى فتاواه: أجمعت الأمة ان من شروط الواقفين ماهو صحيح معتبر يعمل به ومنها ماليس كذالک. (۲)

معلوم ہوا کہ فقہاء کرامؒ کا ارشاد ''شرط الواقف کنص الشارع'' اپنے عموم پر نہیں ہے، علامہ قاسمؒ نے اپنے فتاویٰ میں تحریر فرمایا ہے کہ امت کا اجماع ہے واقفین کی شرائط میں سے بعض شرائط صحیح اور معتبر ہیں ان پر عمل کیا جائے گا، اور بعض شرائط ایسی نہیں ہیں۔

---

(۱) النووى، يحيى بن شرف النووى. تكملة المجموع شرح المهذب (۱۷/۲۳۵)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۴۵)

تیسری قسم کے تحت داخل ہونے والی ممکنہ شرائط

اب ذیل میں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے کلام سے اخذ کر کے وہ شرائط اجمالاً ذکر کی جاتی ہیں جو جائز ہیں اور واجب الاتباع ہیں تا کہ ان شرائط کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے اور آج کے اوقاف میں پائی جانے والی شرائط کا ان ذکر کردہ شرائط کی روشنی میں جائزہ لیا جا سکے۔

وقف کے استحقاق کے لئے بیوہ کے لئے نکاح نہ کرنے کی شرط:

ا۔ واقف نے وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ میرے انتقال کے بعد میری بیوی جب تک دوسرا نکاح نہ کرے اس وقت تک اس کو اس وقف کی آمدنی دی جائے، یا اسی طرح اپنی بیٹیوں پر وقف کیا اور یہ شرط لگادی کہ جب تک یہ نکاح نہ کریں اس وقت تک ان کو اس وقف کی آمدنی دی جائے، یا اپنی امہات الاولاد پر وقف کیا اور اس میں وقف کی آمدنی کے استحقاق کے لئے نکاح نہ کرنے کی شرط لگائی تو ان تمام صورتوں میں یہ شرط جائز ہے اس کا اتباع ضروری ہے، لہٰذا ان میں سے جو بھی نکاح کرلے گا اس کا استحقاق ختم ہوجائے گا۔ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> **وفيها (فتاوىٰ ابن نجيم) سئل عمن شرط السكنىٰ لزوجته فلانة بعد وفاته مادامت عزباً فمات وتزوجت فطلقت هل ينقطع حقها بالتزويج؟ أجاب: نعم.** [1]
>
> فتاویٰ ابن نجیم میں ہے کہ سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے مکان وقف کیا اور اس میں یہ شرط لگادی کہ میری وفات کے بعد اس میں میری فلاں بیوی کو رہنے کا حق ہے، جب تک وہ دوسرا نکاح نہ کرلے، اس شخص کا انتقال ہوگیا اس کی بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا اور پھر اسے طلاق ہوگئی تو کیا نکاح کرنے سے اس کا حقِ رہائش ختم ہوگیا؟ علامہ نے جواب دیا: جی ہاں۔

---

(۱) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۵۲)

علامہ اندریتی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ذکر فی فتاویٰ أبی اللیث: اذا وقف وقفا علی امہات أولادہ الا من تتزوج فانہ لاشیء لھا فتزوجت واحدۃ منھن فلاشیء لھا. [1]

فتاویٰ ابی اللیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی امہات الاولاد پر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ ان میں سے جو نکاح کر لے اسے اس وقف سے کچھ نہیں ملے گا، ان میں سے ایک نے نکاح کر لیا تو اسے وقف سے کچھ نہیں ملے گا۔

علامہ ابن القیمؒ کا موقف:

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کی شرائط کو باطل قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس طرح کی شرائط تعطیلِ نکاح اور ترکِ نکاح کا باعث ہیں حالانکہ ضرورت کے وقت نکاح فرض ہے اور عام حالات میں سنت تو ہے ہی، جو شرط فرض یا سنت کے ترک کا باعث ہو وہ باطل ہونی چاہیے۔ فرماتے ہیں:

اذا شرط الواقف العزوبیۃ وترک التأھل لم یجب الوفاء بھذا الشرط بل ولا التزامہ، بل من التزمہ رغبۃ عن السنۃ فلیس من اللہ ورسولہ فی شییء، فان النکاح عند الحاجۃ الیہ اما فرض یعصی تارکہ واما سنۃ، الاشتغال بھا أفضل من صیام النھار وقیام اللیل وسائر الأوراد والتطوعات واما سنۃ یثاب فاعلھا کما یثاب فاعل السنن والمندوبات.

وعلی کل تقدیر فلا یجوز اشتراط تعطیلہ أو ترکہ، اذا یصیر مضمون ھذا الشرط أنہ لایستحق تناول الوقف الا من عطل مافرض اللہ علیہ وخالف سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن فعل مافرضہ اللہ علیہ وقام بالسنۃ لم یحل لہ أن یتناول من ھذا الوقف شیئاً. [2]

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیہ، کراچی، ادارۃ القرآن، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۸۱۳) وکذا فی البحر (۵/۲۴۶) فتح القدیر (۵/۴۲۸)

(۲) ابن قیم، ابو عبد اللہ محمد بن ابی بکر الدمشقی المعروف بابن قیم الجوزیۃ. اعلام الموقعین عن رب العالمین، بیروت دار احیاء التراث العربی (۴/۱۵۳)

اگر واقف نے عزوبیۃ یعنی نکاح نہ کرنے کی شرط لگائی تو اس شرط کو پورا کرنا واجب نہیں اور نہ ہی اس کا التزام درست ہے، جو سنت سے اعراض کرتے ہوئے اس شرط کو لازم قرار دے اس کا اللہ اور اس کے رسول سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ حاجت کے وقت نکاح یا تو فرض ہے جس کا تارک گنہگار ہوتا ہے یا سنت ہے جس میں مشغول ہونا دن بھر کے روزہ، رات بھر کے قیام اور تمام نفلی اوراد سے افضل ہے یا کم از کم ایسی سنت ہے جس کے کرنے والے کو ثواب ملتا ہے، بہر صورت نکاح کو معطل کرنے اور اس کے ترک کی شرط جائز نہیں کیونکہ اس شرط کا حاصل یہ ہے کہ اس وقف کا مستحق صرف وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے فرض کو ترک کردے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت کرے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرض کو پورا کرے اور سنت پر عمل کرے اس کے لئے اس وقف سے کچھ لینا جائز نہیں۔

اس موقف کی تردید:

اس ناچیز کو علامہ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیونکہ واقف کا مقصود اس شرط سے سنتِ نکاح کی تعطیل اور اس کا ترک نہیں بلکہ اس نے اپنے متعلقین کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ شرط لگائی ہے کہ خصوصاً خواتین اور بالخصوص بیوہ کا جب تک نکاح نہ ہوا نہیں رہائش اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے البتہ نکاح کے بعد شوہر چونکہ ذمہ داری اٹھاتا ہے اس لئے اب ضرورت باقی نہیں رہتی، اس ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے واقف نے یہ شرط لگائی ہے کہ جب تک ان کا نکاح نہ ہو اس وقت تک وہ اس موقوفہ مکان میں رہائش کا استحقاق رکھیں گی، نکاح کے بعد چونکہ اب ذمہ داری ان کے شوہر کی ہوگئی اس لئے اب انہیں اس موقوفہ مکان میں رہائش کا استحقاق نہیں۔

اگر اس نقطہ نظر سے اور اس ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ شرط لگائی جائے تو کیا قباحت ہے؟ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گھر وقف کئے اور یہ شرط لگائی تھی کہ ان کی بیٹیوں میں سے جو مطلقہ ہو جائے وہ اس گھر میں رہے گی، پھر اگر دوسرا نکاح کرلے تو اسے اس گھر میں رہائش کا حق نہیں ہوگا۔

سنن بیہقی میں ہشام بن عروہ کی روایت ہے:

أن الزبير جعل دوره صدقة، قال وللمردودة من بناته أن تسكن غير مضرة ولا مضربها، فان استغنت بزوج فلاشيىء لها. (۱)

---

(۱) البيهقي، احمد بن حسين بن علي البيهقي ۳۸۴ھ ۴۵۸ھ. السنن الكبرىٰ، ملتان، نشر السنة (۱۶۶/۶) وكذا في سنن الدارمي (۸۸۵/۲ رقم الحديث: ۳۱۸۲)

ہشام بن عروہ فرماتے ہیں کہ میرے دادا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر وقف کردیئے تھے، اور یہ فرمادیا تھا کہ ان کی بیٹیوں میں سے جو مطلقہ ہوجائے اسے ان میں رہائش کا حق ہے، وہ نہ کسی کو تکلیف پہنچائے اور نہ ہی کوئی اسے تکلیف پہنچائے، اگر وہ دوسرا نکاح کرکے مستغنی ہوجائے تو اب اس کا ان مکانوں میں کوئی حق نہیں۔

اس روایت میں لفظ ''**استغنت بزوج** '' اس شرط کے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ شرط ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لگائی گئی ہے اس کا مقصد نکاح سے روکنا نہیں ہے، اس لئے فقہاء احناف رحمہم اللہ نے اس شرط کو جائز اور واجب الاتباع قرار دیا ہے۔

وقف علی الذمی میں اسلام لانے کی صورت میں وقف سے محرومی کی شرط لگانا:

۲۔ ذمیوں کے لئے کوئی جائیداد وقف کی اور یہ شرط لگادی کہ ان میں سے جو مسلمان ہوجائے گا وہ وقف کی آمدنی کا مستحق نہیں رہے گا۔ یہ شرط جمہور فقہاء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک جائز ہے، اور اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> **وجاز علی ذمی لأنه قربة حتی لو قال: علی أن من أسلم من ولده أو انتقل الی غیر النصرانیة فلا شیء له، لزم شرطه علی المذهب.** [۱]
>
> ذمی پر وقف کرنا جائز ہے کیونکہ ذمی پر وقف کرنا بھی قربت ہے، یہاں تک کہ اگر کسی نصرانی نے وقف کیا اور یہ شرط لگادی کہ میری اولاد میں سے جو اسلام لے آیا یا نصرانیت سے کسی اور مذہب کی طرف منتقل ہوگیا تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔ تو یہ شرط لازم ہوگی مذہب حنفی کے مطابق۔

امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> **فما تقول ان وقف نصرانی وقفا علی ولده وولد ولده ونسلهم ابداً ومن بعدهم علی المساکین وشرط أن کل من أسلم من ولده وولد**

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۲/۴) وکذا فی البحر الرائق (۱۸۹/۵)

ولده ونسلهم ابداً ماتناسلوا فهم خارجون من صدقته؟ قال: هذا جائز وهو على ماشرط من ذلک. (۱)

آپ کی کیا رائے ہے اس مسئلہ میں کہ ایک نصرانی نے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد اور ان کی نسل پر وقف کیا اور ان کے بعد مساکین پر وقف کیا اور یہ شرط لگادی کہ ان میں سے جو اسلام لے آئے گا وہ اس وقف سے خارج ہوجائے گا تو کیا یہ شرط درست ہے؟ فرمایا یہ شرط جائز ہے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

علامہ ابن القیمؒ کا موقف:

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ اس شرط کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور جائز قرار دینے والوں پر شدید ترین نکیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس شرط کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ:

حتى ان من امن بالله ورسوله واتبع دين الاسلام لم يحل له أن يتناول بعد ذلک من الوقف، فيكون حل تناوله مشروطاً بتكذيب الله ورسوله والكفر بدين الاسلام. (۲)

جوشخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے گا اور دین اسلام کی اتباع کرے گا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ وہ اس وقف سے فائدہ اٹھا سکے، اس وقف سے فائدہ اٹھانے کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب اور دین اسلام کا انکار شرط ہوگا۔

علامہ طرسوسیؒ کا موقف:

علامہ طرسوسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس شرط پر یہی اعتراض کیا ہے کہ اس شرط کو لازم قرار دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ:

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانى المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۲۹۱)

(۲) ابن قيم، ابو عبد الله محمد بن ابى بكر الدمشقى المعروف بابن قيم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين، بيروت دار احياء التراث العربى (۱۵۶/۴)

جعل الكفر سبب الاستحقاق والاسلام سبب الحرمان. [۱]

کفر کو سببِ استحقاق قرار دیا جا رہا ہے اور اسلام کو سببِ حرمان قرار دیا جا رہا ہے۔

جمہور فقہاء کا موقف اور اس شرط کے صحیح ہونے کی علت:

جمہور فقہاء کرامؒ نے علامہ ابن القیم اور علامہ طرسوسی رحمہما اللہ کے اس اعتراض کو زیادہ وزن نہیں دیا اور اس شرط کو جائز قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہاں دو باتیں ہیں:

ذمی پر وقف بھی قربت ہے:

ایک تو یہ کہ ذمی پر وقف کرنا بھی قربت ہے، معصیت نہیں، چنانچہ اسے صدقات بھی دیئے جا سکتے ہیں ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے یہودی بھائی پر وقف فرمایا تھا۔

علامہ ابن قدامہؒ تحریر فرماتے ہیں:

ويصح الوقف على أهل الذمة لأنهم يملكون ملكاً محترماً ويجوز أن يتصدق عليهم فجاز الوقف عليهم كالمسلمين ويجوز أن يقف المسلم عليه لما روى أن صفية بنت حيي زوج النبي صلى الله عليه وسلم وقفت على اخٍ لها يهودى. [۲]

اہلِ ذمہ پر وقف کرنا درست ہے کیونکہ وہ ملکِ محترم کے ساتھ مالک بن سکتے ہیں اور ان پر صدقہ کرنا بھی جائز ہے لہٰذا ان پر مسلمانوں کی طرح وقف کرنا درست ہے اور مسلمان کے لئے بھی جائز ہے کہ وہ ذمی پر وقف کرے، کیونکہ مروی ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا نے اپنے یہودی بھائی پر وقف فرمایا تھا۔

مصرف کی تعیین میں واقف کو اختیار ہے:

دوسری بات یہ ہے کہ واقف اپنے مال کا مالک ہے اسے یہ اختیار ہے کہ وہ وقف کے مصارف میں جسے چاہے متعین کر دے اور جس پر چاہے وقف کرے اگر وہ مصرف مصرفِ معصیت نہیں تو اس سے یہ

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۴۱۷/۵)

(۲) ابن قدامه، موفق الدين ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسى ۵۴۱ھ - ۶۲۰ھ. المغنى، الرياض، دار عالم الكتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م (۲۳۶/۸)

نہیں پوچھا جاسکتا کہ تم نے فلاں پر وقف کیوں کیا؟ اور فلاں پر کیوں نہیں کیا؟

لہٰذا جب واقف کو اختیار ہے کہ وہ جہتِ قربت میں سے جس پر چاہے وقف کردے تو وہ محض ذمیوں پر بھی وقف کرسکتا ہے۔

اگر وہ یہ شرط نہ بھی لگائے کہ ''ان میں سے جو مسلمان ہوجائے گا وہ وقف سے محروم ہوجائے گا تب بھی تخصیصِ مصرف کا تقاضا یہی ہوگا کہ مسلمان کو اس وقف کی آمدنی سے کچھ نہ ملے، معلوم ہوا کہ موقوف علیہم میں سے جو مسلمان ہوجائے اس کا وقف سے محروم ہونا اس شرط کی وجہ سے نہیں بلکہ واقف کے بیان کردہ مصرف کے تحت داخل نہ ہونے کی وجہ سے ہے، اور اسلام لانا نعوذ باللہ اس کی محرومی کا باعث نہیں بلکہ مالک کا اسے نہ دینا محرومی کا باعث ہے، مالک کو یہ اختیار ہے کہ وہ جہتِ قربت میں سے جس جہت پر چاہے صرف کرے، جس پر چاہے صرف نہ کرے۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> نص على ذلک الخصاف ولا نعلم أحداً من أهل المذهب تعقبه غير متأخر يسمى الطرسوسى شنع بأنه جعل الكفر سبب الاستحقاق والاسلام سبب للحرمان، وهذا للبعد من الفقه فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع والواقف مالک له أن يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصية وله أن يخص صنفا من الفقراء دون صنف وان كان الوضع فى كلهم قربة ولاشک أن التصدق على أهل الذمة قربة حتى جاز أن تدفع اليهم صدقة الفطر والكفارات عندنا فكيف لايعتبر شرطه فى صنف دون صنف من الفقراء. أر أيت لو وقف على فقراء أهل الذمة ولم يذكر غيرهم أليس يحرم منه فقراء المسلمين؟ ولو دفع المتولى الى المسلمين كان ضامنا فهذه مثله، والاسلام ليس سببا للحرمان بل الحرمان لعدم تحقق سبب تملكه هذا المال والسبب هو اعطاء الواقف المالک.[1]

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۱۷)

مذکورہ مسئلہ کی امام خصاف رحمۃ اللہ نے صراحت کی ہے اور ہمارے علم کے مطابق اہلِ مذہب میں سے کسی نے اس کا تعقب نہیں کیا سوائے متاخرین میں سے ایک کے جسے طرسوسی کہا جاتا ہے، اس نے اس کو شنیع قرار دیا کہ اس شرط کا مطلب تو یہ ہے کہ کفر کو سبب استحقاق قرار دیا جارہا ہے اور اسلام کو سببِ حرمان قرار دیا جارہا ہے، طرسوسیؒ کی یہ بات فقہ سے دوری کی علامت ہے کیونکہ واقف کی شرائط جب تک شریعت کے خلاف نہ ہوں معتبر ہوتی ہیں، اور واقف مالک ہے اسے اختیار ہے کہ اپنا مال جہاں چاہے صرف کرے بشرطیکہ وہ موضعِ معصیت نہ ہو اور اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ وہ فقراء کی ایک صنف کی تخصیص کردے کہ ایک صنف کو دے دوسری کو نہ دے باوجود اس کے کہ سب کو دینا بھی قربۃ ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اہلِ ذمہ پر صدقہ کرنا بھی قربۃ ہے یہاں تک کہ ہمارے نزدیک انہیں کفارات اور صدقہ فطر دینا بھی جائز ہے تو پھر اس کی اس شرط کا اعتبار کیوں نہیں کیا جائے گا کہ وہ فقراء کی ایک صنف کو دینا چاہ رہا ہے دوسری کو نہیں؟ آپ بتایئے کہ اگر واقف اہل ذمہ پر وقف کردے اور کوئی شرط نہ لگائے تو کیا فقراء مسلمین اس وقف سے محروم نہیں ہوں گے؟ اور اگر متولی فقراء مسلمین کو دے تو وہ ضامن نہیں ہوگا؟ بالکل ہوگا۔ ہمارا مبحوث عنہا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے اسلام وقف سے محروم ہونے کا سبب نہیں بن رہا بلکہ محرومی اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ اس وقف کی آمدنی کے مالک بننے کا سبب نہیں پایا جارہا اور وقف کی آمدنی کا مالک بننے کا سبب واقف کا دینا ہے وہ اسے دے نہیں رہا۔

اہل خانقاہ پر وقف میں تحصیل علم میں مشغول نہ ہونے کی شرط لگانا:

۳۔ایک شخص نے خانقاہ وقف کی اور یہاں رہنے والوں پر یہ شرط لگادی کہ وہ سماعِ حدیث اور فقہ کی تعلیم وتعلم میں مشغول نہیں ہوں گے۔

یہ شرط بھی جائز ہے اور واجب الاتباع ہے اگر اہلِ خانقاہ سماعِ حدیث اور فقہ کی تعلیم وتعلم کا مشغلہ اختیار کریں گے تو وہ اس خانقاہ میں رہنے کے حقدار نہیں ہوں گے، کیونکہ واقف کا مقصود اس خانقاہ بنانے سے یہ ہے کہ یہاں رہنے والے اصلاحِ باطن کے اعمال میں مشغول رہیں اور اس کی تربیت حاصل کریں، ظاہر ہے یہ چیز مستقل توجہ اور وقت کا تقاضا کرتی ہے اگر حدیث وفقہ میں بھی مشغولیت رہے گی تو اس خانقاہ کا اصل مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوگا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مدرسہ بنائے اور اس میں یہ شرط لگا دے کہ یہاں وہی لوگ رہیں گے جو دین کا علم حاصل کرنے میں مشغول رہیں گے جو یہاں رہ کر محض اصلاحِ باطن کا کام کریں گے انہیں یہاں رہنے کی اجازت نہیں، تو اس شرط پر عمل کیا جائے گا اور جو تحصیلِ علم میں مشغول نہیں ہوگا اسے یہاں رہنے کا حق نہیں ہوگا۔

اسی طرح کوئی شخص محدثین کے لئے وقف کردے تو جو لوگ عرف میں حدیث کے کام میں زیادہ مشغولیت کی وجہ سے محدثین کہلاتے ہوں وہی وقف کے حقدار ہوں گے۔[1] اہلِ قرآن و اہلِ فقہ حقدار نہیں ہوں گے، اسی طرح یہ مسئلہ بھی ہے کہ واقف نے وقف کا مصرف طے کردیا ہے اور وہ مصرف بھی جہتِ قربت ہے لہٰذا اس شرط کو پورا کیا جائے گا۔

علامہ ابن القیمؒ کا موقف:

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اس شرط کو بھی ناجائز قرار دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

لو شرط واقف الخانقاه وغيرها على أهلها أن لايشتغلوا بكتابة العلم وسماع الحديث والاشتغال بالفقه، فان هذا شرط باطل مضاد لدين الاسلام لايحل تنفيذه ولا التزامه ...... فان مضمون هذا الشرط أن الوقف المعين انما يستحقه من ترك مايجب عليه من العلم النافع وجهل أمر الله و رسوله ودينه الخ. [2]

اگر واقفِ خانقاہ نے اہلِ خانقاہ پر یہ شرط لگائی کہ وہ علم کے لکھنے میں، حدیث کے سماع میں اور فقہ کی تعلیم میں مشغول نہیں ہوں گے تو یہ شرط باطل ہے دین اسلام کے بالکل مخالف ہے اسے نافذ کرنا درست نہیں، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس وقف کا مستحق وہی ہوگا جو اس علمِ نافع کو ترک کرے جس کا حاصل کرنا اس پر واجب ہے اور وہ اللہ، رسول اور دین اسلام سے بالکل جاہل رہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۵۶)

(۲) ابن قیم، ابو عبد الله محمد بن ابی بکر الدمشقی المعروف بابن قیم الجوزیة. اعلام الموقعین عن رب العالمین، بیروت دار احیاء التراث العربی (۴/۱۵۵)

اس موقف کی تردید اور شرط کے جواز کی علت:

اگر علامہ کے نزدیک یہ شرط باطل ہے تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ واقف کو جہاتِ خیر میں کسی ایک جہت کو مخصوص کرنے کا اختیار نہیں وہ وقف کرے تو تمام جہاتِ خیر پر کرے ورنہ نہ کرے، حالانکہ وہ مالک ہے اور اپنی مملوکہ چیز میں بااختیار بھی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شرط کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اہلِ خانقاہ فرضِ عین علم بھی حاصل نہ کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کو اپنی مشغولیت نہ بنائیں، واقف کے الفاظ میں غور کریں وہ کتابتِ علم، سماعِ حدیث اور اشتغال بالفقہ سے منع کر رہا ہے تو کیا کتابۃِ علم، سماعِ حدیث اور اشتغال بالفقہ فرضِ عین ہیں؟ یہ زیادہ سے زیادہ فرضِ کفایہ ہیں واقف فروضِ کفایہ میں سے ایک کو خاص کر رہا ہے اور جو اس فرض میں مشغول ہوا سے وقف کا مستحق قرار دے رہا ہے اس میں کیا حرج ہے؟ اسے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جو ترکِ واجب کرے اسے وہ مستحق قرار دے رہا ہے؟

اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ محدثین پر وقف کرنے والے کو تارکِ قرآن کہا جائے گا اور فقہاء کرام پر وقف کرنے والے کو تارکِ قرآن وحدیث کہا جائے گا، اور یہ تمام اوقاف درست نہیں ہوں گے۔ حالانکہ امت کا توارث چلا آرہا ہے کہ دین کے مختلف شعبوں میں سے خاص شعبہ کی ترویج اور نشر واشاعت کے لئے وقف کئے جاتے رہے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ شرط درست ہے اور وقت وحالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحِ باطن کی طرف بھرپور توجہ دینے کے لئے یہ شرط لگائی گئی ہے جس کی حقیقت مصرف کی تعیین سے زیادہ کچھ نہیں اور واقف کو وقف کا مصرف متعین کرنے کا اختیار ہے۔

واقف کا اپنے لئے تولیت کی شرط لگانا:

۴۔ واقف نے وقف میں یہ شرط لگائی کہ اس کی ولایت مجھے حاصل ہوگی تو یہ شرط درست ہے اور اس شرط کے مطابق وقف کی تولیت واقف ہی کو حاصل ہوگی۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وأما الثاني وهو فصل اشتراط الولاية لنفسه فجائز بالاجماع لأن شرط الواقف معتبر فيراعى كالنصوص. (۱)

---

۱) الزيلعي، فخر الدين عثمان بن على الزيلعي ۷۴۳ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دار الكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۰م (۲۶۹/۴)

واقف کا اپنے لئے ولایت کی شرط لگانا بالاجماع جائز ہے، کیونکہ واقف کی شرط کا اعتبار کیا جاتا ہے لہٰذا اس شرط کی بھی رعایت کی جائے گی نصوصِ شارع کی طرح۔

اس شرط میں حضراتِ صاحبینؒ کا اختلاف:

علامہ زیلعیؒ نے تو اس شرط کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے لیکن دیگر فقہاءِ حنفیہؒ نے صراحت کی ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہی قول ہے لیکن امام محمدؒ سے دو قول منقول ہیں ایک قول تو یہی ہے جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شرط درست نہیں، علامہ نے پہلے قول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اجماع نقل کیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

مفاده أن فيه خلاف محمد مع أنه قدم أن اشتراط الولاية لنفسه جائز بالاجماع لكن لما كان في دعوىٰ الاجماع نزاع كما قدمناه مع التوفيق بأن عن محمد روايتين احداهما توافق قول أبي يوسف والأخرىٰ تخالفه فدعوى الاجماع مبنية على الرواية الأولىٰ، و دعوىٰ الخلاف على الثانية. (۱)

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں امام محمدؒ کا اختلاف ہے حالانکہ چند صفحات پہلے گذر چکا ہے کہ واقف کا اپنے لئے ولایت کی شرط لگانا بالاجماع جائز ہے لیکن اجماع کے دعویٰ میں نزاع ہے جیسا کہ پہلے گذرا ہے اور وہاں ہم نے یہ تطبیق بھی ذکر کی ہے کہ امام محمدؒ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں منقول ہیں ایک امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق جبکہ دوسری اس کے خلاف، اجماع کا دعویٰ پہلی روایت کی بنیاد پر ہے اور اختلاف کا دعویٰ دوسری روایت کی بنیاد پر ہے۔

امام محمدؒ کی جس روایت کے مطابق واقف کا اپنے لئے ولایۃ کی شرط لگانا جائز نہیں اس کے مطابق ان کے اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہوگا۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۴/۴)

اختلاف کا منشاء:

اور یہ اختلاف درحقیقت اس اصولی اختلاف پر مبنی ہے کہ وقف کی حقیقت کیا ہے؟ وقف بحکمِ صدقہ ہے یا بحکمِ اعتاق؟

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف بحکم اعتاق ہے:

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وقف اعتاق کے حکم میں ہے کیونکہ جس طرح اعتاق میں اسقاطِ ملک پایا جاتا ہے کہ معتِق معتَق سے اپنی ملکیت ساقط کرتا ہے اسی طرح وقف میں بھی واقف شیء موقوف سے اپنی ملکیت ساقط کرتا ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک وقف بحکمِ صدقہ ہے:

جبکہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک وقف صدقہ کے حکم میں ہے کہ جس طرح صدقہ میں انسان اپنی مملوکہ چیز کا اللہ تعالیٰ کو مالک بناتا ہے اسی طرح وقف میں بھی واقف شیء موقوف کو اپنی ملکیت سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں دیتا ہے، لہٰذا وقف صدقہ کے مشابہ ہوا۔

علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا بيان شرائطه الخاصة على قول محمد لأنه كالصدقة وجعله ابويوسف كالاعتاق. [1]

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وقف صدقہ کی طرح ہے جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اعتاق کی طرح قرار دیا ہے۔

اس اختلاف کا ثمرہ:

یہی وجہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ وقف میں تسلیم اور قبضہ کو شرط قرار نہیں دیتے ان کے نزدیک محض تکلم سے وقف لازم ہوجاتا ہے جس طرح اعتاق کے لئے تسلیم اور قبضہ شرط نہیں۔

---

(۱) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۴۸/۴)

اور امام محمدؒ کے نزدیک وقف محض تکلم سے مکمل نہیں ہوتا اس میں تسلیم اور قبضہ شرط ہے کیونکہ یہ صدقہ کے حکم میں ہے اور صدقہ میں تسلیم الی العبد شرط ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

فانه يلزم بمجرد القول عند أبي يوسف بمنزلة الاعتاق بجامع اسقاط الملک، وعند محمدؒ لابد من التسليم الى المتولی والافراز والتابيد أما الأول (التسليم الى المتولی) فلان حق الله تعالیٰ انما يثبت فيه فی ضمن التسليم الى العبد لأن التمليک الى الله تعالیٰ وهو مالک الأشياء لايتحقق مقصوداً وقد يكون تبعاً لغيره فيأخذ حكمه فينزل منزلة الزكاة والصدقة. (١)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محض تکلم سے وقف لازم ہوجاتا ہے کیونکہ یہ بحکمِ اعتاق ہے دونوں میں اسقاطِ ملک پایا جاتا ہے اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک متولی کے حوالہ کرنا وقف کے لزوم کے لئے شرط ہے کیونکہ اس شيء موقوف میں اللہ تعالیٰ کا حق (ملکیت) ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے بندہ کے حوالہ کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی تمام اشیاء کے مالک ہیں انہیں براہ راست مالک بنانا ممکن نہیں ہے، ہاں بندہ کے حوالہ کردیا جائے تو ضمناً اللہ تعالیٰ کا حق (ملکیت) ثابت ہوجائے گا، لہٰذا وقف زکوٰۃ اور صدقات کے حکم میں ہوا۔

اور جب امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف میں تسلیم الی المتولی شرط نہیں ہے تو واقف بھی اس وقف کا متولی ہوسکتا ہے اور وقف میں اپنے لئے تولیت کی شرط لگا سکتا ہے۔

اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ وقف صدقہ کی مانند ہے اور اس میں یہ ضروری ہے کہ واقف شيء موقوف متولی کے حوالہ کرے اس لئے ان کے نزدیک واقف وقف میں اپنے لئے تولیت کی شرط نہیں لگا سکتا ورنہ تسلیم الشيء الی نفسہ لازم آئے گا۔ البحر الرائق میں ہے:

والحاصل أن ابايوسف لما لم يشترط التسليم الى المتولی جاز عنده

---

(١) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (١٩٧/٥)

ابتداء شرط التولية الى نفسه ...... ومحمد لما شرطه انعكست الأحكام عنده (قال الرملي: أى فلايجوز شرط التولية لنفسه) (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب تسلیم الی المتولی شرط نہیں ہے تو ان کے نزدیک واقف کے لئے ابتداءً اپنے لئے تولیت کی شرط لگانا بھی جائز ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک جب تسلیم الی المتولی شرط ہے تو احکام اس کے برعکس ہو جائیں گے، امام رملیؒ فرماتے ہیں لہٰذا واقف کا اپنے لئے تولیت کی شرط لگانا درست نہیں ہوگا۔

قولِ راجح:

ان دونوں اقوال میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو راجح اور مفتیٰ بہ قرار دیا گیا ہے۔ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

وجاز جعل غلة الوقف أو الولاية لنفسه عند الثانى وعليه الفتوىٰ. (۲)

وقف کی آمدنی اور وقف کی تولیت واقف اپنے لئے رکھ سکتا ہے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور اسی پر فتویٰ ہے۔

وجہِ ترجیح:

قیاس کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ واقف کی یہ شرط درست ہو کیونکہ تولیت کے نظام کا مقصد ہی یہ ہے کہ وقف کی دیکھ بھال ہو سکے اور اس کی آمدنی کو صحیح مصرف میں خرچ کیا جا سکے، ظاہر ہے واقف سے بڑھ کر کون ہوگا جس سے وقف کی حفاظت اور دیکھ بھال کی توقع کی جا سکے اس لئے اگر واقف اپنے لئے تولیت کی شرط لگاتا ہے تو یہ مصلحتِ وقف کے عین مطابق ہے۔ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اذا وقف وقفا وجعل النظر فيه لنفسه مدة حياته ثم من بعده لغيره صح ذلک عند الجمهور وهو اتفاق من الصحابة فان عمر رضى الله تعالىٰ

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۲۲۶)

(۲) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۳۸۴)

عنه كان يلي صدقته وكذلك الخلفاء الراشدون وغيرهم من الصحابة، والنبي عليه السلام لما اشار على عمر بوقف أرضه لم يقل له لايصح ذلك حتى تخرجها عن يدك ولا تلي نظرها، وأي غرض للشارع في ذلك؟ وأي مصلحة للواقف أو للموقوف عليه؟ بل المصلحة خلاف ذلك، لأنه أخبر بماله وأقوم بعمارته ومصالحه وحفظه من الغريب الذي ليست خبرته وشفقته كخبرة صاحبه وشفقته ...... فان قيل اخراجه لله يقتضي رفع يده عنه بالكلية كالعتق؟ قيل بالعتق خرج العبد عن أن يكون مالا وصار محرراً محضاً فلا تثبت عليه يد أحد واما الوقف فانه لابد من ثبوت اليد عليه لحفظه والقيام بمصالحه وأحق مايثبت عليه يد أشفق الناس عليه وأقومهم بمصالحه وثبوت يده ونظره لاينافي وقفه لله الخ.[1]

اگر کوئی شخص وقف کرے اور اپنی زندگی میں اپنے لئے اور مرنے کے بعد کسی اور کے لئے حقِ تولیت رکھ لے تو یہ جمہور کے نزدیک صحیح ہے اور اس پر صحابہ کرام کا اتفاق ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے وقف کی نگرانی خود کیا کرتے تھے اسی طرح حضراتِ خلفاءِ راشدین و دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وقف کرنے کے بارے میں مشورہ دیا تو یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ وقف اس وقت تک درست نہیں ہوگا جب تک تم اسے اپنے ہاتھ سے نکال نہ دو اور اس کی نگرانی نہ کرو، اور واقف کے خود نگرانی اور تولیت نہ کرنے میں شارع کی کیا غرض ہوسکتی ہے؟ اس میں واقف اور موقوف علیہ کی کیا مصلحت ہے؟ بلکہ مصلحت تو اس کے خلاف میں ہے کہ واقف خود ہی اپنے وقف کی نگرانی کرے کیونکہ وہ اپنے مال کے بارے میں زیادہ باخبر ہے اور وقف کی تعمیر اور اس کی مصالح کو زیادہ بہتر انداز میں انجام دینے والا ہے بنسبت اس اجنبی متولی کے جس کا تجربہ اور شفقت واقف کے برابر نہیں ہوسکتے۔

---

(١) ابن قيم، ابو عبد الله محمد بن ابى بكر الدمشقى المعروف بابن قيم الجوزية. اعلام الموقعين عن رب العالمين، بيروت دار احياء التراث العربى (٣/٣٠٩)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ وقف کو اللہ کے لئے نکال دینے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ واقف اس سے اپنا ہاتھ بالکلیہ اٹھالے جیسا کہ عتق میں ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عتق میں تو غلام آزاد ہونے کے بعد مال ہی نہیں رہتا لہٰذا اس پر کسی کے تصرف کا تو سوال ہی نہیں جبکہ شیء موقوف وقف کرنے کے باوجود اس کی محتاج ہے کہ کوئی ہاتھ اس کی حفاظت کرے اور اس کے مصالح کو انجام دے، اور تصرف ونگرانی کا سب سے زیادہ حقدار وہ شخص ہے جو اس وقف کے بارے میں شفقت سب سے زیادہ رکھتا ہو اور اس کے مصالح کو بھرپور طریقے سے انجام دے سکے ایسا شخص واقف ہی ہے اسے نگرانی اور تولیت کا حاصل ہونا اس کے وقف للہ ہونے کے منافی نہیں۔

واقف کا وقف کی آمدنی خود استعمال کرنے کی شرط لگانا:

۵۔ واقف نے یہ شرط لگائی کہ اپنی زندگی میں اس وقف کی آمدنی میں ہی لوں گا میرے مرنے کے بعد یہ فقراء کو ملے گی تو یہ شرط بھی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک درست ہے اور واجب الاتباع ہے البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں اختلاف ہے ان کے نزدیک واقف کی یہ شرط شرعاً درست نہیں اس لئے اسے پورا نہیں کیا جائے گا۔

علامہ اندریتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اذا وقف أرضه أو شيئاً آخر وشرط الكل لنفسه أو شرط البعض لنفسه مادام حيا و بعده للفقراء فالوقف باطل عند محمد وهلال الرأى وقال أبويوسف: الوقف صحيح ومشايخ بلخ أخذوا بقول أبى يوسف وعليه الفتوىٰ ترغيباً للناس فى الوقف. (۱)

اگر اپنی زمین یا اور کوئی چیز وقف کی اور یہ شرط لگادی کہ اس کی پوری یا بعض آمدنی اسے ہی ملے گی جب تک وہ زندہ ہے اور اس کے بعد فقراء کو ملے گی تو وقف باطل ہے امام محمدؒ اور امام ہلال الرأی کے نزدیک، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف صحیح ہے، مشائخِ بلخ نے امام ابو یوسفؒ کا قول اختیار کیا ہے اور اس پر فتویٰ ہے لوگوں کو وقف کی ترغیب دینے کے لئے۔

---

(۱) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (۵/۲۱)

یہ اختلاف بھی بعض حضرات کے نزدیک شرط نمبر ۴ کے تحت ذکر کردہ اصولی اختلاف پر مبنی ہے کہ وقف کے بحکمِ صدقہ ہونے کی وجہ سے امام محمدؒ کے نزدیک اس میں تسلیم شرط ہے، اور وقف کی آمدنی اپنے لئے رکھنا تسلیم کے منافی ہے کیونکہ تسلیم الی المتولی کا مقصد یہ ہے کہ واقف کا وقف سے تعلق نہ رہے، اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانے کی صورت میں واقف کا وقف سے تعلق ختم نہیں ہوا لہٰذا تسلیم الی المتولی نہیں پایا گیا اور جب تسلیم الی المتولی نہیں پایا گیا تو وقف بھی درست نہیں ہوا۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے نزدیک وقف کے بحکمِ اعتاق ہونے کی وجہ سے اس میں تسلیم الی المتولی شرط نہیں لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ واقف کا وقف سے کوئی تعلق نہ ہو اس لئے وہ اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگا سکتا ہے۔ صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

قيل ان الاختلاف بينهما بناء على الاختلاف فى اشتراط القبض والافراز.[1]

بعض حضرات نے کہا کہ حضرات صاحبینؒ میں اختلاف درحقیقت وقف میں متولی کے قبضہ اورافراز کے شرط ہونے نہ ہونے پر مبنی ہے۔

علامہ ابن الہمام اس کے تحت فرماتے ہیں:

ان قبض المتولى فلما شرطه محمد منع اشتراط الغلة لنفسه لأنه حينئذ لاينقطع حقه فيه وما شرط القبض الا لينقطع حقه ولما لم يشرطه ابويوسف لم يمنعه.[2]

یعنی متولی کا قبضہ شرط ہے یا نہیں اسی اختلاف پر یہ مسئلہ بھی مبنی ہے جب امام محمدؒ متولی کے قبضہ اور تسلیم الی المتولی کو شرط قرار دیتے ہیں تو وہ واقف کے اپنے لئے وقف کی آمدنی رکھنے کی شرط کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اس صورت میں واقف کا حق اس وقف سے ختم نہیں ہوا

---

(۱) المرغيناني، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۷)

(۲) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندري المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۷) نیز دیکھئے: الرافعى، عبد القادر الرافعى. تقريرات الرافعى ملحق برد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى (۴/۸۵)

تسلیم الی المتولی کی شرط کا مقصد ہی یہی تھا کہ واقف کا وقف سے تعلق ختم ہو جائے، اور امام ابو یوسفؒ چونکہ تسلیم کی شرط نہیں لگاتے اس لئے وہ اس شرط کو بھی ناجائز قرار نہیں دیتے۔

اس شرط میں حضراتِ صاحبین کا اختلاف اختلافِ مستقل ہے:

اور بعض حضرات نے اسے اختلافِ مستقل قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کا مسئلہ تسلیم کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، اس رائے کو علامہ ابن الہمامؒ اور علامہ ابن عابدینؒ نے اُوجہ قرار دیا ہے۔[1]

بہرحال امام ابو یوسفؒ اس شرط کو جائز قرار دیتے ہیں اور امام محمدؒ اس شرط کو جائز قرار نہیں دیتے، فریقین کے دلائل صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانیؒ نے تفصیل سے بیان کئے ہیں، ہم ذیل میں اس کا خلاصہ ذکر کر رہے ہیں:

امام محمدؒ کا استدلال:

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وقف عقدِ تبرع ہے جس میں شیٔ موقوف کی منفعت کا اللہ کی رضا کے لئے کسی کو مالک بنایا جاتا ہے اگر واقف وقف کی آمدنی خود لے تو تملیک من نفسہ لازم آئے گا کہ اپنے آپ ہی کو اپنی وقف کردہ چیز کی آمدنی کا مالک بنالیا کسی اور کو مالک نہیں بنایا اور تملیک من نفسہ کی صورت میں نفس تملیک متحقق نہیں ہوتی لہٰذا وقف کا بنیادی عنصر تملیک نہیں پایا گیا اس لئے یہ وقف درست نہیں ہوا اور جو شرط فسادِ وقف کا باعث ہو وہ خود فاسد ہوتی ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شرط کی مثال تو ایسی ہے جیسے صدقہ منفذہ کہ فقیر کو بطور صدقہ کچھ دیا اور یہ شرط لگادی کہ اس میں اتنا میرا ہوگا، یا مسجد بنانے کے لئے جگہ وقف کی لیکن یہ شرط لگادی کہ مسجد کے اتنے حصہ کو بطور رہائش استعمال کروں گا، تو جس طرح یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں اسی طرح اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانا بھی ناجائز ہوگا۔

علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

وجہ قول محمد رحمہ اللہ أن الوقف تبرع علی وجہ التملیک

---

(۱) دیکھئے: ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۳۷/۵) نیز دیکھئے: الرافعى، عبد القادر الرافعى. تقريرات الرافعى ملحق برد المحتار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى (۸۵/۴) و رد المحتار (۳۸۴/۴)

بالطريق الذى قدمناه فاشتراطه البعض أو الكل لنفسه يبطله لأن التمليک من نفسه لايتحقق فصار كالصدقة المنفذة وشرط بعض بقعة المسجد لنفسه. (۱)

علامہ زیلعیؒ تحریر فرماتے ہیں:

وجه قول محمد أن التقرب بازالة الملک واشتراط الغلة أو بعضها لنفسه يمنع ذلک فكان باطلاً كالصدقة المنفذة. (۲)

امام محمد رحمہ اللہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ وقف میں قربۃ اس سے حاصل ہوتی ہے کہ واقف شیء موقوف سے اپنی ملکیت زائل کرتا ہے، جبکہ پوری آمدنی یا بعض آمدنی کی اپنے لئے شرط لگانا زوالِ ملکیت سے مانع ہے اس لئے وقف باطل ہوگا جیسے صدقہ منفذہ۔

امام ابو یوسفؒ کا پہلا استدلال:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقف کی آمدنی استعمال فرمایا کرتے تھے۔

صاحبِ ہدایہ نے یہ حدیث نقل کی ہے لیکن علامہ زیلعیؒ نے اسے غریب قرار دیا ہے البتہ انہوں نے مصنف ابن ابی شیبہ سے ایک روایت ذکر کی ہے جس سے یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے۔

علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

قوله: "روى أن النبى عليه السلام كان يأكل من صدقته" قلت: غريب ايضاً وفى مصنف بن أبى شيبه فى باب الاحاديث التى اعترض بها على أبى حنيفة حدثنا ابن عيينة عن ابن طاؤس عن أبيه أخبرنى حجر المدرى قال: فى صدقة النبى عليه السلام يأكل منها أهلها بالمعروف غير المنكر. (۳)

---

(۱) المرغينانى، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۴۳۸/۵)

(۲) الزيلعى، فخر الدين عثمان بن على الزيلعى ۷۴۳ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دارالكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ۲۰۰۰م (۲۶۸/۴) وكذا فى المبسوط للسرخسى (۴۱/۱۲)

(۳) الزيلعى، جمال الدين ابو محمد عبد الله بن يوسف الزيلعى. نصب الرايه، بيروت، موسسة الرسالة الطبعة الاولىٰ ۱۹۹۷م (۴۷۹/۳)

یہ حدیث غریب ہے، البتہ مصنف بن ابی شیبہ میں باب ''الاحادیث التی اعتراض بہا علی اُبی حنیفۃ'' میں حضرت حجر مدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا حضور کے وقف میں یہ شرط تھی کہ اس وقف سے اہل وقف مناسب انداز میں کھا سکتے ہیں۔

اور ظاہر ہے وقف سے واقف یا اہلِ واقف کا کھانا اسی وقت ممکن ہے جبکہ وقف کرتے وقت واقف نے اس میں یہ شرط لگائی ہو، بلا شرط تو کسی کے نزدیک وقف کی آمدنی استعمال کرنا جائز نہیں، اسی طرح حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے موقوفہ گھر میں خود بھی رہتے تھے۔[1]

دوسرا استدلال:

دوسری دلیل یہ ہے کہ وقف سے مقصود قربۃ ہے اور قربۃ اس صورت میں بھی حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص اپنی ذات پر خرچ کرے۔

سننِ ابن ماجہ میں حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مـامن كسب الرجل كسب أطيب من عمل يديه وما أنفق الرجل على نفسه وأهله وولده وخادمه فهو صدقة.[2]

انسان کی اپنے ہاتھ کی کمائی سے پاکیزہ کوئی کمائی نہیں، انسان اپنے اوپر، اپنے اہل خانہ اور اولاد پر اور اپنے خادم پر جو خرچ کرتا ہے وہ سب صدقہ ہے۔

لہٰذا وقف کی آمدنی خود استعمال کرنے سے بھی قربۃ کا پہلو حاصل ہو جائے گا۔

تیسرا استدلال:

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسافر خانہ بنائے اور یہ شرط لگائے کہ میں بھی جب یہاں سے گذروں گا تو یہاں اتروں گا یا قبرستان کے لئے زمین وقف کرے اور یہ شرط لگا دے کہ میں بھی یہاں مدفون ہوں گا تو یہ شرط بالاتفاق جائز ہے، حالانکہ یہ بھی تو اپنے وقف سے انتفاع کی ایک صورت ہے۔

---

(۱) دیکھئے: سنن البيهقی (٦/١٦١)

(٢) القزوينی، ابو عبد الله محمد بن يزيد القزوينی المتوفی ٢٧٣ھ. سنن ابن ماجه، رياض، شركة الطباعة العربية، الطبعة الثانية ١٩٨٤م (باب الحث على المكاسب، التجارات) وكذا فی نصب الرايه (٣/٢٧٩)

علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

فصار نظير ما اذا بنى خانا أو سقاية أو جعل أرضه مقبرة وشرط أن ينزله أو يشرب منها أو يدفن فيها.[١]

اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانا ایسا ہی ہے جیسے مسافر خانہ بنایا یا پانی کی سبیل بنائی یا اپنی زمین کو قبرستان کے لئے وقف کر دیا اور یہ شرط لگا دی کہ میں بھی اس مسافر خانہ میں ٹھہروں گا یا اس سبیل سے پانی پیوں گا یا اس قبرستان میں مدفون ہوں گا۔

امام محمدؒ کے استدلال کا جواب:

امام محمدؒ نے یہ جو فرمایا تھا کہ اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانے کی صورت میں تملیک من نفسہ لازم آئے گی کہ اپنی چیز کا اپنے ہی کو مالک بنالیا اس کا جواب امام ابو یوسفؒ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ جب واقف نے وقف کیا تو وقف کرتے ہی وہ موقوفہ چیز واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں داخل ہوگئی پھر واقف نے جب اپنے لئے اس وقف کی آمدنی کی شرط لگائی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی مملوکہ چیز کو اپنے لئے استعمال کیا ہے، لہٰذا تملیک من نفسہ کی خرابی یہاں لازم نہیں آرہی۔

صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

ولان الوقف ازالة الملك الى الله تعالىٰ على وجه القربة على مابينا فاذا شرط البعض أو الكل لنفسه فقد جعل ماصار مملوكاً لله تعالىٰ لنفسه لا أنه يجعل ملك نفسه لنفسه وهذا جائز.[٢]

وقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی ملکیت زائل کر کے اس چیز کی ملکیت اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل کر دی جائے، جب واقف نے کل یا بعض آمدنی کی شرط اپنے لئے لگائی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی مملوک چیز اپنے لئے کر لی، اور یہ جائز ہے، یہ بات نہیں کہ اس نے اپنی ہی مملوکہ چیز کا اپنے آپ کو مالک بنالیا۔

---

(١) الزيلعي، فخر الدين عثمان بن على الزيلعي ٧٤٣ھ. تبيين الحقائق، بيروت، دارالكتب العلمية، الطبعة الاولىٰ ٢٠٠٠م (٢٦٨/٤)

(٢) المرغيناني، برهان الدين ابو الحسن على بن ابى بكر المرغيناني. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (٤٣٨/٥)

قولِ راجح:

اس مسئلہ میں بھی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول راجح ہے کہ واقف وقف کرتے وقت اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگا سکتا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔

علامہ ابن الہمام فریقین کے دلائل ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

فقد ترجح قول أبي يوسف قال الصدر الشهيد: والفتوىٰ على قول أبي يوسف في الوقف واختاره مشايخ وكذا ظاهر الهداية حيث أخّر وجهه ولم يدفعه. [١]

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول راجح ہے، صدر الشہید نے فرمایا کہ فتویٰ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ہے، ہم بھی امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں تاکہ لوگ وقف کی طرف راغب ہوں، مشائخ بلخ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، صاحبِ ہدایہ کے صنیع سے بھی اس کا رجحان معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے امام ابو یوسفؒ کی دلیل آخر میں ذکر کی ہے اور اس کی تردید نہیں کی۔

علامہ ابن نجیمؒ اور علامہ ابن عابدینؒ نے بھی امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ ہونے کی صراحت کی ہے۔[٢]

وقف کی آمدنی سے واقف کے ذمہ واجب قرض اتارنے کی شرط لگانا:

٦۔ وقف کرتے وقت واقف نے یہ شرط لگائی کہ اس وقف کی آمدنی سے پہلے میں اپنے قرض اتاروں گا یا یہ کہا کہ میرے انتقال کے بعد اگر مجھ پر کوئی قرض ہو تو وہ اس وقف کی آمدنی سے اتارا جائے، یہ شرط بھی جائز ہے اس پر عمل کیا جائے گا، کیونکہ یہ بھی اشتراط لنفسہ کی قبیل سے ہے۔

ابن مازہ المحیط البرہانی میں تحریر کرتے ہیں:

وان اشترط الواقف أن له أن يقضي دينه من غلته فذلک جائز،

---

(١) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندرى المتوفى ٨٦١ه. فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (٤٣٩/٥)

(٢) دیکھئے: ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (٢٢٠/٥) رد المحتار (٣٨٤/٤)

وکذالک اذا قال: ان مت وعلیّ دین بدئ من غلة هذه الصدقة بقضاء ماعلیّ من الدین فاذا قضی کانت غلة هذه الصدقة بعد ذلک جاریة علی ماسبلها فذلک جائز. (۱)

اگر واقف نے یہ شرط لگادی کہ وقف کی آمدنی سے اس کا دین ادا کیا جائے گا تو یہ جائز ہے اسی طرح اگر اس نے یہ کہا کہ اگر میں مرجاؤں اور مجھ پر دین ہو تو وقف کی آمدنی سے پہلے میرا دَین ادا کیا جائے گا، دَین ادا کرنے کے بعد یہ آمدنی انہی مصارف پر خرچ کی جائے گی جو متعین کردئے گئے ہیں تو یہ شرط بھی جائز ہے۔

وقف کی آمدنی سے واقف کی طرف سے حج کرانے کی شرط:

۷۔ واقف نے یہ شرط لگائی کہ اس کے انتقال کے بعد وقف کی آمدنی کا مثلاً دسواں حصہ اس کی طرف سے حج کرانے پر خرچ کیا جائے اور اتنا حصہ کفارات کی ادائیگی میں خرچ کیا جائے یا ہر سال اتنی رقم اس کی طرف سے صدقہ کی جائے تو یہ شرائط بھی جائز ہیں۔ (۲)

شرطِ استبدال:

۸۔ واقف نے وقف میں یہ شرط لگائی کہ میں جب چاہوں اس وقف کو تبدیل کرسکتا ہوں یعنی اسے بیچ کر اس کی قیمت سے دوسری زمین یا گھر خرید کر وقف کرسکتا ہوں یا واقف نے یہ شرط متولی وقف کے لئے لگائی کہ وہ جب چاہے اسے بیچ کر اس کی جگہ دوسری زمین خرید کر وقف کردے۔

یہ شرط درست ہے اور اس کے مطابق واقف، متولی یا جس کے لئے بھی واقف نے شرط لگائی ہے اس کو استبدالِ وقف کا اختیار ہوگا۔

علامہ قاضی خان رحمہ اللہ نے تو ایک جگہ اس شرط کے جواز پر اجماع نقل فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) ابن مازه البخاری، برهان الدن ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۹/۹) وکذا فی فتح القدیر (۴۳۹/۵) البحر الرائق (۲۲۰/۵) رد المحتار (۳۹۸/۴)

(۲) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۹/۵) وکذا فی البحر الرائق (۲۲۰/۵)

وأجمعوا على أن الواقف اذا شرط الاستبدال لنفسه فى أصل الوقف يصح الشرط والوقف وملك الاستبدال. (۱)

علماء کا اجماع ہے کہ واقف نے اگر اپنے لئے استبدال کی شرط لگائی تو وقف بھی درست ہے اور شرط بھی درست ہے اور وہ استبدالِ وقف کرسکتا ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس شرط کے جواز پر اجماع کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ خود علامہ قاضی خان کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شرط کے جواز وعدمِ جواز میں اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں:

رجل قال: أرضى هذه صدقة موقوفة لله تعالىٰ ابداً على أن أبيعها وأشترى بثمنها أرضا اخرى فتكون وقفاً على شروط الأولىٰ قال هلالؒ وهو قول أبى يوسفؒ الوقف والشرط جائزان، وقال يوسف بن خالد: الوقف صحيح والشرط باطل. (۲)

ایک شخص نے کہا میں یہ زمین ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر وقف کرتا ہوں، اس شرط پر کہ میں اسے بیچ کر اس کی جگہ دوسری زمین خرید سکتا ہوں جو اس کی جگہ انہی شرائط کے مطابق وقف ہوگی، امام ہلالؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف اور شرط دونوں جائز ہیں، یوسف بن خالدؒ کے نزدیک وقف درست ہے لیکن شرط باطل ہے۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شرط کے جواز وعدمِ جواز میں اختلاف ہے، صاحبِ ہدایہ نے بھی اس میں امام محمدؒ کا اختلاف نقل کیا ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

ولو شرط الواقف أن يستبدل به أرضا آخرى اذا شاء ذلك فهو جائز عند أبى يوسف وعند محمدؒ الوقف جائز والشرط باطل. (۳)

اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ وہ جب چاہے اس وقف کی جگہ دوسری زمین خرید کر وقف کرسکتا ہے تو یہ شرط امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک وقف جائز ہے اور شرط باطل۔

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۲ھ. الفتاوی الخانية بهامش الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانية ۱۴۰۲ھ (۳۰۶/۲)

(۲) حواله بالا (۳۰۵/۳)

(۳) المرغینانی، برهان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی. هدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۹/۵)

علامہ طرابلسیؒ یہ شرط ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

جاز الوقف والشرط عند أبي يوسف استحساناً واختاره الخصاف وهلال، وقال محمد ويوسف بن خالد السمتي: الوقف صحيح والشرط باطل وهو القياس. (۱)

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وقف اور شرط دونوں جائز ہیں استحساناً، خصاف اور ہلالؒ نے اسے ہی اختیار کیا ہے، امام محمدؒ اور یوسف بن خالد السمتیؒ کے نزدیک وقف صحیح ہے اور شرط باطل یہی قیاس ہے۔

ان نصوص سے واضح ہے کہ یہ مجمع علیہ شرط نہیں ہے بلکہ اس میں اختلاف ہے۔

اختلاف کا مبنیٰ:

صاحبِ ہدایہ، علامہ ابن نجیم اور علامہ حصکفی رحمہم اللہ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر واقف اپنے لئے استبدال کی شرط لگائے تو اس کے جواز اور عدمِ جواز پر حضرات صاحبین رحمہما اللہ کا جو اختلاف ہے وہ درحقیقت مسئلہ ''اشتراط الولایۃ والغلۃ لنفسہ'' کے تحت ذکر کردہ اختلاف پر مبنی ہے، اس کی تفصیل ہم شرط نمبر ۴ اور ۵ کے تحت ذکر کر چکے ہیں۔ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وجاز جعل غلة أو الولاية لنفسه عند الثاني وعليه الفتوىٰ وجاز شرط الاستبدال به أرضاً اخرىٰ حنيئذٍ. (۲)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واقف کا وقف کی آمدنی اور ولایۃ کی شرط لگانا جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے لہٰذا اب ان کے نزدیک استبدال کی شرط لگانا بھی جائز ہوگا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ لفظ ''حينئذٍ'' کے تحت لکھتے ہیں:

أى حين اذا كان الفتوى على قول أبي يوسف، وأشار بهذا الى أن اشتراط الاستبدال مفرع على القول بجواز اشتراط الغلة لنفسه،

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ١٣٢٠ھ (٣١) وكذا فى المبسوط (٤١/١٢)

(۲) الحصكفى، محمد بن على الملقب بعلاء الدين الحصكفى المتوفى ١٠٠٨ھ. الدر المختار، كراچى، ايچ ايم سعيد كمپنى الطبعة الاولىٰ ١٤٠٦ھ (٣٨٤/٤)

ولهذا قال في البحر: وفرع في الهداية على الاختلاف بين الشيخين شرط الاستبدال لنفسه فجوزه ابويوسف وأبطل محمد الشرط وصحح الوقف. (۱)

جب مسئلہ ''اشتراط الغلة لنفسه والولاية لنفسه'' میں فتویٰ امام ابویوسفؒ کے قول پر ہے تو مسئلہ استبدال میں بھی فتویٰ امام ابویوسفؒ کے قول پر ہوگا، اور علامہ حصکفیؒ نے اس سے یہ اشارہ کیا ہے کہ شرطِ استبدال کا جواز اپنے لئے وقف کی آمدنی کی شرط لگانے کے جواز پر متفرع ہے، اسی وجہ سے صاحبِ بحرؒ نے فرمایا: ہدایہ میں اشتراط الغلة لنفسہ میں حضرات صاحبین کے اختلاف پر تفریع کرتے ہوئے مسئلہ استبدال میں حضرات صاحبین کا اختلاف نقل کیا گیا ہے کہ امام ابویوسفؒ اسے جائز قرار دیتے ہیں اور امام محمدؒ اس شرط کو باطل اور وقف کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اگر ان حضرات کی اس رائے کو اختیار کرلیا جائے تو فریقین کے دلائل یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہر ایک کے اس مسئلہ میں دلائل وہی ہوں گے جو ہم نے شرط نمبر۴ اور نمبر۵ کے تحت ذکر کئے ہیں، لیکن اسعاف اور اَحکام الاوقاف للخصاف کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان یہ اختلاف اختلافِ مستقل ہے اور امام ابویوسفؒ کا قول استحسان ہے اور امام محمدؒ کا قول قیاس ہے لہٰذا اب وجہِ قیاس واستحسان سمجھنی ضروری ہوگی۔

وجہِ قیاس:

امام محمدؒ اور یوسف بن خالد السمتیؒ کے موقف کو علامہ طرابلسیؒ نے قیاس قرار دیا ہے، وجہِ قیاس یہ ہے کہ وقف کرنے کے بعد شئ موقوف واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اب اسے نہ بیچا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو مالک بنایا جاسکتا ہے، اس اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ واقف کا استبدال کی شرط لگانا جائز نہ ہو کیونکہ استبدال کی صورت میں ظاہر ہے اس وقف کو بیچا جائے گا اور جیسے بیچا جائے گا وہ اس کا مالک بھی بنے گا، وقف کو بیچنا اور کسی کو اس کا مالک بنانا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۵/۴) نیز دیکھئے: البحر الرائق (۲۲۱/۵) هدايه مع فتح القدير (۴۳۹/۵)

یہ وجہِ قیاس ہمیں صراحۃً کہیں ملی نہیں لیکن اسے علامہ خصافؒ کی درج ذیل عبارت سے اخذ کیا جاسکتا ہے، فرماتے ہیں:

قلت: ولم أجزت الوقف على هذا وهو اذا باع الأرض الموقوفة أخرجها عن ذلك الوقف وصارت أرضا تملك بعد الوقف ومن شرط الوقف أن لايملك ولايورث؟

قال: هذا استحسان والقياس عندنا أن الوقف جائز واشتراطه البيع لايجوز. (۱)

سائل نے سوال کیا کہ آپ اس شرط کے ساتھ وقف کو کیوں جائز قرار دیتے ہیں حالانکہ واقف جب اس موقوفہ زمین کو بیچے گا تو اس زمین کو وقف ہونے سے نکال دے گا اور وقف ہونے کے باوجود خریدنے والا اس زمین کا مالک بن جائے گا، وقف کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کا کسی کو مالک نہیں بنایا جاسکتا نہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے۔

امام نے جواب دیا کہ اس شرط کو جائز قرار دینا استحسان ہے ورنہ قیاس ہمارے نزدیک بھی وہی ہے جو آپ نے فرمایا کہ وقف جائز ہو اور شرط جائز نہ ہو۔

وجہِ استحسان:

امام ابویوسف اور ہلال الرأی رحمہما اللہ کے موقف کو علامہ طرابلسیؒ نے استحسان قرار دیا ہے، وجہِ استحسان بیان کرتے ہوئے صاحبِ کفایہ فرماتے ہیں:

لان فيه تحويله الى مايكون خيرا من الأول أو مثله فكان تقريراً لا ابطالاً. (۲)

کیونکہ استبدال میں وقف کو اس سے بہتر یا اس جیسے وقف سے تبدیل کیا جارہا ہے اس لئے یہ وقف کو مزید مستحکم کرنا ہوا نہ کہ وقف کو باطل کرنا۔

---

(۱) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشيبانی المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۳۲)

(۲) الخوارزمی، جلال الدين الخوارزمی. الكفايه شرح الهدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه (۵/۴۳۹)

علامہ خصافؒ تحریر فرماتے ہیں:

الوقف انما يراد منه الغلة والزيادة فيه والتوفير على أهله في الغلة فلذلك جاز اشتراطه الاستبدال به ألا ترى أنه قد يشترى بثمن هذه الأرض التي وقفها واشترط الاستبدال بها أرضا مكانها فيعمرها ويصلحها فيكون أدر على اهل الوقف وأكثر غلة فلهذه العلة جاز اشتراطه ذلك في الوقف. (١)

وقف سے مقصود غلۂ وقف ہے کہ اس میں اضافہ ہو، تاکہ اہلِ وقف کو آمدنی زیادہ سے زیادہ مل سکے، اسی مقصد کے لئے استبدال کی شرط کو جائز قرار دیا گیا ہے کہ اس موقوفہ زمین کو بیچ کر واقف اس کی جگہ ایسی دوسری زمین خرید سکتا ہے جو تعمیر و مرمت کے بعد موقوف علیہم کے لئے زیادہ فائدہ مند ہو اور انہیں آمدنی زیادہ مل سکے اس علت کی وجہ سے اس شرط کی اجازت دی گئی ہے۔

استحسان کی ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ واقف جب اسے بیچے گا تو مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ واقف اور متولی کی حیثیت سے بیچے گا، اور متولی کیلئے وقف کی مصلحت کے پیش نظر وقف کی مملوکہ اشیاء کی بیع تو بہرحال جائز ہے، اس لئے شرط لگانے کی صورت میں اصلِ وقف کو بیچ کر اسے تبدیل کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔

قولِ راجح و وجہِ ترجیح:

اس مسئلہ میں حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ نے امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح قرار دیا ہے کہ واقف وقف کرتے وقت یہ شرط لگا سکتا ہے کہ جب مناسب سمجھوں اس وقف کو بیچ کر اس کی جگہ دوسری زمین خرید کر وقف کر سکتا ہوں۔

وجہِ ترجیح یہ ہے کہ اکثر ایسی صورت پیش آتی ہے کہ ایک زمین یا گھر وقف کیا اور اس کی آمدنی فقراء پر خرچ ہورہی ہے لیکن رفتہ رفتہ زمین یا گھر کی آمدنی کسی وجہ سے کم ہوگئی مثلاً زمین میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے پیداوار صحیح نہیں ہورہی یا گھر بوسیدہ ہوگیا، اس کا کرایہ کم ہوگیا یا آس پاس کے حالات

---

(١) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيباني المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ١٩٩٩م (١٣٥)

امن وامان کے لحاظ سے خراب ہوگئے جس کی وجہ سے لوگوں کی اس زمین یا مکان میں دلچسپی نہ رہی غرضیکہ آمدنی کم ہونے کی کوئی بھی وجہ پیش آسکتی ہے، اب ایسی صورت میں اگر یہ زمین یا مکان بیچ کر کسی اور اچھی جگہ زمین اور مکان خرید لیا جائے تو ظاہر ہے وقف کی آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہے اور یہ بات موقوف علیہم کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے ایسی صورت میں استبدال اسی وقت ممکن ہے جبکہ وقف کرتے وقت واقف نے اپنے لئے یا کسی اور کے لئے استبدال کی شرط لگائی ہو، اگر استبدال کی شرط نہ لگائی ہو تو پھر محض وقف کی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے اس کا استبدال جائز نہیں، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وقف میں استبدال کی شرط جائز ہونی چاہئے۔علامہ طرطوسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ان اشتراط الاستبدال شرط يقتضيه العقد لأنه ربما تقع الضرورة الى استبدال الوقف لأن الأراضى ربما لايخرج فيها من الغلة ما يفضل عن المؤنة فيؤدى الى أن لايصل الى الموقوف عليهم شئ لفساد يحدث بالأرض وتكون الأرض الأخرى أصلح وأنفع للموقوف عليهم فلهذه الضرورة جوزنا اشتراط الاستبدال فى الوقف.[1]

استبدال کی شرط ایسی شرط ہے جس کا عقد تقاضا کرتا ہے کیونکہ بسا اوقات استبدال کی ضرورت پیش آتی ہے کہ مثلاً موقوفہ زمین سے اتنی پیداوار حاصل نہیں ہوتی جو اس کے اخراجات سے زائد ہو زمین میں کسی خرابی کی وجہ سے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موقوف علیہم کو کچھ نہیں مل پاتا، جبکہ دوسری زمین ایسی موجود ہوتی ہے جو موقوف علیہم کے لئے زیادہ مفید اور اَصلح ہوسکتی ہے، اس ضرورت کی وجہ سے اس شرط کو وقف میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں وقف نامہ میں شرطِ استبدال کی ضرورت:

ہمارے زمانہ میں اس شرط کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ فتنہ کا زمانہ ہے، حالات کا کچھ اندازہ نہیں روز بروز حالات خراب ہوتے جارہے ہیں اگر وقف نامہ میں یہ شرط نہیں لگائی جائے گی تو اوقاف کے معطل ہونے کا اندیشہ ہے۔

مثلاً ایک شخص نے فقراء کی رہائش کے لئے ایک علاقہ میں گھر وقف کیا، اس علاقہ میں امن وامان کے لحاظ سے حالات خراب ہوگئے اطمینان سے وہاں رہائش اختیار کرنا ممکن نہیں، ایسی صورت میں اگر

---

(۱) الطرسوسی، ابراهيم بن على الطرسوسى. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶ م (۱۱۳)

استبدال کی شرط نہ لگائی ہوگی تو ان حالات میں بھی موقوف علیہم کو اسی مکان میں اسی علاقہ میں رہنا ہوگا جو بہت مشکل ہے یا اسے خالی چھوڑ دیں، لیکن اگر استبدال کی شرط وقف نامہ میں ہو تو وہ مکان بیچ کر پُر امن علاقہ میں مکان خریدا جاسکتا ہے، جہاں فقراء اطمینان سے رہائش اختیار کر سکتے ہیں۔

اسی طرح مکان وقف کیا اور اس کا کرایہ فقراء پر خرچ کیا جاتا ہے، علاقہ کی امن و امان کی صورتحال مخدوش ہوگئی، لوگ اس علاقہ میں رہائش کو ترجیح نہیں دے رہے تو ظاہر ہے اس مکان کا کرایہ بھی کم ہوجائے گا، اگر وقف نامہ میں استبدال کی شرط ہو تو اس مکان کو بیچ کر بہتر جگہ مکان خریدا جاسکتا ہے جس سے زیادہ کرایہ حاصل ہو اور فقراء کو زیادہ فائدہ پہنچے، اسی طرح بجلی، پانی، گیس اور ٹرانسپورٹ کی سہولت نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں بھی زمینوں اور مکانات کے کرایہ پر فرق پڑتا ہے، جس وقت واقف نے یہ مکان وقف کیا تھا اس وقت یہ تمام سہولتیں وہاں موجود تھیں اور بہتر کرایہ حاصل ہو رہا تھا لیکن بعد میں سہولتیں کم ہوگئیں یا ختم ہوگئیں اور اس کی وجہ سے کرایہ بھی کم ہوگیا تو اگر وقف میں استبدال کی شرط نہ ہو تو اس مکان کو بیچا نہیں جاسکتا کیونکہ آمدنی حاصل ہو رہی ہے، اگرچہ کم حاصل ہو رہی ہے لیکن اگر وقف نامہ میں استبدال کی شرط موجود ہو تو اس مکان کو بیچ کر بہتر جگہ مکان خریدا جاسکتا ہے اور اس سے پہلے کے مقابلہ میں بہتر کرایہ حاصل ہوگا جس میں فقراء کا فائدہ ہے۔

ان مصالح کی وجہ سے احقر کی رائے میں آج کل کے وقف ناموں میں استبدال کی شرط لگانا بہت ضروری اور اہم ہے البتہ اس میں دیگر منفی پہلو بھی ہیں کہ لوگ اس کے ذریعہ اوقاف میں بدعنوانی شروع نہ کر دیں اور اوقاف پر اس بہانہ قبضہ نہ شروع کر دیں، تاہم آگے ہم استبدال کی جو شرائط ذکر کر رہے ہیں انہیں ملحوظ رکھنے سے ان منفی پہلوؤں کا تدارک ہوسکتا ہے۔

امام محمدؒ کے قیاس کا جواب:

امام محمد رحمہ اللہ کے قیاس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ وقف کے بارے میں یہ جو اصول ہے کہ وقف کو بیچا نہیں جاسکتا کسی کو اس کا مالک نہیں بنایا جاسکتا یہ اس وقت ہے جب اس وقف کو ختم کرنے کا ارادہ ہو، لیکن اگر وقف کو بیچا جا رہا ہے مشتری اس کا مالک بن رہا ہے اور ارادہ اس وقف کو ختم کرنا نہیں بلکہ اس کی جگہ اس سے بہتر چیز وقف کرنا ہے تو یہ صورت جائز ہے کیونکہ وقف میں فی نفسہٖ یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک محل سے دوسرے محل کی طرف منتقل ہوجائے، مثلاً موقوفہ زمین پر غاصب نے قبضہ کرلیا اور پھر کسی وجہ سے دوسری زمین قابل انتفاع نہیں رہی تو بالاتفاق غاصب اس زمین کی قیمت کا ضامن ہوگا اور اس قیمت سے وہ زمین خریدی جائے گی جو پہلی زمین کی جگہ وقف ہوگی، یہاں بھی غاصب ضمان ادا کر کے موقوفہ زمین کا

مالک بنا ہے تو معلوم ہوا کہ وقف کا مالک بنا جا سکتا ہے اور وقف میں ایک محل سے دوسرے محل کی طرف انتقال کی صلاحیت ہے۔ علامہ قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

والصحيح قول هلالؒ وأبي يوسفؒ لأن هذا شرط لايبطل حكم الوقف فان الوقف مما يحتمل الانتقال من أرض الى اخرى ويكون الثاني قائما مقام الأول فان أرض الوقف اذا غصبها غاصب وأجرى الماء عليها حتى صار بحراً لايصلح للزراعة يضمن قيمتها ويشترى بقيمتها أرضا أخرى فتكون الثانية وقفاً على وجه الأولىٰ وكذلك أرض الوقف اذا قلّ نزلها لأفة وصارت بحيث لاتصلح للزراعة أولا تفضل غلتها عن مؤنها يكون صلاح الوقف في الاستبدال بأرض أخرى فيصح شرط ولاية الاستبدال وان لم يكن للحال ضرورة داعية الى الاستبدال. (١)

صحیح امام ہلال اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کا قول ہے کیونکہ یہ شرطِ حکم وقف کے خلاف نہیں، وقف ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دوسری زمین پہلے کے قائم مقام ہو کر اس کے حکم میں ہو جائے گی، اگر غاصب وقف زمین غصب کرے اور اس پر اتنا پانی بہادے کہ وہ ایک طرح سے دریا بن جائے اور زراعت کے قابل نہ رہے تو وہ اس کی قیمت کا ضامن ہوگا اور اس سے دوسری زمین خریدی جائے گی جو پہلی کی شرائط کے مطابق وقف ہوگی، اسی طرح اگر وقف زمین کی آمدنی کسی وجہ سے کم ہو جائے کہ وہ قابلِ زراعت نہ رہے یا اس کی آمدنی اخراجات پورا کرنے کے بعد بچے نہیں تو وقف کی مصلحت اس میں ہے کہ اسے دوسری زمین سے تبدیل کر دیا جائے، لہٰذا استبدال کی شرط لگانا درست ہے، اگرچہ فی الحال استبدال کی حاجت نہ بھی ہو۔

مذکورہ بالا تفصیل سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ راجح یہ ہے کہ واقف وقف میں اپنے لئے یا کسی اور کے لئے استبدال کی شرط لگا سکتا ہے، لیکن یہاں کچھ منفی پہلو بھی ہیں کہ وقف ضائع نہ ہو جائے اور استبدال کو وقف میں خورد برد کا ذریعہ نہ بنایا جائے اس کے تدارک کے لئے فقہاء کرامؒ نے کچھ شرائط عائد کی ہیں ان شرائط کی رعایت کرتے ہوئے استبدال جائز ہے ورنہ نہیں۔ وہ شرائط درج ذیل ہیں:

---

(١) الاوزجندي، فخر الدين حسن بن منصور الاوزجندي المتوفى ٥٩٢ھ. الفتاوى الخانية بهامش الهندية، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ١٤٠٢ھ (٣٠٦/٣)

استبدال کی شرائط

واقف رشتہ داروں کو نہیں بیچ سکتا:

۱۔ واقف یہ موقوفہ زمین اپنے رشتہ داروں کو نہیں بیچ سکتا جن کے حق میں اس کی گواہی قبول نہیں، جیسے والدین، اولاد وغیرہ، اسی طرح ان لوگوں کو بھی نہیں بیچ سکتا جن کا واقف کے اوپر قرض ہو، وجہ یہ ہے کہ یہ تمام تعلقات وہ ہیں جن کے ساتھ معاملات کرنے میں انسان عام طور پر رعایت کرتا ہے، اس لئے انہیں وقف زمین بیچنے کی صورت میں رعایت کی تہمت کا اندیشہ ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

أن لایبیعه ممن لاتقبل شهادته له و لا ممن له علیه دین. (۱)

وقف زمین انہیں نہیں بیچ سکتا جن کے حق میں اس کی گواہی قبول نہیں اور اسی طرح اس شخص کو بھی نہیں بیچ سکتا جس کا اس کے اوپر دین ہو۔

بیع غبنِ فاحش کے ساتھ نہ ہو:

۲۔ وقف کی بیع مناسب قیمت پر ہو غبن فاحش کے ساتھ نہ ہو۔ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

ولو باعها بغبن فاحش لایجوز بیعه فی قول أبی یوسف و هلال لأن القیم بمنزلة الوكیل فلا یملک البیع بغبن فاحش. (۲)

اگر غبنِ فاحش کے ساتھ وقف زمین بیچے تو جائز نہیں امام ابو یوسف اور ہلال الرأی کے قول کے مطابق، کیونکہ قیم بمنزلہ وکیل ہے، اور وکیل غبنِ فاحش کے ساتھ بیع نہیں کرسکتا۔

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۶/۴) و کذا فی البحر الرائق (۲۲۴/۵)

(۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۲/۵)

غبنِ فاحش سے مراد:

غبنِ فاحش سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ہم نے یہ تمام اقوال الاشباہ والنظائر کی شرح تسکین الارواح والضمائر کتاب الوقف میں تفصیل سے لکھے ہیں وہاں یہ دیکھے جاسکتے ہیں، ان تمام اقوال میں غبن فاحش کی تعریف کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ کسی چیز کوایسی قیمت پر بیچا جائے جو مارکیٹ کے غیر جانبدار لوگوں کی لگائی ہوئی مختلف قیمتوں سے کم ہو، مثلاً ایک وقف زمین ہے اس کی ایک پراپرٹی ڈیلر ایک لاکھ قیمت لگاتا ہے دوسرا ایک لاکھ دس ہزار، تیسرا نوے ہزار، تو نوے ہزار سے ایک لاکھ دس ہزار تک اگر اسے بیچا جائے تو یہ جائز ہوگا البتہ اگر نوے ہزار سے بھی کم پر اسے بیچا جائے تو غبنِ فاحش کے ساتھ بیع ہوگی اور اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

> **قال فی الذخیرة: تکلموا فی الحد الفاصل بین الغبن الیسیر والغبن الفاحش والصحیح ماروی عن محمدؒ فی النوادر أن کل غبن یدخل تحت تقویم المقومین فھو یسیر وما لایدخل تحت تقویم المقومین فھو فاحش.** [1]
>
> ذخیرہ میں ہے کہ فقہاء کرام نے غبن یسیر اور غبنِ فاحش کی حد فاصل میں کلام کیا ہے صحیح وہ ہے جو امام محمدؒ سے نوادر میں مروی ہے کہ ہر وہ غبن جو قیمت لگانے والوں کی قیمت میں سے کسی کے تحت بھی داخل ہو وہ یسیر ہے اور جو کسی کے تحت بھی داخل نہ ہو وہ فاحش ہے۔

البتہ یہ واضح رہنا چاہئے کہ اوپر ذکر کردہ تفصیل اس وقت ہے جبکہ اس چیز کی کوئی قیمت متعین نہ ہو۔

جس چیز کی مارکیٹ قیمت متعین ہو اس سے کم پر بیچنا جائز نہیں:

اگر موقوفہ چیز ایسی ہے جس کی مارکیٹ میں قیمت متعین ہے تو اس صورت میں اس کی مختلف لوگوں سے قیمت نہیں لگوائی جائے گی بلکہ متعینہ قیمت ہی پر بیچا جائے گا، اس سے کم پر بیچنا جائز نہیں ہوگا، جیسے کسی نے سونا وقف کیا اور واقف نے وقف میں استبدال کی شرط لگائی تھی اس شرط کے تحت وہ سونے کو

---

(۱) ابن الھمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۷/۸۷)

بیچ کر اور کوئی مفید چیز وقف کرنا چاہتا ہے تو سونے کی قیمت نہیں لگوائی جائے گی کیونکہ سونے کا روزانہ کا نرخ مارکیٹ میں متعین ہوتا ہے اسی قیمت پر بیچنا ضروری ہوگا اس سے کم پر بیچنا جائز نہیں ہوگا۔

جامع الفصولین میں ہے:

وقيل مالا يدخل تحت تقويم المقومين، انه فيما ليس له قيمة معلومة في البلد، أما معلوم القيمة كفحم وغيره فلو شراه بيسير الغبن نفذ عليه لاعلىٰ موكله لأنه مما لايدخل تحت التقويم اذ لا يحتاج الى تقويمهم وبه يفتىٰ. (۱)

غبنِ فاحش کی تعریف بعض حضرات نے یوں کی کہ جو قیمت لگانے والوں کی قیمت میں سے کسی کے تحت داخل نہ ہو، صاحبِ جامع الفصولین فرماتے ہیں یہ تعریف اس وقت ہے جبکہ اس چیز کی شہر میں کوئی قیمت متعین نہ ہو، جس چیز کی شہر میں قیمت متعین ہے جیسے کوئلہ وغیرہ، اگر اسے معمولی سے غبن کے ساتھ بھی خریدا جائے تو یہ بیع وکیل ہی پر نافذ ہوگی موکل اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا کیونکہ یہ چیز ایسی ہے جس کی قیمت لگانے کی ضرورت ہی نہیں اس لئے یہ تقویم کے تحت داخل نہیں ہوگی، اسی پر فتویٰ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ موقوفہ چیز کی اگر مارکیٹ قیمت متعین ہے تو اسی پر بیچنا ضروری ہے اور اگر وہ چیز ایسی ہے جس کی مارکیٹ میں کوئی حتمی قیمت متعین نہیں ہے تو ایسی صورت میں مارکیٹ کے غیر جانبدار لوگوں کی لگائی گئی قیمت کے اندر رہتے ہوئے اسے بیچا جائے گا اس سے کم پر بیچنا خود واقف کے لئے جائز نہیں کیونکہ وقف کرنے کے بعد واقف کا وقف سے مالکانہ تعلق ختم ہوگیا صرف تولیت کا تعلق باقی ہے اور متولی کی حیثیت وکیل کی ہوتی ہے لہٰذا وکیل کے احکام واقف پر جاری ہوں گے، وکیل انہی ہدایات کا پابند ہے۔

گھر بیچ کر بہتر جگہ پر گھر خریدا جائے:

۳۔ وقف اگر گھر ہے تو فقہاء کرام رحمہم اللہ نے ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ وہ موقوفہ گھر بیچ کر اس جیسے یا اس سے بہتر محلّہ میں گھر خریدا جائے، اس سے کم تر محلّہ میں خریدنا جائز نہیں۔

---

(۱) ابن سماوه، محمود بن اسماعيل الشهير بابن قاضي سماوه. جامع الفصولين، كراچی، اسلامی کتب خانہ ۱۴۰۲ھ (۳۱/۲) غبن فاحش کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: رد المحتار (۴۰۳/۴) البحر الرائق (۱۶۹/۷) شرح المجلہ لعلی حیدر (۱۱۳/۱)

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

وفي القنية: مبادلة دار الوقف بدار أخرىٰ انما يجوز اذا كانتا في محلة واحدة أو تكون المحلة المملوكة خيراً من المحلة الموقوفة و علىٰ عكسه لايجوز وان كانت المملوكة اكثر مساحة وقيمة واجرة لاحتمال خرابها في أدون المحلتين لدنائتها وقلة رغبات الناس فيها اهـ۔ [1]

قنیہ میں ہے کہ موقوفہ گھر کو دوسرے گھر سے بدلنا اس وقت جائز ہے جب یہ دونوں ایک محلّہ میں ہوں یا دوسرا محلّہ پہلے سے بہتر ہو، اگر اس کا برعکس ہو کہ دوسرا محلّہ پہلے محلّہ سے کمتر ہو تو ایسی صورت میں یہ استبدال جائز نہیں ہوگا، اگر چہ دوسرے محلّہ میں جو گھر لیا جارہا ہے وہ کشادہ ہو اس کی قیمت اور کرایہ زیادہ ہو کیونکہ یہاں یہ احتمال بہرحال ہے کہ اس محلّہ کے کمتر ہونے اور لوگوں کی رغبت کم ہونے کی وجہ سے یہ وقف ویران ہوجائے۔

یہ شرط اگر چہ فقہاء کرامؒ نے دار کے بارے میں لکھی ہے لیکن ہم اس سے یہ اصول اخذ کرسکتے ہیں کہ استبدالِ وقف میں اسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ موقوفہ چیز کو بیچ کر اس کی جگہ جو چیز خریدی جارہی ہو وہ مجموعی اعتبار سے موقوفہ چیز کے برابر یا اس سے بہتر ہو، اگر وہ موقوفہ چیز سے کمتر ہو تو اسے خریدنا جائز نہیں ہوگا۔ واللہ أعلم۔

استبدال کرتے وقت واقف کی شرائط کی رعایت رکھنا ضروری ہے:

۴۔ وقف نامہ میں استبدال کی شق ڈالتے ہوئے اگر واقف نے استبدال کے لئے کچھ شرائط لگائی ہوں تو اس کی پابندی بھی ضروری ہے، مثلاً:

۱۔ واقف نے یہ لکھا ہے کہ یہ موقوفہ زمین بیچ کر کراچی ہی میں کوئی دوسری زمین خرید کر وقف کی جائے گی تو اس کی پابندی ضروری ہے، کراچی سے باہر زمین نہیں خریدی جاسکتی۔

امام ہلال الرائی تحریر فرماتے ہیں:

قلت: فان قال: على أن اشترى بها أرضا من أرض البصرة أله أن يشترى بها من غير أرض البصرة؟ قال: لا. [2]

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۲۳)

(۲) هلال الرای، هلال بن يحيى بن مسلم الرای. کتاب احکام الوقف، حیدر آباد دکن، دائرة المعارف العثمانية ۱۳۵۵ھ (۹۲) وکذا فی الخانية ۳۰۶/۳۰)

میں نے عرض کیا کہ اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ میں یہ وقف زمین بیچ کر اس کے بدلہ بصرہ میں زمین خریدلوں گا تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ بصرہ کے علاوہ کہیں اور زمین خرید لے؟ امام نے فرمایا نہیں۔

۲۔ اسی طرح اگر یہ لکھا کہ موقوفہ گھر کو بیچ کر گھر خریدوں گا تو اس کی جگہ کوئی زمین نہیں خریدی جاسکتی۔

علامہ طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو وقف أرضه وشرط أن يستبدلها بأرض ليس له أن يستبدلها بدار، ولو شرط البدل دارا لا يستبدلها بأرض ولو شرط أرض قرية لايستبدلها بأرض غيرها لتفاوت أراضى القرى مؤنة واستغلالا فليزم الشرط. (۱)

اگر واقف نے زمین وقف کی اور یہ شرط لگائی کہ وہ اسے کسی زمین سے بدل سکتا ہے تو اب اس کے لئے گھر سے بدلنا جائز نہیں، اور اگر گھر سے بدلنے کی شرط لگائی تو زمین سے بدلنا جائز نہیں، اور اگر یہ شرط لگائی کہ گاؤں کی زمین سے تبدیل کروں گا تو گاؤں کے علاوہ کسی زمین سے نہیں بدل سکتا، کیونکہ گاؤں کی زمینیں اخراجات اور آمدنی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں، لہٰذا یہ شرط لازم ہوگی۔

لیکن اگر وقف نامہ میں اس طرح کی کوئی شرط واقف نے نہ لگائی ہو تو ایسی صورت میں واقف اس موقوفہ چیز کو کسی بھی ایسی چیز سے بدل سکتا ہے جو وقف کے لئے زیادہ بہتر ہو اور جس کے باقی رہنے اور نافع ہونے کا امکان زیادہ ہو۔

استبدال میں اتحادِ جنس شرط نہیں:

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ قنالی زادہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ استبدال میں اتحادِ جنس ضروری ہے یعنی زمین کی جگہ زمین، گھر کی جگہ گھر اور دوکان کی جگہ دوکان ہی خرید کر وقف کی جائے گی۔ فرماتے ہیں:

وزاد العلامة قنالى زاده فى رسالته ثامنا وهو أن يكون البدل والمبدل

---

(۱) الطرابلسی، ابراهيم بن موسیٰ بن ابی بكر الطرابلسی. الاسعاف فی احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ۱۳۲۰ھ (۳۲) وكذا فی الخانية (۳/۳۰۶)

من جنس واحد لما فی الخانیة لو شرط لنفسه استبدالها بدار لم یکن له استبدالها بأرض، وبالعکس أو بأرض البصرة تقید. (۱)

بعض حضرات خانیہ کے اس جزئیہ کے علاوہ فقہاء کرامؒ کے ذکر کردہ اس جزئیہ سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں یہ صراحت ہے کہ گھر کے استبدال میں یہ شرط ہے کہ بیچ کر جو گھر خریدا جارہا ہے وہ موقوفہ گھر کے محلّہ سے بہتر یا کم از کم مساوی محلّہ میں ہو، معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ گھر ہی خریدا جاسکتا ہے اس لئے استبدال میں اتحادِ جنس بھی شرط ہے۔

لیکن احقر کی رائے میں یہ شرط ضروری نہیں، وقف کی بہتری کو ملحوظ رکھا جائے گا اگر وقف کی بہتری اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ اسے بیچ کر اسی کی جنس سے کوئی چیز خرید لی جائے تو ایسا ہی کیا جائے گا ورنہ خلافِ جنس سے بھی چیز خرید کر وقف کی جاسکتی ہے، علامہ شامیؒ نے خود قنالی زادہ کے حوالہ سے منحۃ الخالق میں تحریر کیا ہے کہ اگر دوکان وقف کی جس کی آمدنی فقراء پر خرچ ہوتی ہے تو واقف اسے بیچ کر اس کی جگہ زرعی زمین خرید کر وقف کرسکتا ہے بشرطیکہ اس زمین سے اتنی آمدنی ہو جتنا دوکان کا کرایہ حاصل ہوتا تھا اور اس کی وجہ یہ تحریر کی ہے کہ اس میں وقف کا زیادہ فائدہ ہے کیونکہ آمدنی دونوں صورتوں میں یکساں ہے لیکن زرعی زمین میں انہدام، تعمیر ومرمت وغیرہ کی ضرورت نہیں جبکہ دوکان میں یہ تمام احتمالات ممکن ہیں اس لئے وقف کے لئے بہتر صورت اختیار کی جائے گی۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

ثم قال: واذا کانت موقوفة للاستغلال فالظاهر عدم اشتراط اتحاد الجنس علی أن المظور فیها کثرة الریع وقلة المرمة والمؤنة و قابلیة البقاء، الاتری انه لو استبدل الحانوت أو الدار الموقوفة للاستغلال بأرض تزرع وتحصل منها الغلة قدر اجارة الأولیٰ کان أحسن وأولی لاحتمال المسقفات للفناء بالحریق وانهدام البناء واحتیاجها الی الترمیم والتعمیر فی البقاء بخلاف الأراضی المزروعة فانها أدوم وأبقی وأغنی عن الکلفة والخراج علیها. (۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۶/۴)

(۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۳/۵)

قنالی زادہ نے فرمایا اگر استغلال (آمدنی) کے لئے کوئی چیز وقف کی گئی ہے تو ظاہر یہ ہے کہ اس میں اتحادِ جنس شرط نہیں، کیونکہ اس میں آمدنی کی کثرت، اخراجات و مرمت کی قلت اور زیادہ عرصہ تک باقی رہنے کی صلاحیت ملحوظ ہوتی ہے۔

آپ غور کیجئے کہ اگر دوکان یا گھر استغلال کے لئے وقف کیا گیا ہے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی فقراء کو دی جاتی ہے اسے زرعی زمین سے تبدیل کرلیا جائے جس سے دوکان یا گھر کے کرایہ کے بقدر آمدنی حاصل ہو تو یہ زیادہ احسن اور بہتر ہے کیونکہ چھت والی دوکانوں میں آگ سے جلنے، عمارت کے گرنے اور باقی رہنے کے لئے تعمیر و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف زرعی زمین کے کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے اور اخراجات بھی اس میں کم ہیں۔

معلوم ہوا کہ وقف کی بہتری کو ملحوظ رکھا جائے گا، یہی مطمحِ نظر فقہاء کرام کا اس صورت میں بھی ہے۔ جہاں انہوں نے یہ صراحت کی ہے کہ موقوفہ گھر کو بیچ کر بہتر محلّہ میں یا پہلے کے مساوی محلّہ میں گھر خریدا جائے گا۔

گھر کی جگہ گھر خریدنے کی شرط کی حکمت:

اور گھر ہی خریدنے کی شرط اس وجہ سے ہے کہ واقف نے رہائش کے لئے وقف کیا ہے، یہ مقصد گھر کی جگہ زمین خرید کر حاصل نہیں ہوسکتا، یہاں گھر کی جگہ گھر خریدنا اس وجہ سے ضروری نہیں کہ استبدال میں اتحادِ جنس ضروری ہے بلکہ واقف نے اس گھر کا مصرف چونکہ سکنیٰ طے کیا ہے اس لئے اس مصرف کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے شرط نمبر ۳ کے تحت البحر الرائق کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ کمتر محلّہ میں جو گھر خریدا جارہا ہے وہ اگرچہ مساحت، قیمت اور کرایہ کے اعتبار سے پہلے سے بہتر ہو تب بھی اسے خریدنے کی اجازت نہیں کیونکہ اس کے ویران ہونے کا اندیشہ ہے اور ویران ہونے کی صورت میں واقف کا مقصود یعنی رہائشِ فقراء حاصل نہیں ہوگا اس لئے استبدال میں یہ گھر نہ خریدا جائے۔

اور جہاں تک علامہ قنالی زادہؒ کے خانیہ سے استدلال کا تعلق ہے کہ اس جزئیہ میں زمین کے بدلہ زمین اور گھر کے بدلہ گھر خریدنے کا ذکر ہے جس سے اتحادِ جنس کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ خانیہ کے اس جزئیہ میں زمین کے بدلہ زمین اور گھر کے بدلہ گھر خریدنے کو جو ضروری قرار دیا ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ استبدال میں اتحادِ جنس ضروری ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ واقف نے وقف نامہ میں

استبدال کی شق ڈالتے ہوئے یہ شرط لگائی ہے اور واقف کی شرائط کا اتباع ضروری ہے جیسا کہ ہم نے شرط نمبر۴ کے تحت ذکر کیا ہے، خود علامہ قاضی خان یہ جزئیہ نقل کرنے کے بعد اس کی علت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لانه لایملک تغیر الشرط. (۱)

کیونکہ واقف اپنی عائد کردہ شرط کو تبدیل نہیں کرسکتا۔

اس علت سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ قاضی خان رحمہ اللہ کے نزدیک زمین کے بدلہ زمین خرید کر وقف کرنا اور گھر کے بدلہ گھر خرید کر وقف کرنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کے نزدیک اتحادِ جنس ضروری ہے بلکہ یہ شرطِ واقف کی وجہ سے ضروری ہے، چنانچہ جہاں واقف نے بدل کی تعیین نہ کی ہوتو وہاں فقہاء کرامؒ کے نزدیک موقوفہ چیز کی جگہ کوئی بھی دوسری چیز وقف کی جاسکتی ہے۔

علامہ طرابلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو لم یقید البدل بأرض ولا دار یجوز له أن یستبدلها من جنس العقارات بأی أرض أو دار أو بلد شاء للاطلاق. (۲)

اگر بدل کو واقف نے زمین یا گھر کے ساتھ مقید نہ کیا ہوتو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جنس عقار میں سے جس کے ساتھ چاہے اسے بدل دے کوئی بھی زمین ہو یا گھر ہو کسی بھی شہر میں ہو کیونکہ اس نے بدل کو مطلق رکھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ استبدال میں اتحادِ جنس کی شرط ضروری نہیں بلکہ وقف کے لئے جو بدل بہتر ہو اس سے وقف کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ استبدال کرتے وقت اس کی کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ واقف نے جس جنس کا ذکر کیا ہے اس کی حتی الامکان رعایت کی جائے، ہاں نوع بدل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مثلاً زمین سے استبدال کی اجازت دی تو اس میں زرعی زمین اور کمرشل زمین دونوں نوع داخل ہیں، انہی دونوں انواع میں رہتے ہوئے استبدال کی کوشش کرنی چاہئے، البتہ اگر جنس کی رعایت میں وقف کی مصلحت فوت ہورہی ہو تو پھر جنس کا پابند رہنے کے بجائے وقف کی مصلحت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

---

(۱) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۵ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیه، کوئٹه، مکتبه ماجدیه، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۲/۳۰۶)

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۳۲)

استبدالِ وقف کے لئے استبدال بالعقار ضروری نہیں:

بعض حضرات نے استبدال میں یہ شرط بھی لگائی ہے کہ استبدال بالعقار ہو استبدال بالدراہم والدنانیر جائز نہیں، یعنی موقوفہ زمین کو نقد رقم کے عوض بیچنا اور پھر اس نقد رقم کے ذریعہ دوسری زمین خریدنا جائز نہیں، بلکہ زمین کو زمین کے عوض بیچا جائے اور جو زمین حاصل ہو اسے وقف کیا جائے، اس شرط کا مقصد یہ ہے کہ اگر نقد رقم واقف یا متولی کے ہاتھ میں آ گئی تو معلوم نہیں کہ وہ اس سے دوسری زمین خرید کر وقف کرے گا یا نہیں، زمین کے عوض اگر وقف زمین بیچی جائے گی تو یہاں یہ امکان نہیں، بلکہ وہ زمین وقف ہوگی۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

> **ویجب أن یزاد آخر فی زماننا وهو أن یستبدل بعقار لابالدراهم والدنانیر فانا قد شاهدنا النظار یأکلونها وقل أن یشتری بها بدل ولم نر أحدا من القضاة یفتش علی ذلک مع کثرة الاستبدال فی زماننا.** [1]
>
> ہمارے زمانہ میں ایک اور شرط کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ وقف کو زمین سے تبدیل کیا جائے دراہم اور دنانیر سے تبدیل نہ کیا جائے کیونکہ ہم نے وقف کے بہت سے متولیوں کو دیکھا ہے کہ وہ نقد رقم کھا گئے اس رقم سے وقف کی جگہ دوسری زمین بہت کم خریدی جاتی ہے اور ہم نے نہیں دیکھا کہ کسی قاضی نے اس کی تفتیش کی ہو، حالانکہ ہمارے زمانہ میں استبدالِ وقف کثرت سے ہو رہے ہیں۔

جبکہ علامہ حصکفیؒ کے نزدیک وقف کو دراہم و دنانیر سے تبدیل کر کے بھی اگلی زمین خرید سکتے ہیں، زمین کو زمین سے بدلنا ہی ضروری نہیں۔[2] علامہ قاضی خانؒ کی عبارت سے بھی علامہ حصکفیؒ کے موقف کی تائید ہوتی ہے فرماتے ہیں:

> **قال ابویوسفؒ وهلالؒ لایملک البیع الا بالدراهم او بالدنانیر، وهو کالوکیل بالبیع.** [3]

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۲۳/۵)

(۲) دیکھئے: الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۷/۴)

(۳) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۵۹۵ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیه، کوئٹہ، مکتبہ ماجدیہ، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ (۳۰۷/۳)

امام ابو یوسف اور امام ہلال رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ واقف یا متولی وقف کو درہم و دینار کے علاوہ کسی اور چیز کے عوض بیچ ہی نہیں سکتا۔ یہ وکیل بالبیع کے حکم میں ہیں۔

علامہ شامیؒ ان دونوں آراء میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علامہ قاضی خانؒ نے اپنے زمانہ کی خیریت کو دیکھتے ہوئے استبدال بالدراہم والدنانیر کی اجازت دی تھی جبکہ قاریٔ الہدایہؒ اور علامہ ابن نجیمؒ نے اپنے زمانہ کی شریت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی ممانعت فرمائی ہے، علامہ ابن عابدینؒ نے احوط ابن نجیمؒ کے ہی قول کو قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

ولا شک أن هذا هو الاحتیاط ولا سیما اذا کان المستبدل من قضاة هذا الزمن وناظر الوقف غیر مؤتمن. (١)

بلاشبہ احتیاط یہی ہے خصوصاً جبکہ مستبدل ہمارے زمانہ کے قاضی ہوں اور متولی بھی قابل اعتماد نہ ہوں۔

احقر کی رائے میں علامہ ابن نجیمؒ کی رائے کا اگر یہی مطلب لیا جائے کہ موقوفہ زمین کو زمین کے بدلہ بیچ کر حاصل ہونے والی زمین وقف کی جائے جیسا کہ ان کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے تو اس میں کافی تنگی محسوس ہوتی ہے خصوصاً آج کل کے زمانے میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو استبدال کے لئے ایسا شخص تلاش کرنا پڑے گا جس کی زمین وقف کے لئے بہتر ہو اور وہ اس زمین کی جگہ موقوفہ زمین لینے پر تیار بھی ہو، ایسا شخص ملنا مشکل ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آج کل اشیاء کا تبادلہ اشیاء کے ساتھ کرنے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے، اشیاء کا تبادلہ کرنسی یا رائج الوقت نقود کے ذریعہ کیا جاتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ استبدال کسی وجہ سے کیا جا رہا ہوگا کہ موقوفہ زمین سے یا تو آمدنی کم حاصل ہو رہی ہوگی یا اس میں رہائش مشکل ہوگی ایسی صورتحال میں کوئی شخص اپنی بہتر محل وقوع کی زمین دے کر یہ موقوفہ زمین کیوں خریدے گا؟

ان وجوہ کی وجہ سے احقر کے نزدیک آج کل وقف کو نقد رقم کے عوض بیچ کر اگلی زمین خریدنا جائز ہونا چاہئے البتہ اس نقد رقم کے ذریعہ کوئی زمین خرید کر اسے وقف کرنے کو یقینی بنانے کے لئے اور بدعنوانی سے وقف کی حفاظت کے لئے سابقہ ذکر کردہ متفقہ شرائط کے ساتھ ساتھ مزید احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، جن میں سے چند ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

---

(١) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ١٤٠٦ھ (٣٨٧/٤)

استبدال بالعقار دون الدراہم کا دوسرا مطلب:

البتہ اگر علامہ کی اس رائے استبدال بالعقار دون بالدراہم والدنانیر کا یہ مطلب لیا جائے کہ وقف زمین بیشک نقد رقم کے عوض بیچی جاسکتی ہے لیکن اس نقد رقم سے کوئی زمین خرید کر وقف کرنا ضروری ہے وہ نقد رقم (ثمن) وقف نہ کی جائے، تو ایسی صورت میں یہ رائے واقعی قابلِ ترجیح ہوگی، کیونکہ نقد رقم کے وقف میں بدعنوانیوں کے جتنے امکانات ہیں وہ زمین وعقار کے وقف میں نہیں ہیں، اس سے حفاظت کے لئے یہ شرط بہت مفید ہے اگر یہ راستہ کھول دیا جائے کہ موقوفہ زمین بیچ کر اس کی وصول شدہ قیمت نقد رقم کی شکل میں وقف کی جاسکتی ہے تو بدعنوانیوں کا ایک باب کھل جائے گا کہ جو وقف زمین میں بدعنوانی نہیں کر سکے گا وہ اسے بیچ کر اس کی قیمت وقف کر دے گا اور اس نقد رقم کے وقف میں جتنی بدعنوانیاں کرنا چاہے کر سکتا ہے۔

استبدالِ وقف کو بدعنوانیوں سے بچانے کے لئے مزید شرائط:

فقہاءِ کرامؒ نے استبدال وقف کے لئے یہ جو کچھ شرائط بیان کی ہیں ظاہر ہے کہ یہ منصوص نہیں بلکہ انہوں نے اپنے اپنے زمانہ کے اعتبار سے یہ شرائط طے کی ہیں اور سب کا مقصد یہی ہے کہ استبدال کو وقف کے تعطل اور وقف میں بدعنوانی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

موجودہ زمانہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے مالی معاملات کو شفاف بنانے کے لئے جدید حسابی معاییر (Accounting Standards) وجود میں آگئے ہیں، انہیں سامنے رکھتے ہوئے مزید کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں اور ان تدابیر کو شرط کا درجہ بھی دیا جاسکتا ہے۔

استبدال کا اختیار کمیٹی کو ہو:

(۱) واقف استبدال کا اختیار تنہا اپنے لئے یا تنہا کسی اور کے لئے نہ رکھے بلکہ تین یا اس سے زیادہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی منتخب کی جائے جس میں واقف خود بھی ہوسکتا ہے یا جس کے لئے وہ اختیار رکھنا چاہ رہا ہے وہ بھی اس کمیٹی کا ایک ممبر ہوسکتا ہے، یہ کمیٹی استبدال کے تمام امور کا فیصلہ اور اس کی نگرانی کرے۔

کمیٹی کے ارکان:

(۲) کمیٹی میں مقامی یونین کونسل کا ایک بااختیار فرد اور ایک مستند ومعتبر عالمِ دین ہو تیسرا رکن واقف

خود ہو یا جسے وہ نامزد کرنا چاہے وہ ہو۔
اور اگر وقف کے موقوف علیہم متعین اور محدود ہوں تو موقوف علیہم کی طرف سے بھی ایک رکن نامزد ہونا چاہئے۔

وقف کے نام سے اکاؤنٹ کھولا جائے:

(۳) وقف کا وقف کے نام اور عنوان سے حکومت کے منظور شدہ بینک میں اکاؤنٹ کھولا جائے، نقود کی تمام آمد و رفت کے لئے یہ اکاؤنٹ ہی استعمال کیا جائے۔ براہِ راست نقد رقم کا لین دین نہ کیا جائے۔

جوائنٹ اکاؤنٹ ہو:

(۴) یہ اکاؤنٹ تنہا واقف یا متولی کے دستخط سے نہ چلایا جائے بلکہ اس اکاؤنٹ میں کسی بھی ٹرانزکشن کے لئے دو یا اس سے زیادہ افراد کے دستخط ضروری قرار دیئے جائیں۔

اسٹامپ پیپر پر معاہدہ ہو:

(۵) استبدال کی صورت میں جب وقف مکان بیچا جائے تو باقاعدہ قانونی معاہدہ (ایگریمنٹ) اسٹامپ پیپر پر کیا جائے۔
(۶) وقف مکان کی جو قیمت طے ہو وہ نقد کی شکل میں خریدار سے وصول نہ کی جائے بلکہ وقف کے اکاؤنٹ کے نام ڈارفٹ، پے آڈر یا کراس چیک لیا جائے۔
(۷) اس رقم سے جب دوسرا مکان یا زمین خریدی جائے تو اس موقعہ پر بھی باقاعدہ معاہدہ اسٹامپ پیپر پر کیا جائے۔

قیمت کی ادائیگی پے آرڈر وغیرہ کے ذریعہ ہو:

۸۔ بائع کو قیمت کی ادائیگی نقد کی شکل میں نہ کی جائے بلکہ وقف کے اکاؤنٹ سے بائع کے نام ڈارفٹ، پے آڈر یا کراس چیک بنایا جائے۔
ان تدابیر اور شرائط کو ملحوظ رکھنے سے توقع ہے کہ استبدال وقف میں ممکنہ بدعنوانیوں کا سد باب ہو سکے گا اور فقہاء کرامؒ نے یہ جو شرائط عائد کی ہیں ان کا حقیقی مقصد حاصل ہو سکے گا۔

ایک مرتبہ استبدال کے بعد کیا واقف کو دوبارہ استبدال کا اختیار حاصل ہے؟

وقف نامہ میں وقف کرتے وقت اگر واقف نے اپنے لئے یا کسی اور کے لئے بار بار استبدال کی شرط نہ رکھی ہو صرف استبدال کا ذکر کیا ہو تو ایسی صورت میں واقف کو صرف ایک مرتبہ استبدال کا اختیار حاصل ہے، دوبارہ وہ استبدال نہیں کرسکتا۔

اور اگر بار بار استبدال کی صراحت کی ہو تو پھر اس شرط کے مطابق واقف کو بار بار استبدالِ وقف کا اختیار حاصل ہوگا کہ مثلاً ایک مرتبہ وقف کو بیچ کر اس کی جگہ دوسری جگہ خرید کر وقف کر دی، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ دوسری جگہ وقف کے لئے بہتر ثابت نہ ہوئی تو اسے بیچ کر کوئی تیسری جگہ بھی خرید کر وقف کی جاسکتی ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولیس له بعد استبداله مرةً أن یستبدل ثانیاً لانتهاء الشرط بمرة الا أن یذکر عبارة تفید له ذلک دائماً. (۱)

واقف کے لئے ایک مرتبہ استبدال کے بعد جائز نہیں ہے کہ دوبارہ استبدال کرے کیونکہ شرط ایک مرتبہ استبدال سے پوری ہوگئی، الا یہ کہ وہ ایسی عبارت وقف نامہ میں ذکر کرے جس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استبدال کا اختیار اسے حاصل ہو۔

مسجد میں استبدال کی شرط لگانا جائز نہیں:

فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے صراحت کی ہے کہ عام اوقاف میں تو واقف وقف کرتے وقت استبدال کی شرط لگاسکتا ہے لیکن مسجد میں استبدال کی شرط لگانا جائز نہیں کیونکہ مسجد کا مقصد یہ ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے، اس سے آمدنی مقصود نہیں، لہٰذا زمین کی قیمت کم ہوجائے یا امن وامان کی صورتحال بہتر نہ ہو تو تب بھی مسجد کا مقصود فوت نہیں ہوتا اس لئے اس میں استبدال کی ضرورت نہیں البتہ اگر ایسی صورتحال پیش آجائے کہ مسجد ویران ہوجائے اس کے آس پاس آبادی نہ رہے تو ایسی صورت کے مخصوص شرعی احکام ہیں جو ہم وقف کے مصرف کے تحت بیان کرچکے ہیں۔

امام خصافؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۳۹/۵) مزید دیکھئے: رد المحتار (۳۸۵/۴)

قلت: فان جعل داره مسجدا و اشترط أن له بيعه والاستبدال بثمنه؟
قال: اشتراطه باطل وليس له أن يبيع المسجد من قبل أن المسجد ليس يراد منه الغلة وانما يراد منه الصلاة فيه، والصلاة فی هذا المسجد وغيره سواء، لو جاز له الاستبدال به لكان واحداً وانما تبنى المساجد للصلاة لا لغير ذلک.(۱)

میں نے دریافت کیا کہ اگر اپنے گھر کو کسی نے مسجد بنایا اور یہ شرط لگادی کہ اسے بیچنے اور اس کی قیمت سے دوسری جگہ خرید کر مسجد بنانے کا حق ہے؟

فرمایا کہ یہ شرط باطل ہے اور اسے اس مسجد کو بیچنے کا اختیار نہیں، کیونکہ مسجد سے آمدنی مقصود نہیں بلکہ مسجد سے مقصود یہ ہے کہ اس میں نماز پڑھی جائے اور نماز اس مسجد میں اور اس کے علاوہ کسی اور مسجد میں برابر ہے، استبدال کا کوئی فائدہ نہیں، مسجد تو صرف نماز ہی کے لئے بنائی جاتی ہے کسی اور مقصد کے لئے نہیں بنائی جاتی۔

واقف نے استبدال کی شرط نہ لگائی ہو تو ایسی صورت میں استبدال کا حکم:

واقف نے اگر وقف کرتے وقت استبدال کی شرط نہ لگائی ہو تو ایسی صورت میں عام حالات میں واقف یا متولی وقف استبدال نہیں کرسکتا، البتہ اگر ایسی صورتحال پیش آجائے کہ:

(۱) وقف بالکل قابلِ انتفاع نہ رہے یعنی اس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ رہے۔

(۲) اور وقف کی کوئی ایسی آمدنی بھی نہ ہو جس سے اسے قابلِ استفادہ بنایا جاسکے تو متدین قاضی کو شرعاً اجازت حاصل ہے کہ وہ استبدال کی ماقبل میں ذکر کردہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اس وقف کو بیچ دے اور اس کی قیمت سے دوسری زمین یا گھر خرید کر پہلے ہی مصرف پر وقف کردے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والمعتمد أنه بلاشرط يجوز للقاضی بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلية وأن لايكون هناک ريع للوقف يعمره به وشرط فی الاسعاف

---

(۱) الخصاف، ابوبكر احمد بن عمرو الشيبانی المعروف بالخصاف. احكام الاوقاف، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۹۹۹م (۱۳۵) نیز دیکھئے: هلال الرای، هلال بن يحيىٰ بن مسلم الرای. كتاب احكام الوقف، حيدر آباد دكن، دائرة المعارف العثمانية ۱۳۵۵ه (۱۰۰)

أن يكون المستبدل قاضي الجنة المفسر بذى العلم و العمل لئلا يحصل التطرق الى ابطال أوقاف المسلمين كما هو الغالب في زماننا.[1]

قابلِ اعتماد بات یہ ہے کہ اگر واقف نے استبدال کی شرط نہ لگائی ہوتو استبدال کی اجازت صرف قاضی کو ہے بشرطیکہ وقف بالکلیہ قابلِ انتفاع نہ رہا ہو، اور وقف کی کوئی آمدنی بھی نہ ہو جس سے اس کی تعمیر کی جاسکے، اور اسعاف میں یہ بھی شرط ہے کہ وقف کے استبدال کرنے کی اجازت قاضی جنۃ کو ہے یعنی وہ قاضی جس کے پاس علم بھی ہو اور عمل بھی، یہ شرط اس وجہ سے لگائی گئی ہے کہ مسلمانوں کے اوقاف کو کوئی باطل کرنے کا راستہ تلاش نہ کرسکے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں ہو رہا ہے۔

واقف کے استبدال کی شرط لگانے کی صورت میں استبدال کی جو شرائط ماقبل میں تحریر کی گئی ہیں ان میں ان تین شرطوں کا اضافہ کرلیا جائے، ان تمام شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اس صورت میں بھی استبدال کی گنجائش ہوگی جب واقف نے اپنے لئے استبدال کی شرط نہ لگائی ہو۔

اگر واقف نے استبدال نہ کرنے کی شرط لگائی ہوتو اس کا شرعی حکم:

استبدال کی تیسری صورت یہ ممکن ہے کہ واقف نے وقف میں یہ شرط لگائی ہو کہ اس وقف کا استبدال نہیں کیا جاسکتا، تو آیا یہاں استبدال کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟

فقہاءِ کرامؒ کے نزدیک واقف کی عدمِ استبدال کی شرط معتبر نہیں، اگر وقف بالکل قابل انتفاع نہ رہے اور اس کی تعمیر وآبادی کی کوئی صورت نہ رہے تو قاضی استبدال کی دیگر شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے وقف کے استبدال کا فیصلہ کرسکتا ہے، کیونکہ واقف کی یہ شرط مصلحتِ وقف اور مصلحت موقوف علیہم کے بالکل خلاف ہے۔

علامہ طرسوسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

فالواقف اذا شرط أن لايستبدل بالوقف حتى رأى الحاكم المصلحة للوقف في استبداله فاجتمع معنا نص الواقف ورأى الحاكم

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولىٰ ۱۴۰۶ھ (۳۸۶/۴)

والمخالفة بينهما ظاهرة فان عملنا بما شرطه الواقف فقد فوتنا مصلحة الوقف وتتعطل مصلحة الموقوف عليهم، وان نظرنا الى رأى الحاكم فقد عملنا بمصلحته فبقى شرط الواقف فى معنى اشتراط شرط لافائدة فيه للوقف واشتراطه شرطا لافائدة فيه ولا مصلحة للوقف غير مقبول …… فاذا رأى الحاكم المصلحة لجهة الوقف فى الاستبدال فعله ولا يضره قول الواقف · لايستبدل به. [1]

واقف نے یہ شرط لگادی کہ وقف کوتبدیل نہیں کیا جاسکتا، جبکہ قاضی یا حاکم وقف کی مصلحت اس میں سمجھتا ہے کہ اسے تبدیل کردیا جائے، اب ہمارے سامنے واقف کی شرط بھی ہے اور قاضی کی رائے بھی، دونوں میں تضاد واضح ہے۔

اگر ہم واقف کی شرط پرعمل کرتے ہیں تو وقف کی مصلحت فوت ہوجاتی ہے اور موقوف علیہم کی مصلحت بالکل نظر انداز ہوجاتی ہے، اور اگر حاکم کی رائے پرعمل کرکے استبدال کردیں تو اس میں وقف کی مصلحت حاصل ہورہی ہے تو ہم واقف کی شرط کو ایسی شرط قرار دیں گے جس میں وقف کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور واقف کی ایسی شرائط جن وقف کی کوئی مصلحت اور فائدہ نہ ہو وہ باطل ہوتی ہیں مقبول نہیں ہوتیں، لہٰذا اگر حاکم وقف اور موقوف علیہم کی مصلحت اس میں سمجھتا ہے کہ وقف کوتبدیل کردیا جائے تو وہ ایسا ہی کرلے واقف کا یہ شرط لگانا کہ وقف کوتبدیل نہیں کیا جاسکتا قاضی وحاکم کے لئے کوئی مضر نہیں۔

موقوفہ زمین سے بہتر جگہ دستیاب ہوتو کیا بلاشرط استبدال کی گنجائش ہوگی؟

اب تک استبدال کے بارے میں جو تفصیل ذکر کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہے کہ اگر واقف نے استبدال کی شرط نہ لگائی ہو یا عدمِ استبدال کی شرط لگائی ہو تو ان دونوں صورتوں میں استبدال کی گنجائش اس وقت ہے جبکہ وقف بالکل قابل انتفاع نہ رہے، البتہ اگر واقف نے استبدال کی شرط لگائی ہو تو ایسی صورت میں استبدال کے لئے وقف کا بالکل قابلِ انتفاع نہ ہونا شرط نہیں بلکہ واقف جب مناسب سمجھے استبدال کا فیصلہ کرسکتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر واقف نے استبدال کی شرط اپنے لئے یا کسی اور کے لئے نہ لگائی ہو

---

(۱) الطرسوسی، ابراهيم بن على الطرسوسى. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶م (۱۱۶) نیز دیکھئے: حوالہ بالا

اور صورتحال یہ پیش آ جائے کہ اس وقف سے ہر لحاظ سے بہتر جگہ اسی قیمت پر دستیاب ہو اس کی آمدنی بھی اس وقف سے زیادہ ہو محل وقوع اور محلّہ بھی اس سے بہتر ہو تو کیا ایسی صورت میں بہتر فوائد حاصل کرنے کے لئے اس وقف کو بیچ کر اس کی قیمت سے وہ بہتر جگہ خریدنے کی گنجائش ہے؟

علامہ ابن نجیمؒ نے الاشباہ والنظائر میں اس کی گنجائش دی ہے فرماتے ہیں:

استبدال الوقف العامر لایجوز الا فی مسائل: الأولیٰ: لو شرطه الواقف، الثانیة: اذا غصبه غاصب وأجری الماء علیه حتی صار بحراً لا یصلح للزراعة فیضمنه القیم القیمة واشتری بها أرضاً بدلاً، الثالثة: أن یجحده الغاصب ولا بینة وهی فی الخانیة، الرابعة: أن یرغب انسان فیه ببدل أکثر غلة وأحسن وصفا فیجوز علی قول أبی یوسف وعلیه الفتویٰ کما فی فتاویٰ قاری الهدایة. [1]

آباد وقف کا استبدال جائز نہیں ہے، سوائے چند صورتوں میں:

نمبر۱: واقف نے استبدال کی شرط لگائی ہو۔

نمبر۲: وقف زمین کو غاصب نے غصب کر لیا ہو اور اس پر اتنا پانی بہایا ہو کہ وہ قابل زراعت نہ رہی ہو تو متولی اس غاصب کو موقوفہ زمین کی قیمت کا ضامن بنائے گا اور اس سے دوسری زمین خریدے گا جو پہلے کی جگہ وقف ہوگی۔

نمبر۳: غاصب نے غصب کر لیا ہو اور انکار کر رہا ہو اس کے خلاف کوئی بینہ نہ ہو۔

نمبر۴: کوئی شخص وقف زمین میں دلچسپی رکھتا ہو اور اس کی جگہ ایسی زمین دے رہا ہو جس کی آمدنی اس سے زیادہ ہو اور محل وقوع بھی اس سے اچھا ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں استبدال جائز ہے، اسی پر فتویٰ ہے جیسا کہ فتاویٰ قاریٔ الہدایہ میں ہے۔

راجح یہ ہے کہ ایسی صورت میں استبدال جائز نہیں:

لیکن جمہور فقہاء کرامؒ نے اس کی تردید کی ہے اور راجح یہ قرار دیا ہے کہ ایسی صورت میں استبدال جائز نہیں۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. الاشباه والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۱۰۶/۲ کتاب الوقف)

علامہ طحطاویؒ نے اجابۃ السائل کے حوالہ سے صدرالشریعہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

ونحن لا نفتی به وقد شاهدنا فی الاستبدال مالایعد ولا یحصی فان ظلمة القضاة جعلوه حیلة لابطال أوقاف المسلمین. [۱]

ہم اس قول پر فتویٰ نہیں دیتے کیونکہ استبدال میں وہ خرابیاں دیکھی ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ اس طرح تو ظالم قاضی اسے مسلمانوں کے اوقاف ختم کرنے کا ذریعہ بنالیں گے۔

صدرالشریعۃ کا یہ قول نقل کرنے کے بعد صاحب اجابۃ السائل فرماتے ہیں:

ولعمری أن هذا أعز من الکبریت الأحمر وما أراه الا لفظاً یذکر فالاحری فیه السد خوفا من مجاوزة الحد. [۲]

میری زندگی کی قسم صدرالشریعۃ کا یہ ارشاد کبریت احمر سے بڑھ کر ہے اور یہ الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں، احتیاط یہی ہے کہ حد سے تجاوز کر جانے کے خوف سے یہ راستہ بند ہی رکھا جائے۔

وجہِ ترجیح:

اس صورت میں استبدال کے ناجائز ہونے کی وجہ علامہ ابن الہمامؒ نے فتح القدیر میں تحریر فرمائی ہے:

والحاصل أن الاستبدال اما عن شرطه الاستبدال وهو مسئلة الکتاب أولا عن شرطه فان کان لخروج الوقف عن انتفاع الموقوف علیهم به فینبغی أن لایختلف فیه کالصورتین المذکورتین لقاضی خان وان کان لا کذلک بل اتفق انه أمکن أن یؤخذ بثمن الوقف ماهو خیر منه مع کونه منتفعاً به فینبغی أن لایجوز لأن الواجب ابقاء الوقف علی ماکان علیه دون زیادة اخری ولانه لاموجب لتجویزه لأن الموجب فی الأول الشرط وفی الثانی الضرورة ولا ضرورة فی هذا اذا لاتجب الزیادة فیه بل تبقیه کما کان. [۳]

---

(۱) الطحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی. حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار، کوئٹه، المکتبة العربیة (۵۴۶/۲)

(۲) حواله بالا و کذا فی رد المحتار (۳۸۸/۴)

(۳) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۴۴۰/۵)

حاصل یہ ہے کہ استبدال یا تو اس وجہ سے کیا جائے گا کہ واقف نے شرط لگائی تھی تو یہ جائز ہے اور یا اس صورت میں استبدال ہوگا کہ واقف نے شرط نہ لگائی ہو تو اگر اس وجہ سے استبدال کیا جارہا ہے وقف سے موقوف علیہم بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو اس کے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں ہونا چاہئے، اور اس وجہ سے استبدال ہو کہ اس وقف کی قیمت سے ایسی جگہ خریدی جاسکتی ہے جو موقوفہ جگہ سے بہتر ہے حالانکہ وقف قابلِ انتفاع ہے تو اس صورت میں استبدال جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وقف کو اپنے حال پر باقی رکھنا ضروری ہے اس میں اضافہ کرنا ضروری نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ استبدال یا تو شرط کی وجہ سے جائز تھا یا ضرورت کی وجہ سے، یہاں نہ شرط پائی جارہی ہے اور نہ ضرورت، کیونکہ وقف میں اضافہ ضرورت نہیں بلکہ وقف کو اپنے حال پر باقی رکھنا ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ جب وقف قابلِ انتفاع ہو تو اسے کسی دوسری جگہ سے بدلنا جائز نہیں۔

وقف کے ملازمین کی تنخواہوں یا موقوف علیہم کے وظائف میں کمی بیشی کی شرط:

۸۔ وقف کرتے وقت واقف نے یہ شرط لگائی کہ وہ وقف کے ملازمین کی تنخواہ میں کمی بیشی کرسکتا ہے یا موقوف علیہم کے وظائف میں کمی بیشی کرسکتا ہے تو یہ شرط بھی شرعاً جائز ہے۔

علامہ ابن الہمامؒ تحریر فرماتے ہیں:

وعلىٰ وزان هذا لو شرط لنفسه أن يقبض من المعاليم اذا شاء ويزيد ويخرج من شاء ويستبدل به كان له ذلک وليس لقيمه الا أن يجعله له. (۱)

استبدال کی شرط کی طرح اگر واقف اپنے لئے یہ شرط لگادے کہ وہ وظائف میں کمی یا زیادتی کرسکتا ہے اور جسے چاہے نکال سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے کو رکھ سکتا ہے تو اسے اس شرط کی وجہ سے یہ اختیار حاصل ہوگا، متولی وقف کو یہ اختیار نہیں ہوگا البتہ اگر واقف اس کے لئے یہ بھی شرط لگادے تو اسے یہ اختیار حاصل ہوجائے گا۔

---

(۱) ابن الهمام، كمال الدين محمد بن عبد الواحد الاسكندري المتوفى ۸۶۱ھ. فتح القدير، كوئٹہ، مكتبہ رشيديہ (۴۴۰/۵) مزید دیکھئے: رد المحتار (۳۸۵/۴) ہنديہ (۴۰۲/۲) المحيط البرهاني (۸/۹)

موقوف علیہم میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی شرط:

۹۔ واقف نے وقف کی دیگر شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی اولاد یا کسی مخصوص و معین طبقہ پر وقف کیا اور یہ شرط لگا دی کہ وہ جب چاہے ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دے سکتا ہے تو یہ شرط درست ہے اور اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کو ترجیح دے کر اسے وقف کی آمدنی میں سے زیادہ دے اور دوسروں کو کم دے۔

لیکن اس صورت میں اگر واقف یہ چاہے کہ کسی کو وقف کی مکمل آمدنی دیدے اور دوسروں کو محروم کردے تو یہ طرزِ عمل درست نہیں ہوگا کیونکہ واقف نے تفضیل اور ترجیح کی شرط لگائی تھی کسی کو محروم کرنے کا اختیار نہیں رکھا تھا ترجیح کی صورت یہی ہوتی ہے کہ سب کو دیا جائے لیکن کسی کو دوسروں پر فوقیت دے کر زیادہ دیدیا جائے۔ المحیط البرہانی میں ہے:

> اذا قال أرضي صدقة موقوفة على بني فلان على أن أفضل من شئت منهم كان ذالک جائزاً ويكون له أن يفضل من شاء ...... ولو حرم بعضهم ليس له ذلک، لانه جعل لنفسه المشيئة في تفضيل البعض على البعض لافي الحرمان.[1]

اگر واقف نے کہا کہ میری یہ زمین بنی فلاں پر وقف ہے بشرطیکہ مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں ان میں سے جسے چاہوں دوسروں پر ترجیح دے سکتا ہوں تو یہ شرط جائز ہے اور وہ جسے چاہے ترجیح دے سکتا ہے لیکن اگر وہ ان میں سے کسی کو بالکل محروم کردے تو اس کا اسے اختیار نہیں کیونکہ اس نے بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی شرط لگائی تھی نہ کہ بالکل محروم کردینے کی۔

موقوف علیہم میں سے بعض کی تخصیص کی شرط:

۱۰۔ واقف نے وقف میں یہ شرط لگائی کہ وہ موقوف علیہم میں سے جسے چاہے وقف کی آمدنی کے لئے مخصوص کرسکتا ہے تو یہ شرط بھی درست ہے واقف کو اختیار ہوگا کہ موقوف علیہم میں سے سب کو محروم کر کے ایک کو وقف کی آمدنی کے لئے مخصوص کرلے۔

---

(۱) ابن مازه البخاري، برهان الدن ابو المعالي محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاري ۶۱۶ ۵ھ. المحيط البرهاني، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۱۲/۹) وكذا في هنديه (۲/۴۰۴)

علامہ طرابلسیؒ تحریرفرماتے ہیں:

ولو قال: على أن لى أن اخص غلتها بمن شئت منهم جاز له أن يخصها بواحد منهم مطلقاً أو مدة معينة ولو احد بعد واحد. (١)

اگر واقف نے کہا کہ مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ میں وقف کی آمدنی کیلئے موقوف علیہم میں سے جسے چاہوں خاص کرلوں تو اس کے لئے موقوف علیہم میں سے کسی ایک کو ہمیشہ کے لئے یا متعینہ مدت کے لئے خاص کر لینا جائز ہے اور ایک کے بعد ایک کو خاص کرسکتا ہے۔

موقوف علیہم میں سے کسی کو دینے اور کسی کو محروم کرنے کی شرط:

١١۔ واقف نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگائی کہ وہ موقوف علیہم میں سے جسے چاہے دے گا اور جسے چاہے محروم کردے گا تو یہ شرط بھی شرعاً درست ہے اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے دے اور جسے چاہے محروم کردے۔ المحیط البرہانی میں ہے:

ولو قال: على أن لى أحرم من شئت منهم فهو كما قال وله أن يحرم من شاء منهم. (٢)

اگر واقف نے کہا کہ میں جسے چاہوں محروم کرسکتا ہوں تو اسے یہ اختیار حاصل ہے۔

علامہ طرابلسیؒ تحریرفرماتے ہیں:

ولو قال: أرضى هذه صدقة موقوفة لله عزوجل ابداً على أن لى أن أعطى غلتها لمن شئت من بنى فلان صح الوقف والشرط وله أن يجعل غلتها لمن شاء منهم. (٣)

---

(١) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ١٣٢٠ھ (١٢٧) وكذا فى هنديه (٤٠٥/٢)

(٢) ابن مازه البخارى، برهان الدن ابو المعالى محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخارى ٦١٦ھ. المحيط البرهانى، كراچى، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ٢٠٠٤م (١٢/٩) وكذا فى هنديه (٤٠٤/٢)

(٣) الطرابلسی، ابراهيم بن موسىٰ بن ابى بكر الطرابلسى. الاسعاف فى احكام الاوقاف، مصر، مكتبه هنديه ١٣٢٠ھ (١٢٨)

اگر واقف نے کہا کہ میری یہ زمین اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے وقف ہے بشرطیکہ میں اس کی آمدنی بنی فلاں میں سے جسے چاہوں دے سکتا ہوں تو وقف اور شرط دونوں درست ہیں اور اسے اختیار ہے کہ ان میں سے جسے چاہے آمدنی دے۔

اخراج کی شرط:

۱۲۔ واقف نے مخصوص لوگوں پر وقف کیا اور یہ شرط لگائی کہ میں ان میں سے جسے چاہوں وقف سے نکال سکتا ہوں تو یہ شرط بھی درست ہے۔[1]

ادخال کی شرط:

۱۳۔ واقف نے وقف کیا اور یہ شرط لگادی کہ وہ جسے چاہے موقوف علیہم میں داخل کرسکتا ہے اور اسے وقف کی آمدنی سے دے سکتا ہے تو یہ شرط بھی درست ہے اور وہ جسے چاہے اسے موقوف علیہم میں داخل کرسکتا ہے چاہے وہ فقیر ہو یا غنی، رشتہ دار ہو یا اجنبی۔

الاسعاف میں ہے:

ولو قال: علی أن ادخل معهم من شئت جاز له ان یدخل معهم من شاء ولو غنیا ولیس له أن یخرج منهم احدا لعدم شرطه ایاه.[2]

اگر واقف نے کہا کہ میں جسے چاہوں موقوف علیہم کے ساتھ داخل کرسکتا ہوں تو اسے اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہے ان کے ساتھ داخل کردے، چاہے وہ مالدار ہی کیوں نہ ہو البتہ جب ایک مرتبہ جسے داخل کردیا اسے نکال نہیں سکتا کیونکہ اس نے اخراج کی شرط نہیں لگائی تھی (اگر اخراج کی شرط بھی لگائی ہو تو پھر نکال سکتا ہے)

احناف کے یہاں اس شرط میں بہت عموم ہے جبکہ شوافع کے نزدیک یہ شرط اطلاق کے ساتھ درست نہیں بلکہ اخراج وادخال کے لئے صفات طے کرنی چاہئیں کہ مثلاً اگر موقوف علیہم اس وصف سے متصف

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۲۴/۵) ولو وقف علی بنی فلان علی ان لی اخراج من شئت منهم فان اخرج معینا صح.

(۲) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ (۱۲۸)

ہوتو اسے وقف سے نکالا جاسکتا ہے اور جو شخص اس وصف سے متصف ہو اسے وقف میں داخل کیا جاسکتا ہے، حنابلہ سے اس سلسلہ میں دونوں روایتیں ہیں البتہ وہ ایک مزید قید کا اضافہ کرتے ہیں کہ اخراج و ادخال موقوف علیہم ہی میں سے ہونا چاہئے، موقوف علیہم سے خارج کسی شخص کو وقف میں داخل نہیں کیا جاسکتا، اور بعض حنابلہ نے واقف کے اپنے لئے ادخال و اخراج کے حق کو تو درست قرار نہیں دیا البتہ متولی کے لئے اگر یہ شرط واقف لگائے تو اسے درست قرار دیا ہے تفصیل علامہ کبیسیؒ کی "أحكام الوقف فی الشريعة الاسلاميه" میں دیکھی جاسکتی ہے۔(۱)

متولی کے عزل کی شرط:

۱۳۔ واقف نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگائی کہ وقف کے متولی کو معزول کرنے کا اختیار مجھے حاصل ہوگا تو یہ شرط بھی شرعاً درست ہے لیکن اگر واقف نے یہ شرط نہ لگائی ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک واقف کو متولی کو معزول کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

المحیط البرہانی میں ہے:

> **وفی فتاویٰ أبی الليث ماهو قريب من هذه المسألة، وصورتها: اذا أخرج الوقف من يده وسلمه الى المتولی ثم اذا أراد اخراجه من يده ان كان شرط فی أصل الوقف أن له الاخراج من يد القيم، فله أن يخرجه من يده لأن شرط الواقف مراعی، وان لم يشترط ذلک فی أصل الوقف فله ان يخرجه من يده عند أبی يوسف خلافاً لمحمد.** (۲)

فتاویٰ ابو اللیث میں اس سے ملتا جلتا مسئلہ ہے کہ واقف نے جب وقف متولی کے حوالہ کر دیا پھر وہ متولی کو معزول کرنا چاہتا ہے تو اگر اصل وقف میں اس نے یہ شرط لگائی تھی کہ اسے متولی کو معزول کرنے کا اختیار ہے تب وہ اسے بالاتفاق معزول کرسکتا ہے کیونکہ واقف کی عائد کردہ شرائط کی رعایت کی جاتی ہے اور اگر اصل وقف میں اس نے یہ شرط نہیں لگائی تھی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تب بھی اسے معزول کرنے کا اختیار ہے جبکہ امام محمدؒ کے نزدیک وہ معزول نہیں کرسکتا۔

---

(۱) الكبيسی، محمد عبيد الكبيسی. احكام الوقف فی الشريعة الاسلامية، بغداد (۱/۲۹۴)

(۲) ابن مازه البخاری، برهان الدين ابو المعالی محمود بن صدر الشريعة ابن مازه البخاری ۶۱۶ ۵. المحيط البرهانی، كراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م (۹/۷)

اگر چہ فتویٰ حضرت ابو یوسفؒ کے قول یہ ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل چھٹے باب میں ''متولی کی حیثیت'' کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

مخصوص مذہب کے مقلد ہونے کی شرط:

۱۵۔ واقف نے وقف کرتے وقت اگر مخصوص مذہب کے مقلد ہونے کی شرط لگادی تو ایسی شرط بھی معتبر ہے اور اس کی رعایت کی جائے گی، مثلاً واقف نے کہا کہ یہ وقف میری اولاد کے لئے ہے لیکن ان میں سے جو فقہ حنفی چھوڑ کر کسی اور مذہب کی تقلید کرنے لگا وہ اس وقف سے محروم ہو جائے گا تو اس شرط کا لحاظ رکھا جائے گا ان میں سے جس نے فقہ حنفی کی تقلید چھوڑ دی وہ وقف سے محروم ہو جائے گا۔

علامہ اندریتیؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولو أن رجلا جعل أرضه صدقة موقوفة على ولده و نسله وعقبه ابداً ماتناسلوا ومن بعدهم على الفقراء والمساكين وشرط في الوقف أن كل من انتقل من مذهب أبي حنيفةؒ الى مذهب الشافعيؒ خرج من الوقف فهو على ماشرط ولو خرج واحد منهم الى مذهب الشافعي خرج من الوقف.[1]

اگر کسی شخص نے اپنی زمین اپنی اولاد اور نسل کے لئے اور ان کے بعد فقراء و مساکین کے لئے وقف کی اور یہ شرط لگادی کہ ان میں سے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے امام شافعیؒ کے مذہب کی طرف منتقل ہوگا وہ وقف سے نکل جائے گا تو اس شرط کا اعتبار کیا جائے گا، لہٰذا جو امام شافعیؒ کا مذہب اختیار کرے گا وہ وقف سے نکل جائے گا۔

اعتزال کی شرط:

۱۶۔ اسی طرح اگر معتزلی نے وقف کیا اپنی اولاد پر اور یہ شرط لگادی کہ جو اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب اختیار کرے گا وہ وقف سے خارج ہو جائے گا اس شرط کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الاندريتي، عالم بن العلاء الانصاري الاندريتي. الفتاوى التتارخانيه، كراچي، ادارة القرآن، الطبعة الاولىٰ ۱۴۱۱ھ (۷۶۶/۵)

لو كان الواقف من المعتزلة وشرط أن من انتقل الى مذهب اهل السنة صار خارجاً اعتبر شرطه. (۱)

اس طرح کی شرائط کو علامہ ابن الہمامؒ کی اس عبارت کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جو ہم نے ماقبل میں ذمی کے وقف کے ذیل میں ذکر کی ہے کہ جو معتزلی اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب اختیار کرلے اس کا وقف سے محروم ہونا اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ راہ راست پر آ گیا ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ واقف اسے دینا نہیں چاہتا، اس میں واقف کی بیان کردہ شرط نہیں پائی جارہی اور واقف کو اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے دے جسے نہ دینا چاہے نہ دے، مسلمان خواہ کسی بھی فرقہ سے یا مسلک سے تعلق رکھتا ہو اس پر تصدق باعثِ قربت ہے، فقہاء کرام نے تو ذمی پر تصدق کو بھی باعثِ قربت قرار دیا ہے۔

واقف یا چندہ دہندگان کا طلبہ کے لئے ہفتہ میں متعینہ ایام حاضری کی شرط لگانا:

۱۷۔ واقف نے طلبہ علم دین کے لئے جائیداد وقف کرتے وقت یا چندہ دہندگان نے طلبہ کے لئے چندہ دیتے وقت یہ شرط لگائی کہ مثلاً ایک ہفتہ میں کم از کم پانچ دن درس میں حاضری شرط ہے جو پانچ دن درس میں حاضر نہیں ہوگا اسے وظیفہ نہیں ملے گا یا مدرسہ میں رہائش کا استحقاق نہیں ہوگا یا کھانا نہیں ملے گا، تو یہ شرط بھی شرعاً درست ہے اور اس کی تعمیل کی جائے گی، جو طالب علم مذکورہ بالا شرط کو پورا نہیں کرے گا اسے وظیفہ، رہائش یا طعام کا استحقاق نہیں ہوگا، یہ شرط مصلحتِ وقف کے عین مطابق ہے کہ واقف یا چندہ دہندگان چاہتے ہیں کہ ان کے وقف کی آمدنی یا چندہ سے وہ لوگ استفادہ کریں جو علمِ دین صحیح طریقہ سے حاصل کرکے دین کی ترویج واشاعت کا باعث بنیں لہٰذا وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس طرح کی شرائط عائد کرسکتے ہیں۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وبهذا ظهر غلط من يستدل من المدرسين أو الطلبة بما فى الفتاوىٰ على استحقاقه المعلوم بلا حضور الدرس لاشتغاله بالعلم فى غير

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه (۲۴۶/۵) وکذا فی الهندیه (۳۰۶/۲)

تلک المدرسة فان الواقف اذا شرط علی المدرسین والطلبة حضور الدرس فی المدرسة أیاما معلومة فی کل جمعة فانه لا یستحق المعلوم الا من باشر خصوصاً اذا قال الواقف: من غاب عن المدرسة یقطع معلومه فانه یجب اتباعه ولا یجوز للناظر الصرف الیه زمن غیبته وعلی هذا لو شرط الواقف ان من زادت غیبته علی کذا اخرجه الناظر وقرر غیره اتبع شرطه.[1]

اس تفصیل سے ان مدرسین وطلبہ کی غلطی ظاہر ہے جو بعض فتاویٰ کی عبارت سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر مدرسین وطلبہ درس میں حاضر نہ ہوں اور کسی اور مدرسہ میں تحصیل علم میں مشغول ہوں تو وہ وظیفہ کے مستحق رہیں گے، اگر واقف نے مدرسین اور طلبہ پر ہفتہ میں چند متعینہ ایام مدرسہ میں اسباق میں حاضری کی شرط لگادی ہو تو وہی وظیفہ کا مستحق ہوگا جو اس شرط کو پورا کرے گا، خصوصاً اگر واقف نے یہ بھی کہہ دیا یا لکھ دیا ہو کہ جو مدرسہ سے غائب رہے گا اس کا وظیفہ بند کردیا جائے گا اس شرط کی اتباع واجب ہے اور متولی وقف کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ایام غیر حاضری کا وظیفہ ایسے مدرسین وطلبہ کو دے، اسی طرح اگر واقف نے یہ شرط لگائی کہ جس کی غیر حاضری اتنی ہوگئی تو اسے متولی نکال دے گا اور وہ وظیفہ کا مستحق نہیں ہوگا تو اس شرط کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

اس عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ وظیفہ کے استحقاق کے لئے واقف متعینہ ایام میں حاضری کی شرط لگا سکتا ہے، اور جب واقف کو یہ اختیار حاصل ہے تو مدرسہ کی انتظامیہ اور مجلس منتظمہ کو بھی یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے ادارہ کے بنیادی اصول وضوابط میں اس طرح کی شرائط طے کریں کہ مدرسہ سے وظیفہ حاصل کرنے اور مدرسہ سے کھانا یا رہائش کی سہولت حاصل کرنے کے لئے ہفتہ یا مہینہ میں اتنے دن اسباق میں حاضری شرط ہوگی ورنہ ان سہولتوں کا استحقاق نہیں رہے گا، مدرسہ میں چندہ دینے والے جو مدرسہ کے اصول وضوابط کے مطابق خرچ کرنے کے اختیار کے ساتھ چندہ دیتے ہیں یہ شرائط ان کی طرف سے بھی عائد سمجھی جائیں گی اور ان کی تعمیل ضروری ہوگی۔

---

(۱) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۵/۲۲۷)

اس شرط کی موجودہ دور میں ضرورت واہمیت:

آج جبکہ رفتہ رفتہ تدین، احتیاط اور تقویٰ میں کمی ہوتی جارہی ہے اور بے دینی پھیلتی جارہی ہے، وقف کی حفاظت کے لئے اور اس کے اصل مقاصد کے حصول کے لئے اس طرح کی شرائط کا واقف کی طرف سے یا مدرسہ کی انتظامیہ کی طرف سے عائد کرنا اور اس کی بہرصورت تعمیل کرانا اور زیادہ ضروری ہوگیا ورنہ اگر وقف مدرسہ سے سہولیات حاصل کرنے کے لئے اس میں صرف داخلہ لے لینا کافی ہو اور اسباق میں حاضری ضروری نہ ہو تو ان مدارس کا سارا مقصد ہی فوت ہوجائے گا اور مدارس ایسے لوگوں کا مسکن بن کر رہ جائیں گے جن کا مطمح نظر صرف وقف اور مدرسہ سے سہولیات حاصل کرنا ہوگا دین کی تعلیم وتعلم، ترویج و اشاعت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا، اب تو بعض مدارس میں اس طرح کی صورتحال کا مشاہدہ بھی ہورہا ہے، ظاہر ہے یہ صورتحال واقف کی اغراض اور چندہ دہندگان کے مقاصد کے بالکل برخلاف ہے اگر مدرسہ کی انتظامیہ اس کے تدارک کیلئے اپنے قواعد وضوابط میں اس طرح کے اصول طے نہیں کرے گی تو وہ بھی عنداللہ جوابدہ ہوگی۔

اس شرط پر ایک اعتراض:

پاکستان کے بعض دینی مدارس میں اس شرط سے ملتی جلتی ایک شرط مدارس کے اصول وضوابط میں طے کی جاتی ہے کہ مثلاً اگر کسی طالب علم کی مہینہ میں ۲۰ غیر حاضریاں ہوگئیں تو اس کا آدھا وظیفہ سوخت کردیا جائے گا اور اگر ۳۰ غیر حاضریاں ہوگئیں تو پورا وظیفہ بند کردیا جائے گا، ۴۰ غیر حاضریاں ہونے پر کھانا بھی بند کردیا جائے گا اور ۵۰ غیر حاضریاں ہونے پر مدرسہ سے اخراج کردیا جائے گا۔

اس پر بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وظیفہ کاٹنا یا پورا بند کردینا یا کھانا نہ جاری کیا جانا تعزیرِ مالی کی ایک شکل ہے کہ مطلوبہ شرط پورا نہ کرنے پر طالب علم پر مالی جرمانہ لگایا جارہا ہے اور تعزیر مالی احناف کے مفتیٰ بہ قول کے مطابق جائز نہیں اس لئے اس طرح کا اصول مدارس میں طے کرنا جائز نہیں ہونا چاہئے۔

اس کا جواب:

یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ ذکر کردہ صورت میں تعزیرِ مالی کا امکان تب ہوتا جب یہ طالب علم مدرسہ کے اصول وضوابط کے اعتبار سے وظیفہ یا کھانے کا مستحق ہوچکا ہوتا اور پھر اس سے یہ سہولیات واپس

لی جاتیں، یہاں صورتحال یہ ہے کہ جب یہ شرط مدرسہ کے اصول وضوابط میں شامل کردی گئی تو وہ وظیفہ اور کھانے کا مستحق ہی تب ہوگا جب وہ اس شرط کی تعمیل کرے، خلاف ورزی کی شکل میں وہ اس ضابطہ کی رو سے ان سہولیات کا مستحق ہی نہیں ہوگا کسی چیز کے استحقاق کے لئے اگر کچھ شرائط طے کردی جائیں اور شرائط کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں کوئی مستحق نہ قرار دیا جائے تو اسے مالی جرمانہ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، اسے ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک صاحب نے اعلان کیا کہ چالیس دن تک تکبیرِ اولیٰ کی پابندی کرنے والے کو ایک سال تک ماہانہ ہزار روپے دئے جائیں گے، جو لوگ اس شرط کو پورا کریں گے وہ اس انعام کے حقدار ہوں گے اور جو یہ شرط پوری نہیں کرسکیں گے ظاہر ہے انہیں انعام نہیں ملے گا کیونکہ انعام کے استحقاق کے لئے جو شرط تھی وہ انہوں نے پوری نہیں کی، اس انعام نہ ملنے کو کوئی بھی ذی عقل تعزیرِ مالی سے تعبیر نہیں کرے گا کہ تکبیر اولیٰ کی پابندی نہ کرنے پر مالی جرمانہ لگایا گیا ہے یہی صورتحال مدارس کے اصول و ضوابط میں طے کردہ اس شرط کی بھی ہے کہ مدارس کی سہولیات کے مستحق ہونے کے لئے یہ شرط ضابطہ کے طور پر طے کی گئی ہے جو یہ شرط پورا نہیں کرے گا اسے مدرسہ سے سہولیات حاصل کرنے کا استحقاق نہیں ہوگا۔

طلبہ کے علاوہ اوقاف کے دیگر عملہ کے لئے اس طرح کی شرط عائد کرنا:

طلبہ کے علاوہ مدرسین کے لئے بھی اس طرح کی شرط واقف کی طرف سے لگائی جاسکتی ہے یا مدرسہ کے اصول وضوابط میں طے کی جاسکتی ہے بحر کی ذکر کردہ عبارت میں مدرسین کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح وقف کے دیگر عملہ کے لئے یہ شرط طے کی جاسکتی ہے۔

البتہ طلبہ کو مدرسہ سے جو کچھ ملتا ہے اس میں تو صرف وظیفہ ہی کا پہلو ہے لیکن ہمارے عرف میں مدرسین اور وقف کے دیگر عملہ کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس میں اجرت کا پہلو غالب ہے، اس لئے عقد اجارہ کے اعتبار سے بھی یہ شرط لگانا شرعاً درست ہے آجر اجیر سے معاملہ طے کرتے وقت استحقاق اجرت کے لئے یہ شرط لگا سکتا ہے کہ مہینہ میں اتنے ایام اتنے گھنٹہ کام کروگے تو اتنی اجرت کا استحقاق ہوگا ورنہ نہیں۔

طلبہ اور دیگر عملۂ وقف میں فرق:

طلبہ اور دیگر عملۂ وقف کی اس نوعیت کے فرق کی وجہ سے شرط پورا نہ کرنے کی صورت میں دونوں کے عدمِ استحقاق میں یہ فرق ہوگا کہ اگر طالب علم نے اس شرط کی خلاف ورزی کی تو اس کا آدھا یا پورا وظیفہ حسب ضابطہ سوخت ہوجائے گا، جتنے دن وہ درس میں حاضر ہوا ہے اتنے ایام کے وظیفہ کے مطالبہ کا اسے

حق حاصل نہیں ہوگا، جبکہ دیگر عملۂ وقف اگر اس شرط کی خلاف ورزی کرے تو اس کی پوری اجرت سوخت نہیں ہوگی بلکہ جتنے دن اس نے خدمت انجام دی ہے اتنے ایام کی تنخواہ کا اسے استحقاق ہوگا جتنے دن وہ حاضر نہیں ہوا اور اس نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی اتنے ایام کی تنخواہ کا اسے استحقاق نہیں ہوگا، وظیفہ اور اجرت میں یہی فرق ہے۔

بحر کی عبارت کا محمل:

بحر کی ذکر کردہ عبارت میں طلبہ کے ساتھ جو مدرسین کا ذکر ہے اس سے مراد وہ صورت ہے کہ مدرسین کے ساتھ مدرسہ اجارہ کا معاملہ نہ کریں بلکہ مدرسین واقف کی طرف سے طے کردہ وظیفہ، وقف کے موقوف علیہم میں داخل ہونے کی حیثیت سے لیں، اس صورت میں اگر وہ استحقاقِ وظیفہ کی شرط پوری نہیں کریں گے تو اس وظیفہ کے حقدار نہیں ہوں گے اور انہیں ایامِ کارکردگی کے عوض بھی کچھ نہیں ملے گا۔

اگر واقف یہ شرط عائد نہ کرے تو اس صورت کا شرعی حکم:

اگر واقف، چندہ دہندگان یا مدرسہ کی انتظامیہ یہ شرط عائد نہ کرے تو ایسی صورت میں استحقاق وظیفہ کے لئے طلبہ کا کتنے دن درس میں حاضر ہونا ضروری ہوگا؟ یا حاضری کی کوئی قید وحد نہیں ہوگی؟ فقہاء کرام رحمہم اللہ کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں وقف کے مقاصد کے حصول اور تحفظ کے لئے اس زمانہ کے عرف کا اعتبار ہوگا کہ اس جیسے اوقاف میں کتنے ایام کی غیبوبت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور کتنے دن کی غیبوبت پر وظیفہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا، اس کے مطابق یہاں بھی عمل ہوگا، علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہما اللہ نے اپنے اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق اس کی تفصیل لکھی ہے جس کی تفصیل ردالمحتار میں دیکھی جاسکتی ہے، علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے الاشباہ والنظائر میں یہ مسائل ''العادۃ محکمۃ'' کے اصول کے تحت بیان فرمائے ہیں۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کے اس سلسلہ میں بیان کردہ احکام درحقیقت ان کے اپنے اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق ہیں، لہٰذا آج بھی ایسی صورتحال میں مدارس یا اس جیسے دیگر اوقاف کے عرف کو دیکھ کر ہی فیصلہ کیا جائے گا کہ عام طور پر مدارس کے عرف میں جتنے ایام درس میں حاضری ضروری

---

(۱) دیکھئے: الاشباہ والنظائر قاعدہ: العادۃ محکمۃ.

ہوتی ہے اتنے ایام اس مدرسہ کے طلبہ کے لئے بھی درس میں حاضری ضروری ہوگی۔ جس مدرسہ کے اصول و ضوابط میں یا واقف کی شرائط میں اس بارے میں کوئی ضابطہ طے نہ ہو، اس بارے میں ضابطہ کے طے نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ طلبہ کو بہر صورت وظیفہ کا استحقاق ہوگا چاہے وہ درس میں حاضر ہوں یا نہ ہوں۔

موقوفہ کتب مخصوص جگہ سے منتقل نہ کرنے کی شرط:

۱۸۔ واقف نے مدرسہ کے لئے کتاب وقف کی اور یہ شرط عائد کردی کہ یہ کتاب مدرسہ سے باہر نہیں لے جائی جاسکتی تو اس شرط کی پابندی کی جائے گی کیونکہ واقف کا مقصود اس سے موقوفہ کتاب کی حفاظت ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> **الذی تحصل من کلامه انه اذا وقف کتباً وعین موضعها فان وقفها علی أهل ذلک الموضع لم یجز نقلها منه لالهم ولا لغیرهم.** (۱)
>
> حاصل یہ ہے کہ اگر کتاب وقف کی اور اس کی کوئی خاص جگہ متعین کردی تو اگر وہ مخصوص لوگوں کے لئے وقف کی گئی ہے تو اسے اس جگہ سے منتقل کرنا نہ موقوف علیہم کے لئے جائز ہے نہ اور کسی کے لئے۔

ہمارے عرف میں موقوفہ کتب کے سلسلہ میں اسی طرح کی ایک اور شرط عائد کی جاتی ہے کہ موقوفہ کتب کا اگر ایک ہی نسخہ ہو تو اسے مکتبہ سے باہر نہیں نکالا جاسکتا اور اگر ایک سے زیادہ نسخے ہوں تو زائد نسخے مکتبہ سے باہر لے جانے کی اجازت ہوتی ہے یہ شرط بھی شرعاً درست ہے کیونکہ اس کا مقصد بھی موقوفہ کتب کی حفاظت ہے۔

موقوفہ کتب مکتبہ سے باہر نکالنے کے لئے زرِ ضمانت کی شرط:

۱۹۔ واقف نے کتابیں وقف کی اور یہ شرط لگادی کہ مکتبہ سے باہر کتاب لے جانے کے لئے زرِ ضمانت مکتبہ میں رکھنا شرط ہے تو یہ شرط جائز ہے یا نہیں؟

اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر یہ زرِ ضمانت بطور رہن رکھا جارہا ہے کہ کتاب ضائع ہوجائے تو اس سے ضمان وصول کرلیا جائے تو یہ شرعاً درست نہیں کیونکہ رہن تو دین یا اَعیان مضمونہ بنفسہا کے عوض لیا جاسکتا

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۳۶۶/۴)

ہے یہ وقف کتاب مستعیر کے پاس امانت ہے نہ کہ مضمون، یہی وجہ ہے کہ اگر یہ کتاب مستعیر کی تعدی کے بغیر ضائع ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان نہیں لہٰذا زرِ ضمانت اگر بطورِ رہن رکھا جا رہا ہے تو یہ شرط فاسد ہے اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

البحر الرائق میں ہے:

ومن هنا يعلم أن شرط الواقفين في كتبهم أنها لاتخرج الا برهن شرط باطل اذ الوقف أمانة في يد مستعيره فلا يتأتى الايفاء والاستيفاء بالرهن. (۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہے کہ واقف اپنے وقف ناموں میں کتب وقف کے بارے میں یہ جو شرط لگاتے ہیں کہ یہ کتابیں رہن کے بغیر نہیں نکالی جائیں گی یہ شرط باطل ہے کیونکہ وقف مستعیر کے پاس امانت ہے اگر یہ ضائع ہو جائے تو رہن کے ذریعہ ایفاء استیفاء ممکن نہیں۔

البتہ اگر یہ زرِ ضمانت بطور یاد دہانی رکھا جا رہا ہے کہ موقوفہ کتاب لے جانے والے کو کتاب واپس کرنا یاد رہے اور متولی کو کتاب واپس مانگنا یاد رہے تو اس کی گنجائش ہے ایسی صورت میں یہ شرط درست ہوگی اور متولی کے لئے واقف کی اس شرط کی پابندی کرانا ضروری ہوگا۔

علامہ ابن نجیمؒ الاشباہ والنظائر میں تحریر فرماتے ہیں:

وان أريد مدلوله لغة وأن يكون تذكرة فيصح الشرط لأنه غرض صحيح...... ويكون المقصود أن تجويز الواقف الا نتفاع لمن يخرج به مشروط بأن يضع في خزانة الوقف مايتذكر هو به اعادة الموقوف ويتذكر الخازن به مطالبته فينبغي أن يصح هذا، ومتى أخذه على غير هذا الوجه الذي شرطه الواقف يمتنع. (۲)

اگر یہ رہن کے لغوی معنی لئے جائیں کہ یہ بطور یاد دہانی رہے تو یہ شرط صحیح ہے کیونکہ یہ غرض غرضِ صحیح ہے اور مقصود اس شرط کا یہ ہوگا کہ اس کتاب کے نکالنے کے لئے واقف کی اجازت اس بات پر مشروط ہوگی کہ وہ وقف کے خزانہ میں کچھ جمع کرائے کہ اسے موقوفہ کتب واپس کرنا یاد رہے اور خازن کو اس مطالبہ کرنا یاد رہے، ایسی شرط درست ہونی چاہئے اگر اس شرط

---

(۱) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، كوئٹه، مكتبه رشيديه (باب التدبير)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. الاشباه والنظائر، كراچى، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ (۱۵۰/۳)

کو پورا کئے بغیر کتاب لے گا تو یہ ممنوع ہوگا۔

یہ واضح رہے کہ اس صورت میں اس زرضمانت پر رہن کے احکام جاری نہیں ہوں گے بلکہ یہ زر ضمانت متولی وقف کے پاس امانت ہوگا۔(۱) اور اگر تعدی ثابت ہو جائے تو اس امانت سے ضمان بھی وصول کیا جاسکتا ہے۔

کسانوں کو بطور قرض بیج دینے کی شرط لگانا:

۲۰۔ واقف نے کچھ غلہ مثلاً گندم وقف کی اور یہ شرط لگائی کہ جن کسانوں کے پاس بیج نہ ہو انہیں بطور قرض یہ گندم دیدی جائے اور جب ان کی فصل تیار ہو جائے تو ان سے اسی مقدار میں گندم واپس لے لی جائے، یہ شرط بھی جائز ہے کیونکہ واقف کا مقصد اس سے زیادہ سے زیادہ افراد کو فائدہ پہنچانا ہے۔

علامہ طاہر البخاریؒ خلاصۃ الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

وقف علی شرط ان یقرض للفقراء الذین لابذر لهم أن یزرعوه لأنفسهم ثم یوخذ منهم بعد الادراک قدر القرض ثم یقرض لغیرهم من الفقراء ابداً علی هذا السبیل یجب أن یکـ جائزاً قال: ومثل هذا کثیر فی الری وناحیة دماوند.(۲)

وقف کیا اس شرط پر کہ یہ غلہ ان فقراء کو بطورِ قرض دیا جائے جن کے پاس بیج نہ ہو وہ اس کے ذریعہ اپنے لئے زراعت کریں پھر فصل تیار ہونے کے بعد ان سے بقدر قرض وصول کرلیا جائے اور پھر دوسرے فقراء کو اسی طرح یہ غلہ قرض دیدیا جائے، یہ شرط جائز ہونی چاہئے، اسی طرح کے اوقاف ری اور دماوند کے اطراف میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

علامہ شامیؒ اور علامہ ابن نجیمؒ نے بھی اس شرط کے جواز کی صراحت کی ہے۔(۳)

یہاں پر یہ شرائط بطور نمونہ ذکر کی گئی ہیں ان سے یہ واضح ہے کہ واقف وقف میں ایسی شرط لگا سکتا ہے جس میں وقف کی مصلحت ہو یا موقوف علیہم کی مصلحت ہو اور وہ مقتضائے وقف یا شرع کے خلاف نہ ہو۔

---

(۱) حواله بالا، "لكن لاتثبت له احكام الرهن ولا يستحق بيعه ولا بدل الكتاب الموقوف اذا تلف بغير تفريط ولو تلف بتفريط ضمنه لكن لايتعين ذلک المرهون لو فائه ولا يمتنع على صاحبه التصرف فيه."

(۲) طاهر البخاری، طاهر بن احمد بن عبد الرشيد بن حسين البخاری ۵۴۲. خلاصة الفتاوی، کوئٹه، مکتبه رشيديه (۴/۴۲۴)

(۳) دیکھئے: الشامی، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۲ھ (۴/۴۲۴) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشيديه (۵/۲۰۳)

کیا حکومت اور عدالت واقف کی ان جائز شرائط کی خلاف ورزی کر سکتی ہے؟

اگر واقف اور موقوف علیہم کی مصلحت واقف کی عائد کردہ شرط ہی میں ہو تو حکومت یا عدالت بھی اس شرط کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی اور اگر اس کے خلاف کوئی فیصلہ کیا جائے گا تو وہ شرعاً نافذ ہی نہیں ہوگا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ منحۃ الخالق میں تحریر فرماتے ہیں:

ان قضاء القاضی ینقض عند الحنفية اذا كان حكماً لادليل عليه، قال: وما خالف شرط الواقف فهو مخالف للنص وهو حكم لادليل عليه سواء كان نصه في الوقف نصاً أو ظاهراً. (۱)

حنفیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ قاضی کا ایسا فیصلہ جس پر کوئی دلیل نہ ہو نافذ نہیں ہوتا، لہٰذا قاضی کے جس فیصلہ میں واقف کی شرط کی خلاف ورزی ہو وہ بھی ایسا فیصلہ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے اس لئے وہ بھی نافذ نہیں ہوگا، واقف کی شرط اس کے کلام کے نص سے سمجھ میں آئے یا ظاہر سے دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔

علامہ رملیؒ فتاویٰ خیریہ میں فرماتے ہیں:

فالحاصل أن تصرف القاضي في الأوقاف مقيد بالمصلحة لا أنه يتصرف كيف شاء فلو فعل مايخالف شرط الواقف فانه لا يصح الا لمصلحة ظاهرة والنقل في المسألة مستفيض. (۲)

---

(۱) الشامی، محمد امین الشهير بابن عابدين. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۴۶/۵)

(۲) الرملی، خير الدين الرملی. الفتاوى الخيرية بهامش العقود الدريه فی تنقيح الفتاوى الحامديه، کوئٹه، مكتبه رشيديه (۲۱۵/۱)

خلاصہ یہ ہے کہ اوقاف کے سلسلہ میں قاضی کے تصرفات مصلحت کے ساتھ مقید ہیں، یہ تصور درست نہیں ہے کہ وہ وقف میں جو چاہے تصرف کرتا رہے اگر وہ واقف کی شرط کے برخلاف کوئی تصرف کرتا ہے تو وہ درست نہیں ہوگا الا یہ کہ اس میں وقف کی واضح مصلحت ہو، فقہاء کرام کی عبارتیں اس سلسلہ میں مشہور ہیں۔

البتہ اگر وقف کی اور موقوف علیہم کی مصلحت واقف کی شرط کی خلاف ورزی میں ہو تو ایسی صورت میں قاضی واقف کی جائز شرائط کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے، اس کی کئی نظائر فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں، ذیل میں ان میں سے چند ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ امام کے لئے متعین کردہ وظیفہ اس کے لئے کافی نہ ہو:

اگر واقف نے امام کے لئے وقف کی آمدنی میں سے ایک متعین مقدار مقرر کی کہ مثلاً امام کو ہر مہینہ ایک ہزار روپے دیئے جائیں، لیکن یہ تنخواہ امام کسی ضرورت کے لئے ناکافی ہو تو قاضی امام کی تنخواہ میں وقف کی آمدنی سے اضافہ کرسکتا ہے۔

اسی طرح دیگر اربابِ شعائر جن کے نہ ہونے سے وقف کے تعطل کا اندیشہ ہو ان کا طے کردہ وظیفہ اگر ان کی ضرورت کے لئے کافی نہ ہو تو قاضی واقف کی شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس میں اضافہ کرسکتا ہے۔ علامہ حصکفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

تجوز الزيادة من القاضي على معلوم الامام اذا كان لايكفيه و كان عالماً تقياً. (1)

قاضی امام کے متعینہ وظیفہ میں اضافہ کرسکتا ہے اگر امام متقی و عالم ہو اور یہ وظیفہ اس کے لئے کافی نہ ہو۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اس کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

الظاهر انه يلحق كل من في قطعه ضرر اذا كان المعين لايكفيه كالناظر والموذن و مدرس المدرسة والبواب و نحوهم اذا لم يعملوا

---

(۱) الحصكفي، محمد بن علي الملقب بعلاء الدين الحصكفي المتوفى ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴/۴۳۴)

بدون الزيادة. [1]

ظاہر یہ ہے کہ امام کے ساتھ وقف کا ہر وہ ملازم بھی اس حکم میں شریک ہے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے وقف کے تعطل کا اندیشہ ہو جبکہ اس کا وظیفہ اس کے لئے کافی نہ ہو اور وہ بغیر اضافہ کے کام کرنے پر تیار نہ ہو جیسے مؤذن، متولی، مدرسہ کا مدرس اور وقف کا چوکیدار وغیرہ۔

وجہ ظاہر ہے کہ اس میں وقف کی مصلحت ہے اور اضافہ نہ کرنے کی صورت میں وقف کے تعطل کا اندیشہ ہے۔

۲۔ مخصوص مدت سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہ دینے کی شرط لگانا:

واقف نے وقف میں یہ شرط لگا دی کہ موقوفہ زمین یا مکان کو مثال کے طور پر ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا، تو یہ شرط جائز ہے اور اس کی پابندی بھی کی جائے گی کیونکہ اس کا مقصد وقف کی حفاظت ہے، زیادہ عرصہ کے لئے کسی ایک شخص کو کرایہ پر دینے میں یہ احتمال موجود ہے کہ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگے گا۔

لیکن اگر ایک سال کے عرصہ کے لئے کوئی یہ زمین یا مکان کرایہ پر نہ لے رہا ہو یا کم عرصہ کیلئے کرایہ پر دینے کی صورت میں کرایہ کم مل رہا ہو تو ایسی صورت میں قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ واقف کی شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے زیادہ عرصہ کیلئے کرایہ پر دینے کی اجازت دیدے۔

علامہ ابن نجیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

ومنها مافي الفتاوى ايضاً لو شرط الواقف ان لاتوجر اكثر من سنة والناس لايرغبون في استئجارها وكانت اجارتها اكثر من سنة أنفع للفقراء فليس للقيم أن يؤجرها اكثر من سنة ولكنه يرفع الأمر الى القاضي حتى يواجرها أكثر من سنة لأن للقاضي ولاية النظر على الفقراء وعلى الميت ايضاً. [2]

فتاویٰ میں ہے کہ واقف نے یہ شرط لگا دی کہ وقف زمین ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر نہیں دی جاسکتی جبکہ لوگ ایک سال کے لئے اجارہ پر لینے میں رغبت ظاہر نہیں کر رہے اور

---

(۱) الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين. رد المحتار، كراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ (۴۳۶/۴)

(۲) ابن نجيم، زين الدين ابن نجيم. البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ (۲۴۶/۵) وکذا فی رد المحتار (۴۰۰/۴)

ایک سال سے زیادہ کے لئے اجارہ پر دینا فقراء کے لئے زیادہ مفید ہے تو متولی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اسے ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر دے، بلکہ وہ یہ معاملہ قاضی کے پاس لے جائے گا، قاضی کے لئے اسے ایک سال سے زیادہ کے لئے کرایہ پر دینا جائز ہے کیونکہ قاضی کو فقراء پر بھی ولایت حاصل ہے اور مرحوم واقف پر بھی ولایت حاصل ہے۔

۳۔ کسی ذی منصب اور ذی وجاہت شخص کو کرایہ پر نہ دینے کی شرط:

واقف نے وقف میں یہ شرط لگائی کہ کسی ذی منصب اور صاحبِ وجاہت شخص کو وقف کرایہ پر نہ دیا جائے تو اس شرط پر حتی الامکان عمل کیا جائے گا لیکن اگر کوئی صاحبِ منصب و وجاہت شخص اجارہ کی مدت کا پورا کرایہ ایڈوانس دینے کو تیار ہو اور وقف پر اس کے غاصبانہ قبضہ کا بھی احتمال نہ ہو تو قاضی واقف کی شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے ایڈوانس کرایہ کے ساتھ اجارہ پر دینے کا فیصلہ کر سکتا ہے کیونکہ واقف کی اس شرط کا مقصد یہی تھا کہ اس سے کرایہ وصول کرنا ممکن نہیں ہوگا اور اس میں وقف کا اور موقوف علیہم کا نقصان ہوگا لیکن جب وہ کرایہ ایڈوانس دینے کو تیار ہے تو یہ احتمال نہیں رہا اس لئے قاضی وقف کی مصلحت کو دیکھتے ہوئے اس شرط کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔

شارحِ اشباہ علامہ بیری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

شرط فی کتاب وقفه أن لایؤجر لمتجوة ولا ظالم فآجر الناظر لمن منعه الشرط وعجل الأجرة هل یصح؟ الجواب انه یصح لأن الاصل فی الأحکام التعامل والتقییدو الظاهر انه انما منع خوفاً من ضیاع الغلة علی الموقوف علیهم وبالتعجیل امن من الضیاع هذا هو الظاهر. (۱)

کسی نے اپنے وقف نامہ میں شرط لگا دی کہ یہ وقف کسی ذی رتبہ اور ظالم شخص کو کرایہ پر نہیں دیا جا سکتا، متولی نے کسی ایسے ہی شخص کو کرایہ پر دیدیا لیکن اس سے اجرت ایڈوانس لے لی تو کیا یہ صحیح ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کیونکہ احکام میں اصل تعامل ہے اور ظاہر یہ ہے کہ واقف نے اس اندیشہ سے اسے منع کیا تھا کہ اس میں وقف کی آمدنی کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا، ایڈوانس کرایہ لینے سے یہ اندیشہ ختم ہو گیا۔

---

(۱) البیری، ابراهیم بن حسین بن بیری زاده ۱۰۹۹ھ. عمدة ذوی البصائر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه لائبریری جامعه دارالعلوم کراچی (۱۸۰)

۴۔ واقف نے اجارہ کے لئے کرایہ مقرر کردیا اس پر اضافہ کیا جاسکتا ہے:

واقف نے وقف کرتے وقت یہ شرط لگادی کہ یہ موقوفہ مکان مثلاً دو ہزار روپے کرایہ پر دیا جائے، اس شرط کی بھی اتباع کی جائے گی، لیکن اس جیسے مکان کی اجرتِ مثل مارکیٹ میں بڑھ جائے تو قاضی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ واقف کی شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کا کرایہ بڑھا کر اجرتِ مثل کے بقدر رکھے۔

کیونکہ واقف نے یہ شرط وقف کی مصلحت ہی کے لئے لگائی تھی لیکن اب مصلحت بدل گئی ہے تو قاضی اس شرط کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہے۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ واقف کی جائز شرائط کی خلاف ورزی میں وقف کی مصلحت اور موقوف علیہم کی مصلحت سمجھے تو وہ اس کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہے کیونکہ قاضی کو جس طرح موقوف علیہم پر ولایتِ عامہ حاصل ہے اسی طرح اسے واقف پر بھی ولایتِ عامہ حاصل ہے البتہ قاضی کے علاوہ متولی، قیم وغیرہ کے لئے اس کی جائز شرائط کے خلاف عمل کرنا جائز نہیں۔

جو حکم قاضی کا ہے وہی حکم حکومت کا بھی ہے کہ اسے بھی واقف کی جائز شرائط کی خلاف ورزی کا اختیار حاصل ہے لیکن یہ بات بہرحال واضح رہنی چاہئے کہ قاضی یا حکومت کا واقف کی شرط کے خلاف کوئی بھی فیصلہ اس وقت معتبر ہوگا جبکہ اس فیصلہ میں وقف اور موقوف علیہم کی مصلحت پیش نظر ہو اگر ان کا فیصلہ مصلحت وقف وموقوف علیہم کے خلاف ہو تو وہ فیصلہ شرعاً معتبر نہیں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

علامہ ابوسعودؒ فرماتے ہیں:

ومنه يعلم أن تصرف القاضي في الأوقاف مقيد بالمصلحة لا أنه يتصرف كيف يشاء.(۲)

معلوم ہوا کہ اوقاف کے بارے میں قاضی کا اختیار بھی مصلحت کے ساتھ مقید ہے یہ نہیں کہ وہ جیسے چاہے تصرف کرے۔

---

(۱) دیکھئے: البيري، ابراهيم بن حسين بن بيري زاده ۱۰۹۹ھ. عمدة ذوي البصائر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه لائبريري جامعه دارالعلوم كراچي (۱۸۰) عمدة الناظر لابي سعود (۲/۲٦)

(۲) ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفى الآفندي ۹۸۲ھ. عمدة الناظر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، لائبريري جامعه دارالعلوم كراچي (۲/۲۹)

ان تمام گذارشات کا حاصل یہ ہے کہ وقف کرتے وقت واقف اپنے وقف کی حفاظت، اس کے مصارف وذرائع آمدنی کے حوالہ سے جائز شرائط وقف نامہ میں لگا سکتا ہے اور عام حالات میں ان شرائط کی تعمیل بھی ضروری ہے، مخصوص حالات میں حاکمِ مسلمین یا اس کے مجاز نمائندہ کو وقف اور موقوف علیہم کی مصلحت کے پیشِ نظر ان کی خلاف ورزی کرنے کی گنجائش ہے لیکن ان کے علاوہ کسی اور کو اس کا حق حاصل نہیں۔

البتہ اگر واقف نے وقف کرتے وقت وقف نامہ میں کوئی خاص شرط عائد نہیں کی تو بعد میں اسے کسی بھی قسم کی شرط لگانے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا، اس لئے جیسا کہ ماقبل میں چوتھے باب میں بھی عرض کیا گیا کہ وقف کرتے وقت بڑی سوچ و بچار کر کے مناسب شرائط مصرف، وقف کی تولیت، وقف کی ذرائع آمدنی وغیرہ کے حوالہ سے وقف نامہ میں لکھنی چاہئیں تا کہ اس وقف کا صحیح اور دیرپا استعمال ہوتا رہے اور یہ واقعی واقف کے لئے صدقہ جاریہ ثابت ہو۔

اس بحث پر ہم اپنے اس مقالہ کا اختتام کرتے ہیں، اللہ رب العزت کی بارگاہ میں التجاء ہے کہ اسے محض اپنی رضاء کے لئے قبول فرمالیں اور اسے احقر کے لئے اور احقر کے والدین واساتذہ کرام کے لئے صدقۂ جاریہ بنائیں۔ آمین

کتابیات

(۱) القرآن الکریم

الف

(۲) ابن ابی شیبه، عبد الله بن محمد بن ابی شیبه. مصنف ابن ابی شیبه ۲۲۵ھ، ادارة القرآن ۱۹۸۷م

(۳) ابن امیر الحجاج ۸۷۹ھ، التقریر والتحبیر، بیروت، دارالکتب العلمیة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م.

(۴) ابن تیمیه، شیخ الاسلام احمد بن عبد الحلیم المعروف بابن تیمیه. مجموع فتاویٰ ابن تیمیه، ریاض، مطابع الریاض ۱۳۸۳ھ

(۵) ابن حجر، احمد بن علی بن حجر العسقلانی. فتح الباری، لاهور، دار نشر للکتب العلمیة ۱۹۹۹م

(۶) ابن حزم، ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم المتوفی ۴۰۶ھ. المحلیٰ، بیروت، دار الکتب العلمیه

(۷) ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی الشهیر بابن رشد الحفید ۵۹۵ھ. بدایة المجتهد، مصر، مطبعه علی محمد صبیح

(۸) ابن رشد، ابو الولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی الشهیر بابن رشد الحفید ۵۹۵ھ. المقدمات الممهدات، بیروت، دار الغرب الاسلامی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

(۹) ابن سماوه، محمود بن اسماعیل الشهیر بابن قاضی سماوه. جامع الفصولین، کراچی، اسلامی کتب خانه ۱۴۰۲ھ

(۱۰) ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر. کتاب الکافی، ریاض، مکتبة الریاض الحدیثة الطبعة الثانیة ۱۹۸۰م

(۱۱) ابن عبد البر، یوسف بن عبد الله بن عبد البر ۴۶۲ھ. الاستیعاب، بیروت، دارالجبل

(۱۲) ابن عبد الملک، عبد اللطیف بن عبد العزیز بن الملک ۷۱۰ھ. شرح المنار لابن عبد الملک، مطبعه عثمانیه ۱۳۱۵ھ

(۱۳) ابن العربی، محمد بن عبد الله المعروف بابن العربی. احکام القرآن، مصر، مطبعة عیسیٰ البابی

(۱۴) ابن قائد، عثمان بن احمد بن سعید النجدی المعروف بابن قائد ۱۰۹۷ھ. حاشیة منتهی الارادات، بیروت، موسسة الرسالة ۱۴۱۹ھ
(۱۵) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ. ۶۲۰ھ. المغنی، الریاض، دار عالم الکتب، الطبعة الثالثة ۱۹۹۷م
(۱۶) ابن قدامه، موفق الدین ابو محمد عبد الله بن احمد بن محمد بن قدامه المقدسی ۵۴۱ھ. ۶۲۰ھ. الکافی، بیروت، المکتب الاسلامی الطبعة الثالثة ۱۴۰۲ھ
(۱۷) ابن قیم، ابو عبد الله محمد بن ابی بکر الدمشقی المعروف بابن قیم الجوزیة. اعلام الموقعین عن رب العالمین، مکة المکرمة، مکتبة نزار مصطفی الباز، الطبعة الثانیة ۲۰۰۳م
(۱۸) ابن کثیر، اسماعیل بن کثیر. تفسیر ابن کثیر، لاهور، سهیل اکیڈمی ۱۹۷۲م
(۱۹) ابن مازه البخاری، برهان الدین ابو المعالی محمود بن صدر الشریعة ابن مازه البخاری ۶۱۲ھ. المحیط البرهانی، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۴م
(۲۰) ابن منظور، محمد ابن مکرم ابن منظور ۶۳۰ھ. ۷۱۱ھ. لسان العرب، بیروت، داراحیاء التراث العربی، الطبعة الاولیٰ، ۱۹۸۸م
(۲۱) ابن النجار، تقی الدین محمد بن احمد الفتوحی الشهیر بابن النجار. منتهی الارادات، بیروت، مؤسسة الرسالة، الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۹م
(۲۲) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. البحر الرائق، کوئٹه، مکتبه رشیدیه
(۲۳) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم. الاشباه والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ
(۲۴) ابن نجیم، زین الدین ابن نجیم، فتاویٰ ابن نجیم بهامش الفتاویٰ الغیاثیة، کوئٹه، مکتبه اسلامیه، ۱۴۰۳ھ
(۲۵) ابن هشام، عبد الملک بن هشام الحمیری. السیرة النبویة، مصر، مصطفی البابی ۱۹۵۵م
(۲۶) ابن الهمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد الاسکندری المتوفی ۸۶۱ھ. فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه
(۲۷) ابو زهرة، محاضرات فی الوقف، جامعة الدول العربیة، مصر
(۲۸) ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفیٰ الآفندی ۹۸۲ھ. عمدة الناظر شرح الاشباه والنظائر، مخطوطه، لائبریری جامعه دارالعلوم کراچی
(۲۹) ابو سعود، السید محمد ابوسعود المصری. فتح المعین علی شرح الکنز لملامسکین، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی ۱۴۰۳ھ

(۳۰) ابو سعود، محمد بن محمد بن مصطفی الآفندی ۹۸۲ھ. رسالة فی جواز وقف النقود، بیروت، دار ابن حزم ۱۹۹۷م
(۳۱) الاتاسی، الشیخ خالد الاتاسی. شرح المجلة، کوئٹہ، مکتبہ اسلامیہ الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۳ھ
(۳۲) الاعظمی، خلیل احمد اعظمی. تسکین الارواح والضمائر شرح الاشباه والنظائر کتاب الوقف، مخطوطہ لائبریری جامعہ دارالعلوم کراچی
(۳۳) الاندریتی، عالم بن العلاء الانصاری الاندریتی. الفتاوی التتارخانیه، کراچی، ادارة القرآن، الطبعة الاولیٰ ۱۴۱۱ھ
(۳۴) الاوزجندی، فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی المتوفی ۲۹۵ھ. الفتاوی الخانیة بهامش الهندیه، کوئٹہ، مکتبہ ماجدیہ، الطبعة الثانیة ۱۴۰۲ھ
(۳۵) ابن اثیر مبارک بن محمد الجزری ابن الاثیر ۵۴۴ھ. ۶۰۶ھ. النهایة فی غریب الحدیث، ایران، مؤسسة اسماعیلیان
(۳۶) ابن مفلح، ابو اسحاق برهان الدین ابراهیم بن محمد بن عبد اللہ بن مفلح ۸۱۶ھ. ۸۸۴ھ. المبدع فی شرح المقنع، بیروت، المکتب الاسلامی
(۳۷) ابن شبه، عمر بن شبه النمیری المصری، تاریخ مدینه منوره، جده، دارالاصفهان ۱۳۹۳ھ
(۳۸) الانصاری، شیخ الاسلام زکریا بن محمد بن احمد بن زکریا الانصاری. فتح الوهاب بشرح منهج الطلاب، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۸م
(۳۹) الانکوری، محمد بن حسن الانکوری، فتاویٰ الانقرویه، بولاق، المطبعة المصریة

ب

(۴۰) البابرتی، محمد بن محمود البابرتی. العنایه بهامش فتح القدیر، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ
(۴۱) الباجی، القاضی ابو الولید سلیمان بن خلف بن سعد الباجی ۴۰۳ھ. ۴۹۴ھ. المنتقی شرح المؤطا مصر، مطبعة السعادة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۳۲ھ
(۴۲) باشا، محمد قدری باشا. قانون العدل والانصاف، مصر، مکتبة الاهرام ۱۹۲۸م
(۴۳) البخاری، الامام ابوعبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری. صحیح البخاری مع فتح الباری، لاهور، دارنشر للکتب الاسلامیة

(۴۴) البزدوی، فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی ۴۸۲ھ. اصول البزدوی علی متن الکافی، ریاض، مکتبة الرشد، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۱م
(۴۵) البھوتی، منصور بن یونس بن ادریس البھوتی ۱۰۵۱ھ. کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۴ھ
(۴۶) البھوتی، منصور بن یونس بن ادریس البھوتی ۱۰۵۱ھ. کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومة، الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۴ھ
(۴۷) البیری، ابراھیم بن حسین بن بیری زادہ ۱۰۹۹ھ. عمدة ذوی البصائر شرح الاشباہ والنظائر، مخطوطہ لائبریری جامعہ دارالعلوم کراچی
(۴۸) البیھقی، احمد بن حسین بن علی البیھقی ۳۸۴ھ. ۴۵۸ھ. السنن الکبریٰ، ملتان، نشر السنة
(۴۹) البیھقی، احمد بن حسین بن علی البیھقی ۳۷۴ھ. ۳۵۸ھ. معرفة السنن والآثار، قاھرة، دارالوفاء

ت

(۵۰) الترمذی، محمد بن عیسیٰ بن سورہ الترمذی. سنن الترمذی مع تحقیق احمد شاکر، بیروت، دار احیاء التراث العربی
(۵۱) التاجی، محمد ھبة اللہ التاجی ۱۲۲۴ھ. التحقیق الباھر فی شرح الاشباہ والنظائر، مخطوطہ، لائبریری جامعہ دارالعلوم کراچی
(۵۲) التمرتاشی، محمد بن عبد اللہ بن احمد الخطیب التمرتاشی ۱۰۰۴ھ. تنویر الابصار مع الدر المختار والشامیة، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ
(۵۳) تھانوی، حکیم الامت اشرف علی تھانوی. حیلہ ناجزہ. کراچی، دار الاشاعت ۱۹۸۷م
(۵۴) تھانوی، حکیم الامة اشرف علی تھانوی. امداد الفتاویٰ، کراچی، مکتبہ دارالعلوم

ج

(۵۵) الجرجانی، علی بن محمد بن علی الجرجانی ۸۲۶ھ. کتاب التعریفات، بیروت، دارالفکر الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۷م

ح

(۵۶) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المختار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ
(۵۷) الحصکفی، محمد بن علی الملقب بعلاء الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۰۸ھ. الدر المنتقی بهامش مجمع الانهر، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۸م
(۵۸) الحطاب، ابو عبد الله محمد بن عبد الرحمن الحطاب، مواهب الجلیل، بیروت، دار الفکر ۱۳۹۸ھ
(۵۹) الحلبی، محمد بن ابراهیم الحلبی. ملتقی الابحر مع شرحه مجمع الانهر، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۸م
(۶۰) الحموی احمد بن محمد الحموی ۱۰۹۸ھ. غمزعیون البصائر مع الاشباه والنظائر، کراچی، ادارة القرآن، ۱۴۱۸ھ

خ

(۶۱) الخرشی، محمد بن عبد الله بن علی الخرشی المالکی. شرح الخرشی علی مختصر سیدی خلیل، بیروت، دار صادر
(۶۲) الخصاف، ابوبکر احمد بن عمرو الشیبانی المعروف بالخصاف. احکام الاوقاف، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۹۹۹م
(۶۳) الخطیب، احمد علی الخطیب، الوقف والوصایا، بغداد
(۶۴) الخوارزمی، جلال الدین الخوارزمی. الکفایه شرح الهدایه مع فتح القدیر، کوئٹه، مکتبه رشیدیه
(۶۵) الخیاط، الدکتور عبد العزیز عزت الخیاط. الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی، بیروت، مؤسسة الرسالة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۳م

د

(۶۶) الدار قطنی، عمر بن عمر الدار قطنی المتوفی ۳۸۵ھ بیروت، دار المعرفة، الطبعة الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

(۶۷) دارالعلوم، جامعه دارالعلوم کراچی، ماهنامه البلاغ
(۶۸) الدارمی، عبد الله بن عبد الرحمن الدارمی. سنن الدارمی، دمشق، دار القلم ۱۹۹۶م
(۶۹) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الصغیر، مصر، دار المعارف، طبع فی سنة ۱۳۹۲ھ
(۷۰) الدردیر، ابو البرکات احمد بن محمد الدردیر. الشرح الکبیر بهامش الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر
(۷۱) الدسوقی، شمس الدین محمد عرفه الدسوقی. حاشیة الدسوقی علی الشرح الکبیر، بیروت، دار الفکر
(۷۲) الدمیاطی، السید البکری ابن السید محمد شطا الدمیاطی. اعانة الطالبین، بیروت، دار احیاء التراث العربی
(۷۳) دیوبندی، مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، کراچی، دارالاشاعت

ر

(۷۴) الرافعی، عبد القادر الرافعی. تقریرات الرافعی ملحق برد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ
(۷۵) الرملی، خیر الدین الرملی. الفتاوی الخیریة، مصر، مطبع بولاق
(۷۶) الرملی، محمد بن ابی العباس احمد بن حمزة بن شهاب الدین الرملی. نهایة المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی

ز

(۷۷) الزحیلی، الدکتور وهبة الزحیلی. الفقه الاسلامی وادلته، بیروت، دار الفکر، الطبعة الاولیٰ، ۱۹۸۴م
(۷۸) الزحیلی، الدکتور وهبة الزحیلی. اصول الفقه الاسلامی، طهران، دار احسان ۱۴۱۷ھ
(۷۹) الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء، احکام الوقف، دمشق
(۸۰) الزرقاء، مصطفی احمد الزرقاء، المدخل الفقهی العام، دمشق، دارالفکر، الطبعة

التاسعة ۱۹۶۷م
(۸۱) الزرقانی، السید عبد الباقی الزرقانی. شرح الزرقانی علی مختصر خلیل، بیروت، دار الفکر، الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۱م
(۸۲) الزمحشری، جار اللہ محمود بن عمر الزمحشری، الفائق فی غریب الحدیث، بیروت، دار الفکر ۱۹۹۳م
(۸۳) زیدان، الدکتور عبد الکریم زیدان. الوجیز فی اصول الفقه، بیروت، موسسة الرسالة ۱۹۸۷م
(۸۴) الزیلعی، فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی ۷۴۳ھ. تبیین الحقائق، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۰م
(۸۵) الزیلعی، جمال الدین ابو محمد عبد اللہ بن یوسف الزیلعی. نصب الرایه، بیروت، موسسة الرسالة الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۷م

س

(۸۶) السجستانی، ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ. سنن ابی داؤد بیروت، مؤسسة الریان ۱۹۹۸م
(۸۷) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی، المبسوط للسرخسی، بیروت، دارالمعرفة ۱۹۹۳م
(۸۸) السرخسی، شمس الائمه محمد بن احمد بن ابی سهل السرخسی، شرح کتاب السیر الکبیر، افغانستان، حرکة انقلاب اسلامی ۱۴۰۵ھ
(۸۹) السغناقی، حسین بن علی بن حجاج السغناقی ۷۱۴ھ. الکافی شرح اصول البزدوی، ریاض مکتبة الرشید الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۱م
(۹۰) سمرقندی، علاء الدین سمرقندی. تحفة الفقهاء، دمشق، مطبع جامعة دمشق، الطبعة الاولیٰ ۱۹۵۸م
(۹۱) السمهودی، نور الدین علی بن احمد ۹۱۱ھ. وفاء الوفاء، مدینه منوره، الشیخ محمد النمکانی ۱۳۷۴ھ

ش

(۹۲) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. رد المحتار، کراچی، ایچ ایم سعید

کمپنی، الطبعة الاولیٰ ۱۴۰۶ھ
(۹۳) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. شرح عقود رسم المفتی، کراچی، قدیمی کتب خانه
(۹۴) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. منحة الخالق بهامش البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبه رشیدیه
(۹۵) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. العقود الدریه فی تنقیح الفتاوی الحامدیه، کوئٹہ، مکتبه رشیدیه
(۹۶) الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین. مجموعه رسائل ابن عابدین، لاهور، سهیل اکیڈمی ۱۳۹۶ھ
(۹۷) الشافعی، محمد بن ادریس الشافعی. کتاب الام، بیروت، دار قتیبه ۱۹۹۶م
(۹۸) الشاه ولی الله، الشیخ احمد المعروف بشاه ولی الله. حجة الله البالغة، کراچی، قدیمی کتب خانه
(۹۹) الشربینی، الشیخ محمد الشربینی. مغنی المحتاج، بیروت، دار احیاء التراث العربی
(۱۰۰) شفیع، مفتی محمد شفیع، عزیز الفتاویٰ، کراچی، دارالاشاعت
(۱۰۱) شفیع، مفتی محمد شفیع، امداد المفتین، کراچی، دارالاشاعت ۱۹۷۷م
(۱۰۲) شفیع، مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، کراچی، ادارة المعارف
(۱۰۳) شفیع، مفتی محمد شفیع، الکشاف، مخطوطه، لائبریری، جامعه دارالعلوم کراچی
(۱۰۴) الشلبی، عبد القادر بن توفیق الشلبی. حاشیة الشلبی علی تبیین الحقائق، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ ۲۰۰۰م
(۱۰۵) الشوکانی، محمد بن محمد الشوکانی المتوفی ۱۲۵۵ھ. نیل الاوطار، مصر، مصطفی البابی الحلبی طبع فی سنة ۱۳۴۷ھ
(۱۰۶) الشیبانی، محمد بن الحسن الشیبانی. کتاب الحجة علی اهل المدینة، لاهور، دار المعارف النعمانیة الطبعة الاولیٰ ۱۹۸۱م
(۱۰۷) الشیرازی، الامام ابو اسحاق الشیرازی. المهذب، مصر، عیسیٰ البابی

ص

(۱۰۸) الصالحی، محمد بن یوسف الصالحی الشامی ۹۴۲. سبل الهدیٰ والرشاد، القاهرة، لجنة احیاء التراث الاسلامی ۱۴۰۲ھ

(۱۰۹) الصاوی، احمد بن محمد الصاوی المالکی. حاشیة الصاوی علی الشرح الصغیر، مصر، دار المعارف

ط

(۱۱۰) طاهر البخاری، طاهر بن احمد بن عبد الرشید بن حسین البخاری ۵۴۲ھ. خلاصة الفتاوی، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ

(۱۱۱) الطحاوی، ابو جعفر احمد بن محمد المصری الطحاوی ۲۳۹ھ. ۳۲۱ھ. شرح معانی الآثار، ملتان، المکتبة الامدادیه

(۱۱۲) الطحطاوی، احمد بن محمد بن اسماعیل الطحطاوی. حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار، کوئٹہ، المکتبة العربیة

(۱۱۳) الطرابلسی، ابراهیم بن موسیٰ بن ابی بکر الطرابلسی. الاسعاف فی احکام الاوقاف، مصر، مکتبه هندیه ۱۳۲۰ھ

(۱۱۴) الطرسوسی، ابراهیم بن علی الطرسوسی. انفع الوسائل، مطبع الشرق ۱۹۲۶ م

ظ

(۱۱۵) ظفیر، مولانا محمد ظفیر الدین، اسلام کا نظام مساجد، کراچی، دارالاشاعت

ع

(۱۱۶) عارف، ڈاکٹر محمود الحسن عارف، اسلام کا قانون وقف مع تاریخ مسلم اوقاف، لاہور، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

(۱۱۷) عثمانی، ظفر احمد عثمانی، اعلاء السنن، کراچی، ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه، طبع ثالث ۱۴۱۵ھ

(۱۱۸) عثمانی، ظفر احمد عثمانی، امداد الاحکام، کراچی، مکتبہ دارالعلوم کراچی

(۱۱۹) عثمانی، محمد تقی عثمانی، تکملة فتح الملهم، کراچی، مکتبہ دارالعلوم ۱۴۱۵ھ

(۱۲۰) عثمانی، محمد تقی عثمانی، اسلام اور جدید معیشت و تجارت، کراچی، ادارة المعارف

(۱۲۱) عثمانی، محمد عمران اشرف عثمانی، شرکت و مضاربت عصر حاضر میں، کراچی، ادارة المعارف، طبع اول ۲۰۰۰م

(۱۲۲) علی جمعه محمد، الوقف واثره التنموی، مقاله طبعت فی ابحاث ندوة نحودور التنموی للوقف، کویت، وزارة أوقاف و شئون وقف ۱۹۹۳ م
(۱۲۳) علی حیدر، شرح المجلة، بیروت، دار الکتب العلمیة
(۱۲۴) علیش، محمد علیش المالکی، منح الجلیل علی مختصر خلیل، بیروت، دارالفکر
(۱۲۵) العینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد العینی ۷۶۲ھ. ۵۵ ۸ھ. البنایة شرح الهدایه، فیصل آباد، ملک سنز
(۱۲۶) العینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد العینی ۷۶۲ھ ۸۵۵ھ. عمدة القاری، بیروت، دار الفکر

غ

(۱۲۷) الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی ۵۰۵ھ. الوجیز، بیروت، دار المعرفة الطبعة الاولیٰ ۱۳۹۹ھ

ف

(۱۲۸) فیروز آبادی، مهرابن یعقوب فیروز آبادی، القاموس المحیط، بیروت، داراحیاء التراث العربی، الطبعة الاولیٰ ۱۹۹۱م

ق

(۱۲۹) القرطبی، ابو عبد الله محمد بن احمد الانصاری القرطبی. الجامع احکام القرآن، القاهرة، مطبعة دار الکتب العربیه، الطبعة الاولیٰ ۱۳۰۱ھ
(۱۳۰) القزوینی، ابو عبد الله محمد بن یزید القزوینی المتوفی ۲۷۳ھ. سنن ابن ماجه، ریاض، شرکة الطباعة العربیة، الطبعة الثانیة ۱۹۸۴م
(۱۳۱) القسطلانی، احمد بن محمد القسطلانی ۹۳۲ھ. المواهب اللدنیة بالمنح المحمدیة، بیروت، المکتب الاسلامی ۱۴۱۲ھ
(۱۳۲) القشیری، مسلم بن الحجاج القشیری. صحیح لمسلم مع شرح النووی، کراچی، ادارة القرآن

ک

(۱۳۳) الکاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی المتوفی ۵۸۷ھ بدائع الصنائع، بیروت، دار احیاء التراث العربی
(۱۳۴) کامل، محمد کامل بن مصطفی بن محمود الطرابلسی. الفتاوی الکاملیہ، قندھار، دارالاشاعۃ العربیۃ
(۱۳۵) الکبیسی، محمد عبید الکبیسی. احکام الوقف فی الشریعۃ الاسلامیۃ، بغداد
(۱۳۶) الکردوی، الامام محمد بن محمد شھاب المعروف بابن البزاز الکردوی الحنفی ۸۲۷ھ. الفتاوی البزازیہ بھامش الھندیۃ، کوئٹہ، مکتبہ ماجدیہ ۱۹۸۶ء
(۱۳۷) الکشناوی، ابوبکر بن حسن الکشناوی. اسھل المدارک شرح ارشاد السالک، بیروت، دار الفکر

ل

(۱۳۸) شیخ گلاب دین۔ قائداعظم اور وقف علی الاولاد، لاہور آتش فشاں پبلیکیشنز ۱۹۹۰ء
(۱۳۹) لدھیانوی. مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی. احسن الفتاویٰ، کراچی، ایچ ایم سعید کمپنی، طبع نہم ۱۴۲۰ھ

م

(۱۴۰) مالک، الامام مالک بن انس الاصبعی، کتاب الموطا مع شرح اوجز المسالک، ملتان، ادارہ تالیفات اشرفیہ
(۱۴۱) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی. الحاوی الکبیر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(۱۴۲) محدث دھلوی، شاہ عبد الحق محدث دھلوی، اشعۃ اللمعات، لکھنو، منشی نول کشور
(۱۴۳) محمد بن ابراھیم ۷۶۷ھ. ھدایۃ السالک الی المذاھب الاربعۃ فی المناسک، بیروت، دارالبشائر الاسلامیۃ ۱۴۱۴ھ
(۱۴۴) المرداوی، ابو الحسن علی بن سلیمان المرداوی ۸۸۵ھ. تصحیح الفروع

بهامش كتاب الفروع، بيروت، عالم الكتب، الطبعة الرابعة ١٩٨٥م
(١٤٥) المرداوى، علاء الدين ابو الحسن على بن سليمان المرداوى. الانصاف فى معرفة الراجح من الخلاف، بيروت، دار احياء التراث العربى الطبعة الثانية ١٩٨٠م
(١٤٦) المرزوقى، الدكتور صالح بن زابن المرزوقى. شركة المساهمة فى النظام السعودى. مكة المكرمة، مطابع الصفاء ١٤٠٢ھ
(١٤٧) المرغينانى، برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى. هدايه مع فتح القدير، كوئٹه، مكتبه رشيديه
(١٤٨) ملا على قارى، على بن سلطان المعروف بملا على القارى. مرقاة المفاتيح، كوئٹه، المكتبة الحبيبية
(١٤٩) المليبارى، زين الدين بن عبد العزيز المليبارى. فتح المعين بهامش اعانة الطالبين، بيروت، دار احياء التراث العربى
(١٥٠) المناوى، عبد الرؤف بن تاج العارفين المناوى الشافعى. تيسير الوقوف، مكه مكرمه، مكتبه نزار المصطفى الباز الطبعة الاولىٰ، ١٩٩٨م
(١٥١) المهدى، الشيخ محمد العباس المهدى، الفتاوىٰ المهدية، مصر، مطبعة الازهرية، ١٣٠١ھ
(١٥٢) المواق، ابو عبد الله محمد بن يوسف بن ابى القاسم الشهير بالمواق ٨٩٧ھ. التاج والاكليل بهامش مواهب الجليل، بيروت، دار الفكر الطبعة الثانية ١٩٧٨م
(١٥٣) الموسوعة الفقهية، وزارة الاوقاف والشئون الاسلاميه، كويت الطبعة الاولىٰ ١٩٨٠

ن

(١٥٤) النسائى، احمد بن شعيب بن على النسائى. سنن النسائى مع تعليق عبد الفتاح ابوغده، بيروت، دار البشائر الاسلاميه ١٩٨٦م
(١٥٥) النسفى، عبد الله بن احمد المعروف بحافظ الدين النسفى ٧١٠ھ كشف الاسرار، بيروت، دار الكتب العلمية الطبعة الاولىٰ ١٩٨٦م
(١٥٦) نظام، الشيخ نظام وجماعة علماء الهند من القرن الحادى عشر. الفتاوى الهنديه، كوئٹه، مكتبه ماجديه، الطبعة الثانية ١٩٨٣م
(١٥٧) نعمانى، محمد شبلى نعمانى، مقالات شبلى، انڈیا، مطبع معارف اعظم گڑه ١٣٧٣ھ
(١٥٨) النووى، يحيىٰ بن شرف النووى. روضة الطالبين و عمدة المفتين، بيروت، مكتب اسلامى ١٩٨٥م

(۱۵۹) النووی، یحییٰ بن شرف النووی، المنهاج مع شرحه مغنی المحتاج، بیروت، داراحیاء التراث العربی

(۱۶۰) النووی، یحییٰ بن شرف النووی. المجموع شرح المهذب، بیروت دار الفکر

(۱۶۱) النووی، یحییٰ بن شرف النووی، شرح النووی لصحیح مسلم، کراچی، ادارة القرآن

و

(۱۶۲) الونشریسی، محمد بن یحییٰ الونشریسی ۹۱۴ھ. المعیار المعرب، بیروت، دار الغرب الاسلامی ۱۹۸۱م

ه

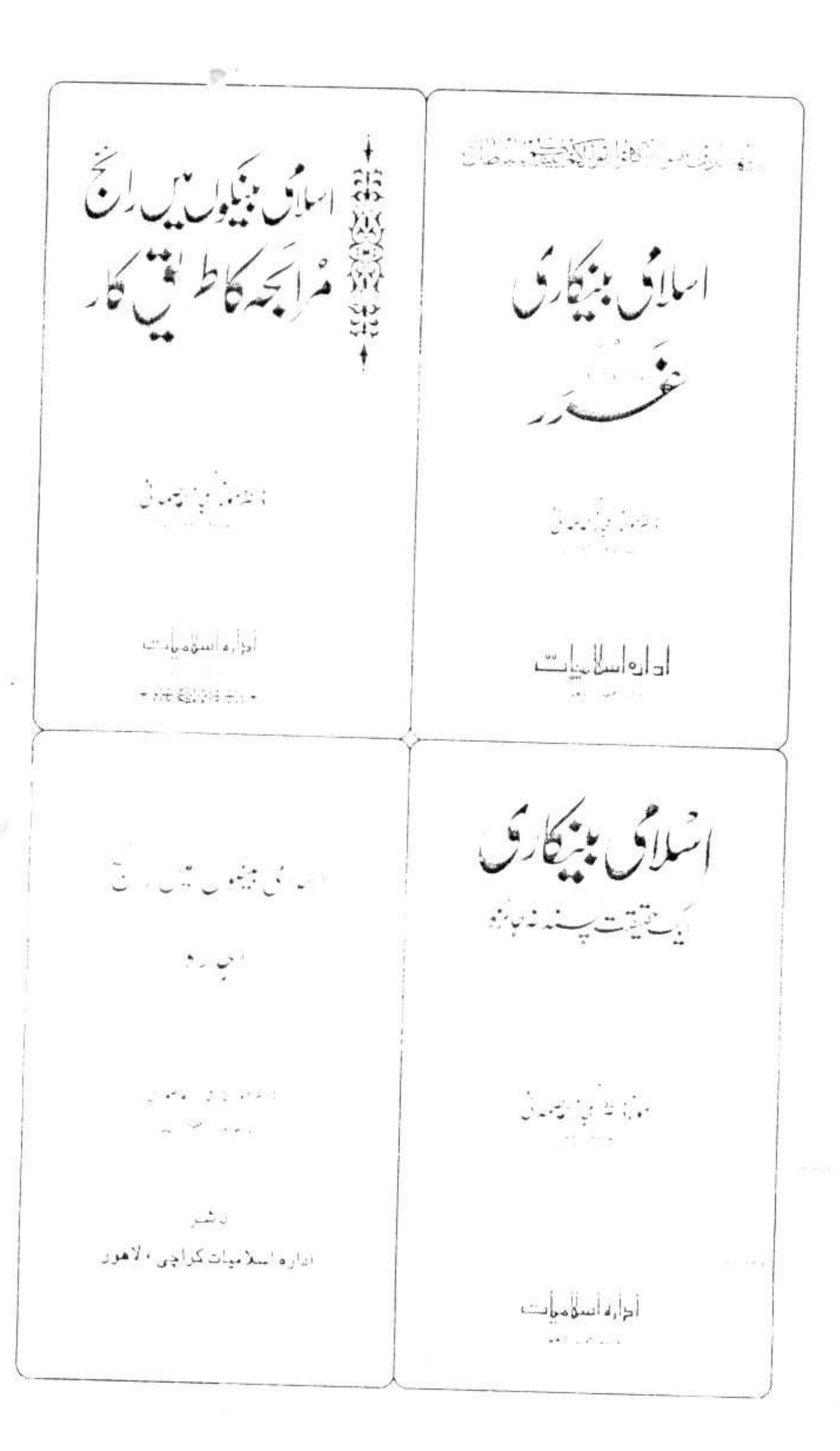
(۱۶۳) هلال الرای، هلال بن یحیی بن مسلم الرای. کتاب احکام الوقف، حیدر آباد دکن، دائرة المعارف العثمانية ۱۳۵۵ھ

English Books

(164) Garner. Brayan A.Garner, Black's Law Dictionary. America, West Group, Seventh Adition (Page: 1517)

(165) The Trust Act 1882. Karachi, Pioneer Book House, Reproduced Edtion 1999

(166) Usmani, Muhammad Taqi Usmani, An Introduction to Islamic Finance. Karachi, Idaratul Maarif 2000



اسلامی بینکوں میں رائج
مرابحہ کا طریق کار
ادارہ اسلامیات
اسلامی بینکاری
ادارہ اسلامیات
ادارہ اسلامیات کراچی ، لاہور
اسلامی بینکاری
ایک حقیقت پسندانہ جائزہ
ادارہ اسلامیات